WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

سرگزشت
07 — ماہر — ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر مختصر ایک نادرروزگار کا تعارف

گفت و شنید
08 — شہرِ خیال — مدیر اعلیٰ
آپ کی باتیں، آپ کے خیال، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت
16 — شاعرِ اخلاق — ڈاکٹر ساجد امجد
اس شاعر کا تذکرہ جس نے شاعری کو نئی جہت دی

معلومات
43 — سری ادب کی ملکہ — فرزانہ نگہت
عالمی طور پر پسند کی جانے والی مصنف کے شب و روز

زندگی نامہ
47 — مردِ آہن — زویا اعجاز
اس نے ملک کے حالات بدل کر دکھا دیے

تذکرہ
77 — وہ ایک تارا — سلمیٰ اعوان
ایک صحافی کی روداد جسے موت دے دی گئی

تحریر خاص
99 — مارچ کی شخصیات — صائمہ اقبال
اس ماہ سے جڑی اہم شخصیات کا ذکرِ خاص

تصویر عالم
111 — شکاگو — علیم شاهد
ایک شہرِ بے مثال کا تذکرہ

خراجِ تحسین
116 — سچا لیڈر — عبداللہ احمد حسن
ملک کو ترقی کی شاہراہ پر لانے والا حکمران

فلم نگری
121 — بے چارہ — انور فرہاد
جس کی آواز آج بھی یاد دلاتی ہے کہ وہ بے مثال تھا

سفر کہانی
137 — شمشال سے ٹورنٹو — ندیم اقبال
جاب وینا زی کا شہکار ایک الگ انداز کی داستان

روداد
161 — کھڑکی — کاشف زبیر
ایک بچے کی دلچسپ کتھا مالک غیر سے

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
✿ تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

معاشرت
ناسور 172
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
ایک معصوم نوجوان کی خون رنگ، لہوگرما دینے والی داستان

شعروادب
بیت بازی 207
قارئین
شعروادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ

انعامی مقابلہ
علمی آزمائش 210
ادارہ
ذہین قارئین کے ذوق جستجو کی تسکین کے لیے منفرد انعامی سلسلہ

پہلی سچ بیانی
شطرنج کی چال 212
نجمہ
اس کی زندگی میں دو کردار اہم تھے ایک بہن دوسرا شوہر

دوسری سچ بیانی
تھکن 227
اختر شہاب
اس پرآشوب دور میں غریبوں کی زندگی کا احوال

تیسری سچ بیانی
انعام 236
سید محمود الحسن
اس کے ہاں سے سب کو ملتا ہے، صبر شرط ہے

چوتھی سچ بیانی
میں ہوا کافر 241
روزینہ
ایک ہنستی مسکراتی تحریر الگ انداز کی

پانچویں سچ بیانی
ڈھلتے سائے 247
اعجاز احمد راحیل
رنگ بدلتی سچ بیانی میں سحر دیرپا ہے

چھٹی سچ بیانی
اس ہاتھ دے 259
شمیم الدین غوری
کر بھلا سو ہو بھلا کی دلچسپ تشریح

ساتویں سچ بیانی
ٹیوشن 267
منظر امام
اسے پیسے دے کر ٹیوشن پڑھانا پڑ رہا تھا

آٹھویں سچ بیانی
پالش والے بابا 273
احمد
ایک عجیب وغریب کردار کی داستان

نویں سچ بیانی
پچھتاوا 277
عامر
ایک عیار و مکار ماں بیٹی نے کیا کر ڈالا

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | f PAKSOCIETY

Downloaded From http://paksociety.com

ماہر

2مارچ1923ءکو کوئٹہ میں سید محبوب علی شاہ کے گھر پیدا ہونے والے بچے کے بارے میں کسے اندازہ تھا کہ وہ اپنا ایک الگ مقام بنائے گا۔ اردو ادب کی آبیاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے گا۔ اس صوبے میں جہاں بلوچی اور کئی دیگر زبانیں رائج ہیں وہاں اردو شاعری میں بلند مقام حاصل کرے گا مگر ابھی وہ مقام حاصل ہونے کا وقت نہیں آیا تھا۔ کچھ ہوش مند ہوا تو اسے گھر پر ہی ابجد سے واقفیت کرائی گئی پھر مقامی اسکول میں داخل کرایا گیا۔ والد سول سروس میں تھے اور ادبی ذوق کے حامل تھے اس لیے ادب سے دلچسپی ہونا ضروری تھا۔ والد کو شاعری کا شوق تھا اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ان کا تبادلہ مختلف شہروں ہوتا رہتا تھا۔ کبھی سبی۔ کبھی نورالائی کبھی قلعہ سیف اللہ۔ 1935ء میں جب لاہور تبادلہ ہوا تو والد کے ساتھ اسے بھی لاہور آنا پڑا۔ اس وقت لاہور کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ادب پرستوں کا شہر کہلاتا تھا۔ ادبی ماحول ملا تو اس صغیر سنی میں ہی وہ شعر کہنے کی مشق کرنے لگا۔ ابھی مشق سخن جاری تھا کہ سر سے سایہ پدری چھن گیا۔ اس وقت عمر ہی کیا تھی صرف سولہ سال۔ ایک غم کا بار چند سال قبل اٹھا چکا تھا۔ عین عالم شباب میں بڑا بھائی سید طاہر علی شاہ نے اس عالم رنگ و بو سے منہ موڑ لیا تھا۔ اس صدمے میں والد نے نوکری سے ریٹائرمنٹ لے لی تھی کہ اب وہ بھی نہ رہے۔ والد کی موت نے وقت سے پہلے اسے کارزار دنیا میں کھینچ لیا اس لیے کہ اب اس پر ایک بہن اور والدہ کی کفالت کا بوجھ آن پڑا تھا۔ اس ذمے داری کو احسن طریقے سے نبھانے کے لیے اس نے تگ ودو شروع کر دی اور مالی حالت کو بہتر کر لیا۔ ابھی وہ صحیح طور پر سکھ کا سانس لے بھی نہ پایا تھا کہ شادی شدہ بڑی بہن انتقال کر گئی۔ اس صدمے نے اسے پھر سے دہلا دیا۔ ہر کام سے دل اچاٹ ہو گیا۔ اسی دوران اس کی تعیناتی کا حکم نامہ موصول ہوا۔ کئی ماہ قبل اس نے محکمہ پولیس میں بھرتی کا فارم بھرا تھا۔ ٹیسٹ دیا تھا۔ گھر کے سونے پن سے وہ پہلے ہی عاجز تھا۔ اس لیے فوراً جوائنگ دینے کے لیے پہنچ گیا۔ اس نے محکمہ پولیس میں ملازمت تو کر لی تھی لیکن یہاں بھی دل نہیں لگ رہا تھا کیونکہ ہر دو تین ماہ بعد تبادلے کا حکم آ جاتا۔ کبھی الور کبھی اجمیر شریف کئی شہروں میں تبادلے ہوئے پھر اس نے محکمہ پولیس کی نوکری ہی چھوڑ دی اور ملٹری اکاؤنٹس میں آ گیا۔ 1941ء میں وہ دہلی میں تھا۔ یہاں اسے بھرپور ادبی ماحول ملا۔ وہ پابندی سے مشاعروں میں جاتا۔ ریڈیو کی محافل میں بھی شرکت کرتا۔ دہلی کے ادبی ماحول نے خوب صیقل کی۔ اب وہ اہمیت حاصل کر چکا تھا اس لیے لوگ ادب سے پیش آتے۔ ادبی دنیا میں پہچان بن چکی تھی۔ لیکن سیاسی ماحول بھی گرم ہوتا جا رہا تھا۔ مسلمانان ہند کی ایک ہی تمنا تھی کہ اپنا ایک الگ ملک ہونا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تحریک پاکستان کے پُرجوش کارکن کی حیثیت سے پہچانے جانے لگا تھا۔ 1947ء کے جون میں جب قیام پاکستان کا باضابطہ اعلان ہوا تو انہوں نے دہلی سے ہجرت کا عندیہ دے دیا۔ ابھی وہ دہلی سے نکلنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ ہر طرف کشت وخون کا بازار گرم ہو گیا۔ اب وہاں رہنا ناممکن سی بات ہو چکی تھی۔ اس لیے ہجرت پر آمادہ ہو گیا اور اگست میں بہ ہزار دکھ تکلیف وہ روہڑی آ گیا پھر وہاں سے 15اگست کو کوئٹہ جا پہنچا۔ کوئٹہ آنے کے دس ماہ بعد وہ رشتۂ ازدواج میں بندھ گیا۔ زندگی میں ایک ٹھہراؤ آیا تھا کہ اگلے ہی سال وہ ملازمت کے سلسلے میں کراچی آ گیا لیکن یہاں بھی زیادہ عرصہ رہ نہ سکا اور 1951ء میں دوبارہ کوئٹہ منتقل ہو گیا۔ 1954ء میں ان کے ہاں سید حسن کی ولادت ہوئی زندگی مزید حسین ہو گئی۔ وہ زندگی میں پھیلتی خوشیاں سمیٹ ہی رہا تھا کہ شریک حیات جسے وہ خوش حالی کی نوید کہتا تھا وہ 11ستمبر 1961ءکو ساتھ چھوڑ گئی۔ منوں مٹی کی چادر اوڑھ کر قبر کا کونا آباد کر لیا۔ بیوی کے انتقال نے اسے توڑ کر رکھ دیا۔ لوگوں نے مشورہ بھی دیا کہ دوسری شادی کر لو لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ بچوں کی پرورش پر داخت میں لگ گیا۔ پے در پے صدمات اور ناموافق حالات نے اس طرح توڑا کہ اپنا کلام تک سنبھال نہ سکا۔ اردو اور فارسی کے ہزاروں کی تعداد میں اشعار تلف ہو گئے۔ دو سال تک روزنامہ کوئٹہ سے وابستہ رہا۔ بڑی تعداد میں فکاہی مضامین، انشائیے، قطعات اور اخلاقیات سے متعلق مضامین لکھے۔ کوئٹہ کی علمی و ادبی محافل میں شرکت کرتا۔ کراچی اور کوئٹہ کے ریڈیو پروگراموں، مشاعروں میں شرکت کرتا رہا۔

دوستوں نے مشورہ دینا شروع کر دیا کہ اب آپ کا مجموعہ کلام آ جانا چاہیے۔ جب اصرار بڑھا تو مجموعہ ترتیب دیا اپنی نگرانی میں کتابت کرائی لیکن فرشتے نے مہلت نہ دی اور 5 ستمبر 1983ءکو اس دنیا سے رخصت ہو گیا، مدفن کراچی بنا۔ کافی عرصے بعد مجموعہ کلام آیا۔ اس قادر کلام شاعر کو ادبی دنیا ماہر افغانی کے نام سے پہچانتی ہے۔

☆☆☆

Downloaded From http://paksociety.com

جلد 27 ❖ شمارہ 02 ❖ مارچ 2017ء

ماہنامہ
کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

شعبۂ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789
نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
رانا محمد حمید 0323-2895528
نمائندہ لاہور افراز علی نازش 0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200
Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER
APNS
CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

''شہر میں فسادات کا ایک سلسلہ سا شروع ہو گیا تھا۔لوگ خوامخواہ ایک دوسرے کو مار رہے تھے۔ایسی خبریں سن سن کر حزبِ اختلاف کے حکیم لقمان چودھری کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔وہ دو دن سے کوما میں تھے۔ڈاکٹروں کا ایک جتھا ان کے گرد جمع تھا۔اسپتال میں ایمرجنسی کی صورت حال تھی۔مریض آ رہے تھے،جونیئر ڈاکٹر ان کو دیکھ رہے تھے کیونکہ تمام سنیئر ڈاکٹر حکیم صاحب کو دیکھ رہے تھے۔حکیم صاحب کسی طور کوما سے باہر آتے نظر نہیں آ رہے تھے۔دوائیں بدل کر بھی دیکھ لی گئی تھی۔انہیں ہوش نہیں آ رہا تھا۔چینلز پر بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔عوامی اتحاد کو پارہ پارہ ہوتے دیکھ حکیم صاحب ہوش کھو بیٹھے ہیں۔تبھی ایک جونیئر ڈاکٹر نے کہا''سر میں اپنا طریقہ آزماؤں شاید یہ ہوش میں آ جائیں۔''سنیئر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا کر طنزیہ انداز میں کہا''آزمالو''وہ ان کے سرہانے پہنچا اور کان سے منہ لگا کر بولا۔''کرسی،کرسی خالی کرسی۔''

آواز کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ حکیم صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ان کے لب ہلے اور اور نقاہت بھری آواز میں پوچھا۔''کہاں ہے کرسی۔''

اس کہانی میں مجھے وہ سب نظر آ رہا ہے جو ہمارے ارد گرد ہو رہا ہے۔کسی کو کسی کی پرواہ نہیں۔سب اپنے مفاد کے لیے ہمدرد بنے ہوئے ہیں۔ایسے وقت میں مجھے حبیب جالب کے یہ دو شعر یاد آ رہے ہیں۔

کہاں قاتل بدلتے ہیں فقط چہرے بدلتے ہیں
عجب اپنا سفر ہے فاصلے بھی ساتھ چلتے ہیں
وہ جس کی روشنی کچے گھروں تک بھی پہنچتی ہے
نہ وہ سورج نکلتا ہے نہ اپنے دن بدلتے ہیں

معراج رسول

Downloaded From http://paksociety.com

شہرِ خیال

☆عبداللہ شجاع سندھی لاڑکانہ سے لکھتے ہیں۔ ''ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی سرگزشت اپنی تمام تر تحریری رعنائیوں کے ہمراہ قارئین کی علمی دلبستگی کا سامان لیے ہوئے حاضر خدمت تھا۔ اگر لفظ سرگزشت کا اشتقاق کیا جائے تو وہ اپنے ماخذ و مصدر ''گزشتہ'' سے ماخوذ ہے۔ اس لیے مذکورہ لفظ اپنے حقیقی اور درست خط و املا کے لحاظ سے حرف ''ز'' کے بجائے حرف ''ذ'' سے جڑ کر ''سرگزشتہ'' ہونا چاہیے۔ (علمی لغت اور فرہنگ آصفیہ ''ز'' کو درست بتاتے ہیں)۔ ممتاز افسانہ نگار جیلانی بانو کے متعلق ایک صفحے میں مکمل اور جامع تذکرہ پڑھ کر ہماری ادبی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا کہ محترمہ نے اپنے زور قلم سے علم و ادب کے خادمین میں اپنی شخصیت کو منوا کر دم لیا۔ ''شہرِ خیال'' کا ہمارے ذہن و قلب پر ایسا سحر طاری رہتا ہے کہ ہم جسمانی طور پر کسی بھی شہر میں کیوں نہ ہوں لیکن سرگزشت کا ''شہرِ خیال'' ہمارے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ بہر کیف مطالعے کے بعد تمام مبصرین سرگزشت کے لیے اپنے احساسات و تاثرات کو جس طرب و نشاط کے ساتھ ظاہر کر رہے تھے وہ ان کی سرگزشت سے والہانہ عقیدت مندی اور شگفتگی کی عمدگی سے غمازی کر رہے تھے۔ ڈاکٹر ساجد امجد معروف ادیب و صحافی حمید اختر کا زندگی نامہ لے کر ہماری علمی نشو و نما اور ضیافت کے لیے حاضر خدمت تھے۔ مذکورہ شخصیت کی ادبی صحافتی اور نجی زندگی کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے قلم سے جس خوب صورت انداز سے رقم کیا ہے اس کے لیے کیا کہا جائے کہ یہ منفرد انداز تحریر کا مالک ہونے کا اعزاز حاصل کرنا ڈاکٹر صاحب کا ہی خاصا ہے۔ ہمارے لیے شمارے میں دکھ کی خبر تھی کہ قلم کاری سے قارئین کو اپنا بنائے رکھنے والے مصنف سلیم فاروقی بھی ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ اللہ مغفرت فرما کر ان کے درجات بلند کرے۔ صائمہ اقبال نے ''فروری کی شخصیات'' سے متعارف کرایا۔ مذکورہ سلسلے کی آبیاری کے لیے جو قلم کار اپنے مضامین پیش کر رہے ہیں ان کی کاوشیں ہم جیسے معلومات کے متلاشی افراد کے لیے باعثِ انبساط ہیں۔ اس مرتبہ انور فرہاد نے پاکستانی فلمی صنعت میں ایک مقام پیدا کرنے والی شخصیت خان عطاالرحمٰن کی فلمی اور نجی زندگی کا سربستہ احوال پیش کر کے ہمیں بھی خان صاحب سے صاحب محبت ہونے کا شرف بخشا۔ فلمی معلومات میں مزید اضافے کے لیے قاسم رضا بھی ایک ''ایک صدی کا قصہ'' کے نام سے یہ حیرت ناک انکشاف کر رہے تھے کہ تقسیم ہند کے بعد پاکستان کی فلمی دنیا لاہور میں عروج پر پہنچی کیونکہ انگریزوں کے دور میں بھی لاہور فلمی صنعت کا مرکز تھا لیکن لوگوں کو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ پاکستان کی فلمی صنعت کو استحکام بخشنے میں ملتان کا بھی ہاتھ ہے۔ بے شک تحقیق کے دریچے سے نکلنے والی یہ لاجواب فلمی شعور کو وا کرنے والی تحریر تھی۔ ''بندہ بیراگی'' کے نام سے ایاز راہی سکھوں میں مقدس سمجھے جانے والے ایک نہایت ظالم اور سفاک شخص مادھو داس عرف بندہ بیراگی خونچکاں تذکرہ لے آئے۔ ایک غریب الوطن کو دیارِ غیر میں کن کن مسائل و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ اس دلخراش سوال کا جواب ندیم اقبال اپنی قلمی محنت سے رقم کیے گئے سفرنامے ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں کچھ اس انداز سے دے رہے ہیں کہ ہر پڑھنے والا باہر جانے سے پہلے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے پر ضرور آمادہ ہو جاتا ہے۔ مرحوم کاشف زبیر کی طویل طبع زاد کہانی ''سراب'' کے دلپذیر اختتام کے بعد محترم ڈاکٹر عبدالرب بھٹی بھی نئے عزم و حوصلے کے ساتھ ایک طبع زاد کہانی ''ناسور'' کی پہلی قسط کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے۔ سچ بیانیوں میں ''ماں جایا'' ایک ایسی تحریر تھی جس میں ایک شفیق بہن اپنے سنگدل بھائی کی طرف سے بے اعتنائی اور بے رخی برتنے کے باوجود خونی رشتے کی فطری طرف داری کرتی ہوئی نہ صرف اپنے بھائی بلکہ ہر عام و خاص کو یہ سبق دے رہی تھی کہ ''ہم شیرہ'' کا قدرتی رشتہ اپنے اندر کتنی محبت بھری گہرائی اور گیرائی رکھتا ہے۔ ''میں کھلونا نہیں'' میں قلم کار اعجاز احمد راحیل نے ایک شادی شدہ دوشیزہ کے لیے وارفتگی کے جذبات کا مظاہرہ کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ جو اپنے عیاش شوہر سے پہلے ہی تنگ آچکی تھی۔ آخری سچ بیانی اپنی موضوعاتی اہمیت کے لحاظ سے پہلی سچ بیانی سے ہرگز کم نہیں تھی۔ مذکورہ سچ بیانی نیکی اور بدی کے متضاد کرداروں کی رسہ کشی پر مبنی ایک متاثر کن تحریر تھی جس میں نیک نیتی کا جذبہ رکھنے والے کرداروں کو فتح و کامرانی اور بدکرداروں کو بالآخر شکست ہوئی۔''

☆رانا محمد شاہد بورے والا سے۔ ''اداریہ پڑھنے کے بعد قرآن کی ایک آیت یاد آگئی، جس کا ترجمہ ہے: ''اور انسان کے لیے وہی کچھ ہے، جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔'' جو مصائب و مشکلات کے باوجود ہمت نہیں ہارتے وہی کامیاب ہیں۔ یک صفحی سرگزشت میں جیلانی بانو پر

Downloaded From http://paksociety.com

دلچسپ تحریر تھی۔ پڑھ کر اچھا لگا کیونکہ کم و بیش سبھی لکھنے والوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ ابتداء میں حوصلہ افزائی بالکل نہیں ہوتی۔ ''مشہرِ خیال'' میر کرسی صدارت پر سید مسرت حسین تھے۔ قیصر عباس خان آپ نے تبصرے کی پسندیدگی کا اظہار کیا، شکریہ۔ انور عباس شاہ خط اور شمارے کی تاریخ کا پوچھ کر آپ نے بہت سارے قارئین کی مشکل آسان کر دی۔ عمران جونانی بھائی کی والدہ کے انتقال پر ان سے تعزیت کرتے ہیں۔ آفتاب احمد نصیر شاید مستقل طور پر کراچی شفٹ ہو چکے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کے حوالے سے آپ نے صحیح لکھا مگر یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات زندگی اور معاشرے کی حقیقتیں اتنی تلخ اور کڑوی ہوتی ہیں کہ عام حالات میں ہمیں ... بی محسوس ہوتی ہے۔ اویس شیخ، برینڈر سل کا جملہ بہت اچھا لگا۔ سدرہ بانو ناگوری اس دفعہ سردیاں دسمبر کی بجائے جنوری میں آئیں اور امریکا، کینیڈا کیا، پاکستان میں بھی سردی کا شاید سو سالہ ریکارڈ ٹوٹ گیا۔ ویسے آپ نے سردی کی جن سوغاتوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے سوپ اور شکر قندی کے علاوہ باقی سبھی کو انجوائے کر لیا ہے۔ دنیا بھر کے مشہور ادیبوں پر سلسلے کی آپ کی تجویز اچھی لگی۔ عبدالجبار رومی کا خط بھی اچھا تھا۔ اس دفعہ ڈاکٹر ساجد امجد مشہور صحافی اور نامور قلم کار حمید اختر پر تفصیلی تحریر لائے۔ انہوں نے ادب و ثقافت کو اپنی اولاد میں بھی منتقل کیا۔ ٹی وی کی معروف اداکارہ صبا حمید ان کی بیٹی ہیں۔ سلیم فاروقی کے بارے میں جان کر دکھ ہوا۔ ان کی ادبی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ آپ نے صحیح لکھا قلم کار کبھی نہیں مرتا۔ اپنی تحریر کی صورت قارئین کے دلوں میں زندہ رہتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ انہیں جنت میں جگہ دے اور ان کے گھر والوں کو صبر دے (آمین)۔ ممکن ہو تو ان کے اور جنید جمشید کے بارے میں تفصیلی تحریر لکھیں۔ زویا اعجاز ویسٹ انڈیز کے ایک بڑے کھلاڑی ڈیرن سیمی پر بڑی دلچسپ تحریر لائیں۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہمارے عظیم بلے باز محمد یوسف کے ساتھ بھی تھی۔ محمد یوسف نے ویسٹ انڈیز کے عظیم بلے باز سر ویوین رچرڈز کے کیلنڈر ایئر میں سب سے زیادہ رنز کا تیس سالہ ریکارڈ توڑا۔ اس کے علاوہ بھی کئی ریکارڈ انہوں نے اپنے نام کیے۔ زویا اعجاز صاحبہ سے گزارش ہے کہ سیمی کی طرح یوسف پر بھی تحریر لکھیے۔ صائمہ اقبال کی تحریر کی خوب صورتی ہے کہ وہ نئی نئی شخصیات سے متعارف کروا رہی ہیں۔ قاسم رضا نے فلمی صنعت کی ترقی میں ملتان کے کردار کے حوالے سے دلچسپ اور تحقیقی مضمون لکھا۔ اسی مضمون میں انہوں نے صفحہ 92 پر ہندی سنیما کے نامور ہیرو راجیش کھنہ کے بارے میں لکھا کہ وہ بورے والا میں پیدا ہوئے۔ تھوڑی تفصیل لکھتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ راجیش کھنہ کا آبائی گھر آج بھی بورے والا شہر کے مرکز میں سٹی تھانہ کی بیک سائیڈ پر موجود ہے۔ طارق عزیز خان کی ''مہم جو'' اور ایاز راہی کی ''بندہ بیراگی'' معلوماتی تحریریں تھیں۔ ندیم اقبال کا سفر نامہ بھی زبردست جا رہا ہے۔ نائیکل اسٹوری ''مل جایا'' معاشرے کی ایک تلخ حقیقت دکھا رہی تھی۔ مہرین نے نہ صرف بیٹی کے طور پر قربانی دی بلکہ ایک بہن ہونے کا بھی حق ادا کر دیا۔''

☆ قیصر خاں نے بھکر سے لکھا ہے۔ ''زمانے کی حقیقت بہت خوب صورت مثال میں سمجھا دی انکل جی نے کہ کندن بننا ہے تو جلنا ہوگا۔ یک صفحی میں جیلانی بانو افسانہ نگار کے بارے میں پڑھا جس کو میں نہیں جانتا تھا۔ 'مشہرِ خیال' میں سید مسرت حسین رضوی کرسی صدارت پر موجود تھے۔ بہت مبارکباں۔ سب کے تبصرے جاندار تھے۔ اللہ کے فضل سے تمام دوست اچھا لکھتے ہیں۔ انکل ندیم اقبال کا سفر نامہ بہت اچھا جا رہا ہے لیکن آپ کا تبصرہ بہت مختصر تھا۔ اللہ آپ کی تمام خواہشات پورے کرے (آمین)۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے بہت خوب صورتی سے حمید اختر کے بارے میں لکھا۔ وہ واقعی بے مثال لکھاری تھے۔ انور فرہاد صاحب انکل آفاقی کی کمی پوری کر رہے ہیں۔ قاسم رضا صاحب نے تو کمال کر دیا ملتان کے فنکاروں کی تاریخ کوزہ میں بند کر دی۔ سر ندیم اقبال کا سفر نامہ تمام رنگینیوں کے ساتھ تھا۔ بہت خوب صورت قسط تھی اور نسرین کا جذباتی ہونا کسی فلمی سین جیسا لگا۔ ''سراب'' کے بعد ڈاکٹر صاحب کی کہانی ''ناسور'' کو پڑھنے لگا ہوں۔ سچ بیانی میں پہلی سچ بیانی میں مجھے زن مرید ملے۔ دوسری کہانی میں عورت کا خطرناک روپ دیکھا۔ ''بے رحم'' انسانی رشتوں کا تقدس اب رہا نہیں ہے۔ ''میری اجالا'' میں اس نے وہ کام کیا کہ انسانیت شرما جاتی ہے۔ ''قاطر بھائی'' تھوڑا سا مسئلہ تھا لیکن عورت نے اعلیٰ ظرفی نہ دکھائی۔ ''خواب سراب'' یہ تمام لوگوں کا المیہ ہے جو غیر ملک جاتے ہیں۔ ''مکافاتِ عمل'' غرور کی سزا ایسے ہی ملتی ہے۔ ''رنگ دوستی'' اس میں دوستی تھی، وفاداری تھی یا قتل تھا، وفاداری میں جائز نہیں کسی ذی روح کو قتل کر دینا۔ دھوکا دینے والے کو کیا موت کی سزا ملنی چاہیے مجھے اعتراز ہے سزا و جزا کا حق صرف انصاف دینے والے کو ہے۔''

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کراچی سے لکھتے ہیں۔ ''جو قومیں آزمائش کی بھٹیوں سے گزرتی ہیں تو سرخرو ہوتی ہیں، ورنہ قومیں اپنے لیڈروں کی وجہ سے چین، جاپان، ترکی، امریکا، انڈونیشیا اور ملائیشیا بن جاتی ہیں۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ جب ہمیں قائداعظم محمد علی جناح اور قائدِ عوام ذوالفقار علی بھٹو نہیں ملتے تو ہماری ساری کھنکھناہٹ، طاقت اور چمک صفر ہو کر رہ جاتی ہے۔ ورنہ بحیثیت قوم ہم آزاد وطن بھی حاصل کر لیتے ہیں اور ایٹمی قوت بھی بن جاتے ہیں۔ آپ کا اس ماہ کا سبق اگر قوم پلے باندھ لے تو محنت کا ایک سادہ سا عمل اسے اقوام عالم میں نمایاں کر سکتا ہے۔ جیلانی بانو کی افسانہ نگاری کو ہم پذیرائی دے کر 'مشہرِ خیال' میں داخل ہوئے تو سید صاحب کی مسرتوں پر حسرت سے نظر ڈالی اور اپنا نام دیکھ کر حسرت و یاس سے باہر بھی نکل آئے لہٰذا خود کو ملنے والی مبارک بادوں میں سے کچھ حصہ رضوی صاحب کی بھی نذر کر دی۔ اس مرتبہ پھر ڈاکٹر آر این ایس انصاری صاحبہ کے خیالات سے محرومی کوفت کا سبب بنی جب کہ ندیم اقبال صاحب کو اپنے درمیان دیکھ کر محظوظ ہوئے۔ ان کی بڑھتی ہوئی ہر دلعزیزی کا راز بھی یہی ہے کہ وہ برقی گوشوں سے بروقت استفادہ کر رہے ہیں پہلے پہل ایاز راہی صاحب بھی آ جاتے تھے تو بہت خوشی ہوتی تھی۔ بڑی خوشی ہوتی ہے جب پڑھنے والے کو یہ پتا چل جائے کہ لکھنے والا اس کے احساسات سے آگاہ ہے۔ ادیب اور صحافی ہونے سے پہلے حمید اختر سادات ہونے کی سعادت بھی رکھتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کی صعوبتوں میں قربانیوں کی مثالیں اور عملی زندگی میں کٹھنائیوں کا انتخاب اور ان میں سرخروئی کائنات کے سب سے ارفع خاندان کی میراث کی ادنیٰ سی مثال

Downloaded From http://paksociety.com

ہے۔ہم انہیں ادیب سے زیادہ صحافی اس لیے قرار دیں گے کہ 1970ء میں بھٹو صاحب کی پیش کردہ ڈھائی لاکھ کی خطیر رقم لوٹا کر صحافت کی آبرو رکھنا انہیں عظیم صحافی کے زمرے میں شامل کرتا ہے۔ویسٹ انڈین کرکٹ کے اسٹیبلشمنٹ نے ملکی کرکٹ کا بیڑہ غرق کردیا ہے۔ٹی ٹوئنٹی میں ان کا دو مرتبہ عالمی چیمپئن بنانا کھلاڑیوں کے قومی جذبے کی مرہون منت ہے۔فروری کی شخصیات میں گلوکار شفقت امانت علی کا قومی ترانہ بھول جانا وہ بھی بھارت میں ناقابلِ برداشت ہے۔شفقت کی یہ غلطی نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔ہرفن مولا عطاء الرحمٰن کے بارے میں انور فرہاد نے کوئی نکتہ نہیں چھوڑا۔اسی طرح قاسم رضا بھی ملتان کے نگینوں کا ذکر کررہے تھے۔صائمہ، انجمن اور ناہید اختر کی آب و تاب تو ہماری آنکھوں کو بھی خیرہ کرچکی ہیں۔امریکا بھلے کرسٹوفر کولمبس نے دریافت کیا ہو یا لیف ایرکسن نے، ہم یہ بات جانتے ہیں کہ اسے دنیا کی واحد سپر پاور ہم نے بنایا اور یہی اس کی سب سے بڑی دریافت ہے۔ندیم اقبال شمشال نہیں صرف ٹورنٹو سے ہمیں یہ بتا رہے تھے کہ غیر اسلامی ممالک میں آکر لوگ بگڑنے کے بجائے راہِ راست پر آجاتے ہیں۔ہم خود بھی دیارِ غیر کے کئی ممالک کی خاک چھان چکے ہیں اور ان کی اس بات سے پوری طرح متفق ہیں کہ گناہ کے حصول میں آسانی خوفِ خدا کے فوری طاری ہونے کا سبب بنتی ہے۔''ناسور'' چونکہ ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے لہٰذا اس پر نشترزنی خطرناک ہوگی۔اس ماہ کی خوب صورتی کا سبب جواہر پارے تھے اتنے زیادہ اور اتنے معلوماتی جواہر پارے ہمیں محظوظ کرگئے۔''ماں جایا'' ماں جائی کے خلوص و ایثار کی روایتی کہانی تھی۔مہرین کا بھائی اور مہرین کا شوہر دونوں ...اپنی اپنی بیویوں کی مرضی کے مطابق چلے، فرق بیویوں کے رویوں کا تھا۔''بے رحم'' پچھتاوے و ندامت کے کنارے کی سبق آموز کہانی تھی۔آخر میں جناب سلیم فاروقی کی روح کو ایصالِ ثواب کے لیے سورۂ فاتحہ و اخلاص و درود شریف کا تحفہ اور ان کے لواحقین کے لیے صبر کی دعا۔''

☆ اعجاز حسین سٹھار نور پور تھل سے رقمطراز ہیں۔''ماہ فروری سے ہمیں پہلے ہی خیر کی توقع نہیں تھی۔یہ ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے قارئین کے لیے کسی خونخوار درندے سے کم ظالم نہیں ہے۔گزشتہ سال محی الدین نواب اور پھر کاشف زبیر جیسے جواں سال لکھاری کو نگل گیا۔اب رہی سہی کسر فروری کے شمارے میں سلیم فاروقی کی موت کی خبر پڑھ کر پوری ہوگئی۔ہم اس صدمے کا اظہار بار بار کریں گے تو شاید آپ بھی اکتا جائیں۔یہ حالات اور بڑھاپے کا اثر ہے کہ میں انتہائی حساس اور نرم ہوگیا ہوگا۔پچھلے دنوں سرگودھا کے ایک بک اسٹال پر سسپنس ڈائجسٹ کے چند پرانے رسالے نظر آگئے تو میں نے وہ خرید لیے۔گھر آکر مطالعہ شروع کیا تو میں نومبر 1996ء کے آخری صفحات پر ایچ اقبال کی تحریر کردہ کہانی ''منقسم'' پڑھ کر کئی بار رو پڑا۔دو بھائیوں کی محبت اور آپس کے اعتماد نے مجھے رلا دیا۔بس اللہ مرحومین کے درجات بلند کرے، (آمین)۔اس بار پھر بکھر والے اپنی چمک دمک کے ساتھ موجود ہیں۔ جن دوستوں نے میرے تبصرے کو سراہا وہ شکریہ قبول کریں۔اس ماہ کی شخصیات میں ہر ایک انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ نظر آرہا ہے۔البتہ شفقت امانت علی کی کارکردگی پر افسوس ہوا، ہم لوگ تنقید کرنے سے نہیں چوکتے حوصلہ افزائی نہیں کرسکتے تاکہ اس میں محنت کرنے کی تحریک پیدا ہو۔''شمشال سے ٹورنٹو'' میں ندیم اقبال جیسے واقعات کو گرفت میں لے کر چل رہے ہیں پھر سب کے حالات خیالات مصروفیات اور احساسات کو سنبھال کر قلم کاغذ کی زینت بنا رہے ہیں اور جہاں تک رسائی ہے اس کی منظرکشی بھی لاجواب ہے۔ ''ناسور'' کو بڑی توجہ اور تجسس سے پڑھا ہے۔واقعات میں تسلسل ہے۔کہانی میں بھی ٹھہراؤ ہے۔زیادہ ہلچل اور ہنگامہ آرائی دیکھنے میں نہیں آئی۔اس بار سچ بیانیاں خلاف روایت بھاری بھرکم شاملِ اشاعت ہیں۔''ماں جایا'' میں جیسا رویہ امجد کا ہے یہ نئی بات نہیں ہے یہاں اکثریت ایسے بھائیوں کی ہے جو بہنوں سے قربانی کی توقع رکھتے ہیں۔''میں کھلونا نہیں'' میں شمائلہ کی زندگی کے اسٹائل کے ساتھ کردار کی مضبوطی اور زندگی کے ہر پہلو پر مثبت اور فلسفیانہ گفتگو نے حیران کردیا۔وہ کس ماحول میں پلی بڑھی، غیر یقینی حالات میں شادی اور الطاف رانا کا برتاؤ سہا لیکن اپنے اندر کی حقیقی عورت کو زندہ رکھا۔''بے رحم'' میں بچہ پالنے والی عورت انسانی روپ میں کوئی دوسری مخلوق تھی سوچنے کی بات ہے کہ اس کے وسائل نہ تھے لیکن ماممتا اور انسانیت کے جذبے سے مجبور ہوکر پرورش کا بیڑا اٹھایا اور کامیاب ٹھہری۔اللہ کی طرف سے بھی مدد حاصل رہی کبھی غیر معمولی صورتِ حال کا سامنا نہ ہوا۔''میری اجالا'' میں ایک تسیم نے معمولی بات پر کتنے پینترے بدلے۔دوسروں کو جھوٹ موٹ سے برائی پر راغب کیا اور قریبی رشتوں سے نفرت پر اکسایا اور اپنی قبر کو انگاروں کا گڑھا بنایا۔پھوپی خوش قسمت رہی کہ جیتے جی سب سے اپنے گناہ بخشوا لیے۔اللہ سب کو ایسی آزمائشوں سے بچائے، آمین۔''قسمت کا کھیل'' میں شاید ہی کوئی خلوص دل سے ارسلان اور اس سے وابستہ لوگوں کا دکھ محسوس کرسکے۔بڑوں سے غلطی ہوجاتی ہے لیکن جیسی صورتِ حال یہاں تھی بات کو چھپانا موقع کے مطابق درست تھا۔جب معاملات بگڑنے لگے تو راز افشا کردیا گیا۔اپنی غلطی فوراً مان کر ارسلان کے والد نے حقیقت بتادی تو میں سمجھتا ہوں بگڑتی صورتِ حال سنبھال لی گئی۔''

☆ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے۔''حکیم رضا شاہ نقوی کی والدہ فوت ہوگئی ہیں۔اللہ ان کو جنت میں جگہ عطا کریں (آمین)۔معراج رسول انکل نے اتنے مختصر سے پیرا میں انسان کو زندگی گزارنے کی کتنی بڑی بات سمجھا دی ہے۔دنیا کے حالات میں جب تک انسان کندن نہ ہوجائے دکھ اور تکلیفیں نہ سہہ سکے تب وہ جنت کی امیدوار کیسے بن سکتے ہیں۔یک مٹھی میں افسانہ نگار جیلانی بانو کے بارے میں پڑھا اور علم میں اضافہ ہوا کہ اردو ادب میں کوئی جیلانی بانو بھی تھیں۔''معمر خیال'' کے دروازے پر یہ سوچ کے دستک دی کہ چلو میں تو باہر ہوں اس بار دیکھتی ہوں کہ اندر والوں نے مجھے یاد رکھا ہے کہ نہیں۔دروازے پر بھائی سید مسرت حسین رضوی کا ہنستا مسکراتا چہرہ نظر آیا۔میں نے بھی کھلے دل سے پہلے نمبر پر آنے کی مبارک باد دی۔آپ کا تبصرہ بہت ہی دل سوز، جامع اور شاندار رہا اور صدارت کے قابل بھی تھا۔فقیر غلام حسین آپ نے کاشف بھائی کو ایسے الفاظ سے یاد کیا کہ دل خون کے آنسو رونے لگا۔اللہ جنت عطا کریں۔قیصر عباس خان کا تبصرہ بھی مختصر لیکن لاجواب تھا۔وہاب احمد اور غلام سبحانی دونوں کے مختصر مختصر تبصرے اچھے لگے۔

Downloaded From http://paksociety.com

محمد احمد رضا انصاری جامع تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ دوسروں کی طرح انور عباس بھی دکھی دل کے ساتھ مسجد اور ان میں پڑھنے والے نمازیوں کے فرقہ پرستی پر دکھی نظر آئے۔ انور عباس بھائی آپ نے نزاہت افشاں کو لڑکی بنا دیا۔ خوب ہنسی آئی۔ بھائی یہ لڑکا ہے اور مستقبل کا شاعر۔ دوسروں کے اشعار بھی ایسے فر فر سناتا ہے جیسے ہم باتیں کرتے ہیں۔ امیر حمزہ اشرف مجھے یاد کرنے کا شکریہ۔ تبصرہ اچھا لگا۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی بہت ہی جامع، شاندار اور تفصیلی تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ رانا شاہد بھائی یہ نزاہت افشاں بھائی کی مجھ سے بے لوث محبت ہے۔ تبصرہ کی تعریف کرنے کا شکریہ۔ باقی تبصرہ ہمیشہ کی طرح جامع اور شاندار رہا۔ اویس شیخ کا تبصرہ، بہت دلچسپ، تفصیلی اور جامع تھا۔ انداز تحریر بہت زبردست ہے۔ نزاہت بھائی مجھے یاد کرنے کا شکریہ۔ آپ خود بھی بہت سویٹ اینڈ نائس ہو۔ تبصرہ بہت ہی لاجواب رہا۔ اعجاز حسین سٹھار صاحب جامع تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ بھائی خوش رہو اللہ آپ کو صحت عطا کریں، (آمین)۔ سدرہ بانو ڈیئر! کاشف زبیر ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ تبصرہ بہت ہی پیارا اور جامع رہا۔ ندیم اقبال آپ کو بہت بہت مبارک آپ کا "شمشال سے ٹورنٹو" ہم سب کو بہت پسند ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ ہمارا اور آپ کا ساتھ ہمیشہ رہے (آمین)۔ عبدالجبار رومی بہت ہی خوب صورت تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ سعید احمد چاند کا مختصر لیکن اچھا تبصرہ رہا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر "ناسور" شروع ہو گئی۔ نو سال نو مہینے ساتھ چلنے والے "سراب" نے جاتے جاتے کاشف زبیر کی موت کا وہ ناسور دیا جو کبھی نہیں بھول پائیں گے۔ اب حسب عادت چلتے ہیں سچ بیانیوں کی طرف۔ پہلی سچ بیانی "ماں جایا" پڑھ کے دکھ بھی ہوا اور ایسے والدین پر غصہ بھی آیا جو بیٹے کو آسمان بنا دیتے ہیں۔ دوسری کہانی میں "کھلونا نہیں" اعجاز راحیل کی تحریر فقط ایک افسانہ لگی۔ "بے رحم" فیاض چانڈیو کی تحریر دل کو خون کے آنسو رلا گئی۔ ماں تو ماں ہوتی ہے۔ ہر عورت میں ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے چاروں روپ ہوتے ہیں اور وہ چاروں کے ساتھ مکمل انصاف کرتی ہے۔ چوتھی سچ بیانی "میری اجالا" رشتوں کے ہونے نہ ہونے کا ایک زبردست شاہکار تحریر تھی۔ پانچویں کہانی "قسمت کا کھیل" کوئی قسمت کا کھیل نہیں بلکہ گھٹیا، خودغرض مرد کی کہانی جو چوری چھپے عیاشیاں کر کے ان کے رزلٹ کو دوسروں کی اولاد کا نام دے دیتے ہیں۔ لعنت ہے۔ چھٹی کہانی "ناظر بھائی" بہت درد بھری کہانی تھی۔ ناظر بھائی جیسے معصوم مرد بھی ہوتے ہیں اس دنیا میں۔ جو ہی نے غلط کیا لیکن اس کا بھی قصور نہیں تھا بس اس کے سمجھانے کا طریقہ غلط تھا۔ ساتویں کہانی "خواب سراب" باہر جانے والے لوگوں کی دکھ درد کی کہانی جو پیسے کے لالچ میں درد سمیٹ لیتے ہیں۔ سچ بیانی "مکافات عمل" واقعی سرفراز کو اپنے کیے کی صحیح سزا ملی۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ وہ ایک معمولی اور کمزور انسان ہے۔ آخری سچ بیانی "رنگ دوستی" دوستی کے نام پے دھبا تھا راجا جیسے شیطان کو اللہ کسی کا دوست نہ بنائے۔ ہمیشہ کی طرح اشعار بہت معیاری تھے۔ خاص کر سید محمد حسین، ارشد حسن، زاہد اکبر، ہادیہ ایمان، ماہا ایمان، عشرت جہاں، سیف اللہ، ندرت علی، مریم بنت کاشف، زاہد شیخ اور میرے سویٹ بھائی نزاہت افشاں کے اشعار۔ صائمہ اقبال "فروری کی شخصیات" میں میرے فیورٹ کھلاڑی شعیب ملک کو لے کر حاضر تھی۔ بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ ندیم صاحب کی تحریر "شمشال سے ٹورنٹو" خدا خدا کر کے انٹرویو کال تو آئی۔ سب کے ساتھ ہماری طرف سے بھی مبارک باد۔ خوب ہنسی آئی جب ین ندیم صاحب کے گلے لگی تو سر جی کے خفا ہونے پر خوب ہنسی آئی۔ اگلی قسط کا انتظار ابھی سے شروع، ویلڈن ندیم صاحب۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے، (آمین)۔ طارق عزیز خان کی تحریر "مہم جو" بھی کافی معلوماتی اور دلچسپ تحریر لگی۔ قاسم رضا کی تحریر "ایک صدی کا قصہ" فلمی معلومات کا خزانہ لگا۔ باقی کا بھی سرگزشت بہت ہی معیاری ہو گا لیکن خط دیر سے پوسٹ ہو تو پھر شائع نہیں ہوتا۔"

☆ **خالد شفیع ملک** بھکرسی سے لکھتے ہیں۔ "محترم قاسم رضا کا مضمون "ایک صدی کا قصہ" بہت ہی انمول معلومات سے بھرپور تھا سرائیکی خطے کے بارے میں جو فلمی دنیا کی معلومات فراہم کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ کہانیاں اس مرتبہ بہت اچھی معلوماتی اور سبق آموز ہیں۔ محترم علی سفیان آفاقی مرحوم جن کے قلم کے آگے تحریریں ہاتھ باندھے کھڑی ہوتی تھیں اور ان جامع تحریریں جگمگاتی ہوئی اور خوشبوئیں بکھیرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں اگر آفاقی مرحوم کی تحریریں دوبارہ پرنٹ کریں تو قارئین "سرگزشت" کے لیے ایک تحفہ ہے۔"

☆ **تحریم تلوکر**، وادی سون خوشاب سے۔ "سرگزشت ایک معیاری ڈائجسٹ ہے۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ایک عرض ہے۔ مہربانی فرما کر جو لکھاری ان ڈائجسٹ میں لکھنے والے فوت ہو گئے ہیں ان پر ضرور تحریریں شامل کریں۔ خاص کر نواب انکل، حقی صاحب، کاشف زبیر پر۔"

☆ **اویس شیخ** کی آمد ٹوبہ ٹیک سنگھ سے۔ "اس بار اداریہ میں "سو بار عقیق کٹا تب یہ نگیں ہوا" مصرعہ کی بہت ہی خوب صورت تشریح کی۔ بلاشبہ کامیابی کے لیے نہ صرف جستجو اور لگن چاہیے بلکہ مستقل مزاجی بھی بہت ضروری ہے۔ "افسانہ نگار" کا شخصیاتی خاکہ بھی معلوماتی تھا۔ "شہر خیال" میں سب سے پہلے مسرت رضوی کا نام جگمگا رہا تھا۔ پہلی صدارت پر مبارک باد۔ بھکر سے دوستوں کی آواز اور ان کی باتیں دل کو لگیں۔ اشرفی بھائی نے اعلیٰ حضرت پر جو جملے کہے، بہت پسند آئے۔ میں تو ابھی تک اس تحریر کے سحر میں ہوں۔ جہاں تک زین مہدی کی بات ہے اس میں کوئی شک نہیں کسی بھی ادیب کے لیے بہت بڑا چیلنج ہے کہ اپنے پیشرو کے چھوڑے ہوئے ادھورے کام کو اسی رفتار کے ساتھ مکمل کر کے پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ زین مہدی صاحب نے یہ کارنامہ سر کیا وہ داد کے مستحق ہیں۔ طاہرہ گلزار پر شاید ایک بار پھر محکمہ ڈاک مہربان رہی۔ انکل ندیم آپ نے ہم کو یاد رکھا۔ بہت شکریہ۔ اللہ آپ کو صحت و ایمان والی زندگی دے۔ صائمہ نور کے بعد امیر حمزہ کی ملتان سے آمد سے محفل میں مزید اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے "ادیب صحافی" پر لکھ کر بہت ہی کمال کر دیا۔ اس بار شخصیت میں فلمی اور اسپورٹس شخصیات رنگ جمائے ہوئے تھیں۔ فیض احمد فیض کا تذکرہ پسند آیا۔ میری دانست کے مطابق اقبال کے بعد تین شاعر ایسے تھے جن کی شاعری کا اسلوب منفرد، بے مثل اور جدت طرازی کا شاہکار تھا، ان میں فیض احمد فیض، منیر نیازی اور عدیم ہاشمی تھے۔ "بندہ

Downloaded From http://paksociety.com

بیراگی'' سکھوں کی تاریخ کا بھیانک باب تھی۔ ''مہم جو'' نادرو نایاب تحریر تھی۔ سفرنامہ بہت خوب صورت انداز سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ''ناسور'' کا شدت سے انتظار تھا۔ پہلی قسط پسند آئی۔ سچ بیانیوں میں اس بار ''میں کھلونا نہیں'' اس ماہ کی صفِ اوّل کہانی ہے۔ اس جملے کی چوٹ کے کیا کہنے جو شائلہ نے کہے ''سب مرد ایک جیسے کیوں ہوتے ہیں؟ کیا ان کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے کہ عورت کی تعریف کرتے رہیں'' منٹو نے کہا تھا۔ ''یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان ادیبوں کے اعصاب پر عورت سوار رہتی ہے۔ یہ سچ ہے آدم سے لے کر اب تک ہر مرد کے اعصاب پر عورت سوار رہی ہے۔ ''ماں جایا'' میں گھریلو نظام زندگی کی روایتی جھلک نظر آئی۔ ''بے رحم'' پڑھی۔ ایسی فراخ روی اور فراخ دلی کس کام کی جب اپنے ہی سایہ دیوار کو تکتے گھٹ گھٹ کر اس جہاں کو خیر آباد کہہ گئے۔ ''میری اجالا'' دو بہن بھائیوں کے رومان اٹوٹ محبت کی بہترین کہانی تھی۔ اپنی محرومی کا قلق اور ذاتی رنجش کا بدلہ لینے کے لیے کتنا غیر اخلاقی حربہ اپنایا گیا۔ میں ابھی تک شاکڈ میں ہوں۔ ''قسمت کا کھیل'' حیرت اور تجسس میں ڈوبی دلچسپ داستان تھی جو شاید زندگی بھر نہیں بھولے گی۔ ''ناظر بھائی'' کا کردار نازک آبگینوں سے کم نہیں محسوس ہوا۔ آخر ہم کب تک کسی کی بہن اور بیٹی کو ذہنی کرب میں مبتلا کرتے رہیں گے؟ ''مکافاتِ عمل'' پڑھی۔ بس اتنا ہی کہوں گا، عبرت سرائے دہر ہیں اور ہم ہیں دوستو۔ ''خواب سراب'' پڑھی۔ دولت اور طاقت کا خمار انسان کو اپنا آپ بھلا دیتا ہے۔ ''رنگ دوستی'' کسی ڈھنگ اور کس نہج کی یہ نمک حلالی تھی کہ آپ نے دو انسانوں کو قتل کر ڈالا؟''

☆ سید مسرت حسین رضوی کا اشاریہ کراچی سے۔ ''معراج رسول صاحب کی کہانی پر نظر رک گئی۔ کمہار کا کام ہے مٹی کھود کر گیلا کرنا، ملائم ہونے کے بعد برتن ظروف و دیگر برتن بنانا جس میں اس کی مہارت کی داد و تحسین ملتی ہے کیونکہ مٹی سے گھڑے بن کر امیر و غریب کے گھر میں پانی ٹھنڈا کر کے پینے کے کام آتا ہے۔ دیگر چھوٹے بڑے کھلونے تک بن جاتے ہیں اور اہم چیز چراغ بن جاتا ہے جو مسجد، مندر، مزاروں اور محلوں میں روشن کیا جاتا ہے مگر ایک اور بھی اہم کام اس سے لیا جاتا ہے مٹی سے اینٹیں بنتی ہیں اور پھر بھٹے میں جمع کر کے پکایا جاتا ہے پک کر سرخ رنگ نمایاں ہو جاتا ہے تب ان سے مکان اور دیوار مندر مسجد بھی بنائی جاتی مگر افسوس اتنی خوبیوں والی چیزیں بنانے والوں کی قدر و منزلت نہیں نہ کھانے کو روٹی نہ مکان، بھٹے کے مالک ان مزدوروں کو قرض میں جکڑ لیتے ہیں جس سے ان کو چھٹکارا نہیں ملتا۔ اس ظلم و ناانصافی کو ختم کرنے کے لیے کوئی مسیحا آئے گا؟ ایک صفحے کا مضمون افسانہ نگار، جیلانی بانو کے افسانے کسی زمانے میں پڑھے تھے اب تو یاد بھی نہیں۔ ''معبرِ خیال'' محفل میں شریک قارئین کے خیالوں سے آگاہی پروگرام اپنے عروج پر ہے۔ روز بروز خوب سے خوب تر ہو رہا ہے مگر صفحات کم ہیں جس کی وجہ سے تمام قارئین کی تحریریں شامل نہیں ہو پاتی اس دفعہ کچھ قارئین شامل نہیں ہوئے۔ نئے قارئین کی آمد ہوئی جن کو خوش آمدید۔ انور عباس شاہ کا بہت شکریہ برادر مجھے جو محسوس ہوتا ہے میں وہی تحریر کر دیتا ہوں کسی کی خوشنودی کے لیے نہیں بلکہ جو سچ لگتا ہے وہ خود بخود ہی قلم سے نکلتا رہتا ہے اور رقم ہو جاتا ہے۔ آپ کو میرا لکھا پسند آیا تہہ دل سے شکریہ آپ کا۔ دیگر پسند کرنے والے قارئین میں نزابت افشاں، عبدالجبار رومی نے حوصلہ دیا ہے تحریر پسند کی ہے انشاء اللہ آپ کے مشورے کی روشنی میں ضرور کوشش کرتا رہوں گا۔ انور سعید احمد چاند کو میرے تبصرے پسند آئے، بہت شکریہ اور دیگر پُرخلوص قارئین نگراں اعلیٰ مدیرِ اعلیٰ سرگزشت ڈائجسٹ کے ممبران کارکنان سب کا بہت بہت شکریہ جو یہ سب حضرات مجھ کو برداشت کر رہے ہیں، تہہ دل سے مشکور ہوں دعاگو ہوں سرگزشت، دن دوگنی راتِ چوگنی ترقی کرے اور مجھے لکھنے کی طاقت ملے تو شاید میرے اندر جو چھالے چھپے ہوئے ہیں آپ سب کی خوشیوں سے ختم ہو جائیں۔''

☆ ظہیر احمد تبسم نے ناظم آباد کراچی سے لکھا ہے۔ ''اداریہ میں انکل نے بڑا زبردست پیغام دیا۔ ارے انکل ہم نے وقت کی قدر کرنا چھوڑ دی ہے۔ جبھی تو ہم روز بروز پستی کی طرف جا رہے ہیں اور جس نے قدر کی ان لوگوں نے ترقی کر لی ہے اور پھر بھی ہم گوروں کی ترقی کے گن گاتے ہیں بجائے اس کے کہ ہم خود کو بدلیں۔ اب کچھ پرچے کے متعلق۔ نیا سلسلہ ''ناسور'' بہت زبردست ہے۔ نعمان احمد پہلی ہی قسط سے چوکس نظر آ رہے ہیں۔ مہرین کی ''ماں جایا'' اچھی رہی۔ ''میں کھلونا نہیں'' بھی کافی زبردست رہی۔ آخرکار چوہدری ہارون اپنی محبت پانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ باقی پرچہ مصروفیات کی وجہ سے ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ قیصر عباس خان کا تبصرہ اچھا لگا۔ قیصر بھائی کافی حساس نکتہ اٹھایا ہے آپ نے۔ سید مسرت حسین رضوی، اویس شیخ، رانا محمد شاہد، سدرہ بانو ناگوری اور عبدالجبار رومی اور باقی تمام دوستوں نے اچھا لکھا۔ آفتاب احمد نصیر کا تبصرہ مجھے بے حد پسند آیا۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری ملیر کراچی سے لکھتی ہیں۔ ''اداریہ میں انکل کی زبانی مٹی کی کہانی پڑھی۔ مٹی جس نے آگ پر تپ کر خود کو کندن بنا لیا۔ عزت کی خاطر کتنی تکلیفیں سہیں مگر انسان کیا ہے فقط مٹی کا پتلا۔ جیتا ہے تو مٹی کا محتاج اور مر جائے تو اسی میں سما جائے۔ گویا مٹی کا پتلا جیتا ہے تو مٹی کا محتاج اور مر جائے تو اسی میں سما جائے۔ گویا مٹی ہی زندگی اور مٹی ہی موت ہے مگر پھر بھی مٹی کے لیے کوئی خراج نہیں، کوئی عقیدت نہیں، کوئی احترام نہیں۔ ہم اسی پر چلتے ہیں اسی پر پلتے ہیں اور اسی پر ہی اکڑتے ہیں۔ ''معبرِ خیال'' میں اداسیاں اور شکوے شکایتیں لیے سید مسرت حسین پہلے نمبر پر رہے۔ اچھا تبصرہ تھا۔ ندیم اقبال نے ''معبرِ خیال'' کے ساتھیوں کا شکریہ ادا کر کے ان صفحات کی رونقیں بڑھا دیں۔ دیگر ساتھیوں کے تبصرے بھی خوب رہے ابتدائی صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد نے کمال کر دیا بہت خوب ڈاکٹر صاحب۔ حمید اختر سے ہمارا تعارف 2011ء میں اس وقت ہوا جب میں میٹرک میں تھی۔ سرگزشت سے ناطہ نہیں جڑا تھا بس ایک حمید اختر ہی تھے جن کے کالم شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ پھر وہ بھی بچھڑ گئے اور ہمیں تو کبھی خبر ہی نہ ہو سکی کہ یہ کمزور سا جھریوں زدہ چہرہ اپنے پیچھے کتنی المناک داستانیں سموئے ہے۔ ''ادیب صحافی'' پڑھ کر ذہن کے پردوں پر ان کے کالموں کی یادیں جیسے پھر سے تازہ ہو گئیں۔ ''ناسور'' نئی کہانی، نیا سلسلہ، نئے کردار اور نئی سوچیں مگر مقصد وہی پرانا۔ اور ابتداء میں ہی ارشاد جیسے دشمن کا خاتمہ۔ دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا ہیرو آگے آگے کیا رنگ دکھاتا ہے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں ندیم بھائی کے

Downloaded From http://paksociety.com

کردار میں ہمیں ایک بات نے بہت متاثر کیا اور وہ ہے اللہ کی ذات پر بے تحاشا یقین، یقین کی یہ دولت کسی کسی کو ملتی ہے۔ ندیم بھائی نے اسی دولت کے بدلے سب کچھ پالیا ہے۔ اب صاحب کتاب بننے جا رہے ہیں تو ہماری دعا ہے کہ اس میں بھی آپ کامیاب ہوں۔ ہاں آپ کے سفر نامے کو پڑھ کر اس بات پر یقین مزید پختہ ہو گیا ہے کہ عاجزی اور انکساری زندگی کو بہت آسان کر دیتی ہے۔ ''بیت بازی'' میں مجمی رحمٰن کا شعر لاجواب رہا۔ امریکا میں رہتے ہوئے امریکا پروار بہت دلچسپی سے کیا گیا۔ سچ بیانی عام سی اور روایتی کہانی ہے۔ ایسی کہانی جو قدم قدم پر بکھری پڑی ہے۔ ''ماں جایا'' سے یہ بات ضرور ضرور واضح ہوئی ہے کہ ایک کامیاب مرد کے پیچھے اگر ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے تو ایک ناکام، لاچار اور بے بس مرد کے پیچھے بھی ایک عورت ہی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ''ناظر بھائی'' پڑھ کر آنکھیں بھیگ گئیں۔ عرشی کا یہ جملہ کہ ''ہمیں جانے والوں کی قدر ان کے جانے کے بعد کیوں ہوتی ہے'' بے قدری تو شاید ازل سے انسانی فطرت میں ہے۔ ہم نے لاکھ ترقی کر لی۔ آسمان کی وسعتوں کو چھو لیا، کامیابیوں کو اپنے قدموں میں جھکا لیا مگر افسوس کہ ہم قدر کے ہنر کو نہ سیکھ سکے ہم بہت بے قدر لوگ ہیں اتنے بے قدر کہ ہم زندہ لوگوں کی قدر نہیں کرتے اور مرنے والوں کی موت پر آنسو بہاتے رہ جاتے ہیں۔ ناظر بھائی تو چلے گئے مگر جوہی آپا کو ہمیشہ کے لیے اداسیوں اور تنہائیوں کے سپرد کر گئے۔ ''قسمت کا کھیل'' جیتے جاگتے لوگوں کے ساتھ بڑا عجیب کھیل، کھیل گئی۔ ''رنگ دوستی'' اچھے انداز میں لکھی گئی بادشاہ کو راہ راست پر لانے اور گمراہی سے بچانے کے لیے نادر نے دوستی کا حق بخوبی ادا کیا، راجا نے برائی کا جو گڑھا کھودا وہ خود اسی گڑھے میں جا گرا اس کا انجام عبرتناک بھی ہوا اور دردناک بھی نئے سال کے آغاز پر ہی ہمارا ایک عظیم فنکار ہم سے رخصت ہوا۔ آہ سلیم فاروقی خدا تمہاری مغفرت کرے اور تمہارے اپنوں کو صبر دے (آمین)۔''

☆ انور عباس شاہ بھکر سے لکھتے ہیں۔ ''شہرِ خیال میں سید مسرت حسین رضوی اپنے سپرہٹ تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت کی زینت بنے نظر آئے۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔ ہمارے بھکر والے دوستوں کے تبصرے بھی خوب تھے۔ وہاب احمد، غلام سبحانی، محمد احمد رضا انصاری اور امیر حمزہ نے مختصر لکھا لیکن خوب لکھا۔ آفتاب نصیر اشرفی کا تبصرہ جامع اور بھرپور تھا۔ رانا محمد شاہد کا تبصرہ بھی دل میں اتر جانے والا تھا۔ رانا صاحب آپ ہمت سے کام لیں ماں کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ انشاء اللہ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ نزاہت افشاں مختصر لکھتے ہیں لیکن خوب لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ عبدالجبار رومی انصاری اور سعید احمد چاند کے خطوط شاندار تھے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس دوسری مرتبہ بھی بلیک لسٹ کی نذر ہو گئیں۔ واہ رے محکمۂ ڈاک تیری کیا بات ہے۔ باجی طاہرہ گلزار اس مرتبہ کہیں بھی نظر نہیں آئیں۔ خدا خیر کرے۔ ندیم اقبال صاحب نے تو یہ کہہ کر ہماری بے تابی میں مزید اضافہ کر دیا کہ وہ جلد صاحب کتاب بننے والے ہیں۔ اب ہمیں ان کی کتاب کا بھی شدت سے انتظار رہے گا۔ ''مکافاتِ عمل'' ایک سنسنی خیز تحریر تھی۔ آخر کار بددیانت اور حرام خور سرفراز قدرت کی گرفت میں آ ہی گیا۔ نئی سلسلے وار کہانی ''ناسور'' کی پہلی قسط پڑھ کر تو اندازہ ہی ہوا ہے کہ یہ کہانی ہمارے معیار پر پورا اترے گی۔ ندیم اقبال صاحب کا سفرنامہ ''شمشال سے ٹورنٹو'' ہر ماہ ایک نئے انداز میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ فلمی دنیا کی معلومات پر مبنی تحریر ''ایک صدی کا قصہ'' کو بلاشبہ اس ماہ کی سپرہٹ تحریر کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح فلمی تحریر ''ہرفن مولا'' بھی بے حد جاندار اور مکمل تحریر تھی ان دونوں مصنفین کا بے حد شکریہ۔ اس کے علاوہ ادیب صحافی اور فروری کی شخصیات بھی اپنی مثال آپ تھیں۔ مارچ کے شمارے میں گلوکارہ مالا بیگم مرحومہ کا تذکرہ ضرور ہونا چاہیے۔''

☆ سیف اللہ ملک وال سے۔ ''انور فرہاد صاحب کے مضامین تو معلوماتی ہوتے ہی ہیں لیکن فروری کے شمارے میں ایک صدی کا قصہ کے لکھاری قاسم رضا کا لکھا۔ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کمپیوٹر چل رہا ہے۔ اتنی معلومات حیران کن ہیں اللہ نظر بد سے بچائے چلیں ادارے کو مبارکاں کہ ایک اچھا لکھاری مل گیا۔ جنوری کے شمارے میں ''اندھا سودا'' نام کی آپ بیتی ایسے لگتا ہے پہلے کہیں پڑھی ہے کب؟ یاد نہیں آ رہا۔ (اگر ہو سکے تو پر چا بتا دیں کیونکہ ایسی غلطی پر ادارہ فوراً ایکشن لیتا ہے اور مصنف کو بلیک لسٹ کر دیتا ہے) جہاز رانوں کی مہم جوئیوں کا پتا چلا۔ بندہ بیراگی کے مظالم سے آگاہی ہوئی۔ ''فروری کی شخصیات'' حسب سابق معلوماتی۔ کرکٹ سے دلچسپی والوں کے لیے ''قسمت گزیدہ'' ادب سے دلچسپی والوں کے لیے ادیب صحافی پرچے میں موجود۔ علی سفیان آفاقی کے بٹ صاحب اور خالق صاحب کی طرح سرجی اور شہباز کی نوک جھوک دودھ جلیبیاں اور سیاپے دلچسپی ختم ہونے ہی نہیں دیتے۔ ''ناسور'' کے متعلق دو تین قسطوں کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا ہے کہ اٹھان کیسی ہے۔''

☆ فقیر غلام حسین ضیاء محلہ چاہ چنی بھکر سے لکھتے ہیں۔ ''میری عرض مختصر سی ہے کیونکہ عمر 85 سال کا تقاضا بھی ہے کہ رو میں ہے رخشِ عمر دیکھئے کہاں تھمے (غالب)۔ وقت کے ساتھ ہر چیز بدل گئی ہے۔ اعجاز احمد راحیل کی تحریر کردہ سچ بیانی بہت پسند آئی ہے۔ مجھے تو ایسے لگتا ہے کہ سعادت حسن منٹو کے افسانے ''چغد'' کا چربہ ہے۔ ہارون صاحب نے صفحہ نمبر 207 پر لکھا ہے کہ ''پھر وہ چلی گئی اور میں اس سے معافی بھی نہ مانگ سکا۔ مرد کبھی جھکنا نہیں جانتا میں بھی نہ جھکا مگر جناب ہارون صاحب آپ کو تو وہ تھپڑ بہت مہنگا پڑا تھا۔ رو رو کر اور دھکے کھا کھا شمائلہ نے آپ کا جینا حرام کر دیا آپ نے خود یہ کہا کہ ''میں ماہی بے آب کی مانند تڑپنے لگا۔'' (یہ فقرہ تو شاید کسی نے میرا چرایا ہے میری غزل کا مقطع جو آج سے 35 سال پیشتر لکھی وہ یوں ہے ''ماہی بے آب کی مانند تڑپتا رہا ملے ابر کرم تو کہاں برستا رہا'') شمائلہ نے مرد کا تجزیہ خوب کیا ہے۔ ہارون نے آخر رو رو کر معافی مانگ لی۔ یہ ہوئی ناں مردوں والی بات۔ مگر شمائلہ اس تھپڑ کو نہیں بھولی ہو گی جو اسے ہارون نے گفٹ کیا تھا۔ شہرِ خیال کے سب دوستوں عزیزوں کو ہدیہ سلام۔''

Downloaded From http://paksociety.com

☆ ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب کا نامہ بھکر سے۔ ”جنوری 2017ء کسی کے لیے خوشی اور کسی کے لیے غموں کے پہاڑ لے کر آیا۔ زندگی تو گزر رہی ہے اور گزر ہی جائے گی۔ وقت کبھی رکتا نہیں۔ جتنی ترقی دنیا میں آتی جا رہی ہے انسان اتنا ہی ایک دوسرے سے دور بلکہ بہت دور ہوتا جا رہا ہے کسی کو کسی کی خیر یت جاننے کے لیے بھی ٹائم نہیں۔ مگر میں آپ سب کو نہیں بھول سکتی۔ آپ سب میرے اپنے ہو۔ بس اپنا نہ بن سکا تو ایک یہ محکمۂ ڈاک۔ ہر ماہ میرا نام بلیک لسٹ میں لکھ دیا جاتا ہے اور میرا خون کھول جاتا ہے۔ دل کرتا ہے محکمۂ ڈاک سے جا کر پوچھوں کہ مجھ معصوم نے آخر کیا بگاڑا ہے۔ جو یہ ظلم کرتے ہیں؟ لگتا ہے محکمہ ڈاک والوں کا جنت میں جانے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ فروری کا سرگزشت ملا۔ معراج رسول نے کیا خوب کہا کہ ”کندن بننے کے لیے آگ پر تپنا ضروری ہے“ شہرِ خیال میں میرے علاوہ سب تھے۔ جی انور عباس شاہ بس اب تو صرف میری حاضری سے ہی خوش ہوتے رہو۔ ارے کوئی میرے دل میں بھی جھانک کر دیکھے۔ میں آپ کے افسوس میں برابر کی شریک ہوں۔ سعید احمد چاند میں تو ہر بار ہی آپ کی شان میں پیار بھرے جملے پھینکتی رہتی ہوں مگر ہائے محکمہ ڈاک۔ مجھے تو ایسے لگتا ہے انڈیا کا بدلہ مجھ سے لیا جاتا ہے۔ بس ایک فیس بک ہی رہ گئی ہے اسی سے پتا چلتا ہے کہ سرگزشت پاکستان کے کونے کونے میں پڑھا جاتا ہے۔ (جتنی تعداد میں اس کے قاری پاکستان میں ہیں اتنی تعداد غیر ممالک میں بھی ہے) سعید احمد چاند آپ کی دعاؤں کا بہت شکریہ۔ اللہ پاک آپ کو بھی بہت خوشیاں اور ترقی دے، (آمین)۔ میں آپ کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ بہت سے سال ہو گئے ہمیں ساتھ ساتھ چلتے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپ کو نظر انداز کروں؟ بلکہ بہت سے پرانے لکھنے والے جو ہمارے ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ بچھڑ گئے دل ان کو یاد کر کے بہت اداس ہو جاتا ہے۔ غلام حسین، قیصر عباس، انور عباس شاہ بھکر سے آئے۔ مطلب اس ماہ بھی بھکر والے ”شہرِ خیال“ پر چھائے رہے اور ”بیت بازی“ میں انصاری چھائے رہے۔ نازش ممتاز کراچی کا شعر بہت پسند آیا۔ سچ بیانیوں میں ”ماں جایا“ مہرین کی بہت اچھی کاوش ہے۔ یہ تو حقیقت ہے کہ اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں۔ ”میں کھلونا نہیں“ نے بہت متاثر کیا۔ سچی محبت کرنے والے آخر کار مل ہی گئے ویسے مجھے بہت حیرت ہوئی کہ ہارون نے شائلہ کا انتظار کیا۔ آج کل تو محبت موسموں کی طرح بدلتی رہتی ہے۔ ”قسمت کے کھیل“ شروع سے آخر تک ایک فلمی کہانی لگی مگر فلمیں بھی تو حقیقت سے لی جاتی ہیں۔ انسان سب سے لڑ سکتا ہے مگر قسمت سے نہیں لڑ سکتا اور دوسری طرف دعاؤں سے تقدیر بدل جاتی ہے۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ آج کل موسم بے ایمان ہوا ہے۔ کبھی بارش کبھی دھوپ اور کبھی بادل کے ساتھ ٹھنڈی ہوائیں۔ بدلتے موسم کی اٹکھیلیاں اپنے عروج پر ہیں۔ اللہ پاک آپ سب کو بہت سی خوشیاں عطا فرمائے، (آمین)۔“

☆ محمد احمد رضا انصاری مرقوم ہیں کوٹ ادو سے۔ ”معراج صاحب نے کیا کمال کا اداریہ لکھا ہے۔ واقعی کندن بننا کوئی اتنا آسان نہیں۔ پہلے جلنا پڑتا ہے، آگ میں تپنا پڑتا ہے پھر جا کر کندن بنتا ہے۔ ”افسانہ نگار“ یک صفحی سرگزشت میں پہلی لائن پڑھتے ہی ہمارے ذہن میں ادا جعفری کا خیال آیا تھا کہ شاید یہ انہی کی سرگزشت ہے مگر آخر میں جیلانی بانو کا نام دیکھ کر حیرت ہوئی۔ ”شہرِ خیال“ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اپنے خط کو ڈھونڈا۔ خوب کانٹ چھانٹ کی ہوئی تھی۔ کبھی مکمل خط بھی شائع کر دیا کریں۔ (ڈائجسٹ کی کہانیوں کے سامنے ادبی کہانیاں اس لیے پھیکی لگتی ہیں کہ ڈائجسٹ کی کہانیوں کا ٹمپو فاسٹ ہوتا ہے۔ کم سے کم الفاظ میں خوب صورتی کے ساتھ کیا گیا تبصرہ پسند کیا جاتا ہے۔ غیر ضروری الفاظ استعمال نہ کریں تو پورا خط لگنا ضروری ہے)۔ عبدالجبار انصاری کے لکھنے کا انداز بہت یونیک ہے۔ نزاہت افشاں، محترم ہیں یا محترمہ؟ ”ادیب صحافی“ ڈاکٹر ساجد امجد نے خوب لکھا۔ ”مہم جو“ پر تحریر کچھ پڑھی پڑھی سی لگی۔ ”شمشال سے ٹورنٹو“ دلچسپ سفر نامے کا گیارہواں حصہ بھی زبردست تھا۔ ”بیت بازی“ میں چند ماہ سے بڑے اچھے اچھے شعر پڑھنے کو مل رہے ہیں۔ ”علمی آزمائش“ میں ہم اس شخصیت کا نام بوجھنے میں کامیاب رہے۔ ”ماں جایا“ پہلی سچ بیانی ٹھیک ہی تھی۔ امجد نے جو بویا تو اسے وہی کاٹنا پڑا۔ ”قسمت کا کھیل“ کیا حیرت انگیز کہانی تھی۔ ”مکافاتِ عمل“ سرفراز کو صحیح سزا ملی۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو غرور و تکبر سے بچائے۔ ”ناظر بھائی“ کی کچھ سمجھ نہ آئی کہ انہیں کیا بیماری تھی۔ وہ فضول خرچی اتنی کیوں کرتا تھا۔ ”ناسور“ میں نہیں پڑھوں گا۔ ہم تو بور ہو چکے ہیں ان جاگیرداروں، وڈیروں، چوہدریوں کے بارے میں پڑھ پڑھ کر۔ توبہ ہی بھلی۔“

☆ احسان سحر کا یہ خط یقیناً گزشتہ ماہ چلا ہو گا جو کل پہنچا۔ انہوں نے میانوالی سے لکھا ہے۔ ”محسن اردو ادب“ مسعود احسن رضوی کے بارے میں پڑھا۔ آفتاب احمد سعید اشرفی کو نئے سال کا اعزاز باعث افتخار ہے۔ خوشی ہوئی۔ اعجاز حسین سٹھار، بڑے خوب صورت خیالات تھے آپ کو سن کر بے حد خوشی ہوئی۔ اللہ پاک آپ کو خوش رکھے۔ حکیم رضا شاہ بھی بڑے عرصے بعد نظر آئے۔ آپ کی باتوں سے ہم بھی متفق ہیں۔ طاہرہ گلزار شکر ہے اس دفعہ مردوں پر زہر افشانی کیے بغیر گزر گئیں۔ سدرہ بانو ناگوری جب انسان ہی انسان نہ رہے اپنے اندر کے درندے کو باہر نکال لے تو پھر سالوں اور دنوں کا تصور نہیں رہتا۔ انور عباس شاہ اور باقی سب دوستوں کو پیار بھرا اسلام جو حاضر تھے اور جو غیر حاضر تھے۔“

☆ پروفیسر راشد احمد غوری نے یونیورسٹی آف پشاور سے لکھا ہے۔ ”میں پچھلے چالیس سال سے آپ کے رسالے پڑھ رہا ہوں۔ خاص طور پر سرگزشت جس میں ماشاء اللہ آپ لوگوں کی کارکردگی قابلِ تعریف ہے۔ پہلی دفعہ ”شہرِ خیال“ کے لیے عرض ہے یک صفحی، شخصیت اور دیگر مضامین بالخصوص ”شمشال سے ٹورنٹو“ اور سچ بیانیاں قابلِ تعریف ہوتی ہیں۔ سچ بیانیوں میں اس بار مجھے اعجاز احمد راحیل کی کہانی ”میں کھلونا نہیں“ بہت پسند آئی۔ مصنف کا طرزِ تحریر بھی قابلِ تعریف ہے۔“

☆ ڈاکٹر خواجہ حنیف ادیب لاہور سے۔ ”حسبِ سابق ماہ جنوری کا شمارہ پیشِ نظر ہے۔ آپ کا موقر ماہنامہ اپنی روایت برقرار رکھتے ہوئے

Downloaded From http://paksociety.com

ہمیشہ کی طرح اچھی تحریریں پیش کررہا ہے۔ سرگزشت کا پہلا صفحہ اور پھر ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی تحریر جو کسی نہ کسی نمایاں شخصیت کا زندگی نامہ ہوتا ہے سب سے پہلے میرے پیش نظر ہوئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب سے ٹورنٹو کا سفرنامہ ابھی چھپنا شروع نہیں ہوا تھا تو سرگزشت اسی مضمون کے لیے پڑھتا تھا۔ پہلا صفحہ بھی بہت معلوماتی افزا تھا۔ اب ٹورنٹو کا سفرنامہ بھی مجھے اپنی طرف متوجہ کیے رکھتا ہے۔ یہ اتنا دلچسپ معلوماتی افزا اور اپنے خوب صورتی اور دلکش انداز بیان سے مزین ہوتا ہے کہ جب تک قسط ختم نہیں ہو جاتی چین سے بیٹھا نہیں جاتا۔ اقبال ندیم صاحب کی خوب صورت اور شگفتہ الفاظ سے بجی تحریر قلب و نظر کو اپنے آخری حرف تک جکڑے رکھتی ہے۔ اس پر ندیم صاحب دلی مبارک باد اور مدح کے مستحق ہیں۔ بعض دیگر تحریریں بھی قاری کے ذوق مطالعہ کو اپنی گرفت میں لیے رکھتی ہیں۔ جن کا فرداً فرداً ذکر طوالت کا باعث بن سکتا ہے۔"

☆ عبدالجبار رومی انصاری کی خیال آفرینی لاہور سے۔ "ماں کبھی بے رحم نہیں ہوتی، وہ ماں ہوتی ہے جس کے اندر اللہ رب العزت نے انتہائی شفیق اور محبت کرنے والا جذبہ رکھا ہے۔ جو خود تو تکلیف اور اذیت صبر و حوصلے کے ساتھ برداشت کرلیتی ہے مگر اپنی اولاد کے لیے ایک حرف شکایت بھی زبان پر نہیں لاتی۔ خلیل صاحب نے ایسی ماؤں کے لیے شاندار اولڈ ہاؤس بنوا دیا لیکن ایک ماں سے بے وفائی کا پچھتاوا دل سے کیونکر جا سکتا ہے۔ شاید ایسے نیک اعمال سے دل کو کچھ تسکین مل جاتی ہو اور دوسروں کو بھی تلقین ہو جاتی ہو کہ والدین خصوصاً ماں کے ساتھ ہمیشہ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ "ماں جایا" تو بہن بھائی تھے لیکن دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مہرین نے اپنی وسعت قلبی اور ہمدردی کی بنا پر ہمیشہ بھائی کو مقدم رکھا لیکن بھائی کی شاہ خرچ بیوی نے اور اس کی کم عقلی نے اسے خودغرض بنا دیا اور امجد کو عقل تب آئی جب موت کے منہ سے بچانے بھی آخر اس کی بہن مہرین ہی آئی۔ "مجھے روک لو پھر شاید میں لوٹ کر نہ آؤں۔" اور معصوم فطرت ناظر بھائی جو ہی آپا سے ہمیشہ کے لیے روٹھ گئے۔ نوین سچ بیانی میں نادر اور بادشاہ نے رنگِ دوستی میں نمک کا حق ادا کردیا۔ آصفہ ضیاء احمد کی آخری سچ بیانی زبردست رہی۔ بچو! میں رب کی بارگاہ میں ایک فریادی کی حیثیت سے پیش ہوں گا میرے لیے غم نہ کرنا بلکہ دعا کرنا اور لومی بیٹا تمہیں میری بے گناہی دنیا کے سامنے ثابت کرنا ہوگی۔ اور پھر نعمان عرف نومی نے اپنے والد کی بے گناہی کے ساتھ ساتھ معاشرتی "ناسور" کو بھی اپنی دوست زنیرہ فاطمہ کے ساتھ دنیا کے سامنے لانے کو کمر کس لی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی "ناسور" شروع ہوگئی۔ "شمشال سے ٹورنٹو" میں ندیم صاحب کو تو انٹرویو کی تیاری بھی کسی امتحان کی تیاری کی طرح کرنا پڑی بلکہ دوستوں کو کروانا پڑی چلو سلیکٹ تو ہوئے ناں۔ "قصہ ایک صدی کا" میں مزید گمنام آرٹسٹ سامنے آئے۔ "فروری کی شخصیات" میں شفقت امانت علی، طاہر القادری اور عطاء الحق قاسمی پر تحریر عمدہ لگی۔ کرکٹ کی دنیا سے زویا اعجاز کی "قسمت گزیدہ" بھی اچھی لگی۔ نامور صحافی اور ادیب حمید اختر کی سرگزشت زبردست تھی۔ شہر خیال میں سید مسرت حسین رضوی کو عمدہ تبصرہ کرنے پر مبارک باد۔ فقیر غلام حسین، قیصر عباس خان اور وہاب احمد نے بھی اچھی تبصرہ نگاری کی۔ انور عباس شاہ، آفتاب احمد، نصیر اشرفی، رانا محمد شاہد اور اویس شیخ کا اندازِ بیاں بھی عمدہ رہا۔ اعجاز حسین ستار، سدرہ بانو، سعید احمد چاند اور خاص کر ندیم اقبال کو اپنے درمیان دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ طاہرہ گلزار، رضوانہ قریشی۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری اس دفعہ بلیک لسٹ ہی رہے۔ افسانہ نگار جیلانی بانو کو یک صفحی سرگزشت نے حیران کردیا۔ اداریہ بہت اچھا لگا۔ بیت بازی سے عشرت جہاں، نجمی رحمٰن اور نوشین کنول کے اشعار پسند آئے۔"

☆ نزاہت افشاں گاؤں مہورہ تحصیل فتح جنگ سے لکھتے ہیں۔ "فروری کا شمارہ دیکھا تو دل کٹ کے رہ گیا کیونکہ کئی تبصرہ نگاروں کے طویل طویل تبصرے تھے جب کہ میرا آدھے سے زیادہ تبصرہ غائب تھا۔ جب کہ میں ہمیشہ مستند حوالہ جات کے ساتھ تنقید کرتا ہوں۔ بصد عقیدت گزارش ہے کہ مثبت تنقید کو ضرور شائع کریں (مخالگر وقت پر مل جائے تو لگانا فرض ہے اور اضافی جملوں کو کاٹ دینا ضروری ہے)۔ جیلانی بانو کا تعارف خوب رہا۔ "شہر خیال" میں سید مسرت حسین رضوی صاحب کرسی صدارت پر بیٹھے تھے۔ انور عباس شاہ جی میں بتا تا چلوں میں کوئی لڑکی نہیں بلکہ مرد ہوں۔ امیر حمزہ یاد کرنے کا شکریہ۔ رانا شاہد صاحب میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ اویس شیخ صاحب میں ناچیز خود شاعر ہوں۔ شاعری سے زیادہ مجھے شاعروں سے عشق ہے۔ اعجاز حسین ستار صاحب، قیصر خان، عبدالجبار رومی کے تبصرے بھی زبردست تھے۔ ندیم اقبال صاحب اللہ آپ کو صحت و تندرستی عطا کرے۔ سعید احمد چاند بہت مختصر تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ ڈیرن سمی کا تذکرہ اچھا رہا۔ "فروری کی شخصیات" میں اس بار بھی کئی شعراء کرام جگہ نہ پاسکے۔ اس کے علاوہ ایک صدی کا قصہ، بندہ بیراگی، ماں جایا، بے رحم، میری اجالا، ناظر بھائی، مکافات عمل اور رنگِ دوستی بہترین تحریریں تھیں۔ "شمشال سے ٹورنٹو" بہت دلچسپ انداز میں نوک جھونک کے سائے میں آگے بڑھ رہا ہے۔ "بیت بازی" میں اچھے اشعار پڑھنے کو ملے۔ آپی گل اس بار پھر غیر حاضر تھیں۔ بشریٰ افضل آپی آپ کہاں غائب ہیں؟ منشی محمد عزیز مے آپ بھی شاید میری طرح "رہینِ غم روزگار" ہیں۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری کا نام اس بار بھی لیٹ آنے والوں میں درج تھا۔ صوبی شاہ، احمد توحیدی بھائی، لیلیٰ مشتاق، شبانہ حنیف اور بھی کئی پرانے تبصرہ نگار غائب ہیں۔ دوستوں آؤ کہ سب کو انتظار ہے۔"

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط:

سعید احمد چاند، کراچی۔ وہاب ملک، سعدیہ احمد، نوشین ناز، لاہور۔ عنایت علی عابد، فیصل آباد۔ اشفاق حسن خان، سرگودھا۔ نسیم اختر، میرپور آزاد کشمیر۔ عباس پاکستانی، دوہا قطر۔

Downloaded From http://paksociety.com

شاعرِ اخلاق

ڈاکٹر ساجد امجد

اس وقت جب اردو شاعری ریزہ کاری کی شکار تھی۔ لطافت، نزاکت، تاثیر، کششِ حسن اور حسن کی اداؤں میں الجھی ہوئی تھی۔ سود و گداز کے نئے دھارے، تصورات کے جدید صنم کدے، افکار کی نئی نئی سمتیں اور وسعتیں غور کی اندیکھی گہرائیاں، نظر کی اچھوتی بلندیاں اور تخلیق کے البیلے امکانات سے سجائی جارہی تھیں۔ اس دور میں الفاظ کی روانی اور بہاؤ سے مزین شاعری جو عام زبان میں کی گئی ہو۔ ایک نئی بات تھی۔ گل و بلبل کے الاپوں کو مسترد کر کے ناصح کی طرح خیالات کو نظم کرنا، خطاب کرنا انوکھی روش تھی۔ اس طرح کی شاعری نے اہلِ علم کی توجہ کو کھینچ لیا۔ اس لیے کہ سیاسی، معاشرتی، اقتصادی، تہذیبی معاملات کو عام فہم زبان میں بیان کرنا وقت کی ضرورت تھی۔ ماحول ہی ایسا بن گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مصلح بن کر بچوں سے مخاطب ہوا تو سا۔ اس نے ایسی شاعری شروع کی تھی جس سے بچے تو مستفیض ہوتے ہی بڑے بھی بھرپور حظ اٹھاتے۔ اس انداز کی یہ شاعری ایسی مقبولیت حاصل کرنے لگی کہ جس کی مثال نہیں۔

ایک ایسے شاعر کا زندگی نامہ جس نے اردو شاعری کو ایک نئی سمت عطا کردی

سورج ابھی زمین پر تھا۔ اندھیرے کی چادر آسمان پر کہیں سمٹی رکھی تھی کہ ایک بیل گاڑی نے پرگنہ لاوڑ سے گزر کر میرٹھ شہر کی بیرونی سڑک کا رخ کیا۔

دن چڑھے بہت دیر ہو چکی تھی اس لیے بازاروں کی رونق عروج پر تھی۔ خیر نگر دروازہ اور سہراب دروازہ اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ خریداروں کا ہجوم تھا۔ بقول شخصے کندھے سے کندھا چھل رہا تھا۔ یہ معلوم ہو رہا تھا جیسے کئی دن بعد بازار آج کھلے ہوں۔ یہ بھیڑ کوئی آج پر منحصر نہیں تھی۔ میرٹھ کے بازار اسی طرح کھلتے، سجتے اور بند ہوتے تھے۔ شیخ پیر بخش کے لیے یہ سب کچھ نیا نہیں تھا۔ وہ کئی مرتبہ لاوڑ سے میرٹھ آچکے تھے اور اس نمائش کے مزے لوٹ چکے تھے۔ نو چندی کا میلہ لگتا تھا تو شیخ پیر بخش کئی کئی دن میرٹھ میں گزارتے تھے۔ میرٹھ کے بازاروں کی رونق ان کے لیے نئی نہ ہو لیکن ان کی اہلیہ اور بچوں کے لیے یہ سب کچھ نیا اور حیران کن تھا۔ بیل گاڑی میں لگے پردوں سے جھانک جھانک کر دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے، سب لوگ سڑکوں پر ہیں تو گھروں میں کون ہوگا۔

شیخ پیر بخش نے گاڑی بان سے کچھ کہا اور بیل گاڑی کچھ دور چل کر دائیں جانب مڑ گئی اور شہر کی جامع مسجد کے سامنے جا کر رک گئی۔ شیخ پیر بخش نے بیل گاڑی سے اتر کر سلامی دی اور پھر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

اب گاڑی کا رخ محلّہ مشائخان کی طرف تھا۔ یہ محلّہ حلقہ اندر کوٹ کا ایک جز تھا۔ اس لیے اسے بالائے قلعہ بھی کہتے تھے۔ محلّہ شائخان کے نام کی وجہ تسمیہ شاید یہ ہو کہ اس مقام پر حضرت مخدوم شیخ شہاب الدین علی اصغر چشتی اصفہانیؒ کا مزار مبارک موجود ہے۔ آپ کے زمانۂ حیات میں سلسلہ طریقت جاری ہوگا۔ علماء، فضلا اور فقرا کی آمد و رفت سے ایک اجتماع خاص رہتا ہوگا۔ رفتہ رفتہ محلے کا نام ہی مشائخان پڑ گیا۔

محلّہ مشائخان شہر کی گنجان آبادیوں سے الگ تھلگ

Downloaded From http://paksociety.com

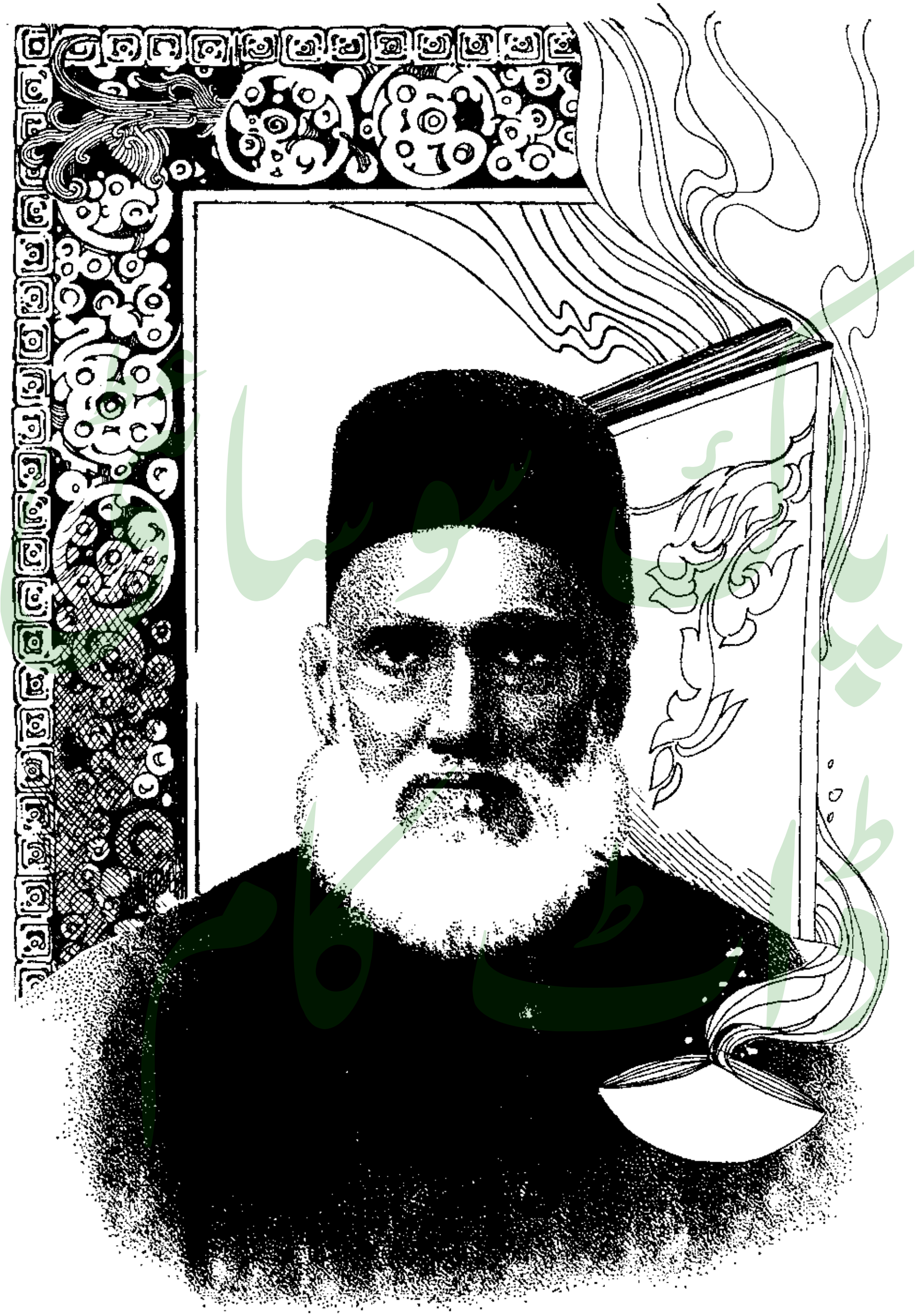

Downloaded From http://paksociety.com

شرفا کی بستی تھی جس میں اہلِ ثروت آباد تھے۔ شیخ پیر بخش کو اسی محلے کے ایک گھر میں جانا تھا۔

اندرکوٹ کی کہانی بھی نہایت دلچسپ ہے۔ ایک راجا مائی دنت نام کا یہاں حکمران تھا۔ امیر تیمور جب ہندوستان آیا اور میرٹھ سے گزرا تو یہ راجا اس سے برسرِ پیکار ہوا۔ راجا کی فوج امیر کے ہراول سے جا بھڑی۔ جب رنگ الٹا دیکھا تو فرار پر مجبور ہوگئی۔ امیر تیمور کے حکم پر میرٹھ میں قتل عام ہوا۔ جس مقام پر راجا کا قلعہ تھا وہ اندرکوٹ کہلایا۔

بیل گاڑی مکان پر مکان چھوڑ کر آگے بڑھ رہی تھی۔ کوٹ کی شمالی حد سے متصل ایک مکان کے سامنے پہنچ کر شیخ پیر بخش نے گاڑی بان کو رکنے کا اشارہ کیا۔ یہ مکان ان کے خالو حافظ شیخ میڈھو کا تھا۔ پیر بخش انہی کے بلاوے پر یہاں آئے تھے۔ شیخ میڈھو لاولد تھے اور پیر بخش سے اولاد کی طرح محبت کرتے تھے۔ اسی محبت نے انہیں مجبور کیا تھا کہ وہ انہیں اپنے پاس بلا کر رکھیں۔ پیر بخش بھی ایسے سعادت مند کہ لاوڑ چھوڑ کر بچوں سمیت ان کے پاس آگئے تھے اور اب ان کے دروازے پر کھڑے تھے۔

شیخ میڈھو کو بھی ان کا انتظار اس بے چینی سے تھا کہ کئی مرتبہ دروازے پر آکر دیکھ چکے تھے۔ اس مرتبہ آئے تو بھانجے کو دروازے پر کھڑا دیکھا۔ دستک سے پہلے دروازہ کھل گیا۔ ایسی بے قراری سے گلے ملے جیسے برسوں بعد ملاقات ہوئی ہو حالانکہ چند روز پہلے ہی لاوڑ جا کر مل آئے تھے۔

گھر بہت بڑا تھا لیکن بچے نہ ہونے سے ویران پڑا تھا۔ شیخ پیر بخش نے بچوں کے ساتھ صحن میں قدم رکھا تو جیسے باغ میں چڑیاں آگئی ہوں۔

ملازم نے حقہ تازہ کر کے رکھ دیا اور باتیں شروع ہو گئیں۔

''خالو جان! میں نے آپ کے اصرار پر لاوڑ چھوڑ تو دیا ہے اور میرٹھ چلا آیا ہوں لیکن بزرگوں کا وطن چھوڑتے ہوئے دکھ ہوا۔''

''یہ تم کوئی نئی بات نہیں کر رہے ہو۔ ہمارے بزرگوں نے بھی اپنی اور اپنی اولاد کی بہتری کے لیے ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ نقل مکانی کی ہے۔ تمہیں معلوم ہے تم حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد میں سے ہو۔ حضرت ابوبکرؓ نے مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کرلی تھی لیکن ان کی اولادوں میں سے کسی نے ترکِ وطن کیا۔ کن کن مراحل سے گزرے اور کتنے عرصے بعد ترکستان کے قدیم شہر ''خوجند'' کو مستقل قیام کے لیے پسند کیا۔ یہ خاندان وہاں پھلتا پھولتا رہا یہاں تک کہ اسی خاندان کے ایک فرد قاضی حمید الدین خوجندی بابر بادشاہ کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے۔ یہی قاضی حمید الدین خوجندی تمہارے مورث اعلیٰ تھے۔ تم نے دیکھا تمہارے بزرگ کہاں سے چلے تھے اور کہاں تک پہنچے یعنی مدینہ منورہ سے ہندوستان تک آگئے۔ ہندوستان آکر بھی وہ کسی ایک جگہ نہیں رہے۔ ہندوستان فتح ہونے کے بعد فتح پور ضلع مظفر نگر میں قیام کیا۔ پھر ایک شاخ بجنور کی طرف چلی گئی۔ قاضی حمید الدین کے ایک صاحبزادے مولانا احمد ضلع میرٹھ منتقل ہوگئے اور قیام کے لیے لاوڑ کا انتخاب کیا۔ گزر بسر کے لیے قصبہ لاوڑ میں زمین عطا کی گئی تھی۔ یہ زمین وہی ہے جو اب بھی تمہارے خاندان کے پاس ہے۔ تم بھی اس کی آمدنی سے شاندار گزر بسر کر رہے ہو۔'' حافظ شیخ میڈھو نے ان کے خاندان کی تاریخ کو مختصراً بیان کیا۔

''یہ واقعات تو میں بچپن سے سنتا چلا آرہا ہوں۔'' شیخ پیر بخش نے کہا۔ ''یہ تو یہ کہہ رہا تھا کہ لاوڑ میں رہ کر زمینوں کی دیکھ بھال اچھی طرح کر سکتا تھا۔''

''وہاں بیٹھ کر بھی کھیتی باڑی کون سی خود کرتے تھے۔ کام کرنے والے دوسرے تھے۔ تمہیں تو تمہارے حصے کی رقم مل جاتی تھی وہ یہاں بھی مل جایا کرے گی۔ میرٹھ سے لاوڑ کتنا دور ہے۔ دن میں کئی مرتبہ آجا سکتے ہو۔ میرٹھ بڑا شہر ہے۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ یہاں رہ کر ان کی تعلیم کا بہتر انتظام ہو سکتا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا جب زمینوں کی آمدنی پر گزارہ ہو سکے گا۔ انگریزوں کی عمل داری ہے، نہ جانے کب زمین ضبط ہو جائے۔ بچوں کو اس قابل تو بنا دو کہ نوکری کے لائق ہو جائیں۔''

''میں کب تک آپ پر بوجھ بنا رہوں گا۔''

''میں افسوس کے سوا کیا کر سکتا ہوں کہ تم خود کو بوجھ کہہ رہے ہو۔ تم صاحب جایداد ہو۔ مجھ سے زیادہ خوش حال ہو۔ یہ تو میری محبت ہے کہ تمہیں اپنے پاس بلا لیا۔ تم اگر الگ رہنا چاہتے ہو تو اس میں بھی مضائقہ نہیں۔ اسی محلے میں الگ مکان لے کر رہنے لگو۔ میرے قریب تو رہو گے۔''

''آپ نے غلط سمجھا۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ لاوڑ کی محبت مجھے بہت دن تک پریشان کرتی رہے گی۔''

''میں نے کتنی مثالیں دیں۔ تمہارے اجداد کہاں کہاں منتقل ہوتے رہے۔ زمانہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اسے بھی

Downloaded From http://paksociety.com

ایک کروٹ سمجھو اور یہ سمجھو کہ جو کچھ ہو رہا ہے تمہاری بہتری کے لیے ہو رہا ہے۔''

''میں بہت جلد باقی سامان بھی میرٹھ منتقل کردوں گا۔''

''اب کچھ دیر کے لیے آرام کرلو۔ اتنی دیر میں رات کے کھانے کا انتظام بھی ہو جائے گا اور ہاں مغرب کی نماز کے لیے جامع مسجد چلیں گے۔''

رات کے کھانے کے لیے دسترخوان بچھا اور اہل خاندان بیٹھے تو پھر بھی باتیں نکل آئیں۔ اب شیخ پیر بخش پوری طرح مطمئن نظر آرہے تھے لیکن ان کے خالو اب بھی انہیں مطمئن کرنے کے لیے طرح طرح کے دلائل دے رہے تھے۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ پیر بخش اپنا فیصلہ بدل دیں گے حالانکہ وہ اپنا ضروری سامان بھی ساتھ لے آئے تھے اور یہ وعدہ بھی کر چکے تھے کہ آہستہ آہستہ تمام اسباب لے آئیں گے۔

رات میں پیر بخش نے اپنی زوجہ سے بھی مشورہ کیا۔ انہوں نے نہایت صائب مشورہ دیا۔

''آپ کے خالو بے شک آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ان کو آپ سے کوئی مطلب نہیں۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ ان کے قریب رہیں۔ ہمارے بچوں کو بھی اپنے بچوں کی طرح سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زیادہ قربت، محبت میں آہستہ آہستہ کمی لے آتی ہے۔ میں آپ کی خالہ کو بھی جانتی ہوں۔ وہ مزاج کی ذرا تیز ہیں۔ اگر ہم اسی گھر میں رہے، تو کبھی نہ کبھی کوئی اونچ نیچ ہو جائے گی۔''

''آخر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟''

''میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اس سے پہلے کہ یہ نوبت آئے آپ الگ مکان خرید لیں۔ یہ مکان بے شک نہایت قریب ہو۔ اس طرح ہم الگ بھی رہیں گے اور ان سب سے قریب بھی۔''

یہ صائب مشورہ پیر بخش کو پسند آیا۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے اپنے خالو سے ذکر کیا۔

''میں چاہتا تو یہی تھا کہ تم اسی گھر میں رہو لیکن تمہارا کہنا بھی ٹھیک ہے۔ ابھی اچھے حالات ہیں تو مکان بنالو۔ بچے بڑے ہو جائیں گے تو ان کے کام آئے گا لیکن یہ مکان اتنے قریب ہو کہ جب چاہو پیدل ہی آجاسکو۔''

''آپ کی محبتوں کا شکریہ۔ میں حاضر ہوتا رہوں گا بلکہ زیادہ وقت آپ کے ساتھ ہی گزاروں گا۔''

شیخ پیر بخش نے اس طرف سے مطمئن ہو کر لاوڑ سے بقیہ سامان بھی لانا شروع کر دیا۔ جب سب سامان آچکا اور کچھ دن ہنسی خوشی گزر گئے تو اسی محلے میں اپنا مکان تعمیر کرلیا۔

شیخ پیر بخش کو میرٹھ آئے چھ سال گزر چکے تھے۔ لاوڑ میں زمینداری تھی۔ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ نہایت عیش سے گزر رہی تھی۔ میرٹھ کے رئیس لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔

ان کی زوجہ اُمید سے ہوئیں اور ولادت کے آثار ظاہر ہوئے۔ اس رات کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی کہ بیوی نے انہیں سوتے سے اٹھایا۔

''جلدی کیجیے کسی کو بلایئے۔ وقت قریب آگیا ہے، آپ باپ بننے والے ہیں۔''

شیخ صاحب جلدی سے اٹھے اور خالو کے گھر کی طرف دوڑے۔ وہاں بھی سب سو رہے تھے مگر ایک آواز پر اٹھ گئے۔ خالہ جلدی جلدی تیار ہوئیں۔ انہیں خود تو کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن یہاں عرصے سے رہ رہی تھیں۔ سب سے جان پہچان تھی۔ دو عورتوں کو ساتھ لیا اور پیر بخش کے گھر پہنچ گئیں۔ حافظ میڈھو اور پیر بخش مردانے میں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی فجر کا وقت قریب تھا کہ بچے کے رونے کی آواز کان میں آئی۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ ملازمہ نے آکر یہ خبر سنادی کہ بیٹا تولد ہوا ہے۔

نماز فجر سے واپس آئے تو بچے کو نہلا دھلا کر تیار کیا جا چکا تھا۔ باپ نے کان میں اذان دی اور بچے کا نام محمد اسماعیل رکھا۔

گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ یہ بچہ گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس کی پرورش ناز و نعم اور لاڈ پیار.... سے ہونے لگی۔ وہ جوں جوں بڑا ہوتا جارہا تھا اس کی ذہانت ظاہر ہو رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ اسے کھلونوں سے زیادہ کتابوں سے رغبت تھی۔ ابھی چلنا سیکھا تھا پڑھنے کی عمر ابھی دور تھی لیکن گھر میں رکھی کتابوں میں سے کوئی کتاب اٹھالیتا اور گھنٹوں اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہتا۔ اگر اس سے کتاب لے کر کوئی کھلونا دے دیا جاتا تو وہ رونے لگتا اور کتاب لینے کی ضد کرتا۔ یہ بھی انوکھی بات تھی کہ وہ گھنٹوں کتابوں سے کھیلتا رہتا تھا لیکن اس نے کبھی کوئی کتاب نہیں پھاڑی۔ بڑوں کے لیے یہ عجیب سی بات تھی۔ اس کے بڑے بے کھٹک اس کے آگے کتابیں ڈال دیا کرتے۔ انہیں معلوم تھا

Downloaded From http://paksociety.com

کہ وہ ان کتابوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔

اس کا یہ شغل دیکھ کر اس کے بارے میں طرح طرح کی پیش گوئیاں کی جارہی تھیں۔ اس کی ماں نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اسے ڈپٹی کلکٹر بنائے گی۔ یہ خیال تو سب ہی کا تھا کہ وہ کسی بڑے عہدے پر پہنچ کر دم لے گا۔

ان پیش گوئیوں کی چھاؤں میں وہ بڑا ہوتا چلا گیا۔

اس زمانے کا دستور تھا کہ ابتدائی تعلیم گھر میں شروع ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کے والد عربی فارسی سے حتی الوسع شناسائی رکھتے تھے لہٰذا یہ ذمہ داری انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ابتدا زبانِ فارسی سے ہوئی۔ گلستاں بوستاں ختم کی، صرف ونحو مکمل کی اور بھی چند کتابیں ختم کر ڈالیں۔ دس سال کی عمر میں قرآن مجید کی تعلیم شروع کی اور صرف پانچ ماہ میں پورا کلام پاک ناظرہ ختم کرلیا۔ یہ اس کی خداداد ذہانت اور قوت حافظہ کا کمال تھا۔

گھر کی تعلیم مکمل ہوئی تو یہ مسئلہ درپیش آیا کہ فارسی زبان کی اعلیٰ تعلیم کے لیے کس استاد کے دامن سے وابستہ کیا جائے۔

میرٹھ میں یوں تو ارباب کمال کی کثرت تھی لیکن مرزا رحیم بیگ کا طوطی بول رہا تھا۔ ان کے شاگرد کثرت سے پھیلے ہوئے تھے۔ شیخ پیر بخش نے ان کی شہرت کے باوجود نہایت چھان پھٹک سے کام لیا۔ ان کے شاگردوں کی قابلیت کو جانچا پرکھا۔ خود ان سے کئی ملاقاتیں کیں اور جب اچھی طرح اطمینان ہوگیا تو اسماعیل کو لے کر ان کی خدمت میں پہنچ گئے۔

مرزا رحیم ابتداً پولیس میں سپاہی تھے مگر شوق علم اس درجہ غالب تھا کہ زمانہ ملازمت میں برابر کتب بینی کا سلسلہ جاری تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں رہتی تھی۔ ساتھی ان کا علمی شغف دیکھ کر انہیں مشورہ دیا کرتے تھے کہ وہ اس نوکری کے لائق نہیں ہیں انہیں تو معلمی کا پیشہ اختیار کرنا چاہیے۔ آخر کار انہوں نے ملازمت سے مستعفی ہوکر معلمی کا پیشہ اختیار کرلیا۔

محمد اسماعیل ان کے دامن فیض سے وابستہ ہوگیا اور بہت جلد ان کی نظروں میں آگیا۔ شوقِ علم اسے بھی کم نہیں تھا۔ حافظہ اس کا بھی قوی تھا۔ مرزا رحیم بیگ اسے عزیز رکھنے لگے۔ وہ بھی ایسا شاگرد ثابت ہوا جو استاد کی ایک ایک خوبی اپنے اندر اتار لینا چاہتا ہو۔ اب کچھ درس کے اوقات پر ہی منحصر نہیں تھا، وہ ہر وقت استاد کے ساتھ دیکھا جارہا تھا۔

مرزا غالب نے فارسی میں ایک رسالہ ''قاطع برہان'' شائع کیا تھا۔ مرزا رحیم بیگ کو اس پر کچھ اعتراضات تھے۔ انہوں نے اس کا جواب ''ساطع برہان'' کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ اس کے لیے انہیں ایک مددگار کی ضرورت تھی۔ یہ علمی مدد اسماعیل کے سوا کون فراہم کرسکتا تھا۔ انہوں نے اسماعیل کے سپرد یہ خدمت کی کہ وہ مختلف لغات سے الفاظ تلاش کرکے ان کے معانی سناتے رہیں اور کبھی کبھی مسودات بھی تحریر کیا کریں۔

اس سے نہ صرف مرزا رحیم بیگ کو مدد ملتی بلکہ خود اسماعیل کے حق میں نہایت مفید ہوا اور یہ معلومات آئندہ چل کر اس کے بہت کام آئیں۔

☆......☆

اپریل 1857ء کے آخری عشرے میں شمالی ہند کے ہر کونے سے پریشان کن خبریں مل رہی تھیں۔ میرٹھ چھاؤنی کے کمپنی کمانڈر کرنل اسمتھ نے ہندوستانی سپاہیوں کو پریڈ کا حکم دیا۔ جب حوالدار میجر نے سپاہیوں کو حکم سنایا تو ان میں اضطرابی کیفیت پھیل گئی۔ سپاہیوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ چربی والے کارتوس استعمال نہیں کریں گے کیونکہ ان میں گائے اور سور کی چربی شامل تھی اور انہیں چلانے سے پہلے منہ سے چھیلنا پڑتا تھا۔

حکم کے مطابق پریڈ کے میدان میں پلاٹون کے 90 سپاہی جمع ہوگئے جن میں سے پانچ نے حکم کی تعمیل کی اور کارتوس استعمال کیے اور باقی نے پریڈ میں عملی طور پر حصہ لینے سے انکار کردیا۔ چنانچہ ان کو فوجی عدالت میں پیش کردیا گیا۔ فوجی عدالت نے ان سب سپاہیوں کو دس دس سال قید مشقت کی سزا سنادی۔

9 مئی 57ء کو ہفتے کا دن تھا۔ صبح دس بجے دھوپ کی تمازت میں شدت تھی۔ ہندوستانی رسالے کو پلٹن کے میدان میں آنے کا حکم دیا گیا۔ ان سپاہیوں کو ننگے بدن پریڈ کراتے ہوئے میدان میں لایا گیا۔ خوف و ہراس اس قدر تھا کہ اگر کوئی سپاہی معمولی سی بھی حرکت کرتا تو سنسناتی ہوئی گولی اس کے سینے کے پار ہوجاتی۔ اس طرح چار سپاہی وہیں گولیوں کا نشانہ بن گئے اور باقی حریت پسند کی وردیاں پھاڑ کر اتار دی گئیں۔ لوہار پہلے سے تیار تھے جنہوں نے سپاہیوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ یہ نظارہ انتہائی ذلت آمیز اور دردناک تھا۔ چند

Downloaded From http://paksociety.com

لمحات میں یہ سب سپاہی ہتھکڑیوں اور پیروں میں بیڑیوں میں نظر آنے لگے۔ایک بھیانک سناٹا تھا۔قیدی سپاہی اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔زبان سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے لیکن ان کی آنکھیں غیرت دلا رہی تھیں جو اپنے ہی ساتھیوں پر بندوقیں تانے کھڑے تھے لیکن چہروں پر شرمندگی تھی۔

قیدی سپاہیوں کو جن کی تعداد ایک سوتھی میرٹھ جیل بھیج دیا گیا۔

جو سپاہی پلٹن میدان سے واپس آگئے تھے وہ نفرت اور غصے کی آگ میں جل رہے تھے۔

10 مئی 1857ء کی صبح کو چند جوشیلے جوانوں نے یکایک مشتعل ہو کر اپنی بیرکوں میں آگ لگا کر جدوجہد آزادی کے آغاز کا اعلان کردیا۔

اسماعیل کے پڑوس میں دعوت روزہ افطاری تھی۔وہ اور اس کے اعزہ اس دعوت میں شریک تھے کہ یکایک ایک ہولناک شوروغل کی آوازیں بلند ہوئیں۔یہ آوازیں سن کر شیخ پیر بخش اور گھر کے دوسرے کئی مرد باہر کی طرف بھاگے۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آئے تو سخت گھبرائے ہوئے تھے۔

''بڑا غضب ہو گیا ہے۔اہل میرٹھ کا اب اللہ حافظ ہے۔'' شیخ صاحب نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔

''خیر تو ہے اسماعیل کے ابا ہوا کیا ہے؟''

''بتانے کے لیے وقت پڑا ہے۔فی الحال تو اپنے اپنے گھروں میں بند ہو جاؤ۔''

''یا اللہ خیر! ایسی کیا آفت آگئی؟'' اسماعیل کی والدہ نے پوچھا۔

''چھاؤنی میں بغاوت ہو گئی ہے۔انگریز افسر قتل کردیے گئے۔بیرکوں میں آگ لگادی گئی۔جیل خانہ توڑ دیا گیا ہے۔قیدی بھاگ رہے ہیں۔لوہاران کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کاٹنے میں مصروف ہیں۔ذرا باہر نکل کر تو دیکھو۔شہر کے لوگ سراسیمہ ہو کر اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ہزاروں لوگ جیل خانے کی سمت دوڑے چلے جارہے ہیں۔انگریز اس ہنگامے کا بدلہ ضرور لے گا۔اللہ ہی خیر کرے۔''

اسماعیل کی عمر اس وقت چودہ سال تھی۔یہ عمر ایسی ضرور تھی کہ اس کا قلب اس ہنگامہ داروگیر سے متاثر ہوتا۔وہ یہ سوچ ضرور رہا ہوگا کہ یہ کیسا انصاف ہے کہ اپنے ہی ملک میں آزادی کے لیے بغاوت کی ضرورت پیش آرہی ہے۔

سوانحی خاکہ

نام: محمد اسماعیل (میرٹھی)
والد: شیخ پیر بخش
پیدائش: میرٹھ
درس گاہ: نارمل اسکول میرٹھ، رڑکی کالج
زوجہ محترمہ: بی بی نعیم النساء
اولاد: قیوم النساء، محمد محمود، محمد حامد، امت الاعلیٰ، محمد اسلم
ملازمت: مدرس، فارسی
قیام ملازمت: میرٹھ، سہارن پور، آگرہ
سن پیدائش: 12 نومبر 1844ء
تاریخ وفات: یکم نومبر 1917ء

اب وقت آگیا ہے کہ انسانی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا جائے لیکن اس وقت وہ کیا کرسکتا تھا۔

اس دن کے بعد سے گھروں کے دروازے بند ہو گئے۔خبریں دیواریں پھلانگ کر اندر پہنچتی رہیں۔اسماعیل یہ خبریں خاموشی سے سن رہا تھا۔یکایک میرٹھ شہر فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھا۔یا اللہ خیر! معلوم ہوا بلند شہر روڈ پر ایک فوجی دستہ نمودار ہوا اور ہجوم پر فائرنگ کردی۔یہاں زبردست قتل عام ہوا۔

دوسرے دن گیارہ مئی کو بائیس حریت پسندوں کو تو چندی کے میدان میں پھانسی دے دی گئی۔شہر کے باشندے یہ خبر سن کر بھڑک اٹھے۔سرکاری دفاتر کو نذر آتش کردیا۔انتظامیہ مفلوج ہو گئی۔ہر طرف آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔آسمان دھوئیں کے بادلوں میں چھپ گیا۔

بارہ گھنٹے کے اندر میرٹھ کے مجاہد کثیر تعداد میں دہلی پہنچ گئے۔دہلی میں مقیم ہندوستانی سپاہیوں نے پلٹن کے کئی انگریز افسروں کو قتل کر ڈالا اور میرٹھ کے مجاہدوں کے ساتھ مل کر لال قلعہ دہلی میں بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت کا اعلان کردیا۔

اسماعیل یہ خبریں سن رہا تھا اور گھر میں بند تھا۔کبھی کبھی مرزا رحیم سے ملنے چلا جاتا تھا۔تعلیم کا سلسلہ تقریباً رک گیا تھا۔

دہلی سے برابر خبریں آرہی تھیں کہ ملک کے دیگر حصوں سے مجاہدین دہلی پہنچ گئے ہیں۔انگریزوں کا صفایا ہو گیا ہے۔مجاہدوں کی عمل داری ہے لیکن چند مہینوں میں نقشہ

Downloaded From http://paksociety.com

بدل گیا۔ مجاہدین آزادی کی حمایت وسیع پیمانے پر ہوئی مگر یہ تحریک کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکی۔ انگریزوں نے اس بغاوت پر قابو لیا۔

میرٹھ کے گھروں میں ناکامی کی خبریں بڑے دکھ سے سنی جارہی تھیں۔ گھر گھر ماتم ہورہا تھا۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ انگریز اب ہندوستانی عوام کو انتقام کا نشانہ بنائیں گے۔

چند لوگوں کے دلوں میں امید کی شمعیں اب بھی روشن تھیں لیکن رفتہ رفتہ وہ بھی بجھ گئیں۔ انگریزوں کی عمل داری پھر سے قائم ہوگئی اور اس طرح قائم ہوئی کہ مصلحت کے سارے پردے اٹھ گئے۔ بہادر شاہ ظفر برائے نام بادشاہ تھے۔ اب وہ بھی نہیں رہے۔ دہلی کے لال قلعہ پر برطانیہ کا پرچم لہرانے لگا۔ انگریزوں کا اقتدار مستحکم ہوگیا۔

زندگی کا نظام درہم برہم ہوگیا تھا۔ محمد اسماعیل گھر میں بیٹھا حالات کی درستی کا انتظار کررہا تھا لیکن وہ خالی بیٹھنا تو جانتا ہی نہیں تھا۔ تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا تھا لیکن گھر میں رکھی کتابیں تو غائب نہیں ہوگئی تھیں۔ دہلی سے خبریں آرہی تھیں۔ مظلوموں کو پھانسیاں دی جارہی تھیں۔ میرٹھ کے بااثر افراد کو گرفتار کرکر کے لے جایا جارہا تھا۔ وہ دن رات کتابیں پڑھ رہا تھا۔

باپ کی رکھی کتابوں کا ذخیرہ اس کے حافظے میں اتر گیا۔

حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ رفتہ رفتہ حالات نے کروٹ بدلی امن قائم ہوگیا۔

باہر نکلنے کا سامان ہوا تو یہ فکر ہوئی کہ تعلیم کا سلسلہ کہاں سے شروع کیا جائے۔ تعلیم کن مضامین میں اور کس مقصد سے حاصل کی جائے۔

میرٹھ میں نارمل اسکول قائم ہوچکا تھا۔ اس وقت مصلحت کا تقاضا بھی تھا کہ نارمل اسکول میں داخلہ لے لیا جائے تاکہ آیندہ سرکاری ملازمت ملنے پر آسانی ہو۔ اس نے والد ماجد کے حکم پر نارمل اسکول میں داخلہ لے لیا۔

نارمل اسکول میں منشی ایسری پرشاد علم ہندسہ کے استاد تھے۔ پرانے بریلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ علم ہندسہ میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ اسماعیل کو اس مضمون سے قدرتی لگاؤ تھا۔ نارمل اسکول کے نصاب میں علم ہندسہ شامل نہیں تھا لیکن اسماعیل نے اپنے فطری شوق کی بناء پر ایسری پرشاد سے فزیکل سائنس اور اسٹرانومی (علم ہیئت) کے مضامین اپنے فطری شوق سے سیکھنا شروع کردیے۔

رفتہ رفتہ ان دونوں مضامین میں مہارت حاصل ہوگئی۔ علم ہندسہ میں مہارت کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ رڑکی کالج جاکر اوورسیری کی تعلیم حاصل کی جائے۔ والد سے مشورہ کیا تو انہوں نے بھی اس خیال سے تائید کی کہ اس تعلیم کے بعد اچھی نوکری کا حصول ممکن ہوجائے گا۔ والد کی اجازت ملتے ہی وہ رڑکی روانہ ہوگیا۔ داخلے کے امتحان میں بیٹھے تو امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوا اور بہ آسانی داخلہ مل گیا۔ یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ گھر سے دور ہوا تھا۔ گھر والوں کی یاد بھی آرہی تھی۔ وطن کا خیال بھی دل سے دور نہیں ہوتا تھا۔ اجنبی طلبہ تھے جن سے دل نہیں ملتا تھا اور پھر یہ کہ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس نے جیسے تیسے کچھ دنوں تو تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا مگر پھر دل بالکل ہی اچاٹ ہوگیا تو تعلیم ادھوری چھوڑ کر میرٹھ واپس آگیا۔

اس طرح تعلیم ادھوری چھوڑ کر اس کا واپس آجانا گھر والوں کے لیے مایوس کن تھا لیکن اس کی اہلیت سے یقین تھا کہ وہ اپنے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکال لے گا۔ یہی ہوا بھی اس کے علمی مشغلے نے راہ سجھائی۔ اس نے انسپکٹر مدارس میرٹھ کے محکمے میں درخواست دے دی اور اس کا تقرر بطور کلرک ہوگیا۔

اسماعیل کا مکان بالائے قلعہ میں تھا اور یہ علاقہ شرفاء کی بستی تھی۔ صدر تحصیل اور کوتوالی شہر یہیں واقع تھی لہٰذا اکثر حکام اس محلے پارس کے قرب و جوار میں سکونت رکھنے کو پسند کرتے تھے۔

جس سال اسماعیل محکمہ تعلیم میں ملازم ہوا اسی سال منشی نجم الدین بجنور سے ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوکر میرٹھ تشریف لائے اور محلہ مشائخان میں قیام کیا۔ ان کے آتے ہی محلے کی رونق بڑھ گئی۔ منشی نجم الدین کو فنون لطیفہ سے بے حد شغف تھا۔ ان کے آتے ہی ان کا دولت کدہ ایک باقاعدہ کلب بن گیا جس کی نہ کوئی فیس تھی نہ چندہ۔ شہر بھر کے اہل علم یہاں جمع ہونے لگے۔ صبح و شام احباب کا مجمع، شعر و سخن پر گفتگو، تصوف کا چرچا، علمی مسائل پر بحث احباب ہم خیال کا شغل تھا۔ اس پر مستزاد منشی نجم الدین کا حسن اخلاق تھا کہ جس نے شہر میرٹھ کی ہر قابل ذکر ہستی کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ان کا گھر اسماعیل کے گھر سے ڈیڑھ سو قدم کے فاصلے پر تھا۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ اسی کے گھر کے قریب ایسی محفلیں سج رہی ہوں اور وہ ان میں شریک نہ ہو

http://paksociety.com

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
- ایڈ فری لنکس
- ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
- ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
- کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Downloaded From http://paksociety.com

اس نے بھی وہاں جانا شروع کر دیا۔ ایک دن کسی صاحب نے فرمائش کی کہ حاضرین میں سے ہر شخص اپنی پسند کا بہترین اردو شعر سنائے۔ جب اس کی باری آئی تو خیالات یک لخت منتشر ہو گئے۔ کوئی اردو شعر یاد نہ آیا۔ اس نے بہ اجازت احباب فارسی کا ایک شعر سنایا۔

محفل ختم ہوئی اور وہ گھر آیا تو طبیعت سخت افسردہ تھی۔ شرمندگی الگ تھی کہ اتنے لوگوں کے سامنے خفت کا سامنا ہوا۔ اس دن سے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب تک فارسی میں سر کھپایا ہے اب اردو شاعری کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس نے اساتذہ کا اردو کلام پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ مطالعہ اس طرح شروع ہوا کہ گھر میں امام بخش صہبائی کا مرتب کردہ گلدستہ سخن رکھا تھا جو شعرائے اردو کا تذکرہ تھا۔ اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اس کے بعد ذوق، مومن اور کلام غالب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ شعراء کا کلام پڑھ کر تحریک ملی اور ٹوٹے پھوٹے شعر خود بھی کہنے لگا۔ ایک دن غالب کی ایک غزل پر نظر پڑی اور کئی دن کی شبانہ روز محنت کے بعد اس نے غالب کی زمین میں غزل تیار کر لی۔

کام اگر حسب مدعا نہ ہوا
تیرا چاہا ہوا برا نہ ہوا
خاک اڑتی جو ہم خدا ہوتے
بندگی کا بھی حق ادا نہ ہوا
سب جتایا کیسے نیاز قدیم
وہ کسی کا بھی آشنا نہ ہوا
سخت فتنہ جہان میں اٹھتا
کوئی تجھ سا ترے سوا نہ ہوا
تو نہ ہو یہ تو ہو نہیں سکتا
میرا کیا تھا ہوا ہوا نہ ہوا
وہ رو مسلک توکل ہے
وہ جو محتاج غیر کا نہ ہوا

غزل نہایت جاندار ہو گئی تھی لیکن اسماعیل کی فطرت میں حجاب بہت تھا۔ اس نے یہ غزل کہہ کر بستے میں بند کر لی۔ اس وقت اس کی عمر سولہ سال تھی۔

اس کے بعد اس نے اور بھی غزلیں کہیں لیکن احباب کو مطلق خبر نہ ہونے دی۔ کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا۔ یہی اس کے ساتھ بھی ہوا۔ اس کے ایک عزیز بزرگ کو اس کے شغل غزل گوئی پر واقفیت ہو گئی۔ انہیں مشاعروں میں شرکت کا شوق تھا۔ اشعار واجبی سے کہتے

خیال پارے

حالی کے بعد کسی نے سننے کے لائق کچھ کہا ہے تو وہ مولوی اسماعیل میرٹھی ہیں۔ (شبلی نعمانی)

کلیات میں جتنی غزلیں درج ہیں ان سب میں متانت بیان و پختگی الفاظ کی وہی شان موجود ہے جو میر، مصحفی یا غالب و مومن کے کلام کے ساتھ مخصوص سمجھی جاتی ہے۔ (حسرت موہانی)

جدید نظم کا زاویہ محمد اسماعیل میرٹھی نے پیدا کیا۔ غزل ان کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی تھی لیکن اسے بھی انہوں نے اخلاقی مضامین کے لیے نئے انداز میں استعمال کیا۔ ان کی بڑی عطا یہ ہے کہ انہوں نے نئی نظم کو ارتقاء کے اگلے پڑاؤ کی طرف گامزن کرنے کے لیے نظم معرا کا تجربہ کیا۔ (ڈاکٹر انور سدید)

وہ بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے موضوع کو شعر میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ دل و دماغ دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ (ڈاکٹر سید اعجاز حسین)

آزاد اور حالی کے پاس بھی مقامی رنگ ایک حد تک موجود ہے لیکن ایسا صاف، حقیقی اور راست نہیں جیسا کہ اسماعیل میرٹھی کی نظموں میں دکھائی دیتا ہے۔ (پروفیسر عبدالقادر سرمدی)

حالی و آزاد کے ہم عصر انیسویں صدی کے بہترین شاعر مولوی اسماعیل ہیں جن کی نظمیں محاسن شاعری میں آزاد و حالی دونوں سے بہتر ہیں۔ (پروفیسر حامد حسن قادری)

ان کی تشبیہات بڑی لطیف ہوتی ہیں جو ان کے طرز بیان کی سادگی سلاست و روانی کی دل آویزی میں مزید اضافے کا کام کرتی ہیں۔ (ڈاکٹر عبدالوحید)

قصیدے کو حقیقت سے قریب رکھتے ہوئے انہوں نے اس صنف میں جدید مضامین کی گنجائش پیدا کی۔ (علی جواد زیدی)

تھے۔ جب انہوں نے اسماعیل کی چند غزلیں سنیں تو سوچا اس سے مدد لی جائے۔ کہیں ایک طرحی مشاعرہ ہو رہا تھا۔ انہوں نے مصرعہ طرح اس کے سامنے رکھ دیا۔

”صاحبزادے اس مصرعے پر فکر تو کرو۔ اس مشاعرے میں ضرور جانا ہے اور فکر سخن کی فرصت نہیں۔“

یہ صاحب اس سے کم از کم دس سال بڑے تھے۔ وہ

Downloaded From http://paksociety.com

انہیں ٹال بھی نہیں سکتا تھا۔اس نے غزل بنادی۔

ہاں تو ہی تاجدار ہے دارالسلام کا
ہے ملک جاں میں سکہ رواں تیرے نام کا
طالب ہوں تجھ سے تیری محبت کے جام کا
تیرے سوا نہیں ہے کوئی تشنہ کالام کا
ہے نورحق جبین مبارک سے آشکار
قصہ ہی ہاں تمام ہے ماہِ تمام کا
اعجاز مندرج ہیں تری بات بات میں
الہام طرز خاص ہے تیرے کلام کا

مقطعے میں اس نے ان عزیز کا تخلص ''قمر'' ڈال دیا۔

کچھ آج ہی نہیں ہوں ثناء خوانِ مصطفیٰ
ہے مجھ کو اے قمر یہ وظیفہ دوام کا

ایک روز آئے تو ایک اور مصرعہ طرح پیش کردیا اور اصرار ہوا کہ مشاعرہ قریب ہے۔اس پر غزل کہہ دو۔اس نے غزل لکھ دی۔

تو اور عذر طعنِ رقیباں غضب ہوا
دل پارہ پارہ جب نہ ہوا تھا تو اب ہوا
میرے سوا حریف ستم کوئی بھی نہ تھا
اب مہربان ہو گئے یہ کیا غضب ہوا
لبریز شکوہ ہائے تغافل تھا میں ولے
لو تشکر کا سبب گلہ بے سبب ہوا
ان کا نہ آستانے سے باہر قدم بڑھا
سو بار انتظار ہی میں جاں بلب ہوا

اس کے بعد تو جیسے سلسلہ بندھ گیا۔اسماعیل سے غزل لکھوانے اور مشاعروں میں داد پاتے رہے۔اسماعیل خودتو مشاعروں میں جاتا نہیں تھا اس لیے کسی کو یہ تک معلوم نہ ہوسکا وہ شعر کہہ سکتا ہے۔دوسری طرف شیخ قمرالدین کی غزلوں کی دھوم مچی ہوئی تھی جو دراصل اسماعیل کی غزلیں تھیں۔وہ یہ سوچ کر غزلیں کہتا رہا کہ چلو اس بہانے شعر گوئی کی مشق ہورہی ہے۔

وہ میلوں ٹھیلوں اور مشاعروں میں شریک نہیں ہورہا تھا لیکن منشی نجم الدین کی محفلوں میں برابر شریک ہورہا تھا۔یہیں شہر بھر کے شرفا سے ملاقات ہوجایا کرتی تھی۔یہ علمی صحبت تھی اور اس کا تعلق سررشتہ تعلیم سے تھا لہٰذا روز بروز شوق علمی میں ترقی ہوتی رہی۔کتب بینی کے شوق میں اضافہ ہوتا رہا، درسیات کی تکمیل میں جو کمی رہ گئی تھی ان محفلوں نے اس کمی کو پورا کردیا۔

ان ہی محفلوں کا فیض تھا کہ اسماعیل نے چند درسی کتب بزبان فارسی اس زمانے کی ضروریات کے لحاظ سے تصنیف کیں ان کی طباعت اور اشاعت کا اہتمام بھی خود کیا۔

جب تک اس کا قیام میرٹھ میں رہا یہ کتابیں اوران کی اشاعت اس کی آمدنی کا ذریعہ بھی بنا رہا۔

اس کی ملازمت بھی ہوگئی تھی۔کتابوں کی اشاعت بھی آمدن کا ذریعہ بن گئی تھی۔ان کتابوں نے میرٹھ کی حد تک اسے مشہور بھی کردیا تھا۔منشی نجم الدین کی محفلوں میں بیٹھنے کی وجہ سے بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات بھی ہوگئے تھے۔گھر والوں نے بھی سوچا کہ کوئی اچھا سا خاندان دیکھ کر اس کی شادی کردی جائے۔لڑکی ڈھونڈنے کے لیے زیادہ دور جانا نہیں پڑا۔دو چار گھر جھانکے تھے کہ کسی نے مشورہ دیا۔

''اے بوا'' شیخ محبوب بخش کے گھر کیوں نہیں جاتیں؟کسی نے اسماعیل کی والدہ کو مشورہ دیا۔

''بھلا وہ کیوں؟''

''ان کی بیٹی ہے نعیم النساء۔صورت چاند کا ٹکڑا اور سیرت کی تو میں خود شاہد ہوں۔بڑوں کا ادب تو اس پر ختم ہے۔اسماعیل کے لیے بہت مناسب رہے گی۔''

''اے لو،اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔محبوب بخش تو میرے سسرالی رشتے داروں میں ہیں۔''اسماعیل کی والدہ نے کہا۔

''بس تو پھر کیا ہے۔چھان پھٹک کی ضرورت ہی نہیں۔لے جاؤ رشتہ۔''

''دیکھو اسماعیل کے ابا کیا کہتے ہیں۔ان سے ذکر کر کے دیکھوں گی۔''

''نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔اچھا آپا اب میں چلتی ہوں۔''کہنے والی نے کہا اور چل دی۔

شیخ پیر بخش گھر آئے۔زوجہ نے حقہ تازہ کر کے آگے رکھ دیا۔

''میں جانوں شیخ محبوب بخش سے تو آپ کی رشتہ داری ہے۔''

''ہاں وہ بھی ہماری طرح قاضی حمید الدین کی اولاد میں سے ہیں۔''

''آپ تو ایسے گوشہ نشین ہوئے ہیں کہ خاندان میں بھی آنا جانا چھوڑ دیا ہے۔''

Downloaded From http://paksociety.com

''خیر تو ہے یہ آج میرے خاندان والوں کی وکالت کا خیال کیسے آگیا۔''

''ارے سنیے تو۔'' وہ قریب ہو کر بیٹھ گئیں۔ ''میری ایک سہیلی آئی تھیں۔ یہیں قریب میں رہتی ہیں۔''

''پھر میں کیا کروں اگر وہ آئی تھیں۔''

''پوری بات تو سنیے۔''

''سنائیے۔''

''اسماعیل کے لیے لڑکی بتا کر گئی ہیں۔''

''اچھا۔'' انہوں نے حقے کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''کس کی صاحبزادی ہیں؟''

''شیخ محبوب بخش کے گھر کی رونق ہے بی بی نعیم النساء۔ آپ سے ذکر کرنا ضروری تھا۔ آپ کہیں تو جا کر دیکھ آؤں۔''

''بھئی حرج کیا ہے۔ خاندان کی لڑکی ہے اگر صورت شکل آپ کو بھاتی ہے تو بات آگے بڑھالیں گے۔''

''چلی تو جاؤں بس عجیب سا لگ رہا ہے۔ آج تک تو ان کے گھر جانا نہیں ہوا۔ وہ کہیں گے آج کیسے خیال آگیا۔''

''کہیں گے کیا، سمجھ لیں گے کہ جہاں بیری ہوتی ہے پتھر آتے ہی ہیں۔''

وہ شیخ محبوب بخش کے گھر پہنچ گئیں اور تمام معلومات جمع کر کے لوٹ آئیں۔

''ماشاء اللہ صورت تو خوب صورت ہے۔ عمر بھی پندرہ سولہ سے زیادہ نہیں۔ دھان پان سی ہے۔ بس ایک کمی ہے صرف قرآن شریف پڑھا ہے، اردو فارسی کچھ نہیں جانتی۔''

''بھئی، یہ اس بچی کی نہیں اس کے والدین کی غلطی ہے۔ لڑکیوں کے لیے بھی تعلیم اتنی ہی ضروری ہے جتنی لڑکوں کے لیے۔ یہ بات نہ جانے ہم مسلمانوں کی سمجھ میں کب آئے گی۔''

''ہمارا اسماعیل بہت پڑھا لکھا ہے۔ وہ اردو فارسی سب سکھا دے گا۔ آپ محبوب بخش سے بات تو کریں۔''

''نہیں ابھی نہیں۔ پہلے اسماعیل سے بات کرلوں پھر محبوب بخش سے بات کروں گا۔''

''اسماعیل سے کیا بات کرنا، شادی ہماری مرضی سے ہوگی یا اس کی مرضی سے؟''

''اب ہمارا تمہارا زمانہ نہیں ہے۔ اسماعیل کی رضا

نظمِ بے قافیہ

ارے چھوٹے چھوٹے تارو
کہ چمک دمک رہے ہو
تمہیں دیکھ کر نہ ہووے
مجھے کس طرح تحیر
کہ تم اونچے آسماں پر
جو ہے کل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے
کہ کسی نے جڑ دیے ہیں
گہر اور لعل گویا

(تاروں بھری رات)

☆

دو تین چھوٹے بچے چڑیا کے گھونسلے میں
چپ چاپ لگ رہے ہیں سینے سے اپنی ماں کے
چڑیا نے مامتا سے پھیلا کے دونوں بازو
اپنے پیروں کے اندر بچوں کو ڈھک لیا ہے
اس طرح روز مرہ کرتی ہے ماں حفاظت
سردی سے اور ہوا سے رکھتی ہے گرم ان کو
لیکن چڑا گیا ہے چگا تلاش کرنے
دانہ کہیں کہیں سے پوٹے میں اپنے بھر کر
جب لائے گا تو بچے منہ کھول دیں گے جھٹ پٹ
ان کو بھرائے گا وہ ماں اور باپ دونوں
بچوں کی پرورش میں مصروف ہیں برابر
اور چھوٹے بچے خوش ہیں تکلیف کچھ نہیں ہے
اے چھوٹے چھوٹے بچوں تم اونچے گھونسلے سے
ہرگز نہیں گرو گے پر اور پرزے اب تک
نکلے نہیں تمہارے اس واسطے ابھی تم
اونچے نہ اڑ سکو گے ہاں جب تمہارے بازو
اور پر درست ہوں گے تو دن کی روشنی میں
سیکھو گے تم بھی اڑنا کرتے پھرو گے چیں چیں
اڑتے پھرو گے پھر پھرائے چھوٹے بچو لیکن
کوا بری بلا ہے اس سے خدا بچائے

Downloaded From http://paksociety.com

مندی بہت ضروری ہے۔''

والد گرامی نے اسماعیل سے ذکر کیا۔ یہ بھی بتا دیا کہ لڑکی پڑھی لکھی نہیں۔ اس نے آج تک باپ کی کسی بات سے انکار نہیں کیا تھا یہ اہم معاملہ بھی باپ کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

اس کی رضا مندی ملتے ہی نعیم النساء سے اس کی شادی ہوگئی۔

نعیم النساء پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن نہایت سمجھ دار ثابت ہوئیں۔ آتے ہی شوہر کے مزاج سے واقف ہوگئیں اور پھر کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔

تصنیف وتالیف اور تحصیل علم کی کوششوں میں سات سال کا عرصہ گزر چکا تھا کہ محکمہ تعلیم نے ان کی اہلیت کا صحیح اندازہ لگایا۔ پہلی مرتبہ محسوس کیا گیا کہ اس کی صلاحیتیں کلرکی میں ضائع ہورہی ہیں۔ اس کا تبادلہ سہارن پور کردیا گیا۔ اسے وہاں کے ضلع اسکول میں مدرس فارسی بنا کر بھیجا گیا۔ یہاں اس نے ہیڈ مولوی تک ترقی کی۔

اس کی فارسی میں استطاعت قابل رشک تھی۔ کئی نصابی کتب تحریر کر چکا تھا۔ اہل علم کی صحبتیں میسر تھیں۔ طبیعت نرم تھی۔ سمجھانے کا انداز ایسا تھا کہ بچوں کو بوجھ معلوم نہیں ہوتا تھا۔

سہارن پور میں علوم عربیہ کی تعلیم کا چرچا زیادہ تھا لہٰذا آپ نے یہاں رہ کر عربی زبان کی تحصیل پر توجہ کی۔ باقاعدہ ایک استاد رکھا اور اس سے عربی پڑھی۔

ابھی سہارن پور میں رہتے ہوئے تین سال ہوئے تھے کہ اس کا تبادلہ ایک مرتبہ پھر انسپکٹر مدارس میرٹھ کے دفتر میں ہوگیا۔ ان دنوں ممالک مغربی وشمالی اودھ کے ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم مسٹر کیمسن تھے۔ ان کے حکم سے مسٹر ٹی جے کین انسپکٹر مدارس سرکل میرٹھ نے انگریزی کی اخلاقی نظموں کا انتخاب فرمایا اور ان نظموں کا اردو ترجمہ میرٹھ ہی کے ایک شاعر قلق میرٹھی سے کرایا۔ اسماعیل میرٹھی بھی اسی دفتر میں تھا۔ لہٰذا ان تراجم کو بغور دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ ان نظموں کے تراجم دیکھتا جاتا تھا اور ان کے مضامین پر غور کرتا جاتا تھا۔ جیسے جیسے آگے پڑھتا جاتا تھا اسے تعجب ہوتا جاتا تھا کہ شاعر ایسا کلام بھی لکھتے ہیں۔ اسے اردو شعراء کی غزلیں اور قصائد یاد آگئے جن میں دوراز کار تشبیہات اور مبالغہ آرائی تھی۔ پست درجے کے عشقیہ مضامین کی بھرمار تھی اخلاق بگاڑنے کے سارے سامان مہیا تھے۔ جھوٹ کا نام شاعری تھا۔ اردو برائے نام فارسی کی بھرمار تھی۔ ان تراجم کو دیکھا تو مناظر قدرت اور جذبات انسانی کی صحیح مصوری اور وہ بھی سادہ وسلیس طرز میں نظر آئی۔ خیال گزرا کہ وہ بھی قدیم تغزل کو چھوڑ کر یہی سادہ وسلیس انداز اپنائے۔ یہ امر اتفاقی تھا کہ ان تراجم نے اس کی طبیعت کا رخ بدل دیا۔ اس کی قسمت میں دائمی شہرت اور طرز نو کا موجد ہونا لکھا تھا کہ اس نے بھی طبع زاد نظمیں لکھنے سے پہلے انگریزی سے ترجمہ کرنے کی ٹھان لی۔ مشکل یہ تھی کہ وہ انگریزی زبان سے ناواقف تھا لیکن طبیعت میں محنت وکاوش کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ فرہادسخن تھا کہ پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکال سکتا تھا۔ اس نے بعض احباب کی مدد سے ایک انگریزی نظم کا ترجمہ نثر میں کیا اور خیالات کو منظوم شکل دے دی۔

تم اس کیڑے کو دیکھو تو لگاتار
تمہاری راہ میں ہے گرم رفتار
چلا کترا کے کیا کیا پیچ وخم سے
جھجکتا ہے یہ آواز قدم سے
کسی سوراخ میں دن کاٹتا ہے
سویرے اٹھ کے شبنم چاٹتا ہے
اسے قدرت نے زریں پروئے ہیں
کچھ اک سبزی و سرخی بھی لیے ہیں
تمہیں لگتی ہے اچھی مور کی دُم
کہ خوش ہوتے ہو اس کو دیکھ کر تم
مگر کیڑے کو بھی سمجھ نہ ہیٹا
یہ مانا خاک مٹی میں ہے لیٹا
نہ بے پروائی سے چلیے جھپٹ کر
قدم رکھیے ذرا کیڑے سے ہٹ کر
اگر ہے خوب صورت مور پیارا
تو کیڑا بے گنہ کیوں جائے مارا
بظاہر کچھ نہیں اس کی حقیقت
مگر جب اس کی کرتے ہو بری گت
تو ہے ننھی سی جاں اس کی تڑپتی
ہے تم جیسا ہی اک جاندار وہ بھی

(کیڑا)

جب اس نظم کو دوستوں نے پسند کیا تو اس نے دوسری نظم کا ترجمہ شروع کردیا۔

اے دیدہ وران و دانش آثار
دنیا میں ہیں کیسے کیسے جاندار

Downloaded From http://paksociety.com

ہاتھی چیونٹی عقاب مکھی
قدرت نے ہے سب میں بات رکھی
ایسا تو بتاؤ کوئی حیواں
جیسا ناداں ہے یہ انساں
ہر ایک ہے اپنی راہ چلتا
جس رہ سے ہے مدعا نکلتا
آرام و خورش جو چاہتے ہیں
قدرت کی روش نباہتے ہیں
جس شے سے ہیں فائدہ اٹھاتے
دھوکا نہیں اس میں گاہ کھاتے
جس چیز سے ہے گزندانی کو
آتی ہی نہیں پسند ان کو
انسان ہے اگرچہ سب پہ فائق
مشہور ہے اشرف الخلائق
اڑتا ہے مگر اسی کا خاکہ
پتلا ہے یہ سہو اور خطا کا
(انسان کی خام خیالی)

یہ طرز سخن ایسا بھایا کہ اگلے ایک دو سال میں اس نے کئی نظمیں ترجمہ کر ڈالیں۔

ہے مصیبت مال و دولت میں پڑی
موت کا دھڑکا ہے اس کو ہر گھڑی
لطف قدرت کا نہیں اس کو نصیب
یہ بہار بے خزاں بھی ہے عجیب
یہ بیاباں یہ سمندر یہ ہوا
گو بجتی ہے ان میں قدرت کی نوا
کان سے گلن کی لیکن دور ہے
وہ تو دولت کے نشے میں چور ہے
(ایک قانع مفلس)

جب کہ طوفاں ہو زندگی میں بپا
گھیر لیں ہر طرف سے موج و ہوا
جب کہ لغزش میں پاؤں تیرا ہو
اور آنکھوں تلے اندھیرا ہو
بلکہ ہوش و حواس بھی ہوں جدا
ڈر نہ زنہار رکھ نظر بہ خدا
تھام دل کو نہ خوف کر نہ ہراس
کہ نگہبان ہے تیرا تیرے پاس
(موت کی گھڑی)

دنیا کو اس وقت معلوم ہی نہیں تھا کہ اسماعیل میرٹھی اردو شاعری میں طرز نو کو ایجاد کر رہے ہیں کیونکہ اس وقت تک جدید شاعری کا ڈول ڈالا ہی نہیں گیا تھا۔ اوّل تو غزلیں کہی جا رہی تھیں، نظموں کا رواج ہی نہیں تھا اور پھر نظمیں بھی کیسی! انگریزی سے متاثر نظمیں۔ اسماعیل میرٹھی نے جو روش اختیار کی وہ اس وقت کے مروجات کے خلاف تھی۔ لوگوں نے شاید اس طرف توجہ بھی نہیں کی اسماعیل میرٹھی کی گوشہ نشینی نے انہیں مشہور بھی نہیں ہونے دیا۔ مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے تھے کہ نظمیں دور تک جاتیں۔ ان نظموں کی شہرت کم از کم زمانہ ابتدائی میں حاصل نہیں ہوئی۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ انجمن پنجاب کے مشاعروں کی بنیاد 1874ء میں رکھی گئی۔ پہلی مرتبہ دنیا کو معلوم ہوا کہ شاعری میں تبدیلی ہوئی ہے جب کہ اسماعیل میرٹھی اس سے پہلے یہ تبدیلی پیدا کر چکے تھے۔ اس کے اسباب بھی ظاہر ہیں۔ انجمن پنجاب جیسی کوئی انجمن صوبہ مغربیہ وشمالی اودھ میں قائم نہ تھی، نہ اس صوبے کے ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم نے اس ذوق کے ساتھ اردو زبان کی ترقی میں دلچسپی لی جو طرح کرنل پالرائڈ نے صوبہ پنجاب میں۔ اسماعیل میرٹھی نے اپنے طور پر کسی مثال کو سامنے رکھے بغیر شاعری میں یہ انوکھے تجربے کیے۔ عرصہ دراز کے بعد جو نمونے اردو شاعری کو نصیب ہوئے اسماعیل میرٹھی نے پہلے ہی فراہم کر دیے۔

ایک مکھی کہ ہے نری احمق
فکر انجام رہے نہیں مطلق
کوتہ اندیش، لالچی، ناداں
دیتی پھرتی ہے مفت اپنی جاں
گری شیرہ پہ حرص کے مارے
پاؤں اور لتھڑ گئے سارے
آخرش پھنس کے رہ گئی مکھی
کیا حماقت کی چاشنی چکھی
ایک مکھی ہے سخت دور اندیش
سوچ لیتی ہے کام کا پس و پیش
اس پہ غالب نہیں ہوسناکی
اڑتی پھرتی ہے وہ بہ چالاکی
کہیں مصری کی جب ڈلی پائی
تو یہ آہستگی اتر آئی
گرچہ اس کام میں لگی کچھ دیر

Downloaded From http://paksociety.com

چاٹ کر وہ ہو گئی مگر ، وہ سیر
چاٹ کے کھا کے اڑ گئی پھر پھر
دور بنی کا اس کو یاد ہے گر
کس مزے سے گزارتی ہے دن
شکر کا گیت گاتی ہے بھن بھن

مولانا الطاف حسین حالی نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ ہم نے تمام عمر میں تین صاحب کمال بزرگ دیکھے ہیں۔ شاعروں میں غالب، مدیروں میں سرسید احمد خاں اور فقراء میں حضرت مولانا سید غوث علی شاہ۔ یہ بات اسماعیل میرٹھی کے کانوں تک آئی تو انہیں سید غوث علی شاہ سے ملاقات کا شوق ہوا۔ آپ ملاقات کے لیے پانی پت پہنچ گئے۔ غوث علی شاہ صاف باطن بزرگ تھے۔ دیکھتے ہی پہچان گئے کہ سائل کس درجے پر فائز ہے۔ دیکھتے ہی بیعت سے سرفراز فرمایا اور روشنی توجہ سے بقعہ نور بنا دیا۔ تعلیم باطن ایک راز ہے مرید اور شیخ کے درمیان لیکن شیخ نے جو رنگ اسماعیل میرٹھی پر چڑھایا اس کی جھلک ان کے کلام سے ٹپکنے لگی یا یہ کہہ لیجیے کہ کمال فن قدرت نے ودیعت کیا تھا، شیخ کامل کی صحبت نے اسے صیقل کر کے چمکا دیا۔

ایک ملاقات میں حضرت شیخ نے دریافت فرمایا کہ میاں اسماعیل تم شعر کہتے ہو؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا مگر اس طرح جیسے کوئی مجرم اقرار جرم کرتا ہے۔ شیخ نے ارشاد فرمایا کہ بھائی ہم کو تو حضرت مولانا شاہ ابوسعید ابوالخیرؒ کی رباعیاں پسند ہیں۔ عرض کیا حضرت مجھے تو ان کے مطالعے کا اتفاق نہیں ہوا۔ حضرت نے فرمایا۔ ”تعجب ہے۔“ اور خاموش ہو گئے۔

اس حاضری کے بعد وطن واپسی ہوئی تو محلے میں داخل ہوتے ہی معلوم ہوا منجھلے بھائی کی طبیعت ناساز ہے۔ اس لیے پہلے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عیادت کی۔

”میاں اسماعیل! کل شام ایک صاحب تشریف لائے تھے اور ایک کتاب دے گئے۔ میری طبیعت تو بہتر نہیں تم اسے لیتے جاؤ اور اپنے مطالعے میں لاؤ۔ وہ یہ کتاب گھر لے آئے۔ آکر دیکھا تو حضرت ابوالخیرؒ کی رباعیات کا مجموعہ تھا۔ فوراً شیخ کا خیال آیا یہ جو کہہ دیا تھا کہ ابوالخیر کو نہیں پڑھا۔ انہوں نے یہ کتاب مطالعے کے لیے بھیج دی یہ لطیف اشارہ بھی گوش گزار ہو گیا کہ شیخ کی خواہش ہے اسی رنگ کی رباعیاں کہی جائیں۔ پہلے اس مجموعے کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور پھر رباعیات کہنے بیٹھ گئے۔

مکشوف ہوا کہ دید حیرانی ہے
معلوم ہوا کہ علم نادانی ہے
ڈالا ہے تلاش قرب نے دوری میں
مشکل ہے بڑی یہی کہ آسانی ہے

☆

ساقی وہی میکش وہی مینا بھی وہی
گویا وہی شنوا وہی بینا بھی وہی
آدم وہی بندہ وہی مولا بھی وہی
ہے کبھی وہی تھا بھی وہی ہو گا بھی وہی

☆

ہر خواہش و عرض و التجا سے توبہ
ہر فکر سے ذکر سے دعا سے توبہ
از بس کہ محال ہے سمجھنا اس کا
جو آئے سمجھ میں اس خدا سے توبہ

مختلف مضامین پر آپ نے چالیس رباعیاں کہہ ڈالیں۔ سب کی سب تصوف پر مبنی تھیں۔ جب رباعیاں کہہ لیں تو شیخ کی خدمت میں پیش بھی کر دیں۔ شیخ نے ملاحظہ کیں اور بے اختیار کہا۔

”اسماعیل ایک فرشتہ ہے جو ہر وقت عالم سکوت میں رہتا ہے۔“

☆......☆

اسی سال یعنی 1870ء میں گورنمنٹ یو پی نے بھی دوسرے صوبوں کی طرح اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے انعامی اشتہار جاری کیے تھے۔ دعوت عام تھی کہ لوگ اس انعامی مقابلے میں حصہ لیں اور اپنی تخلیقات روانہ کریں۔ اسماعیل میرٹھی نے بھی اس مقابلے میں حصہ لینے کے لیے ایک خیالی مگر اخلاقی قصہ تصنیف فرمایا۔ اس کی عبارت مقفیٰ اور سرتا سر فسانہ عجائب کے طرز تحریر کی نقل تھی۔ اس تحریر پر انہیں دو سو روپے انعام ملا۔

ایک مثنوی فکر حکیم کے نام سے تصنیف فرمائی۔ یہ کتاب کی صورت میں شائع کی گئی۔ انہوں نے اس کی ایک جلد سرسید احمد کی خدمت میں بھی پیش کی۔ سرسید نے اس پر تبصرہ شائع کیا۔ سرسید نے لکھا تھا کہ اس میں فارسی تراکیب کی بھرمار ہے اگر یہ شاعر محاورہ اردو پر توجہ دے تو اُمید ہے کہ اس کو بہت کامیابی ہوگی۔

اسماعیل میرٹھی نے اس نصیحت پر عمل کیا اور فارسی

Downloaded From http://paksociety.com

رنگ کو خیر باد کہہ دیا۔

طلسم اخلاق اور مثنوی فکر حکیم یہ دونوں کتابیں انہوں نے اپنے منجھلے بھائی عبدالحکیم صدیقی کے نام سے شائع کی تھیں۔ اب یہ معلوم نہیں کہ انہیں اپنے کلام پر اعتماد نہیں تھا یا پبلک کی حرف گیری سے خائف تھے۔ جو نظمیں دیگر جگہوں پر شائع ہوتی تھیں ان میں بھی اپنا نام اکثر نہیں دیتے تھے۔

1877ء میں روس اور ترکی کے درمیان آغاز جنگ ہوا۔ اسی زمانے میں منشی محمد حیات کی تحریک پر جو ضیائی پریس میرٹھ کے مالک تھے ''نجم الاخبار'' کا اجراء کیا۔

یہ اخبار محض جنگ کی خبریں شائع کرنے کی غرض سے نکالا گیا تھا لیکن جنگ کے بعد بھی آٹھ برس تک جاری رہا۔ یہ اخبار میرٹھ سے نکلا تھا۔ منشی محمد حیات (مالک) سے ان کے دوستانہ مراسم تھے لہٰذا انہوں نے پابندی سے اس اخبار میں لکھنا شروع کر دیا۔ مضامین اور نظمیں طبع ہونا شروع ہو گئیں۔ کبھی کبھی ایڈیٹر کی غیر حاضری میں ایڈیٹر کی ذمہ داریاں بھی پوری کرتے تھے۔

ابھی جنگ ختم نہیں ہوئی تھی۔ ترک مجروحین کی مالی امداد کے لیے مسلمانانِ میرٹھ نے ایک عام جلسہ منعقد کیا۔ اسے بھی اس جلسے میں تقریر کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ اس جلسے میں انہوں نے جو تقریر کی وہ نجم الاخبار میں شائع ہوئی۔ اس تقریر کی ایسی شہرت ہوئی کہ سرسید نے اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق میں اس تقریر کی فصاحت کا ذکر کیا اور یہ تک لکھ دیا۔

''اب مجھے اپنے مرنے کا افسوس نہیں کہ اردو میں ایسے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں جیسا یہ لیکچرار ہے۔''

ان کا تبادلہ میرٹھ کے نارمل اسکول میں بہ حیثیت مدرس فارسی ہو گیا تھا۔ یہ وہی اسکول تھا جہاں انہوں نے کبھی پڑھا تھا۔ اب پڑھا رہے تھے۔ طلبہ کی الجھنوں سے واقف تھے۔ کبھی وہ خود اس دور سے گزرے تھے اب دوسرے گزر رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ طلبہ کو کن کتابوں میں کیا الجھنیں درپیش آتی ہیں لہٰذا یہ ارادہ کیا کہ نصابی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے آسان زبان میں کتب تحریر کر دی جاتیں۔ اسی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے جغرافیہ کے مضمون پر ایک کتاب ''مرقع زمین'' تالیف کی۔ مطالب تو وہی تھے جو رائج الوقت رسائل میں موجود تھے۔ انہوں نے ایسی ترتیب سے بیان کیا جسے یاد رکھنے میں طلبہ کو آسانی ہو۔ اختصار کو بھی مدنظر رکھا اور غیر ضروری تفصیلات سے گریز

ابیات

جو بات کہو صاف ہو ستھری بھلی ہو
کڑوی نہ ہو کھٹی نہ ہو مصری کی ڈلی ہو

............☆............

نہ حلوا بن کر چٹ کر جائیں بھوکے
نہ کڑوا بن کر جو چکھے سو تھوکے

............☆............

راستی سیدھی سڑک ہے جس میں کچھ کھٹکا نہیں
کوئی راہ رو آج تک اس راہ میں بھٹکا نہیں

کیا تاکہ طلبہ کو یاد رکھنے میں آسانی ہو۔

''میں نے ان چند اوراق کی تالیف میں کوئی کار نمایاں نہیں کیا کیونکہ وہی مطالب ہیں جو اکثر رائج الوقت رسائل میں موجود ہیں۔ البتہ یہ کوشش کی ہے کہ ان اجزائے مختلف کو جا نا مرتب انبار کی صورت میں اوپر تلے دبے پڑے ہیں۔ ایسی ترتیب سے قرینہ بہ قرینہ لگا دوں کہ امتحان دینے والے طلبہ کی حاجت اور حالت و وقت کے مناسب ہو جائیں۔ الفاظ میں بھی قطع و برید کی ہے۔''

خوش خطی اس وقت کا ایک عام مضمون تھا۔ اسماعیل میرٹھی خود نہایت خوش قلم تھے۔ اس فن سے متعلق بہت (دیباچہ) سی باتیں جانتے بھی تھے۔ کئی کتابیں شائع ہو جانے کے سبب ادائے مطلب کے ہنر سے بھی واقف تھے۔ انہوں نے نہایت سادہ الفاظ میں فن خوش خطی پر بھی کئی چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کیے۔

سرسید نے ان کی مثنوی ''فکر حکیم'' کی اشاعت کے بعد ایک تبصرے میں اصرار کیا تھا اور کہا تھا کہ اگر یہ شاعر فارسی کو چھوڑ کر اردو پر توجہ دے تو نامور ہوگا۔

اس مشورے کے بعد سے انہوں نے طرز بیان میں سادگی اور کلام محاورہ اردو کی رنگینی سے کام لینا شروع کر دیا تھا۔ کئی نظمیں سادہ اور آسان زبان میں کہیں اور احباب کو سنائیں۔ ان میں سے کئی نجم الاخبار میں شائع بھی کرائیں۔

شفق پھولنے کی بھی دیکھو بہار
ہوا میں کھلا ہے عجب لالہ زار
ہوئی شام بادل بدلتے ہیں رنگ
جنہیں دیکھ کر عقل ہوتی ہے دنگ

(شفق)

............☆............

Downloaded From http://paksociety.com

گیا دن ہوئی شام آئی ہے رات
خدا نے عجب شے بنائی ہے رات
نہ ہو رات تو دن کی پہچان کیا
اٹھائے مزہ دن کا انسان کیا
لگے ہوئے اب ہاٹ بازار بند
زمانے کے سب کار بہوار بند
درختوں کے پتے بھی چپ ہو گئے
ہوا تھم گئی پیڑ بھی سو گئے

(رات)

☆

ہونے کو آئی صبح تو ٹھنڈی ہوا چلی
کیا دھیمی چال سے یہ خوش ادا چلی
لہرا دیا ہے کھیت کو ہلتی ہے بالیاں
پودے بھی جھومتے ہیں لچکتی ہیں ڈالیاں
پھلواریوں میں تازہ شگوفے کھلا چلی
سویا ہوا تھا سبزہ اسے تو جگا چلی

(ہوا چلی)

ان کی ان نظموں کو احباب نے جمع کیا۔ ریزہ جواہر کے نام سے کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ اس کتاب کو ایسی مقبولیت ہوئی کہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئی۔

اسی سال ان کی ایک اور تصنیف ''رسالہ قلندری'' شائع ہوا۔ اس کا مضمون تصوف تھا۔ اس رسالے کی طرز انشاء سے صاف پتا چلتا تھا کہ یہ اسماعیل میرٹھی کی تصنیف ہے لیکن سرورق پر ان کے پیر بھائی نجم الدین کا نام تھا۔ اسے اپنے پیر بھائی سے محبت کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

☆......☆

اسماعیل میرٹھی کی نظمیں کبھی کبھی بلا نام ''نجم الاخبار'' میں طبع ہوا کرتی تھیں۔ ان کی نظم ''صبح کی آمد'' حسب دستور بلا نام نہایت آب و تاب کے ساتھ نجم الاخبار میں شائع ہوئی۔ نہایت سادہ زبان میں مناظر فطرت کی ایسی دلکش تصویریں بنائی گئی تھیں جو اس وقت تک انگریزی نظموں کے سوا کہیں نہیں ملتی تھیں۔

خبر دن کے آنے کی میں لا رہی ہوں
اجالا زمانے میں پھیلا رہی ہوں
بہار اپنی مشرق سے دکھلا رہی ہوں
پکارے گلے صاف چلّا رہی ہوں
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں
اذاں پر اذاں مرغ دینے لگا ہے
خوشی سے ہر اک جانور بولتا ہے
درختوں کے اوپر عجب چہچہا ہے
سہانا ہے وقت اور ٹھنڈی ہوا ہے
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

ابھی اس طویل شاندار نظم کی اشاعت کو کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ ایک نظم ''ملمع کی انگوٹھی'' اس اخبار نجم الاخبار میں شائع ہوئی۔

چاندی کی انگوٹھی پہ جو سونے کا چڑھا جھول
اوچھی تھی لگی بولنے اترا کے بڑا بول
چاندی کی انگوٹھی کے نہ میں ساتھ رہوں گی
وہ اور ہے میں اور یہ ذلت نہ سہوں گی
میں قوم کی اونچی ہوں بڑا میرا گھرانا
وہ ذات کی گھٹیا نہیں اس کا ٹھکانا
میری سی چمک اس میں نہ میری سی دمک ہے
چاندی کہ ہے رانگ مجھے اس میں بھی شک ہے
میری سی کہاں چاشنی میرا سا کہاں رنگ
وہ مول میں اور تول میں میرے نہیں پاسنگ
اے دیکھنے والو تمہی انصاف سے کہنا
چاندی کی انگوٹھی بھی ہے کچھ گہنوں میں گہنا
یہ سنتے ہی چاندی کی انگوٹھی بھی گئی جل
اللہ رے ملمع پہ نہ اترا مری پیاری
دو دن میں بھڑک اس کی اتر جائے گی ساری
کچھ دیر حقیقت کو چھپایا بھی تو پھر کیا
جھوٹوں نے جو سچوں کو چڑایا بھی تو پھر کیا
مت بھول کبھی اصل کو اپنی اری احمق
جب تاؤ دیا جائے گا ہو جائے گا منہ فق
کھوٹے کو کھرا بن کے نکھرنا نہیں اچھا
چھوٹے کو بڑا بن کے ابھرنا نہیں اچھا

(ملمع کی انگوٹھی)

شمس العلماء منشی ذکاء اللہ ان نظموں کو بڑے شوق اور توجہ سے پڑھ رہے تھے۔ ان نظموں پر چونکہ شاعر کا نام درج نہیں تھا اس لیے قدرتی طور پر انہیں فکر تھی کہ اس شاعر کا نام معلوم کیا جائے۔ اس باکمال شاعر کے بارے میں کچھ تو معلوم ہوا ڈپٹی نجم الدین ان کے دوست تھے اور ہم جماعت رہ چکے تھے۔ منشی ذکاء اللہ نے انہیں خط لکھ کر استفسار کیا کہ اس گم نام شاعر کے نام و نشان سے آگاہ فرمائیں جس کا

Downloaded From http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

کلام نجم الاخبار میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ نجم الدین نے لکھ دیا کہ آپ میرٹھ تشریف لائیں تو اس باکمال شاعر سے ملاقات کرادی جائے گی۔

منشی صاحب پہلی فرصت میں میرٹھ تشریف لائے اور نجم الدین صاحب کے یہاں قیام فرمایا۔ اسماعیل میرٹھی روزانہ شام کے وقت شریک صحبت ہوا کرتے تھے۔ اس شام تشریف لائے تو ایک اجنبی صورت کو بیٹھے دیکھا۔ لطیفہ یہ بھی ہوا کہ وہ صاحب انہیں دیکھتے ہی احتراماً اٹھ کھڑے ہو گئے۔

''آپ ہیں اسماعیل میرٹھی؟''

''اور جناب؟''

''شمس العلماء منشی ذکاء اللہ دہلوی۔''

''زہے نصیب! آپ سے آج ملاقات ہوگئی۔''

''آپ کی نظمیں پڑھ کر آپ کو داد دینے حاضر ہوا ہوں۔''

''اسے آپ کی عظمت ہی کہوں گا۔''

''نہیں آپ اس کے مستحق ہیں آپ اردو شاعری میں ایک نئے رنگ کا اضافہ کررہے ہیں۔ اس کے موجد آپ ہیں اور غالباً خاتم بھی آپ ہی ہوں گے۔ آپ کے بعد اس رنگ کو کوئی نبھا نہیں سکے گا لیکن ایک تبدیلی ضرور آئے گی۔''

اس کے بعد منشی صاحب آپ کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے رہے۔

منشی صاحب جتنے دن میرٹھ میں رہے اسماعیل میرٹھی سے ملاقاتیں رہیں اور ان کی نظمیں سنتے رہے۔

اب اسماعیل میرٹھی کی مروت کا تقاضا تھا کہ وہ بھی دہلی جائیں اور منشی ذکاء اللہ سے ملاقات کریں اور ان کا شکریہ ادا کریں۔ وہ منشی ذکاء اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے ساتھ دلی لائبریری تک گئے۔ واپسی میں جامع مسجد تک ساتھ رہا۔ جامع مسجد کے قریب ہی محمد حسین آزاد سے ملاقات ہوگئی۔ مولانا آزاد نے ذوق سخن کی کیفیت سن کر انجمن لاہور کے مشاعرے کے واسطے سے نظم کی فرمائش کی۔ اسماعیل میرٹھی نے اس مشاعرے کے لیے تین مثنویاں لکھیں، چاند اور آب زلال تصنیف کیں لیکن انہیں پڑھنے کا موقع انجمن پنجاب کے مشاعرے میں نہ مل سکا۔ اس کے بعد بھی کسی مشاعرے میں لاہور نہ جا سکے کچھ تو سرکاری مصروفیات اور کچھ اس لیے کہ وطن سے دور رہنا یا کچھ عرصے کے لیے بھی جانا گوارا نہ تھا۔ ملازمت کی بات الگ تھی کہ مجبوری تھی۔ اس لیے بھی گوارا ہوگیا کہ ملازمت اپنے مطلب کی تھی۔

تصنیف و تالیف کا شوق تھا کہ نچلا نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ فارسی کے مدرس تھے اس لیے جانتے تھے کہ انگریزی مدارس میں فارسی کا برا حال ہے۔ اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے آپ نے فارسی ریڈروں کا ایک سلسلہ تصنیف کیا۔ فارسی زبان میں نظمیں خاص اس سلسلے کے لیے تصنیف فرمائیں۔ بعض نظمیں فارسی میں انہی مضامین پر تھیں جن پر اردو میں ہی لکھی تھیں اور اردو ریڈروں میں شامل کی گئی تھیں۔

مگر یہ سلسلہ شائع نہ ہوسکا۔

☆......☆

1888ء میں میرٹھ اور جھانسی کے نارمل اسکول توڑ دیئے گئے اور ایک سینٹرل نارمل اسکول آگرہ میں قائم ہوا چنانچہ ان دونوں نارمل اسکولوں کا عملہ بھی آگرہ تبدیل کردیا گیا۔ اسماعیل میرٹھی کو بھی آگرہ جانا پڑا۔

مولانا اسماعیل میرٹھی کے کلام کی شہرت و مقبولیت آگرہ کے قیام میں ظہور پذیر ہوئی۔

اسماعیل میرٹھی آگرہ جاچکے تھے۔ منشی ذکاء اللہ ان دنوں مدارس پرائمری کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ایک سلسلہ اردو ریڈروں کا طبع کرانے کا ارادہ کررہے تھے۔ وہ اسماعیل میرٹھی کی نظموں کو سن بھی چکے تھے اور پڑھ بھی چکے تھے۔ اس وقت کوئی دوسرا شاعر بچوں کے معیار کی صاف اور سلیس نظمیں نہیں لکھ رہا تھا۔ کوئی اردو ریڈر شائع ہو اور اس میں اسماعیل میرٹھی کی نظم شامل نہ ہو یہ تو ایسا ہی تھا جیسے کلاس میں بچے موجود ہوں لیکن استاد نہ ہو۔ منشی ذکاء اللہ مولوی اسماعیل سے متاثر بھی تھے اور انصاف کا تقاضا بھی یہ تھا کہ ان ریڈروں میں ان کی نظمیں شامل کی جائیں۔ انہوں نے ان ریڈروں کے تین سلسلے شائع کیے اور تینوں میں اسماعیل میرٹھی کی شاعری بہ کثرت شامل کیں۔ بچہ اور ماں، ایک لڑکا اور بیر، میرا خدا میرے ساتھ ہے، پن چکی، صبح کی آمد، ہماری گائے، اب آرام کرو، کوشش کیے جاؤ، ایک پودا اور گھاس، خدا کی قدرت، سچ اور جھوٹ وغیرہ نظمیں ان ریڈروں میں شامل ہوکر مقبول خاص و عام ہوئیں۔ داخل نصاب ہوکر گھر گھر میں پہنچ گئیں۔ آگرہ کی گلیوں میں بچے گاتے پھرتے تھے۔

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

Downloaded From http://paksociety.com

اس مالک کو کیوں نہ پکاریں
جس نے پلائیں دودھ کی دھاریں
خاک کو اس نے سبزہ بنایا
سبزے کو پھر گائے نے کھایا
کل جو گھاس چری تھی بن میں
دودھ بنی اب گائے کے تھن میں
دودھ میں بھیگی میری روٹی
اس کے کرم نے بخشی سیری
گائے کو دی کیا اچھی صورت
خوبی کی ہے گویا مورت
کھا کر تنکے اور ٹھٹھرے
دودھ ہے دیتی شام سویرے
رب کی حمد و ثناء کر بھائی
جس نے ایسی گائے بنائی
(ہماری گائے)

نہر پہ چل رہی ہے پن چکی
دھن کی پوری ہے کام کی پکی
بیٹھی تو نہیں کبھی تھک کر
تیرے پہیے کو ہے سدا چکر
پیسنے میں لگی نہیں کچھ دیر
تو نے جھٹ پٹ لگا دیا اک ڈھیر
لوگ لے جائیں گے سمیٹ سمیٹ
تیرا آٹا بھرے گا کتنے پیٹ
(پن چکی)

مولانا وحید الدین پانی پتی ٹم ٹم میں سوار ایک گلی سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے چند لڑکوں کو کورس کی شکل میں ایک نظم پڑھتے ہوئے دیکھا۔ وہ لہک لہک کے گا رہے تھے۔

کوے ہیں سب دیکھے بھالے
چونچ بھی کالی پر بھی کالے
کالی کالی وردی سب کی
اچھی خاصی ان کے ڈھب کی
کالی سینا کے ہیں سپاہی
ایک سی صورت ایک سیاہی
لیکن ہے آواز بری سی
کان میں جا لگتی ہے چھری سی

وحید الدین پانی پتی ٹم ٹم رکوا کر اس نظم کو سنتے رہے۔ پھر ٹم ٹم سے اترے اور بچوں کے قریب پہنچ کر رک گئے۔

بچے انہیں دیکھ کر خاموش ہو گئے اور ان کا منہ تکنے لگے۔

”بچو! تم یہ کس کا کلام پڑھ رہے تھے، کچھ معلوم ہے؟“

”مولوی صاحب کا۔“

”کون مولوی صاحب۔“

”مولوی اسماعیل میرٹھی۔“

”ان کا گھر تمہیں معلوم ہے؟“

”گھر تو ہمیں نہیں معلوم۔ ہم نے تو یہ نظم کتاب میں پڑھی تھی۔“

انہیں بچوں کے قریب کھڑے دیکھ کر ایک دکاندار اپنی دکان سے اٹھ کر آ گیا۔ یہی سوال انہوں نے اس دکاندار سے پوچھا۔

”بھائی مجھے اسماعیل میرٹھی کے گھر جانا ہے۔“

”اس شہر میں نئے ہو؟“

”میں پانی پت سے آیا ہوں۔“

”جبھی تو ورنہ کون نہیں جانتا کہ وہ چھوٹا غالب پورے محلہ نائی کی منڈی میں رہتے ہیں۔ وہاں تک چلے جاؤ پھر مکان کوئی بھی بتا دے گا۔“

مولانا وحید الدین کو یہ نظم سن کر یقین ہو گیا تھا کہ اسماعیل میرٹھی وہی ہیں جن کی تلاش میں وہ آگرہ آئے ہیں۔ ایسی نظم ان کے سوا کوئی لکھ ہی نہیں سکتا اور ان کے پرچے ”معارف“ میں جو نظم ”ایم آئی“ کے نام سے شائع ہوئی ہے وہ بھی اسماعیل میرٹھی ہیں۔

ٹم ٹم والے نے انہیں محلہ نائی کی منڈی پہنچا دیا۔

مولانا ان دنوں میرٹھ سے تبادلہ ہو کر آگرہ آ گئے تھے اور نائی کی منڈی میں فروکش تھے۔

مولانا سے ملاقات ہوئی تو وحید الدین سلیم پانی پتی نے اپنا تعارف کرایا۔ مولانا کے لیے وہ اجنبی نہیں تھے لیکن وحید الدین انہیں پہلی مرتبہ دیکھ رہے تھے۔ چوڑی پیشانی، ستواں ناک، تنگ دہانہ، گھنی داڑھی۔ عمر پچاس سے کچھ کم ہی ہو گی۔ لباس و مکان سادگی کا مرقع بنے ہوئے تھے۔

”حضرت میرے رسالے ”معارف“ میں آپ کی مثنوی ”شمع ہستی“ شائع ہوئی ہے۔“

”شکریہ ادا کرنے تو مجھے آنا چاہیے تھا۔ کم از کم خط ہی لکھ دیا ہوتا۔ بہرحال اب آپ کا شکریہ ادا کیے دیتا ہوں گر قبول افتد۔“

”میں تو لاعلم تھا کہ یہ نظم کس کی ہے۔ آپ نے تو

Downloaded From http://paksociety.com

صرف ایم آئی کے نام سے نظم بھیجی تھی۔"
"پھر یہ گتھی کیسے سلجھی؟"
"میں اتفاق سے پانی پت گیا ہوا تھا۔ وہاں مولانا حالی سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان کے سامنے آپ کی دو مثنویاں شمع ہستی اور سیف و قلم رکھ کر دریافت کیا کہ ان مثنویوں کا خالق کون ہوسکتا ہے۔ مولانا حالی نے پہلے تو ان مثنویوں کی تحسین کی اور اس کے بعد فرمایا کہ اگر ایسی مثنویاں کوئی لکھ سکتا ہے تو وہ مولانا محمد اسماعیل ہیں۔ اب ایم آئی کی گتھی سلجھ گئی اور میں آپ سے ملاقات کا شوق لیے آگرہ چلا آیا۔"

"میں بھی کتنا ناعاقبت اندیش ہوں۔" اسماعیل میرٹھی نے کہا۔ "اگر مثنوی پر نام پہلے ہی لکھ دیا ہوتا تو آپ کو یہ زحمت اٹھانی نہیں پڑتی۔"

"نام و نمود سے ایسی بھی کیا گریز پائی۔ اپنی تخلیقات پر اپنا نام ضرور لکھا کیجیے۔"

"آئندہ کسی مدیر کو یہ شکایت نہیں ہوگی۔"

رسالہ معارف علی گڑھ سے نکلتا تھا۔ وحید الدین سلیم پانی پتی اس کے مدیر تھے اور بلند ادبی معیار پر یہ پہلا اردو رسالہ تھا۔ اس ادبی رسالے میں اسماعیل میرٹھی کی نظمیں ان کے نام کے ساتھ شائع ہونا شروع ہوئیں تو ان کا نام ادبی حلقوں میں گونجنے لگا۔

پنجاب میں اس وقت درسی کتابیں تیار کی جارہی تھیں۔ مولانا کی شہرت اس منزل پر تھی کہ ان کی کئی نظمیں اس میں انتخاب کی گئیں لیکن ایسی صورت پیش نہ آسکی کہ مولانا انجمن پنجاب کے مشاعرے میں عملی حصہ لیتے۔

ایسے انسان کے لیے جو خود ہی غیر مانوس سوسائٹی میں شرکت سے جھجکتا ہو ان کے لیے لازم تھا کہ اپنی طبیعت کے لیے کوئی نئی جولاں گاہ تلاش کرے چنانچہ جو وقت ملا انہوں نے بچوں کی تربیت اخلاق کے لے خزینہ نظم جمع کرنے میں سرف کیا۔

قیام آگرہ کے دوران ان کی ادبی خدمات کے طفیل ان پر ترقی کے دروازے کھلے۔ پروفیسر سینٹ جانس ان کی شاعری کے بہت مداح تھے۔ انہوں نے ایک راستہ نکالا اور ان کے نام ضلع بجنور کی ڈپٹی انسپکٹری کا پروانا جاری کرادیا۔ یہ نہایت سنہری پیش کش تھی لیکن مولانا نے یہ کہہ کر انکار کردیا۔ "اس عہدے پر اکثر سفر میں رہنا پڑتا ہے اور یہ ہم کو پسند نہیں۔"

تصوف سے وابستگی نے دل غنی کردیا تھا۔ اشاعت کتب سے وافر آمدنی ہوتی تھی لیکن اس دولت سے ان کے رہن سہن میں کوئی فرق نہ آیا۔ دولت کے باوجود کبھی سواری کا رکھنا پسند نہیں کیا۔ جائداد بھی خریدی تو اولاد کے نام منتقل کردی۔

آگرہ کے قیام کے دوران ادب اردو کا ایک انتخاب اردو مڈل کلاس کے طلبہ کے لیے مرتب فرمایا جو توزک اردو کے نام سے شائع کیا۔ یہ انتخاب کئی برس تک سررشتہ تعلیم کے نصاب میں داخل رہا۔ کئی برس تک ہائی اسکولوں کی نویں اور دسویں جماعتوں میں پڑھایا جاتا رہا۔

قواعد اردو سے مولانا کو خاص دلچسپی تھی۔ آگرہ کے قیام کے دوران قواعد اردو کے نام سے دو حصوں میں اپنی تالیف شائع کرائی لیکن یہ رسالے صرف ابتدائی مدارس کے طلبہ کے لیے کارآمد تھے۔

ایک کتاب ترجمان فارسی کے نام سے تصنیف کی جس میں اردو سے فارسی اور فارسی سے اردو ترجمہ کرنے کے طریقے سکھائے گئے تھے۔

آگرہ میں بارہ سال گزارنے کے بعد 1899ء میں پنشن لے کر بار ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔

آگرہ نے جہاں انہیں کئی خوشگوار تحفے دیے وہیں ایک دردناک تحفہ بھی دیا۔ زندگی بھر کی ساتھی ان کی اہلیہ تین سال بیمار رہ کر اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ انہیں آگرہ ہی میں دفن کیا اور تدفین کے چند روز بعد میرٹھ واپس آگئے۔

وطن واپسی کے بعد کچھ عرصہ فرزند اصغر کے پاس دہلی میں رہے۔

☆......☆

آگرہ کے قیام کے دوران چند صدمے ایسے جھیلے تھے کہ دنیا سے دل سرد ہوگیا۔ پہلا صدمہ تو اس وقت دیکھنے کو ملا جب منجھلے صاحبزادے شیخ محمد حامد کا انتقال نوجوانی میں ہو گیا۔ مولانا کو اس فرزند سے دلی لگاؤ تھا۔ فقراء کی خدمت میں حاضر ہونے کا شوق تھا۔ شادی ہوچکی تھی۔ ملازمت کا تعلق بھی ہوگیا تھا۔ باپ کے پاس آگرہ آئے ہوئے تھے۔ وہاں حضرت حاجی وارث شاہ بھی تشریف فرما تھے۔ ان کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا کرتا تھا۔ ایک دن کچھ ایسی توجہ فرمائی کہ دل اس عالم کی رونق سے سرد ہوگیا۔ رفتہ رفتہ جسم پر بھی اثرات نمودار ہونے لگے۔ نہایت گبرو جوان تھے۔ تین سال بیمار رہے۔ گھل کر پانی ہو گئے۔ بہترین

Downloaded From http://paksociety.com

انگریزی اطبا کا علاج رہا لیکن تندرستی کی توقع باقی نہ رہی۔ مولانا نے انہیں میرٹھ روانہ کردیا۔ انتقال سے قبل مولانا میرٹھ تشریف لے گئے تھے اور فرزند عزیز سے رخصت ہو آئے تھے کہ 22 اکتوبر 1895ء کو ان کے انتقال کی خبر بذریعہ خط آگرہ موصول ہوئی۔ آخر باپ تھے۔ جب ضبط کا یارا نہ رہا تو آنسوؤں کا چشمہ ابل پڑا۔ اسی عالم اضطراب میں روتے جاتے تھے اور اشعار موزوں کرتے جاتے تھے۔

یہ تھا جگر گوشہ کا مرثیہ

حامد کہاں کہ دوڑ کے جاؤں خبر کو میں
کس آرزو پہ قطع کروں اس نظر کو میں
مانا بری خبر ہے یہ تیری خبر تو ہے
صبر و قرار نذر کروں نامہ بر کو میں
یہ سنگ و خشت آہ دلاتے ہیں تیری یاد
روتا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں
ہے تیری شکل یا تری آواز کا خیال
کرتا ہوں التفات یکایک جدھر کو میں
افسوس ہائے ہائے کی آتی نہیں صدا
پوچھے تو کیا بتاؤں ترے چارہ گر کو میں
کیا ہو گیا اسے کہ تجھے دیکھتی نہیں
جی چاہتا ہے آگ لگا دوں نظر کو میں
اچھا جو تو نے گوشۂ مرقد کیا پسند
اب اپنے حق میں گور بناؤں گا گھر کو میں
تیرے سر عزیز کی بالش ہو خاک سے
بالین غم سے اب نہ اٹھاؤں گا سر کو میں
دیکھی نہ تھی بہار ابھی تیرے شباب کی
بھولا نہ تھا ابھی ترے عہد صغر کو میں
حکم خدا یہی تھا کہ بیٹھا کیا کروں
ماتم میں تیرے اشک فشاں چشم تر کو میں
وہ جانے اور اس کی رضا جو پسند ہو
سب کام سونپتا ہوں اسی داد گر کو میں
ہوتا نہ دل میں درد تو کرتا نہ ہائے ہائے
دیتا نہ طول یوں سخن مختصر کو میں

☆.....☆

چھوٹے فرزند محمد اسلم نے دہلی میں چھاپہ خانہ قائم کیا تھا اور بعد میں ایک تجارتی کمپنی۔ مولانا پنشن لے کر آ چکے تھے لہٰذا کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے دہلی میں سکونت اختیار کر لی لیکن اس کام میں شاید آپ کا دل نہیں لگا اور چند سال گزارنے کے بعد میرٹھ آ گئے۔

اب جو وقت کی تبدیلی اور نئے زمانے کی ضرورتوں پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ سرکاری نصاب کے تحت مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کا کچھ بندوبست نہیں جب کہ لڑکیوں کا تعلیم یافتہ ہونا بہت ضروری تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور آگے بڑھتا وہ خود آگے بڑھے اور 1909ء میں ''مدرسۃ بنات المسلمین'' کی بنیاد ڈال دی۔

انہیں اس کا اندازہ نہیں تھا کہ صورتِ حال کیا ہے۔ جب اس مدرسے کا اعلان میرٹھ میں ہوا تو جواب میں سناٹا تھا۔ مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ اپنی لڑکیوں کو مدرسے میں تعلیم کے لیے بھیجنا خلاف شریعت سمجھتے تھے۔ روزانہ کوئی نہ کوئی شخص یا وفد مولانا کے پاس آتا اور لعن طعن کر کے چلا جاتا۔ کسی نے یہ مشہور کیا کہ انگریزوں نے اس کام کے لیے بہت دولت دی ہے۔ اس دولت کے لالچ میں وہ ہماری لڑکیوں کا اخلاق بگاڑنے پر تلے ہوئے ہیں جب کہ ان کے سامنے مولانا حالی کی مثال تھی۔ سرسید کا خیال یہ تھا کہ قوم کے لڑکے پڑھ جائیں گے تو خود بخود عورتوں کی تعلیم کا اہتمام کریں گے بلکہ حالی کا کہنا تھا کہ قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس کی خواتین تعلیم یافتہ نہ ہوں۔ انہوں نے اپنے گھر میں لڑکیوں کا مدرسہ بھی کھولا تھا۔ ان کے سامنے بھی یہی مشکلات آئی ہیں۔ انہوں نے اس مشکل کا یہ حل نکالا کہ خاندان کی لڑکیوں کو اس میں تعلیم دلانا شروع کی۔ رفتہ رفتہ دوسروں کو بھی شوق ہونے لگا۔ ساکنان قرب و جوار نے اس مدرسے سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔

تین سال میں یہ مدرسہ اتنی ترقی کر گیا کہ اس مدرسے کی طرف سے آٹھ لڑکیاں ورنیکلر اور مڈل امتحان میں شریک ہوئیں۔ ان میں سے تین اوّل درجے میں کامیاب ہوئیں اور تین دوسرے میں۔

مولانا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ''کیے جاؤ کوشش میرے دوستو۔''

انہوں نے بھی کوشش کی اور ان کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں اور عزیزوں نے بھی۔ بڑی جدوجہد کے بعد یہ قرار پایا کہ میونسپل بورڈ میرٹھ مولانا کی تعلیمی خدمات کے اعتراف میں ایک ہزار نو سو بیس روپے سالانہ بطور گرانٹ دیا کرے گا۔

مولانا کی وفات کے دس سال بعد تک یہ مدرسہ میونسپل بورڈ کے زیر اہتمام رہا پھر قومی درس گاہ بن گیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

☆......☆

مولانا الطاف حسین میرٹھ اسٹیشن پر اترے تو حسب توقع ان کے نواسے غلام الثقلین ان کے انتظار میں تھے۔

گھر پہنچتے ہی انہیں اسماعیل میرٹھی کا خیال آیا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے میرٹھ آؤں اور اسماعیل میرٹھی سے نہ ملوں۔

غلام الثقلین نے آدمی دوڑایا۔ معلوم ہوا مولوی صاحب میرٹھ میں نہیں ہیں لکھنو گئے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب کے چھوٹے بیٹے اسلم سیفی آئے۔

''حضرت ابا جان تو لکھنو گئے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کچھ دن یہاں ہیں تو میں انہیں خط لکھ دوں۔''

''صاحبزادے میں ان کا انتظار کرلیتا لیکن مجھے علی گڑھ پہنچنا ہے۔ ٹھہر نہیں سکتا۔''

گفتگو کے دوران مولوی صاحب کی غزلوں کا ذکر نکل آیا پھر خود ہی فرمائش کی۔

''اگر آپ کو مولوی صاحب کی کچھ غزلیں یاد ہوں تو سنایئے۔ میں سمجھوں گا ان سے ملاقات ہوگئی۔'' مولانا حالی نے فرمائش کی۔

''حضرت ایک غزل مجھے یاد آرہی ہے جو ابا جان نے آگرہ میں کہی تھی۔ غالب کی زمین میں ہے۔''

''ضرور سنایئے۔''

جہاں تیغ ہمت علم دیکھتے ہیں
محالات کا سر قلم دیکھتے ہیں
کمالات صانع پہ جن کی نظر ہے
وہ خوبی مصنوع کم دیکھتے ہیں
نہیں مبتلا جو تن آسانیوں میں
انہیں دم بہ دم تازہ دم دیکھتے ہیں
نہیں جن کو جاہ و حشم کا تکبر
وہی لطف جاہ و حشم دیکھتے ہیں
شکم پروری جن کا شیوہ ہے ان کو
اسیر جفائے شکم دیکھتے ہیں

اس غزل میں جب یہ شعر سنایا۔

بس اے رنگ و بو تو نہ کر ناز بے جا
خدا جانے کیا بات ہم دیکھتے ہیں

خواجہ حالی نے بہ آواز بلند ''خوب اور'' سبحان اللہ فرمایا۔ ارشاد فرمایا پھر پڑھیے۔ دوبارہ پڑھا۔ جب اگلا شعر پڑھنا شروع کیا تو فرمایا، نہیں اسی شعر کو پڑھیے۔

جب یہ داد و تحسین دیکھی تو اسلم سیفی کی ہمت بندھی۔

''حضرت استاد غالب کی زمین میں ابا جان کی ایک غزل اور یاد آرہی ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں۔''

''ضرورت ہے۔ آپ تو ہمارے استاد غالب کی یاد تازہ کررہے ہیں۔''

زلف دیکھی اس کی جن قوموں نے وہ کافر نہیں
رخ نظر آیا جنہیں وہ سب مسلماں ہوگئیں
خود فروشی حسن کو جب سے ہوئی مد نظر
نرخ دل بھی گھٹ گئیں جانیں بھی ارزاں ہوگئیں
خوف ناکامی ہے جب تک کامیابی ہے محال
مشکلیں جب بن گئیں ہمت سب آساں ہوگئیں
ہائے کس کو روئیے اور کس کی خاطر پیٹیے
کیسی کیسی صورتیں نظروں سے پنہاں ہوگئیں
کیا انہیں اندوہ ہنگام سحر یاد آگیا
شام ہی سے بزم میں شمعیں جو گریاں ہوگئیں
کیا ہے وہ جان مجسم جس کے شوق دید میں
جامہ تن پھینک کر روحیں بھی عریاں ہوگئیں
تھی وہ توفیق الٰہی میں نے سمجھا اپنا فعل
طاعتیں بھی میرے حق میں عین عصیاں ہوگئیں

☆......☆

''مولانا کا کلام نہایت پختہ ہے۔ وہ مسلم الثبوت استاد ہیں۔ ہماری جانب سے کہیے گا، اس غزل کا مطلع نہیں ہے اس کا مطلع ضرور کردیں۔''

چند روز بعد اسماعیل میرٹھی وطن واپس آئے تو مولانا حالی کی آمد کا ذکر کیا گیا اور حالی کی فرمائش گوش گزار کی گئی۔

شب کے دس بجے کا وقت تھا اور موسم سرما تھا۔ بستر پر آرام فرما رہے تھے۔ کئی صاحب مولانا کے نزدیک فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ فرمایا لکھو

عارض روشن پہ جب زلفیں پریشاں ہوگئیں
کفر کی گمراہیاں ہم رنگ ایماں ہوگئیں

☆......☆

وہ سرسید اور ان کے تعلیمی کاموں کے نہایت مدح خواں تھے۔ نہایت خاموشی سے مدرستہ العلوم کی مالی امداد کیا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد بھی انہوں نے کالج فنڈ کی امداد سے ہاتھ نہیں کھینچا تھا۔

ان کی ہر دلعزیزی اور کالج سے ان کا شغف دیکھ کر ڈاکٹر ضیاء الدین وائس چانسلر نے چندہ جمع کرنے کی غرض سے ایک وفد میرٹھ بھیجنے کا ارادہ کیا۔ وفد بھیجنے سے پہلے

Downloaded From http://paksociety.com

انہوں نے روسائے میرٹھ سے دریافت کرنا ضروری سمجھا کہ وفد کب تک آئے اور کس قدر چندے کی امید کی جائے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین کی جانب سے موصول ہونے والے خط کی روشنی میں مشاورت کی غرض سے ایک جلسہ نواب اسد اللہ خاں کے دولت کدے پر منعقد ہوا۔ اس جلسے میں اسماعیل میرٹھی بھی مدعو تھے۔ کچھ لوگوں کا نامعلوم یہ خیال کیوں تھا کہ وفد کو ابھی میرٹھ آنے کی دعوت نہ دی جائے۔ مولانا کو غصہ بہت آتا تھا لیکن اس وقت غصے کا عجب عالم تھا۔ بپھرے ہوئے شیر کی طرح کھڑے ہوئے اور اعلان کیا۔

''میں پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ چند مخالفین کی رائے کے برخلاف تمام سربرآوردگان میرٹھ کی یہ رائے ہے کہ وفد کو بلانے کے لیے یہ وقت نہایت موزوں ہے۔''

مولانا کی اس تجویز کا خیر مقدم کیا گیا اور وفد کو دعوت دے دی گئی۔

مولانا نے اس موقع پر اپنا تصنیف قصیدہ جو خاص اسی موقع کے لیے لکھا گیا تھا نہایت پُرجوش انداز میں پڑھا۔ اس قصیدے میں مسلمانوں کی اخلاقی کمزوریوں، اقتصادی خرابیوں اور ادبی بدمذاقیوں پر سختی سے حرف گیری کی گئی تھی اور آخری حصے میں یونیورسٹی کی امداد کے لیے اہل وطن سے چندہ دینے کی اپیل کی۔

اگر قوم کی زندگی چاہتے ہو
تو ہے ورسٹی چشمہ آبِ حیواں
اطبائے حاذق کی تجویز ہے یہ
گھٹے گا اسی سے مذلت کا یرقاں
تلافی آفات کا گر یہی ہے
کمر باندھ لو اور بنو مردِ میداں
اٹھا دو سمندِ عزیمت کی باگیں
بجا دو بس اب کوس ایثار و احساں
گرجنے لگے ابر جود و کرم کا
برسنے لگے دام و درہم کا باراں
چمکنے لگیں بجلیاں سیم و زر کی
ابلنے لگے چشمہ جیب و ہمیاں
خزینہ دفینہ نہیں ہے تو کیا غم
نہ ہونا نہ ہونا نہ ہونا ہراساں
زراہِ خلوص ایک کوڑی بھی دو گے
تو رکھے گی وہ قدر لعل و بدخشاں
کرو جمع جو جو تو ہو جائیں سو سو
بنے قطرے قطرے سے دریائے اعمال
جو ہمت کرو تم حامی خدا ہے
خدا کے سوا کون ہے سیر ساماں
ہے امید واثق کہ سرمایہ کافی
خزانے میں داخل ہوتا ماہِ رمضاں
جو دریا دلی قوم نے کی تو فوراً
ہمارے امیر اور نواب اور خاں
کریں گے یہ کوشش کہ اس ورسٹی کا
مزین ہو طغرائے شاہی سے قرباں
کرو جدوجہد اب خدا کے بھروسے
ہمارا تمہارا خدا ہے نگہباں
کمربستہ ہو کر کرے کام بھی کچھ
سنے جو کوئی یہ نوائے زمستاں

☆......☆

اس قصیدے کی ایسی برکت ہوئی کہ میرٹھ کے مسلمانوں نے اپنی جیبیں خالی کردیں۔

مولانا کو یوں تو گوشہ گیری سے محبت تھی، مجلس آرائی کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن کمال کے قدردان تھے۔ باکمال لوگوں سے خود جا کر ملا کرتے تھے۔ حالی، سرسید، مولانا ظفر علی خاں سب ہی سے خط کتابت رہا کرتی تھی۔ ان کے سفر بھی کسی نہ کسی باکمال سے ملنے کے لیے ہوا کرتے تھے۔ سرسید کے قدردان تھے۔ ان کے خلاف کوئی بات سننے کے روادار نہ تھے لیکن اکبر الہ آبادی کی شاعری کے ایسے رسیا تھے کہ ان سے ملنے الہ آباد گئے خود بھی ایسے باکمال کہ اکبر جیسا باکمال فرمائش غزل کہے بغیر نہ رہ سکا اور ہر شعر پر ایسے داد دیتا رہا کہ مولانا اس دادگری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ غزل بھی وہ سنائی جسے سنانے کے لیے کسی قدردان کی تلاش کررہے تھے۔

بزمِ ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں
ہے یہ تیری ہی صدا غیر کی آواز نہیں
کہہ سکے کون وہ کیا ہے مگر از روئے یقیں
گل نہیں شمع نہیں سرو سرافراز نہیں
بھاگ ویرانۂ دنیا سے کہ اس کی منزل
منزلِ مہمان بجز مائدۂ آز نہیں
دلبری جذبِ محبت کا کرشمہ ہے فقط

Downloaded From http://paksociety.com

کچھ کرامت نہیں جادو نہیں اعجاز نہیں
دست قدرت نے مجھے آپ بنایا ہے تو پھر
کون سا کام ہے میرا کہ خدا ساز نہیں

☆...☆

اسماعیل میرٹھی آرام سے میرٹھ میں بیٹھے تھے۔ فرصت کے دن تھے لیکن نچلا بیٹھنا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ کچھ قدیم شعرا کا انتخاب جمع کر رہے تھے کہ ان کے چھوٹے بیٹے نے اخبار ان کے سامنے رکھ دیا۔ اس اخبار میں یہ اعلان شائع ہوا تھا کہ اس سال کے آخر میں ملک معظم قیصر جارج پنجم بہ نفس نفیس ہندوستان تشریف لا کر دربار تاج پوشی منعقد فرمائیں گے۔ انہوں نے اس خبر کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اور اخبار کو ایک طرف رکھ دیا۔ ابھی کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا مراسلہ موصول ہو گیا۔ اس مراسلے کے ذریعے انہوں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ مولانا ایک قصیدہ دربار تاج پوشی کے متعلق تصنیف فرمادیں۔

''بھئی ہمارا یہ مزاج کہاں کہ قصیدے لکھتے پھریں۔ ان سے معذرت کرلو۔ خرابی صحت کا بہانہ کر کے جان چھڑاؤ۔'' چند شاگرد جو سامنے بیٹھے تھے ان سے معذرت کہلوادی۔

مشکل سے دو دن بھی نہیں گزرے تھے کہ مجسٹریٹ صاحب کی بیگم مسز پیرس ملنے آگئیں اور قصیدہ لکھنے پر اصرار کیا۔ خود چل کر آئی تھیں۔ مہمان تھیں۔ خاتون تھیں۔ مولانا انکار نہ کرسکے اور وعدہ کرلیا۔ قصیدہ لکھا اور انہی کی معرفت سرجان ہیوٹ کی خدمت میں ارسال کردیا۔

یہ قصیدہ بھی ان کی نظموں کی طرح سادہ اور سلیس تھا۔ پرانی وضع کی مدح سرائی کا نام ونشان تک نہیں تھا البتہ نظام سلطنت سے جو عمدہ نتائج مرتب ہوئے تھے اور ایسے ادارے قائم کیے گئے تھے جو مخلوق کے واسطے فائدہ مند ثابت ہو رہے تھے ان کا ذکر کیا گیا تھا یا سائنس کو عملی جامہ پہنانے سے جو نئی ایجادات ہو رہی تھیں ان کا ذکر کیا گیا تھا۔

سنا تو یہ گیا تھا کہ ایک دربار خاص منعقد ہوگا اور اس میں شہنشاہ ہند کے روبرو شعرائے ہند اپنے قصائد سنائیں گے لیکن پھر پروگرام بدل گیا اور یہ قصیدے ایک جلسے میں پڑھے گئے جس کی صدارت گورنر پنجاب نے کی، مولانا کو بھی اس جلسے کی دعوت دی گئی تھی لیکن مولانا نے وہاں جانے کی زحمت نہیں کی۔

ان قصائد کو جانچنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اس کمیٹی نے مولانا کے قصیدے کو تیسرے انعام کا مستحق ٹھہرایا تھا۔ اس کے صلے میں ایک چاندی کا تمغہ اور سرٹیفکیٹ دیا گیا۔

''سرٹیفکیٹ کا مضمون یہ تھا۔''

یہ سرٹیفکیٹ ان کے طویل مفید کام کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو بہ حیثیت درس فارسی انجام دیا اور ان خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو انہوں نے زبان اردو کی ترویج میں کی ہیں بہ حیثیت اردو نثار اور شاعر کے اور جن کی نثر ونظم ملک کے واسطے ایک نمونہ ہے بطور صلہ عطا کیا جاتا ہے۔''

غالباً اسی قصیدے کے انعام کے طور پر سرکار ہند کی جانب سے مولانا کو خطاب ''خان صاحب'' عطا ہوا۔ اس خطاب کو سن کر احباب کو مایوسی بھی ہوئی اور ہنسی بھی آئی۔ یہ ایسا بے جوڑ خطاب تھا کہ اسماعیل میرٹھی کی ذات وخدمات سے کسی طرح بھی مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ احباب کی رائے کے مطابق انہیں شمس العلماء کا خطاب ملنا چاہیے تھا۔

یوپی کے سررشتہ تعلیم نے مولانا کی ادبی خدمات کے بارے میں یہ انتہائی بے نیازی کا برتاؤ کیا۔ ان کی ادبی خدمات نے اطراف ہند میں ان کا نام روشن کیا ہوا تھا لیکن سرکاری سطح پر ناقدری کا مظاہرہ کیا جارہا تھا۔

اس کی تلافی بہرحال اس طرح ممکن ہوگئی کہ عوامی سطح پر ان کے کاموں کی قدر کی جارہی تھی۔ اہل علم اور ادب کے سرپرست اس کی اہمیت سمجھتے تھے۔ اس قدر دانی کی چھاؤں میں مولانا اپنا ادبی سفر جاری رکھے ہوئے تھے اور مایوسی سے بچے ہوئے تھے۔

☆......☆

شمس العلماء نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کی تحریک پر یہ قرار پایا تھا کہ امیر خسرو کا کل کلام جمع کیا جائے اس کی کامل تصحیح کی جائے اور اس کی مکمل تاریخ اردو زبان میں لکھی جائے۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ امیر خسرو جیسے شاعر کے کلام کو مستقبل کے لیے محفوظ کیا جاسکے۔

یہ کام ایسا نہیں تھا کہ کوئی ایک شخص اسے مکمل کرسکے۔ اس کام کے لیے خاص خاص حضرات انتخاب کیے گئے جو زبان فارسی پر مکمل عبور اور سخن فہمی میں مکمل درجہ کمال رکھتے ہوں۔ ملک میں کوئی ادبی کام ہو رہا ہو اور اسماعیل میرٹھی پر نظر نہ جائے یہ کیسے ہوسکتا تھا لہٰذا عماد الملک میرٹھ تشریف لائے اور مولانا کو اس عظیم منصوبے سے آگاہ کیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

ان دنوں مولانا نہایت انہماک کے ساتھ ''قواعد اردو'' کی تدوین میں مصروف تھے لیکن امیر خسرو کے کلام کی ترتیب کو قومی اور ادبی کام سمجھ کر اپنا کام چھوڑا اور امیر خسرو کی تصنیفات کو سنبھالا۔ انہوں نے مثنوی قران العدین کی تنقید اور حیات امیر خسرو کو اپنے ذمے لے کر کام شروع کر دیا۔

اس کام میں مولانا کا ایک سال سے زیادہ وقت صرف ہوا لیکن مولانا نے اپنے وقت کی قیمت وصول نہیں کی یعنی کسی معاوضے کے بغیر یہ کام کیا۔ اس ایثار کی مثال بھی دنیائے ادب میں شاید بہت کم ملے گی یا شاید بالکل نہ ملے جب کہ کتب کی اشاعت ہی مولانا کا وسیلہ روزگار تھا۔ ایک سال تک کسی اور ادبی کام کو ہاتھ نہ لگانا خسرو سے عقیدت بھی تھی اور ادب کی خدمت بھی اور یہ بھی کہ مثنوی قران العدین کی اشاعت وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے۔ یہ مثنوی ان کی وفات کے بعد 1918ء میں شائع ہوئی۔

مثنوی کی تکمیل کے بعد حیات امیر خسرو کی طرف متوجہ ہوئے اور تمام وقت کتب متعلقہ سے اقتباسات نقل کرنے میں گزرنے لگا۔

یہ کام آپ کی وفات کی وجہ سے ادھورا رہ گیا۔

☆......☆

مولانا کو علمی مشاغل کے علاوہ ہر ایسی تحریک سے شغف تھا جس سے قومی تنظیم اور اصلاح کا کام انجام پا سکے۔ صرف دلچسپی نہیں لیتے تھے بلکہ عملی حصہ بھی لیتے تھے تاکہ نوجوانوں کی رہنمائی کر سکیں۔ وہ مسلم لیگ میرٹھ کے وائس پریزیڈنٹ تھے۔ انجمن ترقی اردو کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ مولانا عبدالحق سے خط کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ لوکل الیکشنوں میں برابر دلچسپی لیتے رہے۔ اصلاح مراسم میں بھی ہمیشہ کوشاں رہے۔ ان نامعقول مراسم کو جو شادی اور غمی کے مواقع پر مروج ہو گئے ہیں سخت ناپسند کرتے تھے۔ اس امر میں ہمیشہ کوشاں رہے کہ کسی بھی طرح قوم کو ان رسوم سے بھات دلا دیں۔ اس کام کے لیے انہوں نے تبلیغ و تعلیم سے بھی کام لیا اور ایسی نظمیں بھی تخلیق کیں جن میں ان رسموں کی طرف توجہ دلائی۔

دام بلا ہے قرض پھنسے اور ہوئے شکار
ہے پاس آبرو تو رہو ہوشیار تم

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

مارچ کی روپہلی دوپہریں
شمارۂ جاسوسی کی تیز تر لہریں

اولین صفحات
جرم کی دلدل دور سے بہت رنگین، پُرفریب سراب کے مانند مگر انجام بالآخر دھنسنا ہی ہوتا ہے...... اقبال کاظمی کا تحفہ گم گشتہ خزانے سے

انگارے
شریف آدمی کو بدمعاش بننے پر مجبور کر دینے والے قانون شکن عناصر کی یکجائی سے جنم لینے والا ہولناک سلسلہ طاہر جاوید مغل کے قلم سے

آوارہ گرد
چلچلاتی دھوپ میں بے آسرا و تنہا مسافر کی آبلہ پائی...
عبدالرب بھٹی کی طبع آزمائی

سرورق کی کہانیاں

چیں نکتہ چینی

آپ کے تبصرے...
مشورے... محبتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

پہلا رنگ
زندگی سے بندھے کچے تعلق کی پاداش میں دربدر بھٹکتے بے قراروں کی دل گداز داستان...... زویا اعجاز کا وجدان

دوسرا رنگ
آنکھوں ہی آنکھوں میں جرم کے زینے عبور کرتی چلی گئی...... ہنستے مسکراتے کرداروں کی آنکھ مچولی...... محمد فاروق انجم کی من چلی تحریر

Downloaded From http://paksociety.com

کسمساتے ہی رہو گے سدا قرض خواہ سے
اس ننگ و عار کو نہ کرو اختیار تم
دیکھو یہ قرض وعدہ خلافی نہ دے سکھا
ہو جاؤ گے جہان میں بے اعتبار تم
جب تک وبالِ جان نہ جانو گے قرض کو
ہرگز نہ بن سکو گے کفایت شعار تم
گر دُرِ شاہوار ملے کوڑیوں کے مول
زنہار بھول کر بھی نہ لینا ادھار تم
پھر ہو سکے گا کوئی بھی افسوس نہ کارگر
لقمے کو قرض کے نہ کرو زہر مار تم
(قرض)

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ میرٹھ میں قائم کی گئی۔ مدعا یہ تھا کہ مسلمانانِ میرٹھ تعلیمی معاملات میں قومی خدمت انجام دے سکیں۔ مولانا ایسی تحریکوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے چنانچہ اہلِ میرٹھ نے بہ اصرار مولانا کو وائس پریزیڈنٹ بنایا۔ مولانا کا یہ حال کہ علیل ہوں یا صحت یاب اس کے اجلاسوں میں ضرور شریک ہوتے اور نظم و نثر کے ذریعے اس کی آمدنی میں اضافے کے لیے کوشاں رہے۔ قطعات و خطوط لکھ کر ہندوستان بھر کے اہلِ ثروت کو متوجہ کرتے رہے تاکہ زیادہ سے زیادہ عطیات جمع ہوں جو نادار طلبہ کی امداد کے کام آسکیں۔

فیضِ عام ہائی اسکول میرٹھ سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمانوں کا کوئی اور ہائی اسکول میرٹھ میں نہیں تھا۔ وہ اس اسکول کے ٹرسٹی اور وائس پریزیڈنٹ بھی تھے۔ انہوں نے اس ادارے کی ترقی و تعمیر کا ایک طریقہ یہ نکالا تھا کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے موقعوں پر قطعات لکھ دیا کرتے تھے۔ منتظمین کی جانب سے یہ قطعات کارڈوں پر چھپوا کر عید گاہ میں تقسیم کیے جاتے تھے اور اس طرح اچھا خاصا چندہ جمع ہو جاتا تھا مثلاً ایک مرتبہ یہ قطعہ لکھا

ہو مبارک آپ کو عید سعید
دے ترقی آپ کو ربِ جلیل
آپ ہی کا مدرسہ ہے فیضِ عام
آپ کی خدمت میں کرتا ہے اپیل
دیکھیے میرے مدارج کا عروج
کیجیے میرے مصارف کی سبیل
آپ میری ہمت افزائی کریں
قوم کے اطفال کا میں ہوں کفیل
بارک اللہ گر ہو مقدار کثیر
میرے سر آنکھوں پہ ہے ہر قدر قلیل
التفاتِ خاص میں گر ہو نہ دیر
میری کوشش میں بھی پھر ہوں گی نہ ڈھیل
سرزمین مصر کب دیتی ہے پھل؟
جوش پر آتا ہے جب دریائے نیل

وہ اپنے قائم کردہ مدرسہ بنات المسلمین کے مالیات کی جانب سے بھی اکثر متفکر رہا کرتے تھے۔ اس مشکل کو دور کرنے اور مدرسے کے قیام و دوام کی طرف اس چشمہ فیض (سرکار نظام دکن) کی توجہ مبذول کرانے کے لیے ایک قصیدہ لکھنا شروع کیا تھا عدیم الفرصتی نے اسے مکمل نہیں ہونے دیا۔

☆......☆

مولانا کم گو تھے لیکن جن لوگوں سے مانوس ہو جاتے تھے ان کے سامنے بے تکلف گفتگو کرتے تھے۔ حافظہ ایسا تھا کہ کوئی کتاب دیکھے بغیر علم کے دریا بہا دیتے تھے۔ حافظے کا یہ عالم عمر کے آخری حصے تک رہا۔ انتقال سے چھ ماہ قبل چند ایسے لوگ ملاقات کے لیے آئے جن سے وہ بے تکلف تھے۔ اس زمانے میں مولانا حیاتِ خسرو کی تصنیف میں مصروف تھے۔ لہٰذا گفتگو کا رخ اس جانب مڑ گیا۔ ابتداء میں خسرو کے فارسی کلام پر گفتگو ہوتی رہی۔ پھر دیگر فارسی شعراء کے کلام کا موازنہ خسرو کے کلام سے ہونے لگا۔ مولانا ایک جھٹکے کے ساتھ اس طرح بستر سے اٹھے جیسے کوئی پہلوان اکھاڑے میں اترتا ہے اور پھر اس روانی سے اساتذۂ فارسی کے اشعار سنانے شروع کیے کہ سب کو حیرت ہوئی۔ ایک ہی مضمون پر مشتمل مختلف اساتذہ کے اشعار بروقت یاد آجانا آسان نہیں ہوتا لیکن وہ اسی طرح سنا رہے تھے جیسے باتیں کر رہے ہوں۔ دیکھو اس مضمون کو فلاں نے اس طرح کہا ہے۔ فلاں کا انداز یہ ہے اور فلاں اس طرح کہتا ہے۔ بعض احباب نے آزمانے کے لیے خود موضوع دینا شروع کر دیے۔

"حضرت انسان مظہر الٰہی ہے۔ اس موضوع پر خسرو کا کوئی شعر ہے؟"

"کیوں نہیں۔ یہ لیجیے۔"

مولانا نے ذرا دیر غور کرنے کے بعد خسرو کے ایک

Downloaded From http://paksociety.com

نہیں دو اشعار سنا دیے اور پھر تو جیسے حافظے کا چراغ جل گیا۔ حافظ، سعدی، فردوسی، حکیم سنائی ہر شاعر کے اشعار سناتے چلے گئے۔ پھر کسی نے کوئی اور موضوع دے دیا۔ ایک مرتبہ پھر اشعار کی بارش شروع ہوگئی۔

جب بہت دیر ہوگئی تو آپ نے کمر ٹیک لی۔ ”بس اب میں آرام کروں گا۔“ انہوں نے سب کو حیرت میں چھوڑا اور تکیے پر سر رکھ لیا۔

☆......☆

اسماعیل میرٹھی نے دوسرے بہت سے شعراء کی طرح ابتدا غزل گوئی سے کی۔ غزل گوئی اس وقت کے فیشن میں داخل تھی۔ وہ ابتدا میں غزلیں کہہ ضرور رہے تھے لیکن اس صنف کلام پر وہ زیادہ متوجہ نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غزلوں کی تعداد بہت کم رہی اور جب انہیں انگریزی نظموں کے تراجم پڑھنے کو ملے تو وہ نظموں کی طرف راغب ہوگئے۔ ان نظموں میں ان کا فطری جوہر چمکا۔

ان کی غزلیں بھی تخیل کی پرواز، بیان کی سادگی قوافی کی برجستگی اور تراکیب کی چستی کا نمونہ تھیں۔ ابتدائی غزلوں میں عشق کا عنصر زیادہ تھا۔ البتہ بعد میں دیگر مضامین نے بھی جگہ لے لی لیکن جو کچھ بھی اس صنف میں لکھا اس میں پختگی ٹپکتی ہے تصوف، پند و حکمت، توکل ہمدردی، ہمت، تسلیم و رضا، گردش زمانہ، ظرافت، نزاکت خیال غرض کیا ہے جو ان کی غزل کے دامن میں نہیں۔

پروانے کی تپش نے خدا جانے کان میں
کیا کہہ دیا کہ شمع کے سر سے دھواں اٹھا

☆

دوستی اور کسی غرض کے لیے
وہ تجارت ہے دوستی ہی نہیں

☆

ذرا غم زدوں کے بھی غم خوار رہنا
کریں ناز تو ناز بردار رہنا

☆

ہمت کے لیے عار ہے احسان اٹھانا
وہ درد بھی اچھا جو نہ محتاج دوا ہو

☆

نہیں معلوم کیا واجب ہے کیا فرض
مرے مذہب میں ہے تیری رضا فرض

☆

بس اے رنگ بو تو نہ کر ناز بے جا
خدا جانے کیا بات ہم دیکھتے ہیں

☆

زمانہ ان سے کراتا ہے آج خارکشی
جو محو سرو و صنوبر تھے خانہ باغوں میں

☆

تھی وہ توفیق الٰہی میں نے سمجھا اپنا فعل
طاعتیں بھی میرے حق میں عین عصیاں ہوگئیں

شاعری کا دوسرا دور سہارن پور اور پھر میرٹھ میں گزرا۔ سہارن پور میں رہ کر چند قصیدے اور فارسی نظمیں کہیں۔ اس دور کی نظموں میں فارسی تراکیب زیادہ ملتی ہیں لیکن پھر سرسید کی نشاندہی پر خالص اردو کی طرف لوٹ آئے۔

شاعری کا تیسرا دور آگرہ میں گزرا۔ یہیں ان کی شاعری کو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہاں رہ کر نظمیں بھی تخلیق کیں اور غزلیں بھی کہیں۔ مثنویاں لکھیں، جن میں اپنی قادر الکلامی کا کمال دکھایا۔ یہ وہ دور ہے جب ان کا کلام نظم و نثر نہ صرف یوپی بلکہ دکن تک پہنچا۔

ہوں میں تو وہی معتکف گوشہ عزلت
حالانکہ مرا ریختہ پہنچا ہے دکن تک

شاعری کا چوتھا دور 1900ء سے وفات تک ہے۔ اس دور میں قصائد اور قطعات زیادہ لکھے۔ اب ان کی سادگی کمال سادگی کا مرقع پیش کرتی دکھائی دیتی ہے۔

ان کی شاعری کے ان نمونوں نے میرٹھ کے ایک محلے سے نکال کر ہندوستان کے گوشے گوشے میں جہاں اردو زبان بولی اور پڑھی جاتی ہے انہیں روشناس کرا دیا۔

☆......☆

مولانا کی تندرستی جوانی میں بھی اچھی نہیں تھی۔ اکثر درد قولنج کی شکایت رہتی تھی۔ کبھی کبھی درد گردہ بھی اٹھتا تھا۔ یہ کیفیت قیام آگرہ میں بھی جاری رہی۔ کھانسی کی شکایت اکثر رہتی تھی۔ سگریٹ بہت پیتے تھے۔ کھانسی کا اصل سبب یہی تھا۔

جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی یہ شکایات بھی بڑھتی گئیں۔ موسم سرما میں ان کی طبیعت زیادہ ناساز ہو جاتی تھی۔ 1917ء کا موسم سرما کچھ زیادہ ہی بھاری ہوا۔ جب کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ حیات امیر خسرو پر کام کر رہے تھے لیکن زندگی بھر

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

Downloaded From http://paksociety.com

ہمت کا درس دینے والے کی ہمت ٹوٹ گئی۔ کام سمیٹ کر رکھ دیا اور بستر پکڑ لیا۔

محروم الحرام 1326ھ کو معمولی بخار لاحق ہوا۔ اس کی ابتداء دردِ سر کی شکایت سے ہوئی۔ بظاہر کوئی غیر معمولی کیفیت نہیں تھی۔ یہ اندیشہ بھی نہیں تھا کہ یہ بخار موت کا سبب بن جائے گا۔

اس سال محرم اور رام لیلا کے جلوسوں کی ایک ہی تاریخ پڑ گئی تھی۔ لہٰذا فساد کا احتمال تھا۔ مولانا کی طبیعت اتنی خراب نہیں تھی کہ اس طرف سے غافل ہو جاتے لیکن ایسی حالت بھی نہیں تھی کہ بستر سے اٹھتے۔ محرم کی چھ تاریخ ہوگئی کہ نواب اسد اللہ خان اور دوسرے کئی اکابر تیمارداری کے لیے آئے تو مولانا نے ان سے ذکر کیا۔

''صاحبو! میری طبیعت کا چھوڑو۔ کوشش اس کے لیے کرو کہ ہندو مسلم فساد نہ ہو جائے۔ بیمار تو میں اب پڑا ہوں۔ بستر پر جانے سے پہلے کہہ رہا ہوں کہ انسداد فساد کے لیے کچھ کیا جائے لیکن میری کوئی سنتا ہی نہیں۔ اب آپ لوگ آئے ہیں تو آپ سے بھی یہی کہتا ہوں کہ بااثر حضرات کا ایک جلسہ مرتب کیا جائے اور اس میں یہ قرارداد ہو کہ ہندوؤں کے میلے میں مسلمان اور مسلمانوں کے میلے میں ہندو انتظام میں ایک دوسرے کے شریک و معاون رہیں گے۔''

نواب صاحب نے وعدہ کرلیا اور ان کے دولت کدے پر ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں سر سیتا رام ممبر میونسپل بورڈ نے بھی شرکت کی اور طے پا گیا کہ ایسا ہی ہوگا جیسا کہ مولانا اسماعیل کی خواہش ہے۔

جس دن محرم اور رام لیلا کے جلوس نکلے مولانا نسبتاً ہشاش بشاش تھے۔ بار بار اپنے بیٹوں یا خادموں میں سے کسی کو بھیجتے تھے کہ باہر کی خبر لاؤ، کوئی کشیدگی تو نہیں۔ یہ خبریں برابر ملتی رہیں کہ تمام انتظامات خوش اسلوبی سے ہو رہے ہیں۔

دوسرے دن سر سیتا رام خود چل کر آئے۔ مولانا نے بہترین انتظامات کرنے پر ان کا شکریہ ادا کیا۔

دس تاریخ کے بعد سے بخار میں شدت آگئی۔ کبھی کبھی غشی کی سی کیفیت ہو جاتی تھی۔

عزیز، اہلِ برادری، ہمسائے، اہل شہر، عمائدین مزاج پرسی کے لیے تشریف لاتے رہے۔

مدرسہ بنات المسلمین کا خیال اس وقت بھی حاوی تھا۔ جب ہوش میں آتے اسی کے بارے میں دریافت کرتے۔ محرم کی چودہ تاریخ تھی کہ آپ نے فرمایا۔

''مدرسے کے لیے امداد کی ضرورت ہو تو سرکار نظام میں رجوع کرنا، وہاں سے امداد ملے گی۔''

یہ آخری الفاظ تھے۔ اس کے بعد انہوں نے کسی سے بات نہیں کی۔ آنکھیں موندھ لیں۔ لوگوں نے اس خیال سے آواز نہیں دی کہ سو رہے ہیں۔ نیند میں خلل نہ ڈالا جائے لیکن جب دوا دینے کے لیے آواز دی اور ہلکا سا جھنجوڑا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ صرف نیند نہیں ابدی نیند ہے۔ دیکھنے والے نے فوراً گھڑی کی طرف دیکھا چار بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔ جمعرات کا دن تھا۔ 14 محرم الحرام 1336ء بمطابق یکم نومبر 1917ء تاریخ تھی۔

وفات کے فوراً بعد آپ کو زنانے مکان میں لے جایا گیا۔ جس کمرے میں پیدا ہوئے تھے اسی میں غسل میت دیا گیا۔

دو تین سال قبل ایک مرتبہ عیدگاہ جاتے ہوئے ایک مقام کو دیکھ کر کہا تھا ہم کو اسی مقام پر دفن کرنا اور یہ زمین بیع کر لینا۔

آپ کے اس ارشاد کو وصیت تصور کیا گیا۔

اس مقام سے کوئی دو سو قدم جانب دکن غازی آباد کی سڑک پر منشی نجم الدین کی قبر تھی جن کا انتقال 1907ء میں ہو چکا تھا۔ قدرت نے دونوں پیر بھائیوں کے مزار ایک دوسرے سے متصل مقرر کر دیے تھے۔ زندگی بھر جدا نہ ہونے والے مرنے کے بعد بھی ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔

مولانا کا جنازہ مغرب کے قریب اٹھایا گیا۔ اگرچہ دفن میں عجلت کی گئی پوری طرح اطلاع بھی نہیں ہو سکی تھی لیکن اس کے باوجود ہندو مسلمانوں کا مجمع کثیر جنازے میں شامل تھا۔

اے خوشا وہ کہ نیک نام جیا
اس کو مقبول کبریا کہیے

ماخذات

کلیات اسماعیل میرٹھی معہ حیات اسماعیل، محمد اسلم سیفی

تذکرہ شعرائے میرٹھ ...... نور احمد میرٹھی

Downloaded From http://paksociety.com

سرّی ادب کی ملکہ

فرزانہ نکہت

اردو کے سرّی ادب کا نام لیا جائے تو بس ایک نام سامنے آتا ہے، ابن صفی لیکن جب عالمی پیمانے پر سرّی ادب کا نام لیا جائے تو سب سے اوپر اگا تھا کرسٹی کا نام آئے گا۔ دنیا میں ایسا ایک بھی ملک نہیں ملے گا جہاں اگاتھا کرسٹی کے ناول نہ پڑھے جاتے ہوں۔ قلم کی اس ملکہ کی زندگی بھی تھرل بھری تھی۔ اس کی زندگی کا ہلکا سا عکس۔

ایک مقبول لکھاری کا مختصر سا تذکرہ

اس عنوان سے قارئین بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ اشارہ کس کی طرف ہے۔ جی ہاں یہ اگاتھا کرسٹی ہے۔ کسی بھی انگریز مصنف کے مقابلے میں زیادہ پڑھی جانے والی دنیا کو قتل کی انوکھی نرالی کہانیوں سے تحیر زدہ کردینے والی مصنفہ جو بذاتِ خود بھی انوکھی نرالی تھی۔

اکتوبر 1976ء میں جاسوسی ادب کے مبصرین نے بڑے اشتیاق و دلچسپی سے ایک نئے ناول نے "نجات پنے۔ یہ اگاتھا کرسٹی کا ناول "سلیپنگ مرڈر" (قتلِ خوابیدہ) تھا جس کے بارے میں افواہیں تھیں کہ اس میں مس مارپل نے اپنے ہم پلہ کا سامنا کیا تھا اور موت کے گھاٹ اتر گئی تھی۔

مگر خوش قسمتی سے ایسا نہ ہوا تھا۔ اگاتھا کرسٹی کی اپنے ناولوں کے پلاٹ کے تانے بانے بننے کی خصوصی مہارت اور

Downloaded From http://paksociety.com

جاںبکدستی یہاں بھی اپنا کام دکھا گئی تھی اور اس کے قارئین کی دل پسند اور محبوب سراغرساں مس مارپل موت کے منہ میں جاتے جاتے بچ گئی تھی۔

لیکن فاضل مصنفہ نے 1975ء میں شائع ہونے والے اپنے ناول ”دی کرٹین“ (پردہ) میں اپنے معروف و ہردلعزیز جاسوس ہرکیول پوئرو کو موت کے گھاٹ اتار دینے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ دکھائی تھی۔ اس کے مقابلے میں اس نے مس مارپل کو نہ صرف زندہ رکھا تھا بلکہ ہر طرح سے اس پر گویا سبقت بھی دلادی تھی۔

”دی ٹائمز“ کے تنقید نگار ایچ ایف کیٹنگ نے بڑے مسرور انداز میں مس مارپل کے زندہ بچ نکلنے کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”یہ عظیم کرسٹی کا ذہن ہی تخلیق کرسکتا ہے۔ انتہائی روانی کے ساتھ واقعات در واقعات ظہور پذیری، سنسنی خیزی اور تجسس کا نقطۂ عروج پھر یکسر خلاف توقع اختتام۔ جانے میڈم کرسٹی اس طرح کیونکر کرلیتی ہیں؟“ لیکن اگاتھا کرسٹی جسے 1971ء میں ”ڈیم کمانڈر آف دی آرڈر آف دی برٹش ایمپائر“ بنایا گیا۔ اپنی تخلیقات کے بارے میں ویسی ہی عجز وانکساری کا پیکر بنی رہی۔ بلکہ ایک موقع پر تو اس نے اپنے آپ کو اپنی گراں قدر تخلیقات کے حوالے سے ”ساسیج مشین“ تک کہہ ڈالا۔

12 جنوری 1976ء میں پچاسی سال کی عمر میں انتقال کے وقت اس کے کریڈٹ پر ایک سو دس تخلیقات تھیں۔ جن میں چھیاسٹھ جرم وسزا کے بھرپور ناول تھے۔ جن کی 350 ملین جلدیں فروخت ہوئیں۔ ان کا 157 زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ یعنی شیکسپیئر سے 63فی صد زیادہ!

اس کی کہانیوں پر پندرہ فلمیں اور سترہ ڈرامے پیش ہوئے۔ ”ماؤس ٹریپ“ یا چوہے دان دنیا کا طویل ترین ڈراما تھا جسے ستائیس سال قبل لندن میں پیش کیا گیا۔ یہ اب بھی دنیا کا مقبول ترین کھیل گنا جارہا ہے۔

فلم ”مرڈر آن اورینٹ ایکسپریس“ جو کرسٹی ہی کی کہانی پر مبنی ہے۔ 1975ء میں دس میں سے پانچ باکس آفس کی سرفہرست گنی جانے والی فلموں میں سے ایک تھی۔ جب کرسٹی نے انتقال کیا تو ”دی کرٹین“ برطانیہ اور اٹلانٹک پار امریکا میں پرفروش ترین کتابوں میں شامل ہورہی تھی۔

اپنی جاسوسی کہانیوں سے کرسٹی نے جتنی دولت کمائی اس کا تخمینہ اٹھارہ ملین ڈالر لگایا جاتا ہے۔ اس نے انگریزی زبان کے کسی بھی ادیب کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ دولت کمائی۔ اسے اگر تاریخ کی سب سے زیادہ دولت کمانے والی مصنفہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ”سلیپنگ مرڈر“ جب امریکا میں طبع ہوئی تو اس کے پیپر بیک حقوق ساڑھے آٹھ لاکھ ڈالر میں فروخت ہوئے۔

اس کا اصل نام اگاتھا ملر تھا۔ وہ برطانیہ میں ٹرکوائے، ڈیون کے مقام پر پیدا ہوئی۔ اس کا گھرانہ اچھا خوش حال گھرانہ تھا۔ اس کا باپ امریکی اور ماں انگریز تھی جو اس غیر روایاتی نظریئے کی حامی تھی کہ اسکول کی تعلیم بچے کی آنکھوں اور ذہن کے لیے بہت سخت اور نقصان دہ ہوتی ہے۔ اس نظریے کے پیشِ نظر اس کے والدین نے اسے خود تعلیم دینا شروع کردی۔ یوں اسے بہت کچھ پڑھنے کا موقع ملا۔ رومانی ناول، شرلاک ہومز کے کارنامے، جنہوں نے آگے چل کر اسے جاسوسی کہانیاں لکھنے کی تحریک دلائی۔ جس کا خود اس نے بھی اعتراف کیا۔ ایک دن جب اس کی طبیعت ناساز تھی تو اس کی ماں نے اس سے کہا کہ وہ وقت کاٹنے کے لیے کوئی چھوٹی سی کہانی لکھ دے۔ اس وقت سے اس کے قلم نے ایسی سلسلہ وار کہانیاں اگلنی شروع کیں جن کے زیادہ تر کردار موت کے گھاٹ اتر گئے۔

1915ء میں پہلی جنگِ عظیم کے دوران اس کی بڑی بہن نے اسے چیلنج دیا کہ وہ ایک اچھی سی جاسوسی کہانی لکھ کر دکھائے۔ اگاتھا نے یہ چیلنج قبول کرلیا۔ اس وقت تک وہ رائل فلائنگ کور کے ایک افسر آرچی بالڈ کرسٹی سے بیاہی جاچکی تھی جو اس وقت ٹرکوائے اسپتال میں ریڈکراس والنٹیئر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس وقت قصبے کے باہر بلجیئن مہاجرین کی آبادکاری کے انتظامات بھی جاری تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے اگاتھا کے ذہن نے انڈے کی شکل جیسے سر، گھنی روغنی مونچھوں اور چمچماتے جوتوں والے ہرکیول پوئرو کی شخصیت تراشی۔ وہ اگاتھا کے سب سے پہلے جاسوسی ناول ”دی مسٹریئس افیئر ایٹ اسٹائلز“ میں جو اگاتھا نے اپنی بہن کا چیلنج قبول کرتے ہوئے لکھا تھا، نمودار ہوا۔

اگاتھا کے اس پہلے ناول کو تین سال تک یکے بعد دیگرے کئی پبلشر شائع کرنے سے انکار کرتے رہے۔ پھر بالآخر 1920ء میں اسے شائع ہونا نصیب ہو ہی گیا لیکن اس کی صرف ڈھائی ہزار جلدیں ہی فروخت ہوسکیں۔ جن کے اسے ایک سو ڈالر موصول ہوئے۔ ”دی مرڈر آف راجر ایکسرائیڈ“ 1925ء میں شائع ہوئی۔ اس نے اگاتھا کو بحیثیت جاسوسی ناول نگار شہرت اور ناموری عطا کی۔ اس وقت وہ اپنے شوہر اور بیٹی روزالنڈ کے ساتھ برک شائر میں رہ رہی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

وہاں رہتے ہوئے اس کی ازدواجی زندگی تلخیوں کا شکار ہونے لگی تھی۔ اس کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کا شوہر ایک دوسری عورت میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

پھر اگاتھا پراسرار طور پر لاپتہ ہوگئی۔

اس کی متروکہ کار قصبہ کی سڑک پر کھڑی پائی گئی۔ دس دنوں تک ہزاروں پولیس والے اور رضا کار اس کی تلاش میں ملک بھر کو کھنگالتے رہے۔ پھر ایک ٹیلی فون کال کے سراغ میں پولیس نے اسے ہیروگیٹ کے ایک ہوٹل میں تلاش کرلیا۔ وہاں وہ اس عورت کے نام سے ٹھہری ہوئی تھی جس کی محبت میں اس کا شوہر مبتلا چلا آرہا تھا جس سے بعد میں اس نے شادی رچالی۔ یہ خبر ہر اخبار نے شہ سرخیوں میں شائع کی۔ اکثر اخبارات نے تو طنزاً اسے ''دی مرڈر آف راجر ایکسرائیڈ'' کا پبلسٹی اسسٹنٹ قرار دیا۔

ہر چند کہ یہ حقیقت جلدی منظرِ عام پر آگئی کہ وہ یادداشت کھو جانے کے مرض میں مبتلا تھی۔ اس لیے اس سے یہ حرکت سرزد ہوئی۔ وہ اپنی گمشدگی کے بارے میں عمر بھر بے حد حساس رہی۔ تاہم یہ ضرور ہوا کہ اس واقعے نے اس کا نام ملک بھر میں مشہور کردیا اور اس کے مذکورہ ناول کی ایک ملین سے زیادہ کاپیاں فروخت ہوگئیں۔

اس واقعے کے دو سال بعد کرنل کرسٹی سے اسے طلاق ہوگئی لیکن وہ اس کا نام بدستور اپنے جاسوسی ناولوں کے لیے استعمال کرتی رہی۔

1930ء میں اس نے ایک بلند پایہ ماہرِ آثارِ قدیمہ میکس میلوون سے دوسری شادی کی جسے 1968ء میں سر کا خطاب دیا گیا۔ وہ کئی سالوں تک اس کے ہمراہ شرقِ اوسط میں مناظر کشی اور اصل اشیاء کی نقول کی فہرستیں تیار کرنے میں اس کی مدد کرتی رہی۔ اگاتھا کرسٹی میلورن نام سے لکھے جانے والے اس کے ناول ''کم ٹیل می ہاؤ یو لیو'' (آؤ مجھے بتاؤ کہ تم کیسے رہتے ہو) میں اس نے اپنی ان مصروفیات کا ہلکا پھلکا تذکرہ کیا ہے۔ اس نے افسانے بھی لکھے اور نظموں کی ایک کتاب بھی، میری ویسٹ میکوٹ کے نام سے بہت سے رومانٹک ناول بھی لکھے۔

لیکن قتل برائے تسکین کے فنِ لطیف کی خالق کی حیثیت سے اگاتھا نے اپنا ایک الگ مقام بنایا ہے۔ اس کی کتابوں پر گہری تخلیق و جستجو کی گئی ہے۔ وہ جب اسپتالوں میں کام کرتی تھی تو اس دوران اسے مختلف زہروں کے بارے میں جاننے کا موقع ملا تھا۔ اس کے شوہر کی آثارِ قدیمہ کی کھدائی، ان کی جستجو اور تحقیق نے اسے بیشتر ناولوں کے لیے پس منظر مہیا کیا۔ مرڈر ان میسوپوٹیمیا، ڈیتھ آن دی نیل، ڈیتھ کمز ایس این اینڈ جو دو ہزار قبل مسیح کے پس منظر میں لکھا گیا جس کی ہر تفصیل لا متناہی تحقیق و جستجو کا پہلو لیے ہوئے ہے۔

شک اور بے یقینی میں مبتلا ایک قاری جو اورینٹ ایکسپریس کے ذریعے یورپ کا سفر کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اگاتھا کرسٹی نے ''مرڈر آن اورینٹ ایکسپریس'' میں اس ٹرین کے سوچوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہوا تھا، ٹھیک ہی لکھا تھا۔

جہاں تک اگاتھا کرسٹی کے کہانیوں کے انتہائی مضبوط و مربوط پلاٹ کا تعلق ہے تو ان میں سے اکثر اس وقت سوچے گئے تھے جب وہ غسل کررہی ہوتی تھی یا سیب کھا رہی ہوتی تھی یا کھانا پکانے یا کپڑے دھونے میں مصروف ہوتی تھی۔ اس وقت اس کا ذہن اپنے ناولوں کے پلاٹوں کے تانے بانے بنا کرتا تھا۔ اسی خصوصیت نے اسے بھول بھلیوں کی ملکہ کا خطاب دلوایا۔

اسے اپنے قاری کو جھانسے دینے اور اس کے ساتھ فریب کاری کرنے میں لطف آتا ہے لیکن وہ اپنے قاری کی غلط سمت راہنمائی نہیں کرتی بلکہ اسے اجازت دیتی ہے کہ وہ خود ہی غلط سمت اپنی رہنمائی کرے۔ مثال کے طور پر ایک شخص جس پر قتل کا شک کیا جارہا ہے، کو کہا جاتا ہے کہ وہ ایک تاریخ کی توثیق کرے۔ وہ عدالت کے کمرے میں سے گزرتا ہے اور دیوار پر لٹکے ہوئے کیلنڈر پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتا ہے۔ اس پر قاری اس غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ اس نے اس کیلنڈر پر وہ تاریخ دیکھی ہے جب کہ درحقیقت اس شخص کی نظر اتنی کمزور ہوتی ہے کہ اسے کمرے کی کوئی چیز صاف نہیں دکھائی دیتی۔ اسی طرح اگاتھا کرسٹی کی ایک اور فریب کاری، کندھے پر سے مبتلائے فریب کرنے والی چال ہے۔ ایک شخص اپنے عین سامنے ایک شخص کے کندھے کے اوپر دیکھ رہا ہے۔ اس کے چہرے پر تحیر و تعجب کے تاثرات رقصاں ہیں۔ یہ نظارہ ہمیں تفصیلی طور پر بتایا جاتا ہے تاکہ ہم صحیح طور پر جان سکیں کہ خطِ بصارت میں لوگ اور چیزیں کیسی ہوتی ہیں۔ صاف اور واضح کلیو کو یوں بے تکلفانہ آگے لا پھینکا جاتا ہے کہ ہم سرخ ہیرنگ مچھلیوں کے سمندر میں ہاتھ مارتے ہی رہ جاتے ہیں۔

اپنے انتہائی مہارت اور ذہانت سے بنے گئے ایک پلاٹ میں اگاتھا نے مظلومین میں سے ایک کو قاتل دکھایا ہے۔ دوسرے مقام پر اس نے اپنے سراغرساں کو ہی قاتل دکھا دیا ہے۔ اس کی فنکارانہ صلاحیتوں کا برطانیہ کے شاہی خاندان کی

Downloaded From http://paksociety.com

طرف سے بھی اعتراف کیا گیا۔ جب آنجہانی ملکہ میری کی سالگرہ منائی جانے لگی تو اس نے فرمائش کی کہ اس موقع پر ریڈیو سے اگاتھا کرسٹی کا کوئی ڈراما نشر کیا جائے۔ اگاتھا اس پر تیار ہو گئی۔ اس نے ڈرامے کو پہلے مختصر کہانی کی صورت میں لکھا۔ پھر طویل ڈرامے کی صورت دی۔ یہ ''دی ماؤس ٹریپ'' یا چوہے دان تھا۔

اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ یہ ڈراما اتنا کامیاب ثابت ہوگا۔ اس ڈرامے سے اسے جو رائلٹی حاصل ہوئی وہ اس نے اپنے نواسے کو دے دی جس سے وہ ایک امیر کبیر شخص بن گیا۔ درحقیقت اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنی آمدنی مختلف کاموں میں کھپانی شروع کر دی تھی۔ یوں جب اس نے انتقال کیا تو اس کے کل اثاثوں کی مالیت ایک لاکھ اسی ہزار ڈالر سے زیادہ نہ تھی۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ سال بھر میں صرف ایک کتاب لکھا کرتی تھی جو پبلشر کرسمس کے موقع پر شائع کیا کرتا تھا۔ اس کی تشہیر اس طرح کی جاتی تھی ''کرسمس کا تحفہ ایک اور کرسٹی'' چونکہ وہ بسیار نویس تھی۔ اس لیے اس کی آمدنی کا غالب حصہ ''ان لینڈ ریونیو'' کی طرف چلا جاتا تھا اور بقول خود اس کے ''احمقانہ منصوبوں'' پر خرچ ہوتا تھا۔

وہ فطرتاً ایک شرمیلی اور تنہائی پسند عورت تھی جو اپنے باغ سے بے حد محبت کرتی تھی۔ اسے اس کے لٹریری ایجنٹ پرانی وضع قطع کی حامل ایک شریف خاتون کہا کرتے تھے۔ وہ اپنے قاتلوں کی طرح دیہاتی وضع کے وسیع وعریض گھروں میں گھومتی پھرتی رہتی تھی۔ جہاں لوگ کھانے کے لیے اور دعوتوں پر جانے کے لیے عمدہ لباس پہنتے تھے۔ اچھے فارموں کی موت پر نوحہ کناں ہوتے تھے۔ جہاں چاندی کے برتنوں کو خوب چمکایا جاتا تھا۔ جہاں نوجوان لڑکیاں کبھی چلتی پھرتی نہ دکھائی دیتی تھیں بلکہ باغیچوں میں بڑی نفاست سے کٹی ہوئی گھاس پر سبک قدمی سے دوڑتی تھیں (قدموں کے نشانات محفوظ کرنے کے لیے)۔

اگاتھا کرسٹی کے ناولوں میں کہیں بھی فحش نگاری یا ناشائستگی نہیں دکھائی دیتی۔ نہ ہی فرائیڈین تھیوریاں کام کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ جنس صرف ایک پاکیزہ بوسے تک ہی محدود ہے۔ ''میں تشدد دانہ رویوں اور عبرت ناک قسم کی موتوں کو پسند نہیں کرتی۔'' وہ کہا کرتی تھی حالانکہ یہ بالکل واضح ہے کہ اس نے لوکریشیا بورجیا کے بعد سے کسی بھی عورت کے مقابلے میں قتل سے زیادہ منفعت حاصل کی ہے۔ ''میں پستولوں اور ریوالوروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ میں اپنے کرداروں کی موت کے لیے زہر یا کند اوزار پسند کرتی ہوں۔''

چونکہ اسے کرداروں کی باہم لڑائیاں اور خون خرابہ کبھی پسند نہ رہا تھا۔ اس لیے اس نے خوش وضع پھرتیلے مستعد کارکوتاہ قامت پرکیول پوئرو کو اپنے معاملات سلجھانے کے لیے کلی اختیارات تفویض کر دیے۔ کسی معمولی سی غلطی پر انتہائی مضطرب و متوحش ہو جانے والا، اپنے اوپر بھرپور اعتماد کرنے والا، اپنی آستین سے رومال کے ساتھ گرد جھاڑتے رہنے والا اور اپنے جملوں میں فرانسیسی الفاظ استعمال کرنے والا پوئرو غالباً شرلاک ہومز کے بعد جاسوسی ادب کا مشہور ترین کردار ہے۔

جب میڈم کرسٹی نے یہ کردار تخلیق کیا تو اس نے اس کا تعارف ایک بلجیکن سراغرساں کی حیثیت سے کرایا جو پہلی جنگِ عظیم کے بعد اپنی ملازمت سے ریٹائرڈ ہو گیا تھا۔ اس طرح 1975ء میں اس کی وفات تک اس کی عمر ایک سو بیس سال بنتی ہے۔ نیویارک ٹائمز نے اس موقع پر اس کی موت کی خبر اپنے پہلے صفحے پر بڑے نمایاں انداز میں شائع کی تھی۔

کرسٹی خود اعتراف کرتی ہے کہ پوئرو کی ہر دلعزیزی اسے بھی حیران کیا کرتی تھی۔ کیونکہ وہ موجودہ دور والا سراغرساں نہیں تھا لیکن یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ پوئرو کو یوں عالمگیر پیمانے پر کیوں پسند کیا جاتا ہے اور مس جین مارپل خاتون سراغرساں کو بھی جس کا کردار میڈم کرسٹی نے اپنی دادی کے نمونے پر تخلیق کیا تھا جو پہلی مرتبہ ''مرڈر ایٹ دی ویکارج'' میں نمودار ہوئی تھی۔ ان دونوں کی دنیا میں نیکی اور حق کی فتح ہوتی ہے اور بدی اور برائی کو شکست۔

میڈم کرسٹی کی ہر جاسوسی کہانی میں کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق پنہاں ہوتا ہے۔ تقریباً نصف صدی تک وہ اسی نکتۂ نظر سے اپنی کہانیاں تخلیق کرتی رہی۔ اس کا کہنا تھا۔ ''اپنی خوشی اور ناخوشی خود آپ پر ہی منحصر ہے۔''

جب اس نے انتقال کیا تو اس وقت تک اگاتھا کرسٹی اور جاسوسی ادب ایک دوسرے کے ہم معنی بن چکے تھے۔ دنیا کے گوشے گوشے سے اسے اخراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ اسے ایک ایسی لیجنڈ کہا گیا جو اپنے تمام ہم عصروں پر سبقت لے گئی تھی۔ اس نے قارئین کی تفریح کے لیے بے مثال اور بھرپور تخلیقات پیش کیں۔ اسے ایک اخبار نے جن الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا اسے بہترین اور جامع ترین کہنا چاہیے۔

''اس نے کتابیں لکھنے والے تمام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ پُرلطف اور بہترین کتابیں لکھیں۔'' اور اصل کارنامہ اسے ہی کہتے ہیں۔

www.paksociety.com

مردِ آہن

زویا اعجاز

دنیا بھر میں اپنی انفرادیت کی وجہ سے مشہور حکمران جس نے امریکا کو تگنی کا ناچ نچا رکھا تھا۔ اس نے امریکا کی ہر پالیسی کی مخالفت کو اپنا وتیرا بنا لیا۔ اتنے طویل عرصے تک شاید ہی کسی ملک کے صدر نے صدارتی کرسی کو اپنے قبضے میں رکھا ہو۔

ہمت و حوصلے کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور سربراہ کا قصہ

آسمان ابر آلود تھا۔

بارش کے بعد موسم بہت نکھرا سا تھا۔ ہوا میں ساحلی مٹی کی خوشبو رچی تھی۔ جزیرے میں آج عوامی تعطیل تھی۔ لوگ مختلف ٹولیوں کی صورت میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ساحل سے کچھ ہی دور چھ سے آٹھ سالہ بچے اپنی ہی دنیا میں مگن تھے۔ وہ پانچ لڑکے تھے۔

ان میں سے چار بچوں کے ظاہری حلیے سے عسرت نمایاں تھی۔ وہ شرارت اور استہزا کی ملی جلی نظروں سے اپنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From http://paksociety.com

ساتھی کو دیکھ رہے تھے جو تیوریوں پہ بل ڈالے انھیں گھور رہا تھا:

''دیوانے مت بنو۔تم زیادہ ہی شیخیاں بگھار رہے ہو اب۔'' گروہ کے ایک ساتھی نے کہا۔

''میں شیخی نہیں بگھار رہا بلکہ اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔'' اس متمول اور اکھڑ مزاج لڑکے نے کہا۔

''تو تمھارا کہنا ہے کہ تم کسی بھی چیز سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔''

''بالکل بھی نہیں۔''

''ناممکن باتیں کرر ہے ہوتم۔''

''میں اپنا دعویٰ ثابت بھی کرسکتا ہوں۔''

''رہنے دو...... رہنے دو...... امیر باپ کے بیٹے ہو ذرا سی چوٹ پہنچے تو آنسو بہنے لگتے ہیں امیروں کے اور تم کہتے ہو کہ کسی سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔'' ایک اور ساتھی نے اسے طرح دی۔

اس متمول لڑکے کی آنکھوں میں غصہ عود آیا۔

''ٹھیک ہے تو پھر ابھی لو۔''

اس نے اپنی سائیکل سنبھالی اور ایک طرف بنی دیوار کی طرف تیزی سے بڑھتا چلا گیا۔اگلے ہی پل اس نے خود کو سائیکل سمیت دیوار میں دے مارا اور دائیں جانب گر گیا۔اس کے چہرے ،سر اور ہاتھوں پر اچھی خاصی خراشیں آئی تھیں۔ماتھے سے خون بہنے لگا لیکن اسے کسی بھی چوٹ اور درد کی پروا نہیں تھی۔

لڑکھڑاتے قدموں سے وہ اٹھا اور اپنے لباس سے مٹی جھاڑ کر اپنے ساتھیوں سے بولا۔

''میں کسی بھی چیز سے نہیں ڈرتا...... یاد رکھنا یہ بات۔''

سبھی لڑکے اسے حیرت و ستائش سے دیکھ رہے تھے۔وہ تمکنت سے چلتا ہوا وہاں سے چل دیا۔

وہ بچے نہیں جانتے تھے آتش فشانی مزاج کا حامل یہ لڑکا آئندہ اس جزیرے میں تاریخی تبدیلیاں برپا کرنے والا تھا۔ملکہ الزبتھ دوئم کے بعد اسے طویل ترین حکمرانی کا اعزاز حاصل ہونا تھا۔

وقت کے نادیدہ قلم نے اس کے یہ الفاظ محفوظ کر لیے تھے۔

فیدل اپنے زخموں سے بے نیاز گھر کی جانب گامزن تھا۔

☆☆☆

'فیدل آلیجاندرو کاسترو روز' ایک مشکل اور مہم جو بچہ تھا۔۱۳ اگست 1926ء میں مشرقی کیوبا میں پیدا ہونے والے اس لڑکے کی پیدائش سے ایک المیہ وابستہ تھا۔وہ کیوبا کے ایک متمول اور بااثر فرد 'انجیل کاسترو' اور اس کی بیوی کی ذاتی خادمہ 'لینا روز' کا بیٹا تھا۔

انجیل کا تعلق اسپین سے تھا۔کیوبا منتقلی کے بعد اس نے گنے کی تجارت کاری سے کاروبار میں اپنے قدم جما لیے تھے۔گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔اخلاقی برائیاں تو معاشی حیثیت کی فخریہ علامت تھیں۔وہ اسپین سے جب یہاں آیا تو بالکل قلاش تھا لیکن قسمت نے ایسی یاوری کی کہ کاروبار خوب پروان چڑھا۔امریکی تجارتی کمپنی 'یونائیٹڈ فروٹ' کے ساتھ روابط سے ترقی کے زینے چڑھتا گیا۔کیوبا کی زراعت پر اس وقت یہی کمپنی حاوی تھی۔

فیدل نے لڑکپن ہی سے گھر میں بہت خوشحالی دیکھی تھی۔انجیل نے کچھ عرصہ بعد پہلی 'ماریہ لوئیسا آرگوتا' سے علیحدگی اختیار کر لی۔'لینا روز' کو اس کا جائز اور قانونی مقام مل گیا۔

فیدل کاسترو کی اکھڑ مزاجی اور ضدی طبیعت کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہ تھی۔پڑھائی سے اسے کوئی رغبت نہ تھی،ہاں البتہ کھیل کود اور مشکل اہداف سر کرنے میں خوب دل لگتا تھا۔چھ سال کی عمر میں اسے 'سنتیاگو ڈی کیوبا' میں ایک معلم کے پاس بھیج دیا گیا۔اس وقت وہ رومن کیتھولک چرچ سے بپتسمہ حاصل کرنے کا مجاز نہیں تھا۔

وہ آٹھ سال کا ہوا تو بپتسمہ ملتے ہی 'سنتیاگو' کے La Salle Boarding اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔اساتذہ اور ساتھی طلبہ سے اس کا رویہ بہت نازیبا تھا۔رگوں میں پارے کی طرح مچلنے والا خون ہمہ وقت بے قراری میں مبتلا رکھتا۔انجیل نے اسے ایک نجی ادارے Jesuit run Dolores School بھیجنے میں ہی عافیت سمجھی۔لینا کے لیے نصف درجن مزید بچوں کے ساتھ فیدل کی سرکشی اور ہٹ دھرمی پر قابو پانا بہت مشکل تھا۔

اسکول میں بھی اس کی افتادِ طبع سے کوئی محفوظ نہ رہتا۔ہر وقت ادھم مچائے رکھتا۔اڑیل اور شدت پسند فیدل نے سب کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔لیکن ایک بات تو طے تھی کہ مشکل وقت میں کبھی کسی کا ساتھ نہ چھوڑتا۔

اس کی جماعت پیدل سیر کے لیے پادری کے ساتھ ایک پہاڑی پر گئی۔پادری کا پاؤں پھسلا اور وہ اپنا توازن

Downloaded From http://paksociety.com

برقرار نہ رکھ سکا۔ تیز روندی میں گرتے ہی اس کے حواس باختہ ہو گئے۔ طلبہ کو اس کی موت یقینی نظر آ رہی تھی۔ فیدل کے سوا ندی میں کودنے کی ہمت کسی میں بھی نہ تھی۔ وہ کسی بھی طرح اسے کھینچ کر کنارے پر لے آیا۔ دونوں نے وہیں گھٹنوں کے بل جھک کر اپنی اس خوش قسمتی کے لیے خصوصی شکرانہ ادا کیا۔

فیدل کاسترو کو اس وقت یہ علم ہی نہ تھا کہ وہ خوش قسمی میں اپنی مثال آپ ہے۔ اور یہ عنصر تاعمر اسے اپنی چھایا میں رکھنے والا تھا۔

☆☆☆

عمر کی نقدی خرچ ہونے لگی تو اس کے مزاج میں صرف ایک ہی تبدیلی نظر آئی۔ اسے تاریخ اور جغرافیہ کے مضمون میں کافی دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ کھیل کود اور غیر نصابی سرگرمیوں میں سابقہ روش ہی برقرار تھی۔

نصابی نتائج میں اس نے کبھی کوئی خاطر خواہ اور قابلِ ذکر کارکردگی نہ دکھائی لیکن اس کی مستقل مزاجی اور اپنے اہداف کے لیے لگن وخلوص میں کوئی بھی دورائے نہ تھی۔

1945 میں فیدل نے 'ہوانا یونیورسٹی' کے شعبہ قانون میں داخلہ لے لیا۔ اسے اپنی 'سیاسی ناخواندگی' کا بخوبی علم تھا اس لیے 'طلبہ سیاست' میں سرگرم رکن بن گیا۔ یونیورسٹی میں سیاست کا بازار خوب گرم تھا۔ سامراجیت سے اسے شدید خار تھی تو کیوبا سمیت کئی کیریبین جزائر میں امریکی مداخلت بھی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔

کیوبا کے وجود سے جونک کی طرح چمٹی سامراجیت اسے بہت طیش دلاتی۔

1492 میں کرسٹوفر کولمبس کی دریافت یہ جزیرہ انیسویں صدی کے اختتام تک اسپین کے زیر اثر رہا۔ دنیا کا سترھواں بڑا جزیرہ اگلے کچھ سالوں میں امریکی تسلط سے بھی آزاد ہو گیا تھا لیکن اس کے حکمران اب بھی انھی کی جنبش ابرو اور احکام بجالاتے۔ فیدل ان سب حالات سے بہت نالاں تھا۔ لیکن ابھی صبر کے کڑوے گھونٹ پینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اس کی سیمابی روح کو کتابوں میں قید کر دیا گیا تھا لیکن وہ خطروں کا کھلاڑی تھا۔ اپنے لیے ایک دشوار گزار راہ منتخب کر چکا تھا۔

یونیورسٹی طلبہ کی فیڈریشن کے لیے اس نے انتخابات میں حصہ لیا۔ ''ایمانداری، شرافت، انصاف'' اس کی انتخابی مہم کا ستون تھے۔ لیکن اس عہدے کے لیے اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ناکامی نے اس کے حوصلے مسمار نہ ہونے دیئے۔ قوت پرواز مزید مہمیز ہونے لگی۔

ملکی سیاست میں بھی بدعملی اور انتشار کی کیفیت تھی۔ صدر ''ریمن'' کا اقتدار اور متنازعہ اعمال اس کے لیے بالکل بھی تسلی بخش صورتِ حال نہ تھی۔ حکمرانوں کی امریکا نواز حکمت عملیاں اور ملکی وسائل ومسائل سے چشم پوشی فیدل جیسے ہزاروں نوجوانوں کے لیے طیش اور غضب کا باعث تھے۔ ان کی کوتاہ بینی اور بلاجواز تشدد بھی اس کے ذہن میں کسی آتش فشاں کی مانند سلگتا رہتا۔

نومبر ۱۹۴۶ میں فیدل کاسترو نے طلبہ اور دیگر ساتھیوں کے عوامی اجتماع کے سامنے اس حساس موضوع پر ایک شعلہ بیاں خطاب کیا۔ اگلے روز کئی اخبارات کے مرکزی صفحات پر اسی کا تذکرہ تھا۔ کیوبائی طلبہ سیاست کے جنگل میں ایک شیر کی آمد ہوئی تھی۔ اس کی گرج سے رن کانپ رہا تھا۔

سیاست کا سودا فیدل کے ذہن میں سما چکا تھا۔ اس رستے سے واپسی اب اس کے لیے ممکن نہ تھی۔ منزل سے ابھی وہ لاعلم تھا لیکن مسافت کی پُرپیچ راہیں اس کی میلان طبع کے عین مطابق تھیں۔ اس نے آگے بڑھنے کا اٹل فیصلہ کر لیا تھا۔

۱۹۴۷ میں اس نے کیوبا کی ایک عوامی تنظیم میں شمولیت اختیار کر لی۔ Orthodox Party بائیں دھڑے کی ایک مقبول جماعت تھی۔ Eduardo Chibas نے حکومتی نااہلی کے انتہائی ردِعمل کے طور پر اس تنظیم کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کی کرشماتی شخصیت کیوبا کی نسلِ نو کو اپنے سحر میں لینے لگی۔ مثبت قومی شناخت، معاشی خودمختاری اور سماجی اصلاحات کے نفاذ کا خواب آنکھوں میں بسائے وہ بہت دیانت داری سے اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔

۱۹۴۸ کے عام انتخابات میں چباس تیسرے درجے تک ہی پہنچ پایا۔ کاسترو اسی لگن سے اس کا ہمدم رہا۔ سیاسی افق پر چھائے سحاب کسی ہولناک طوفان کی آمد کی خبر دے رہے تھے۔ ملکی صدر نے مقامی بدمعاش تنظیموں کے چنیدہ افراد کو پولیس میں بھرتی کرنے کا آغاز کر دیا۔ باشعور حلقوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔

☆☆☆

ایک طویل میز کے گرد کچھ کرسیاں موجود تھیں۔ کاسترو اور تنظیم کے سرکردہ افراد اپنی نشستیں سنبھالے بیٹھے تھے۔ ان کے مابین گہری خاموشی کی فضا قائم تھی۔

''ہمیں اچانک کیوں بلوایا ہے کاسترو؟'' ایک ساتھی

Downloaded From http://paksociety.com

نے استفسار کیا۔

''کچھ دکھانا چاہتا تھا میں آپ سب کو؟''اس نے پُرسکون انداز میں کچھ کاغذات ان کے سامنے رکھ دیے۔

''کیا ہے یہ سب؟''وہ الجھن میں تھے۔

''صدر کے پروردہ نئے افسران کی جانب سے 'محبت نامے' ہیں۔ مجھے یونیورسٹی کے تنظیمی معاملات سے کنارہ کشی کرنے کے لیے بضد ہیں۔ بصورت دیگر مجھے ہلاک بھی کیا جا سکتا ہے۔''وہ اطمینان سے بولا۔

''اوہ! یہ تو بہت تشویشناک صورتِ حال ہے۔''

''قطعاً نہیں ہے۔ یہ افسران خوف کی تجارت کرتے ہیں اور یہ لاعلم ہیں کہ فیدل کاسترو کسی سے نہیں ڈرتا......آپ سب کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے ساتھ ہتھیار رکھوں گا۔ میرے اردگرد موجود دیگر ساتھی بھی نہتے نہ ہوں، میں اپنے مسلح دشمنوں کے سامنے غیر مسلح رہنے کو صریح خودکشی تصور کرتا ہوں۔''

سبھی اس سے متفق تھے۔

''کوئی خصوصی حکمت عملی سوچ رکھی ہے کیا؟''ایک ساتھی متجسس ہوا۔

''بالکل سوچ رکھی ہے۔''وہ کبھی کسی کو اپنے دلی بھید نہیں دیتا تھا۔''مناسب وقت کا انتظار کیجیے بس۔''

جون ۱۹۴۷ میں فوجی افسران نے دائیں بازو سے منسلک فوجی افسر 'رافیل تروجیلو' کی سبکدوشی کے لیے ایک مہم کا منصوبہ بنالیا تھا۔ رافیل 'ڈومینیکن ری پبلکن' (کیوبا کے بعد کیریبین میں دوسرا بڑا جزیرہ) میں امریکی اتحادی تھا۔ یونیورسٹی کی سیاسی تنظیم سے منسلک ہونے کے باعث وہ اس مہم میں عملی سرگرمی کے لیے بہت پُرجوش تھا۔

مقامی افراد کے علاوہ ری پبلکن سے جلاوطن افراد نے بھی اس مہم میں شمولیت اختیار کر لی۔ آن کی آن میں 1200 کی افرادی قوت پر مشتمل دستہ تیار تھا۔ انھیں کیوبا سے بحری سفر کے ذریعے منزل تک پہنچنا تھا۔ لیکن جولائی 1947 میں امریکی دباؤ کے تحت حکومت نے ان کی روانگی میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ کاسترو اور اس کے کئی ساتھی یقینی گرفتاری سے بچ نکلے۔

حکومتی ناانصافیوں کے ساتھ اس کا طیش اور احتجاج دگنے تناسب سے بڑھ رہا تھا۔ ہائی اسکول کے ایک طالبعلم کی سرکاری محافظوں کے ہاتھوں ہلاکت میں اس نے شدید غم و غصے سے مظاہروں میں شرکت کی۔ طاقت کے نشے میں بد مست سرکاری اہلکاروں نے اسے خوب مارا پیٹا لیکن وہ جانتے ہی کہاں تھے کہ جسمانی درد و تکلیف فیدل کاسترو کی قوت ارادی اور جوش کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

فیدل کاسترو جہاں بھی قدم نشین ہوتا ،نت نئے ہنگامے بیدار ہو جاتے۔ اپریل 1948 میں ارجنٹائن کے صدر 'پیرن' کے تعاون سے وہ مقامی طلبہ کے ایک گروہ کے ہمراہ کولمبیا روانہ ہوا اور وہاں بائیں بازو کے ایک مقبول رہنما ایالا کے قتل کے بعد قدامت پسند حکومت،فوج اور حریت پسندوں میں شدید فسادات اور تصادم برپا ہوگیا۔

اس نے پولیس اسٹیشن سے ایک بندوق چرائی اور حریت پسندوں کے گروہ میں شامل ہوگیا۔ یہ لمحہ اس کی زندگی میں ایک اہم ترین موڑ تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے ہزارہا افراد

احتجاج کی ایک تیز رو لہر میں بہہ رہے تھے۔ عوام کی یہ قوت اور جذبہ اسے خودشناسی عطا کر گیا۔ ذہن کے دریچوں پر ایک نوخیز خیال دستک دینے لگا۔

☆☆☆

کیوبا واپسی کے بعد اس کی روح میں ایک نیا اضطراب کروٹ لینے لگا۔ اس کے احتجاجی مظاہروں میں مزید شدت پیدا ہوگئی۔ حکومت کی جانب سے ذرائع نقل و حمل کے کرایہ جات میں اضافہ ایک ناقابلِ قبول امر تھا۔ وہ اپنی پوری قوت سے اس ناانصافی کے سامنے ڈٹ گیا۔ فیدل کے لیے کوئی بھی ناہمواری ناقابلِ برداشت ہوتی۔ نتائج کی پروا کیے بغیر وہ فرعون وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے سے بھی گریز نہ کرتا۔

کیوبا کے سیاسی حلقوں میں اس کا نام خوف، تناؤ اور بے چینی کا سبب بننے لگا۔ اس کی بے خوف فطرت بداعمال سیاستدانوں کے لیے ڈراؤنا خواب بن گئی جبکہ دوسری طرف وہ ایک انوکھی اور گداز کیفیت سے سرشار ہو رہا تھا۔

اس کی انقلابی اور بھاگ دوڑ والی اس زندگی میں محبت نے شب خون مار دیا تھا۔

ایک نازک اور حسین پیکر اس کے فولادی دل میں بلا اجازت سما گیا تھا۔ 'مارٹا ڈیاز بالارٹ' ہوانا یونیورسٹی میں شعبہ فلسفہ کی طالبہ تھی۔ وہ 'رافیل ڈیاز بالارٹ' کی بیٹی تھی۔ رافیل اس وقت کیوبا کا ایک نمایاں سیاستدان اور Banes نامی قصبے کا میئر تھا۔

اس شادی کے لیے دونوں خاندان کے بزرگ ہی

Downloaded From http://paksociety.com

راضی نہ تھے۔لیکن ان کی محبت اور ضد کے سامنے انھیں گھٹنے ٹیکنے پڑے۔کاسترو کی ہٹ دھرمی تو ویسے بھی مسلمہ تھی۔انھیں شادی کی اجازت دیتے ہی بنی۔

محبت جیت گئی، تجربہ اور خدشات ہار گئے۔وہ دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔شادی کے بعد رافیل نے انھیں اپنے ذاتی خرچ پر سہ ماہی ہنی مون کے لیے میامی روانہ کر دیا۔کاسترو کی سنگین زندگی میں رنگینی نے بھی قدم جما لیے تھے۔

شادی کے بعد زندگی میں تبدیلی ایک آفاقی سچائی ہے۔فیدل کاسترو کے ساتھ بھی یہی ہوا۔وہ اشرافیہ طبقے سے متعارف ہوا۔کچھ سیاسی پرتیں مزید آشکار ہونے لگیں۔ذہنی افق کی وسعت اب مزید بڑھ رہی تھی۔

اسی سال صدر ریمن نے دوبارہ ہونے والے انتخابات میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کرلیا۔نتیجتاً ایک نئے امیدوار ’کارلوس‘ نے میدان مار لیا۔یہ فتح اپنے جلو میں بے شمار ہنگامے سمیٹ لائی۔’آتھینٹک پارٹی‘ کا یہ امیدوار اس وقت اصل مشکل میں گرفتار ہوا جب ماضی میں بدمعاش تنظیموں کے پولیس میں بھرتی افراد نے کاسترو کے ایک اشتراکی دوست ’جسٹو فیونٹس‘ کا قتل کر دیا گیا۔ملک کے طول و عرض میں احتجاجی مظاہروں کا ایک نہ تھمنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ریمن ان گروہوں کو کچلنے کے لیے رضا مند تو تھا لیکن ان کی طاقت اور وسائل کے سامنے بے بس تھا۔کاسترو کے نظریات میں مزید تغیر رونما ہونے لگا۔یہی وہ وقت تھا جب وہ ’کارل مارکس‘ اور ’ولادی میر لینن‘ کے افکار و نظریات سے بے حد متاثر ہو رہا تھا۔اسے کیوبا کے ان تمام تر مسائل کی وجہ سمجھ آ چکی تھی۔اس کا وطن بد اعمال سیاستدانوں کی ناکامیوں سے نہیں بلکہ آمرانہ سوچ اور سرمایہ دارانہ نظام کے باعث ان حالات کا شکار تھا۔

کیوبا کے ملی امراض سے واقفیت کے بعد اس نے ان کا علاج بھی تشخیص کر لیا تھا۔اس ملک میں بامعنی سیاسی تبدیلیوں کے لیے ’انقلاب‘ درکار تھا۔متوسط اور نچلے طبقے کی سوچ و فکر میں انقلاب۔وہ ہوانا کے غریب ترین ہمسایہ صوبوں کے دورے کرنے لگا۔طلبہ کے ساتھ نسل پرستی کے خلاف مہمات میں وہ سرگرم ترین رکن بن گیا۔مارکس اور لینن کے نظریات نے اسے معاشرے کی اصل ہیئت سے آگاہ کیا۔اب تک کی زندگی تو بصیرت کی کوئی کوتاہی تھی۔اپنی ذات جنگل کی تاریکی میں گھرے ایسے شخص کی مانند محسوس

ہونے لگی جسے شمال اور جنوب کی اطراف تک نظر نہ آ رہی ہوں۔تلخ ترین حقائق کی اس یلغار نے اسے ایک اور آفاقی نقطہ سمجھایا تھا۔معاشرے کو ’طبقاتی کشمکش‘ کے سپرد کرنے اور غریب طبقے کے استحصال سے زندگیوں میں تاریکی، جہالت اور لاعلمی کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

سیاسی تبدیلی کے خواب دیکھتے اس کی نجی زندگی میں ایک خوشگوار ترین تبدیلی آ گئی۔ستمبر 1949 میں مائرٹا نے ایک بچے کو جنم دیا۔’فیدلتو‘ کی پیدائش کے بعد یہ جوڑا قدرے بڑے فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔اولاد کی محبت فطری طور پر انسانی ارادوں اور حوصلوں کو کمزور کر دیتی ہے لیکن فیدل کاسترو نے اس مقام پر بھی کوئی خوف و کمزوری خود پر غالب نہ ہونے دی۔وہ ’خطروں کا کھلاڑی‘ تھا۔اور خطرات سے کھیلنا فیدلتو کی ولادت کے بعد بھی بلاتعطل جاری تھا۔

کاسترو نے September 30 Movement میں شمولیت اختیار کر کے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع تر کر دیا۔اس تحریک میں مقامی افراد کے علاوہ اشتراک پسند بھی موجود تھے۔تنظیم کا بنیادی مقصد یونیورسٹی میں جرائم پیشہ گروہوں کی مداخلت کا سدباب تھا۔کارلوس ان گروہوں کا قلعہ قمع کرنے میں تاحال ناکام تھا۔اس کا وعدہ تو ایفا نہ ہوا، عزائم میں مزید سنگینی نظر آنے لگی۔وہ ان جرائم پیشہ افراد کو سرکاری وزارتیں نوازنے کے کئی ایک منصوبے مرتب کیے بیٹھا تھا۔اس صورتِ حال میں کاسترو نے اپنی تنظیم کی جانب سے رضا کارانہ تقریر کی حامی بھر لی۔13 نومبر کو منعقدہ اس تقریر میں حکومتی خفیہ عزائم، ملازمتوں کے لیے منتخب کردہ گینگسٹرز کے نام بھی طشت ازبام ہونے تھے۔

اس کی شعلہ فشانی نے ایک طرف قومی پریس کی توجہ اپنی جانب مبذول کی تو دوسری جانب ’متاثرہ افراد‘ کا طیش و غضب اس کی ذات بھسم کر دینا چاہتا تھا۔اسے منظرِ عام سے غائب ہوتے ہی بنی۔کچھ وقت مضافاتی علاقوں میں روپوشی کے بعد وہ امریکا چلا گیا۔

اس خطرہ سے نمٹتے ہفتوں بیت گئے۔پڑھائی پر توجہ نہ ہونے کے برابر تھی تاہم کسی نہ کسی طرح وہ ستمبر ۱۹۵۰ میں ’ڈاکٹر آف لاء‘ کی ڈگری کے حصول میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔

☆☆☆

پڑھائی مکمل ہوتے ہی اس کی اڑان میں مزید نکھار آ گیا۔خواب نگری تک رسائی کے لیے کچھ عملی اقدامات اٹھانے کا وقت آ گیا تھا۔اس نے بطور شریک بانی ایک قانونی

Downloaded From http://paksociety.com

شراکت داری کی بنیاد رکھی جس کا مقصد غریب مقامی افراد کی بنیادی ضروریات کی شافی تکمیل تھا۔

یہ منصوبہ تو یقیناً بہت شاندار تھا لیکن ناتجربہ کاری نے اسے ناکام کر دیا۔ ذاتی روزگار کی کوئی مستقل صورت نہ تھی۔ مادی اشیاء اور رقم کی بھی اتنی فکر نہ تھی۔ ان سب عوامل کا نتیجہ وہی برآمد ہوا، جو ایسی صورتِ حال میں متوقع تھا۔ بلز کی عدم ادائیگی کے بعد اس کا فرنیچر واپس لے لیا گیا، بجلی منقطع کر دی گئی۔ لینا کے لیے اپنی گرہستی میں انتشار کی یہ صورت بہت رنج کا باعث تھی۔ شادی کے اوّلین دنوں کی محبت کا خمار اب حقائق کے آسیب تلے کہیں دب کر رہ گیا تھا۔

اس ناکامی کے بعد وہ کیوبا کے جنوبی ساحلی علاقوں میں ہونے والے احتجاجی مظاہروں میں شریک ہو گیا۔ وزارتِ تعلیم کی جانب سے طلبہ کی سیاسی تنظیموں پر قدغن عائد کر دی گئی تھی۔ زمانہ طالب علمی میں ان تحریکوں میں شمولیت کے بعد اسے مستقبل کی نوجوان نسل کے لیے یہ پابندی قطعی منظور نہ تھی لیکن اس بار حکومتی اہلکار اس کے پیچھے تھے۔ وہ اس بار اسے کوئی بھی رعایت نہ دینا چاہتے تھے۔ ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کی پاداش میں اسے گرفتار کر لیا گیا۔ شومئی قسمت مجسٹریٹ کو ان الزامات میں کوئی دم نظر نہ آیا اور اسے رہا کر دیا گیا۔

کاسترو کی تمام تر امیدوں کا مرکز اب بھی 'چباس' اور Patrido Ortodoxo تھے۔ ان امیدوں کا شیرازہ اس وقت بکھرا جب 1951 میں چباس ایک ریڈیو پروگرام کے دوران خود کو گولی مار کر ایک دردناک موت سے بغلگیر ہو گیا۔

اس کی موت کے بعد فیدل کاسترو ہی اس کا حقیقی جانشین تھا۔ وہ اگلے برس جون میں ہونے والے انتخابات میں حصہ لینا چاہتا تھا۔ لیکن تنظیم کے دیگر سرکردہ افراد اس کے آتشیں مزاج سے بہت خائف رہتے تھے۔ انہوں نے اس کی نامزدگی مسترد کرتے ہوئے اسے ہوانا کے نچلے طبقے کے علاقوں میں House Of Representatives کی نمائندگی نواز دی۔ کاسترو نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کر دیا۔ پارٹی کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اس مرتبہ وہ اپنی کامیابی کے لیے بہت پُرامید تھے۔

اسی دوران فیدل کی ملاقات 'جنرل فلگینسیو باچستا' سے ہوئی۔ وہ سابق صدر بھی تھا اور اس بار 'وحدانی نظام حکومت' کا لائحہ عمل لیے ایک بار پھر میدان میں کود پڑا تھا۔ وہ دونوں ہی کارلوس کی حکومت کے خلاف تھے۔ اس مشترکہ قدر کے باوجود ان کی ہر ملاقات محض رسمی گفتگو کے دائرے میں مقید رہتی۔ کاسترو اس شخص سے کبھی بھی 'مطمئن' نہیں ہو پایا تھا۔ اس کی چھٹی حس جنرل کی بابت کچھ غیر واضح اشارے دیا کرتی جو بالآخر ایک بدترین حقیقت کا روپ دھار گئے۔

مارچ 1952 میں فوجی دستوں کی قیادت میں جنرل نے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ کارلوس میکسیکو فرار ہو گیا اور جنرل باچستا نے متوقع صدارتی انتخابات منسوخ کرتے ہوئے ملکی صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ نظام حکومت پر اس شب خون کو اس نے 'جمہوریت' کا ایک نیا آغاز قرار دے دیا لیکن سبھی جانتے تھے کہ کیوبا پر 'آمرانہ نظام' مسلط ہو گیا ہے۔

جنرل کا ذہنی رجحان دائیں بازو کی طرف واضح تھا۔ ملک کے اشرافیہ اور امریکی حکومت سے بڑھتے روابط و ضوابط اس کی بدنیتی بھی بخوبی ظاہر کر رہے تھے۔ سوویت یونین کے ساتھ تعلقات منقطع ہونے لگے، تجارتی یونینز پر جبر میں اضافہ ہوا اور 'مقامی اشتراک پسندوں' پر زندگی مشکل سے مشکل تر ہوتی چلی گئی۔

کاسترو نے اس پر کئی جائز اور قانونی دعوے دائر کیے جن کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ اس دورِ حکومت کے خاتمہ کے لیے اب وہ سنجیدگی سے کئی ایک متبادل منصوبوں پر غور و خوض کرنے لگا تھا۔

ایک نئے طوفان کی آمد آمد تھی۔

☆☆☆

حالات و واقعات پر بھرپور غور و فکر کے بعد اس نے ایک نیا گروہ۔ The Movement تشکیل دیا اور فوری طور پر اس میں Clandestine Cell System لاگو کر دیا۔

اس خفیہ طریقۂ کار میں مزاحمت کاروں اور حریت پسندوں کو مخصوص انداز میں تربیت دی جاتی ہے۔ انہیں چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور ہر گروہ اپنے ساتھیوں کے سوا کسی دوسرے گروہی ساتھی سے واقف نہیں ہوتا۔ اس لیے کسی بھی گرفتاری کی صورت میں دیگر افراد اور اعلیٰ عہدیداران خطرات سے مکمل محفوظ رہتے ہیں۔

کاسترو نے چند دیگر سہولت کاروں کی مدد سے زیر زمین اخبار کی اشاعت ممکن بنائی۔ El Acusador(The Accuser) نامی یہ اخبار حکومتی اراکین کے لیے اچھا خاصا ذہنی تناؤ تھا۔ جنرل کے خلاف مزید محاذ آرائی کے لیے نئے بھرتی شدہ افراد کی خصوصی تربیت

Downloaded From http://paksociety.com

بھی جاری تھی۔

انقلاب کی تپش اس کے دل و دماغ کو سلگا رہی تھی۔

اس نے ہوانا کے قرب و جوار میں میلوں سفر کے بعد 1200 افراد منتخب کیے۔ ان سبھی افراد میں صرف ایک ہی قدر مشترک تھی غربت، انتہائی غربت۔ وہ ہوانا کی ٹوٹی پھوٹی گلیوں میں حشرات الارض کی مانند زندگیاں بسر کرتے تھے۔ کاسترو ان کی اس حالتِ زار کے ذمہ داران کو مزید تقویت دینے والے جنرل باچستا کے خلاف ان لوگوں کی نفرت اور طاقت استعمال کرنا چاہتا تھا۔

اس اہم ترین موڑ پر کاسترو ہوش کا دامن سنبھالے ہوئے تھا۔ اشتراکی نظریات کا حامی ہونے کے باوجود وہ کسی بھی اشتراکی تنظیم سے الحاق سے تاحال گریز پا تھا۔ البتہ ان تنظیموں کے سرکردہ افراد سے اس کے روابط میں ماضی کی نسبت اضافہ ہی ہوا تھا۔ انھی افراد میں راول کاسترو بھی شامل تھا...... فیدل کاسترو کا چھوٹا بھائی۔ جسے مستقبل قریب میں فیدل کے ساتھ کیوبا کی تاریخ کا دھارا ہی بدل دینا تھا۔

اسلحہ جمع ہوتے ہی اس نے 'مونکادا بیراکوں' پر حملہ کے لیے کمر کس لی۔ اس کی مختصر سپاہ نچلے اور مزدور طبقہ پر مشتمل تھی۔ اس سپاہ میں صرف چار افراد یونیورسٹی گریجویٹس تھے، دیگر کی تعلیم رسمی تھی۔ لگ بھگ 137 باغیوں کی عمر چھبیس سال تھی۔ 9 ارکان نوعمر تھے۔ 96 افراد بیس کی دہائی میں تھے۔ 27 نے تیس جبکہ پانچ افراد نے زندگی کی چالیس بہاریں ہی دیکھی تھیں۔

ان سبھی حریت پسندوں کو ہوانا یونیورسٹی میں اسلحہ چلانے کی تربیت دی جاتی۔ حکومتی عتاب سے بچنے کے لیے انھوں نے ایسے کاروباری افراد کا روپ دھار رکھا تھا جو پرندوں کے شکار کے لیے نشانہ سازی کی مشقیں کرتے رہتے۔ ان کے پاس شاٹ گنز، ہینڈ گنز، رائفلز اور سب مشین گنز تھیں۔

اسلحہ کے بعد اگلے مرحلے میں انھیں فوجی وردیاں درکار تھیں۔ کاسترو نے تنظیم کے ایک رہنما پیدرو سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا اور کافی سوچ بچار اور منصوبہ سازی کے بعد ملٹری اسپتال کی لانڈری سے اضافی وردیاں چرالی گئیں۔

سرفروشوں کا یہ قافلہ ایک خطرناک داؤ کھیلنے کے لیے تیار تھا۔

☆☆☆

تاریک آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے۔ فضا میں خاموشی غالب تھی۔ سیبونے گاؤں کے اس فارم ہاؤس میں نیلگوں وردیاں پہنے ان سینکڑوں افراد کی پرتپش آنکھیں اپنے سامنے موجود اس بے خوف انسان پر جمی تھیں، جو اس تناؤ زدہ صورتِ حال میں بھی اپنے حواس پر قابو پائے ہوئے تھا۔ وہ اس لمحہ اپنے اندر کیوبا کے تاریخی ہیرو 'جوس مارٹی' کی روح حلول ہوتے محسوس کرنے لگا۔ مارٹی نے بھی انیسویں صدی میں اسپین کی فوجی بیرکوں پر حملہ کیا تھا۔

پچیس جولائی کی اس رات نے ابھی نصف سفر بھی طے نہیں کیا تھا۔ کاسترو بیرکوں پر حملے کے لیے ساتھیوں کو اپنے منصوبہ سے حتمی آگاہی دینے لگا۔

''بیرکوں میں جہاں بھی، جیسا بھی اسلحہ نظر آئے، اس پر قابض ہو جانا میرے جوانو!! عمارت میں موجود مواصلاتی آلات سے ہم فوج کو گمراہ کن پیغامات بھیجیں گے۔ اس مہم سے واپسی کے بعد اسلحہ سارے شہر میں چھپایا جائے گا۔ مستقبل میں ہمیں یقینی طور پر اس کی بہت ضرورت پیش آئے گی۔ سنتیاگو ریڈیو اسٹیشن پر غالب ہو کر عوام کو حکومت کے خلاف سڑکوں پر لے آئیں گے۔ لیکن بلا ضرورت خون خرابے سے گریز کرنا بس منزل اب دور نہیں، اپنے حوصلے توانا رکھو۔ اگلے چند گھنٹے ہماری قسمت کا فیصلہ کر دیں گے، ہم فاتح قرار پائیں گے یا پھر مفتوح۔ ناکامی کی صورت میں ہم اپنے کیوبائی بھائیوں کے لیے محض شرمندگی کی ایک علامت بن کر رہ جائیں گے اور اگر کامیابی مقدر ٹھہری تو آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ بن جائیں گے۔ ہماری کامیابی ان کے دلوں میں اپنے ملک کے لیے جان قربان کر دینے کا حوصلہ پیدا کرے گی۔ مارٹی کی ادھوری تمنائیں تکمیل پا لیں گی۔''

چھبیس جولائی کی صبح پونے پانچ بجے یہ قافلہ اس فارم ہاؤس سے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

اس کال کوٹھری میں تاریکی اور سیلن کے سوا اگر کوئی تیسری چیز موجود تھی تو وہ کراہتی آوازیں تھیں۔ زخموں سے چور چند کٹے پھٹے وجود وہاں اپنی یقینی موت کے منتظر تھے۔ اسی پل دائیں جانب سے ایک سرسراتی آواز ابھری۔

''یقین ہی نہیں آتا...... سب کچھ ختم ہو گیا...... ہم تباہ ہو گئے۔''

''ہم تباہ ہوئے ہیں نہ ہی سب ختم ہوا ہے، یہ محض عارضی جمود ہے اور جب تک میرے جسم میں ایک بھی سانس باقی ہے میں شکست تسلیم نہیں کروں گا، کبھی بھی نہیں۔'' یہ

Downloaded From http://paksociety.com

مضبوط آواز اور چٹانی لہجہ بلاشبہ فیدل کاسترو ہی کا تھا۔
وہ کھردری، سرد دیوار کے پاس تنے ہوئے جسم کے ساتھ بیٹھا تھا۔ کچھ دن پہلے کے مناظر پردہ تصور پر ایک بار پھر لہرانے لگے۔
اس روز وہ قافلہ سولہ گاڑیوں پر سبونے سے روانہ ہوا تھا۔ حکومتی اراکین کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے انھوں نے مغربی کیوبا سے آئے اعلیٰ افسران کا روپ دھار رکھا تھا۔ طے شدہ حکمت عملی کے مطابق 'سانتا مریا' نے بیس افراد کے ساتھ بیرکوں کے عقب میں واقع ایک سویلین اسپتال پر قبضہ کرنا تھا۔ پانچ افراد 'لیسٹر' کی نگرانی میں Audencia Building پر حملہ کرتے۔
تیسرے گروہ کے 90 افراد کی کمان کاسترو کے ہاتھ میں تھی۔ انھیں بیرکوں اور ریڈیو نشریات پر قابض ہونا تھا۔
لیکن.......
سب کچھ بکھر سا گیا۔
گاڑیوں کے قافلے کی ترتیب خراب ہوئی اور وہ سب سے اہم 'اسلحہ بردار' گاڑی منزل کا نشان کھو بیٹھی۔ اسلحہ کی عدم موجودگی کے باعث کئی اہم افراد بھی اس قافلے سے پیچھے رہ گئے۔ کاسترو اپنی گاڑی چلاتا ہوا بیرکوں کے مرکزی دروازہ کے پاس پہنچ گیا تھا لیکن سامنے قطار بنائے فوجیوں کی موجودگی کی وجہ سے اسے وہیں رکنا پڑا۔ فوجی قرب و جوار میں غیر معمولی نقل و حمل سے غالباً چوکنے ہوگئے تھے اس لیے وہ ان کے رستہ میں رکاوٹ بنے کھڑے تھے۔
کاسترو کی گاڑی رکتے ہی اس کے پیچھے آنے والی گاڑیاں بھی رک گئیں جن کے سوار بیرکوں میں پہنچنے کا گمان لیے فوری طور پر اپنے ہتھیار تھامے باہر نکل آئے۔
اب کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی تھی۔ اندرونی عمارت میں کرخت اور تیز الارم بجا دیے گئے۔ اپنی 'مہلک غلطی' کا خمیازہ انھوں نے بہت جلد بھگت لیا۔ کاسترو کو انھیں متنبہ کرنے کا موقع بھی نہ مل سکا اور اس کے چار ساتھی فوجیوں کی فائرنگ کا نشانہ بن گئے۔
اسی دوران 18 باغی سویلین اسپتال پر قبضہ میں کامیاب ہوگئے لیکن مکمل ہتھیاروں سے لیس بھرے ہوئے فوجی ان پر آندھی اور طوفان کی طرح ٹوٹ پڑے اور دو گھنٹوں میں باغی افراد کے گرد گھیرا تنگ کر دیا گیا۔ تشدد اور گرفتاری کے بعد انھیں کسی بھی مقدمہ کی سماعت کا حق دیے بغیر پھانسی دے دی گئی۔

سرکاری فوج پورے گیریزن میں موت بانٹتی پھر رہی تھی۔ اگلے تین دن میں چونتیس فرار شدہ باغی بھی ڈھونڈ نکالے گئے۔ حملہ میں شرکت کے اعتراف کے بعد انھیں قتل کر دیا گیا۔ کاسترو سمیت کئی سرکردہ افراد نزدیکی دیہاتی علاقوں میں روپوش ہوگئے تھے۔ لیکن بالآخر انھیں جلد ہی تلاش کر کے گرفتار کرلیا گیا۔
اس کال کوٹھری میں بیٹھے کاسترو کی آنکھیں اپنے ساتھیوں کے اس انجام پر شدت سے جل رہی تھیں۔
''یہ قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ اپنی یہ غلطیاں اب ہم کبھی نہیں دہرائیں گے۔ ہم اس قید سے آزاد بھی ہوں گے اور باچستا کو اسی کے سکوں میں ادائیگی کریں گے۔ وقت بہت جلد مہربان ہوگا، بہت جلد۔'' اس نے ایک عزم سے خود کلامی کی۔

☆☆☆

سینکڑوں گرفتار شدہ افراد پر غداری کا مقدمہ دائر کر کے جنرل نے ملک میں مکمل مارشل لاء نافذ کر دیا۔ میڈیا پر پابندی عائد تھی۔ حکومت نے اس واقعہ کو ایک الگ ہی رنگ دے دیا تھا۔ ان کے جاری کردہ بیان کے مطابق اشتراک پسندوں نے سویلین اسپتال پر حملہ کر کے مریضوں کا قتل عام کیا تھا۔

جنرل نے اختلاف رائے کے خلاف سخت ترین قوانین نافذ کر دیے تاہم باغیوں کے قتل اور فوری پھانسی کی کچھ خبریں اور تصاویر منظر عام پر آنے سے نہ روک سکا۔ عوام اور سنجیدہ حکومتی حلقوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ حکومتی دباؤ کے باعث انھیں مقدمہ کی سماعت کا حق دیا گیا اور 21 ستمبر 1953 میں 'باغی' عدالت میں پیش کر دیے گئے۔ کاسترو اپنے دفاع میں دلائل خود دے رہا تھا۔ اس کا دوٹوک رویہ اور بے خوف انداز مخالفین کے کیمپ میں کھلبلی پیدا کرنے لگا۔ وہ استغاثہ کے ہر سوال پر دندان شکن جواب دے رہا تھا۔
''اس بغاوت کا ماسٹر مائنڈ کون تھا؟'' استغاثہ نے ایک سوال جڑا۔
''مارٹی! اس کی ہمت اور جدوجہد۔'' کاسترو نے جواب دیا۔
''کیا آپ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ بغاوت کا یہ عمل غیر آئینی ہے۔''
''میں محض اتنا جانتا ہوں کہ جنرل صاحب کا اقتدار پر جبری قبضہ بھی 'غیر آئینی' ہے......ہم نے تو صرف عمل کا ردِعمل

Downloaded From http://paksociety.com

ظاہر کیا۔"

اس کے دلائل اور بے خوفی سے خائف ہو کر اسے آیندہ سماعتوں میں اس کی 'شدید بیماری' کا بہانہ بنا کر عدالت میں پیش کرنے سے گریز کیا جانے لگا۔ اس مقدمہ کا اختتام 55 باغیوں کو سات ماہ سے تیرہ سال کی سزائیں دی گئیں۔ کچھ افراد کو نا مناسب شہادتوں کے باعث بری کر دیا گیا۔ راول کاسترو کو تیرہ سال جبکہ فیدل کاسترو کو پندرہ سال قید میں بھیج دیا گیا۔

اسے علم تھا کہ جیل کسی بھی طرح اس پر مہربان ثابت نہیں ہوگی۔ جیل کا تصور مکمل ہولناکی کے ساتھ اس کے ذہن میں واضح تھا۔ مستقبل میں وہاں پیش آنے والے متوقع سنگین حالات' خطرات، بدمعاشی اور جیل حکام کی بزدلانہ وحشت بربریت بھی اس کے لیے انجان نہ تھے۔ لیکن اسے ان سب باتوں کا خوف بھی نہ تھا۔

25 ساتھیوں کے ساتھ قید میں سب سے پہلے اس نے اپنی تنظیم کے نام میں تبدیلی کی۔ 26th of July Movement کے اس نئے نام کے بعد اس کی ذہنی قوت اور مضبوطی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اپنے ہلاک شدہ ساتھیوں کی یاد میں یہ نام اسے ہمہ وقت ایک قرض کی ادائیگی کی یاد دلاتا۔ جیل میں ملنے والی فرصت میں اس نے مارکس، لینن' مارٹی کے علاوہ، شیکسپیر، فرائڈ اور دستو وسکی کے افکار اور کتابوں کا وسیع مطالعہ کیا۔ آزاد دنیا کے ساتھیوں سے خط و کتابت بھی جاری تھی۔

قید میں ملنے والی محدود آزادی اور نقل و حمل بھی چار دن کی چاندنی تھی۔ فروری 1954 میں صدر نے وہاں دورہ کیا تو اس کے ساتھی با آواز بلند باچستا کی ہرزہ سرائی میں نغمے گانے لگے۔ جیل حکام نے اس واقعہ کا سارا ملبا کاسترو پر گرایا اور اسے 'قید تنہائی' کا تحفہ دے دیا گیا۔

تنہائی کی عفریت بھی اس کے عزائم میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کر پائی لیکن ابھی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں مزید در آنی تھیں۔ مائرٹا نے وزارتِ داخلہ میں نوکری کا آغاز کر دیا۔ ایک ریڈیو اعلان میں نشر ہونے والی یہ خبر کسی بجلی کی طرح اس کا ضبط خاکستر کر گئی۔ غاصب حکومت میں اپنی خدمات سر انجام دینے کی ذلت آمیز زندگی سے اسے ہزار ہا دفعہ موت قبول تھی۔

باہمی خط و کتابت میں ان دونوں کے اختلافات شدید سے شدید تر ہونے لگے اور نتیجتاً یہ قضیہ طلاق پر منتج ہوا۔ عدالتی حکم کے مطابق بیٹے کی حوالگی مائرٹا کے سپرد کر دی گئی۔ فیدل کاسترو کے لیے یہ فیصلہ بھی نا قابلِ برداشت تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی پرورش بے حس اور مردہ ضمیر اشرافیہ کے ہاتھوں میں نہیں دے سکتا تھا لیکن وہ ان سلاخوں کے پیچھے بے بس تھا۔

شیر بہت زخمی تھا۔ اس کی تلملاہٹ بتاتی تھی کہ وہ مخالفین پر قہر بن کر ٹوٹے گا۔

☆☆☆

کانفرنس ہال میں اس وقت گرما گرمی کا ماحول تھا۔ جنرل باچستا ملک میں صدارتی انتخابات منعقد کروا رہا تھا لیکن حزب اختلاف سے کوئی نمائندہ بھی اس کے مخالف کھڑا نہ ہوا۔ انتخابات میں اس قدر 'خاموشی' عوام میں دھوکا دہی اور جبر کا تاثر پیدا کرنے لگی۔ جنرل کی ساکھ ایک بار پھر داؤ پر لگی تھی۔ وہ اس صورتِ حال سے محفوظ رستہ چاہتا تھا۔ اس کے غیر مشروط وفادار مقربین اسی مسئلے کے حل میں سر جوڑے الجھے بیٹھے تھے۔

"کیا یہ مسئلہ اتنا دقیق ہے کہ میری ریاست کے بہترین دماغ ابھی تک اس کا حل تلاش نہیں کر پائے؟" وہ طنزیہ گویا ہوا۔

"ہمیں اس مسئلے کا بہترین حل درکار ہے چیف!! آپ کے خلاف حزب اختلاف کی جانب سے کوئی مخالف للکار فطری انداز میں تخلیق کرنی ہے۔ اور یہ فطری ہونے کی شق ہی اس وقت ہمیں الجھا رہی ہے۔" ایک مشیر بولا۔

"لیکن اسے دوسرے پہلو سے بھی حل کیا جا سکتا ہے؟" دوسرے مشیر نے کہا۔

"وضاحت سے بتاؤ مجھے۔" جنرل نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"ہم ان انتخابات میں عوامی ردِعمل سے خائف ہیں لیکن اگر عوام کے دل میں آپ کے لیے محبت و عقیدت پیدا کر دی جائے تو وہ کسی بھی غیر فطری عمل پر کوئی ردِعمل نہیں دیں گے۔"

"اور یہ سب کیسے ممکن ہوگا؟"

"کاسترو اور اس کے ساتھیوں کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیں۔ عوام خود بخود آپ کی عقیدت مند ہو جائے گی۔" دلی طور پر کاسترو کے لیے ہمدردی رکھنے والے اس مشیر نے کہا۔

"اس خیال پر سوچ بچار کی جا سکتی ہے۔" جنرل نیم رضا مند تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''ایسا کوئی بھی قدم آپ کے اقتدار کے لیے خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ وہ ایک زہریلا سانپ ہے، اسے بل میں ہی قید رہنے دیں۔'' ایک اور مشیر نے تلملاتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ قید وصعوبت اچھے اچھوں کے دماغ ٹھکانے لگا دیتی ہیں۔ اس کے ہوش بھی ٹھکانے آگئے ہوں گے۔'' جنرل نے تنفر سے جواب دیا۔ اس کا حتمی انداز دیکھ کر وہ مزید کچھ کہنے کے مجاز نہ رہے۔

جنرل باچستا کا یہ فیصلہ کیوبائی تاریخ میں اس کا نام امر کرنے والا تھا۔

15 مئی 1955 کو کاسترو اور اس کے ساتھیوں کو رہائی مل گئی۔ ہوانا واپسی کے بعد وہ یکدم بہت سی مصروفیات میں الجھ گیا۔ ریڈیو اور اخبارات میں اس کے کئی ایک انٹرویوز شائع ہونے لگے۔ حکومت کی جانب سے اس کی ہر نقل و حرکت کی نگرانی کی جارہی تھی۔ حکومتی تحفظات اور اقدام کے علاوہ اسے ایک اور اضطراب بھی لاحق تھا۔ ایک بھرپور ازدواجی زندگی گذارنے کے بعد اب تجرد کی زندگی اس کے لیے بہت بڑی آزمائش بن گئی تھی۔

صنفِ مخالف کے لیے اس کی شخصیت اور مزاج ہمیشہ ہی سے باعثِ کشش رہا تھا اور اب بھی اس کے افکار و نظریات کی حامی دو عورتیں اس کی خلوت کی ساتھی بن گئیں۔ 'نیٹی' اور 'ماریہ' نامی ان خواتین نے بعد ازاں اس کے بچوں کو بھی جنم دیا۔

جنسی آسودگی میسر آتے ہی اس کی ذہنی گرہیں کھلتی چلی گئیں۔ اس نے MR-26-7 کے تنظیمی معاملات ایک بار پھر سنبھال لیے اور ماضی کی نسبت دگنی قوت سے اپنے عزائم کو عملی ہیئت دینے میں مشغول ہوگیا۔ گیارہ معتمد قومی افسران پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی لیکن مختارِ کل صرف وہی تھا۔ اس کے پیشِ نظر اب صرف ایک ہی مقصد تھا...... انقلاب...... اور اس انقلاب کے لیے کسی کمیٹی کے بہت سے اراکین کی بجائے فقط ایک مضبوط اور نڈر رہنما کی ضرورت تھی۔ کاسترو نے ایسا ہی ایک رہنما بننے کی ٹھان لی تھی۔ کیوبائی عوام کو امریکی پٹھوؤں کی دست برد سے محفوظ رکھنے کی یہ ذمہ داری اس نے آپوں آپ اپنے سر لے لی۔

1955 میں حکومت نے کچھ مظاہرین سے اختلاف رائے کے بعد ان پر بارود کی بارش کر دی۔ فیدل اور راؤل کے گرد گھیرا تنگ ہونے لگا اور انھیں گرفتاری سے بچنے کے لیے کیوبا سے روپوش ہونا پڑا۔ فیدل نے قومی اخبارات کے نام ایک خط ارسال کر دیا؛

''میں کیوبا چھوڑ رہا ہوں، میری اس روانگی کو فرار ہرگز نہ سمجھا جائے۔ یہاں پُرامن احتجاج اور مذاکرات کے تمام دروازے اب بند ہو چکے ہیں، مارٹی کا پیروکار ہونے کے ناتے میرا ایمان ہے کہ اب وہ گھڑی آگئی ہے کہ اپنے حقوق چھین لیے جائیں، حقوق کے حصول کی التجاؤں کا وقت اب ختم ہو چکا ہے، اب کوئی مذاکرات یا التجا نہیں ہوگی، اب صرف جنگ ہوگی، انقلاب کے لیے جنگ۔''

وہ کیوبا کے طول و عرض میں ایک خوشگوار تبدیلی لانا چاہتا تھا۔ امریکی تسلط کے زیرِ اثر سیاسی حکمرانوں نے ملکی وسائل کا بے دردی سے استحصال کیا تھا۔ کاسترو میکسیکو روانہ ہو گیا جہاں راؤل اور اس کی ملاقات ارجنٹائن کے ایک ڈاکٹر ''ارنیسٹو چیگوارا'' سے ہوئی۔ وہ بھی مارکس 'لینن کا بہت مرید تھا۔ ارنیسٹو ایک صحافی اور فوٹوگرافر کی حیثیت سے بھی کافی مقبول تھا۔ درحقیقت وہ فیدل سے بھی بڑا 'انقلابی' تھا۔ اس کے بعد وہ ایک اسپینی 'البرٹو' سے بھی ملا جس نے اس کی تنظیم کے جنگجوؤں کو گوریلا جنگ کی بنیادی مہارتیں سکھانے کی حامی بھر لی۔

تنظیم کے لیے مالیات کی قلت اب بھی بہت بڑا چیلنج تھا۔ کاسترو نے مخیّر حضرات کی تلاش میں امریکا روانگی کا قصد کر لیا لیکن وہاں باچستا کے گماشتوں کی نظروں سے نہ بچ سکا۔ ان گماشتوں نے اس پر ایک قاتلانہ حملہ بھی کیا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔

کیوبا میں MR-26-7 کے اراکین سے وہ مسلسل رابطہ میں تھا۔ اوریینٹ (صوبہ) میں جنرل کی دیگر مخالف تنظیمیں بھی اب کھل کر سامنے آگئیں۔ ان تنظیموں میں کیوبائی طلبہ کی اکثریت تھی۔ وہ اسے دلی طور پر اپنا رہنما تسلیم کر چکے تھے۔ فیدل کاسترو ہزاروں دلوں کی دھڑکن بن گیا تھا لیکن خود اس کا دل تو اپنے بیٹے میں اٹکا تھا۔ امریکا میں ڈیاز کے پاس اس کی موجودگی اب تک بحالتِ مجبوری برداشت کی تھی۔

اس نے کیوبا روانگی سے قبل بیٹے کے ساتھ کچھ دن گزارنے کے لیے ڈیاز کو راضی کر لیا اور بعد ازاں فیدلتو کو میکسیکو میں اپنے ایک دوست کے حوالہ کر کے ایک پُرخطر سفر کی تیاری میں جت گیا۔

☆☆☆

25 نومبر 1956 میں وطن واپسی کے لیے فیدل نے ایک پرانی کشتی (Granma) خریدی اور 81 مسلح

Downloaded From http://paksociety.com

ساتھیوں کے ہمراہ 1200 میل پُرخطر سفر پر روانہ ہوگیا۔
واپسی خواہ کوئی بھی ہو، کبھی بھی آسانیاں نہیں لاتی۔ ان سب کے لیے بھی مشکلات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ خوراک میں تیزی سے کمی ہونے لگی، کئی افراد سمندری متلاہٹ کی زد میں آگئے۔ کشتی میں ہونے والے سوراخ کی فوری مرمت نے اس سفر میں عارضی جمود پیدا کر دیا اسی دوران ایک شخص کو سمندری لہروں نے نگل لیا۔
منصوبے کے مطابق انھیں پانچ دن میں یہ سفر طے کرنے کے بعد اپنے دیگر ساتھیوں سے مل کر مسلح حملوں میں شرکت کرنی تھی۔ کیوبا میں موجود ان عسکریت پسندوں نے حملوں کا آغاز کر دیا لیکن کاسترو ان کو بروقت کمک فراہم نہ کرسکا۔ وہ مقرر کردہ وقت سے دو دن تاخیر سے پہنچے۔ اس کے ساتھی وقفے وقفے سے کچھ حملوں کے بعد منتشر ہوگئے تھے۔
2 دسمبر کو بالآخر وہ منزل مقصود تک پہنچ گئے۔ اور بینٹ کے پہاڑی جنگلات Sierra Maestra میں ڈیرے جما لیے۔ انقلاب پسندوں پر جنرل اور اس کے اتحادیوں کے حملے جاری تھے۔ افرادی قوت تیزی سے کم ہوتی جا رہی تھے۔ اس نے نزدیکی چیک پوسٹس پر چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کے بعد اسلحہ لوٹنے کا آغاز کر دیا۔
انہی جھڑپوں میں 'اوسوریو' نامی ایک اہلکار ان کے قابو میں آگیا۔ اوسوریو حکومت کی جانب سے زرعی اراضی کا نگہبان تھا اور اکثر باغی اس کی وجہ سے جنرل کے شکنجے میں پھنس گئے تھے۔ اوسوریو کی ہلاکت کے بعد گویا مقامی افراد اور کسانوں کے دل کی کلی کھل گئی۔ وہ اس کے جابرانہ رویے اور استحصال سے تنفر کی انتہائی حد تک نالاں تھے۔ کاسترو اور مقامی افراد میں باہمی اعتماد پروان چڑھنے لگا۔ قبل ازیں یہ کسان انقلابیوں کے معاملے میں غیر جانبدار اور جوش و جذبہ سے بالکل عاری تھے۔ لیکن اب وہ اسے تقویت فراہم کرنے کے لیے بھرپور ساتھ فراہم کرنے لگے۔ دیہاتیوں کے علاوہ شہروں ....سے بھی افرادی کمک میسر آنے لگی۔ فیدل کاسترو کی 'انقلابی فوج' ازسرنو تشکیل پانے لگی تھی۔
جولائی 1957 میں 200 سے زائد ان نو بھرتی شدہ افراد کو اس نے تین حصوں میں منقسم کر دیا اور ان کی قیادت کی کمان اپنے علاوہ، راول کاسترو اور چیگوارا کے سپرد کر دی۔ شہری علاقوں میں MR-26-7 کی تحریک اور بغاوت جاری تھی۔ وہ کاسترو کو بھی وقتاً فوقتاً مطلوبہ متعلقہ سامان پہنچا دیتے۔ اسی دوران اس کی ملاقات 'سیلیا' سے بھی ہوئی گہری دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ سیلیا بھی انقلاب کی داعی تھی اس لیے کاسترو سے اس کی خوب گاڑھی چھننے لگی۔
جنرل باچستا کے خلاف مظاہروں اور مسلح جھڑپوں میں اضافے کے بعد مقامی پولیس بھی حرکت میں آگئی۔ پکڑ دھکڑ، تشدد اور ماورائے عدالت پھانسیوں کا سلسلہ ایک بار پھر زور پکڑ گیا۔ باغیوں کی قوت ختم کرنا ان کے لیے اب آسان نہ رہا تھا۔ وہ ہر بار نئے جوش اور ولولے سے اپنے اہداف پر ٹوٹ پڑتے۔ ناکامی یا کامیابی ان کے لیے بے معنی تھی۔ وہ اپنے وجود کی تپش سے جنرل کے اقتدار کی جڑیں بھسم کر دینا چاہتے تھے۔ صدارتی محل پر ایک ایسے ہی حملہ میں انھیں ناکامی کے بعد 'اینٹونیو' کی ہلاکت کا ایک عظیم نقصان برداشت کرنا پڑا ......لیکن ان کے حوصلے اب بھی غیر متزلزل تھے۔ کاسترو کے افکار کے رنگ بہت پختہ تھے۔
اینٹونیو کے بعد اس تنظیم کو دوسرا بڑا جھٹکا اس وقت لگا جب 'فرینک پائس' بھی ہلاک کر دیا گیا۔ MR-26-7 کے اہم ستون زمین بوس ہونے لگے تھے اور اب صرف فیدل کاسترو ہی واحد قائد تھا اور دھیرے دھیرے اس کے مزاج میں بھی سیاسی پینترے جھلکنے لگے۔ راول کاسترو اور چیگوارا اشتراکیت کے داعی تھے لیکن فیدل یہ بات ابھی طشت ازبام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اس سچائی کے سامنے آتے ہی اس کے حامی بدک جائیں گے اور انقلاب محض ایک خواب بن کر ماضی کے دھندلکوں میں کھو جائے گا۔
تنظیم کے 'سینیٹرز' کے ساتھ روابط میں تیزی آنے لگی۔ روپوشی کے دوران باہمی معاہدوں پر عمل درآمد کا وقت آگیا تھا۔ وہ کیوبا میں عبوری حکومت کے قیام کے بعد زرعی اصلاحات 'صنعت و حرفت اور تعلیمی نظام کو مکمل طور پر ایک نئی ہیئت دینا چاہتے تھے۔ انتخابات سے قبل وہ اپنے اس پارٹی منشور کو عوام کے سامنے لانا چاہتے تھے لیکن پریس حکومتی عتاب کے باعث سنسر تھی۔ غیر ملکی میڈیا کے ذریعے کاسترو نے اپنا مطمع نظر عوام تک پہنچایا۔ اس کی شہرت میں راتوں رات کئی گنا اضافہ ہوگیا تھا۔
تنظیم کے گوریلا اراکین نے فوجی چوکیوں پر حملوں میں مزید شدت پیدا کر دی۔ 1958 کے موسم بہار میں انھوں نے ایک اسپتال، اسکولوں، قصاب خانوں، پرنٹنگ پریس، بارودی سرنگیں اور سگار بنانے والے کارخانوں پر قبضہ جما لیا۔ دوسری جانب جنرل پر اس کی جابرانہ حکمت عملی اور انتظامی نااہلی کے باعث دباؤ بڑھنے لگا تھا۔ اشاعتی اداروں پر

Downloaded From http://paksociety.com

پابندی اس کے لیے بہت مہلک ثابت ہوئی تھی۔قیدیوں پر غیر انسانی تشدد اور ماورائے عدالت پھانسیاں اس کے تابوت میں آخری کیل تھیں۔عوامی غم وغصہ اور مخالفت کے بعد امریکا نے بھی اپنا آشیر باد ختم کر دیا اور اسے فراہم کیے جانے والے ہتھیاروں کی کمک روک دی۔امریکی حکومت کی دور اندیش نگاہیں بخوبی محسوس کر چکی تھیں کہ کیوبا کی سیاسی شطرنج میں ان کا یہ مہرہ بری طرح پٹ گیا تھا۔

کاسترو کی تنظیم نے اس گرتی ہوئی دیوار کو حتمی دھکے کے لیے ہڑتال کا اعلان کرتے ہوئے مسلح حملوں میں تیزی پیدا کر دی۔انھیں کیوبا کے دیگر حصوں کی نسبت وسطی اور مشرقی علاقوں سے بھرپور معاونت حاصل تھی۔

بجھتے ہوئے چراغ کی مانند جنرل نے ایک آخری داؤ کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔اس کے حامی فوجیوں نے پہاڑی جنگلات پر اندھا دھند گولہ باری کا آغاز کر دیا۔اسے یقین کی حد تک شبہ تھا کہ کاسترو اور عسکریت پسند ابھی دشوار گزار مقامات میں روپوش ہیں۔اپنی دس ہزار سپاہ 'جنرل کینٹیلو' کی قیادت میں Sierra Maestra کی پہاڑیوں کے گھیراؤ کے لیے روانہ کر دی۔عددی اور تکنیکی اعتبار سے اس فوج کا پلہ بہت بھاری تھا،لیکن انھیں گوریلا جنگ لڑنے کا بالکل بھی تجربہ نہ تھا۔کاسترو نے بارودی سرنگوں اور پہاڑی بھول بھلیوں میں گھات لگا کر ان کے جارحانہ عزائم کے سامنے بند باندھ دیا۔سرکاری فوج اپنے جنرل کے ان تجربات سے اب نالاں ہونے لگی تھی۔

MR-26-7 کی کامیابیاں ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنی اہلیت کا لوہا منوانے لگیں۔اسی سال گرما میں باغیوں نے پہاڑی جنگلات سے ان سبھی فوجیوں کو باہر دھکیل دیا۔نومبر میں کاسترو کی افواج نے 'اورینٹ' اور 'لاس ویلاس' پر کافی حد تک اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔کیوبا اب دو حصوں میں منقسم ہو گیا تھا۔باغیوں نے مرکزی شاہراہیں اور ریلوے لائنز مکمل طور پر بند کر دیں۔جنرل باچستا کے ہاتھوں اقتدار بند مٹھی میں ریت کی مانند پھسلتا جا رہا تھا......اور وہ بے بس تھا۔

امریکا کی حمایت ختم ہوتے ہی جنرل کو اپنا انجام واضح نظر آنے لگا۔وہ اب 'سپر پاور' کے لیے ایک بے کار وجود کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور دوسری جانب کاسترو کے اشترا کی نظریات بھی انھیں ہولا رہے تھے۔امریکی انتظامیہ نے 'جنرل کینٹیلو' کو اس بساط پر اپنا مہرہ بنا لیا۔کینٹیلو نے فیدل کاسترو کو خفیہ طور پر جنگ بندی کا پیغام بھجوا دیا اور باچستا کو 'جنگی مجرم' قرار دینے کی حامی بھر لی۔

کینٹیلو کے عزائم اور بدنیتی سے بے خبر کاسترو اس جنگ بندی کے لیے رضامند ہو گیا۔

لیکن باچستا کو محض تنبیہہ کے بعد جلاوطن کر دیا گیا۔وہ 300،000،000 امریکی ڈالرز سمیٹے 31 دسمبر 1958 کو ملک سے فرار ہو گیا۔کینٹیلو نے ہوانا میں قصر صدارت پر قابض ہو کر سپریم کورٹ کے جج 'کارلوس پیڈرا' کو صدر نامزد کر دیا۔انھوں نے ہنگامی بنیادوں پر غیر مشروط وفادار ساتھیوں کو حکومتی عہدوں سے نوازنے کا آغاز کر دیا۔

کاسترو اس دھوکا دہی پر شدید مشتعل تھا۔اس نے جنگ بندی کا معاہدہ منسوخ کر دیا اور فوج کے غیر جانبدار حلقوں سے کینٹیلو کی گرفتاری کا مطالبہ کر دیا۔صورت حال انتہائی مخدوش ہو چکی تھی۔اس نے اپنی تنظیم کے اراکین کو لوٹ مار اور توڑ پھوڑ کی اجازت دے دی۔سنفیوشس اور چگیوارا اپنی سپاہ کے ساتھ ہوانا میں موجود تھے اور کاسترو سینٹیاگو پہنچ گیا تھا۔

اپنے دونوں نائب قائدین کے پاس ہوانا پہنچنے کی مسافت ایک تاریخی لمحہ تھی۔وہ مصنوعی روشنی کے ایک دائرے میں گھرا عوام سے خطاب کے لیے ملٹری ہیڈ کوارٹر آیا تھا۔تنا ہوا جسم 'بارعب چال' گرجدار لہجہ اس کے سامنے موجود ہزاروں افراد کی رگوں میں بجلیاں دوڑانے لگا۔اس رات وہ دیر تلک جنگ سے بیزار اور حکومتی بے حسی کے شکار لوگوں کے سامنے تقریر کرتا رہا۔جوش وولولے میں انھوں نے فضا میں سفید فاختائیں آزاد کیں۔ایک فاختہ اڑان بھرتی ہوئی اس کے کندھے پر آ بیٹھی۔بلند آواز میں نعروں کا شور آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔

وہ جنگجو،باریش گوریلا ان کے لیے ایک مسیحا کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

☆☆☆

کیوبا کا سیاسی میدان اس وقت مکمل تبدیلیوں کی زد میں تھا۔

ملک میں ایک عبوری حکومت قائم تھی۔اور ایک معتدل مزاج وکیل 'مینیل یوروتیا' کو عبوری صدر کا عہدہ دے دیا گیا۔ہاں،وہ بات الگ تھی کہ اس کی کابینہ میں اکثر افراد کا تعلق MR-26-7 سے تھا۔کاسترو کی یہ سپاہ،بہت تندہی سے مسند اقتدار تک اس کی رسائی کے لیے سرنگ بنا رہی تھی۔

فیڈرل کاسترو نے عبوری حکومت میں مسلح افواج کے نمائندہ' کا عہدہ سنبھال لیا تھا اور اپنا دفتر و رہائش 'ہوانا ہلٹن

Downloaded From http://paksociety.com

ہوٹل' کے سائبان میں منتقل کرلیا۔

اس وقت کاسترو کے ذہن پر ایک ہی دھن سوار تھی۔ وہ کیوبا سے کرپشن اور ناخواندگی کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا۔ انتظامی عہدوں سے سابق جنرل کے متعین کردہ افسران بھی اس کی نظروں میں بے طرح کھٹکتے تھے۔ وہ موجودہ حکومتی نظام کے معاملات اپنے ہاتھ میں لینے لگا۔ میئنل محض ایک کٹھ پتلی حکمران بن گیا۔ اس کی ہر ایک جنبش و فیصلہ کاسترو کے اشاروں کے زیر اثر تھے اور ایسے ہی ایک حکم نامے کے تحت اس نے ملک کی دیگر سیاسی پارٹیوں کو بالکل دیوار کے ساتھ لگا دیا۔

فیدل کاسترو کے 'پاپولر سوشلسٹ پارٹی' کے اراکین سے خفیہ روابط میں مزید تیزی آگئی۔ ماضی میں اشتراکیت سے منحرف کاسترو نے کیوبا میں اشتراکی حکومت کی داغ بیل ڈالنے کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کے لیے عملی اقدامات کا آغاز کردیا۔

یہ تاریخی اقدام مستقبل قریب میں دنیا کی دو سپر پاورز اور کیوبا کے مابین طبلِ جنگ ثابت ہونے والا تھا۔

☆☆☆

''تو آپ کے خیال میں باغیوں کی اس طرح قتل و غارت ایک جائز عمل ہے۔'' اس امریکی رپورٹر نے اپنے تئیں مدلل نکتہ اٹھایا تھا۔

''تو کیا آپ کے خیال میں یہ جائز عمل نہیں ہے؟'' کاسترو نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ اکثر یونہی سوالات گھما کر رپورٹرز کو انھی کے جال میں جکڑلیا کرتا تھا۔

''قطعی نہیں جناب!!'' رپورٹر جوش میں آگیا۔

''تو جب سابق جنرل باچستا صاحب اس کارِ خیر میں مصروف تھے اس وقت آپ یا آپ کی حکومت کیوں خاموش تھی؟'' اس نے طنزیہ کہا۔

ماضی قریب میں جنرل باچستا نے بغاوت کے خاتمہ کے لیے بہیمانہ قتل و غارت کی تھی اور اب فیدل کاسترو بھی اپنی عبوری حکومت میں اسی ردِعمل میں باغی افراد کو تختہ دار پر دھکیلنے لگا۔ اس نے اختلاف رائے اور امریکی حکومت کے اشاروں پر مختلف سازشوں میں ملوث باچستا کے حامیوں پر مقدمات دائر کرنے کے بعد فوری سماعت اور سزا کو یقینی بنا دیا تھا۔ نتیجتاً امریکی حکومت اور پریس اس کے خلاف سخت واویلا کرنے لگی۔

''وہ بالکل خاموش نہ تھی۔'' رپورٹر سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔

''ہم کسی بھی بے گناہ اور معصوم انسان کو پھانسی نہیں دے رہے۔ یہ سب قاتل ہیں اور اسی انجام کے حقدار ہیں۔'' وہ چٹانی لہجے میں بولا۔

''آپ کے دائر کردہ ان مقدمات کی سماعت منصفانہ نہیں ہے۔''

''انقلابی انصاف آئینی احکام سے ماورا ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد صرف اخلاقی ضابطہ اخلاق ہوتا ہے۔''

امریکی حکومت کاسترو کے اس رویئے' اپنی ناکامی اور متوقع خدشات کی بدولت بے طرح جھنجلائی ہوئی تھی۔ وہ اسے کسی بھی طریقہ سے قابو نہ کر پا رہے تھے۔ اور دوسری جانب صدارتی محل تک اس کی رسائی میں حائل سبھی رکاوٹیں دور ہونے لگیں تھیں۔

وینزویلا میں کچھ معاشی معاملات طے کرنے کے بعد وہ ہوانا واپس آیا تو حکومتی اراکین کے ساتھ ایک بار پھر بحث و مباحثہ کا بازار گرم ہوگیا۔ اس کی ہدایات کے برعکس ملک میں تا حال بیروزگاری عروج پر تھی۔ اس بحث اور تلخ کلامی کے بعد وزیراعظم Jose Miro Cardona مستعفی ہو گیا۔ وہ کاسترو کے نظریات سے بہت بیزار تھا۔ اس نے جلاوطنی کی زندگی اختیار کرتے ہوئے امریکا میں قیام کرلیا اور حسب توقع anti-castro movement میں شمولیت اختیار کرلی۔

☆☆☆

16 فروری 1959 میں کاسترو نے کیوبا کے نئے وزیراعظم کا حلف اٹھالیا۔ اور اب وہ اپنے افکار پر عمل درآمد کرنے کے لیے کسی بندش میں قید نہ تھا۔ اس نئے عہدے کو سنبھالتے ہی اس نے اپریل میں امریکا کا دورہ کیا اور نائب صدر 'رچرڈ نکسن' سے ملاقات کی اور فوری طور پر اسے ناپسندیدگی کی سند عطا کردی۔ امریکی حکام کے لیے اس کے جذبات کبھی بھی مثبت نہ رہے تھے اور اسی پہلو نے انھیں مضطرب کر رکھا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد آزاد ہونے والے سبھی ممالک نے سوویت یونین اور امریکا میں کسی ایک ریاست سے الحاق کیا تھا۔ سوویت کے اشتراکی نظام حکومت کے باعث 'سرمایہ دارانہ نظام' کی حامل ریاست ہائے متحدہ امریکا میں کبھی بھی گہرے تعلقات قائم نہ ہوسکے اور اب فلوریڈا سے نوّے میل دور جزائر کیوبا کے اس نئے اشتراکی

Downloaded From http://paksociety.com

رہنما کا وجود ان کے لیے صریح دھمکی تھی۔

اور فیدل کاسترو ہر گذرتے دن ان کے لیے ایک نیا ذہنی تناؤ سامنے لے آتا۔

اس نے زرعی زمینوں کے لیے خصوصی اصلاحات نافذ کیں۔ زمینداری نظام کے اختیارات میں کمی کے بعد زمین کی ملکیت میں بھی خاصی کمی کر دی گئی۔ اس کے نئے قانون کے تحت ایک فردِ محض 993 ایکڑ رقبہ زمین پر قبضے کا مجاز تھا۔ غیر ملکی افراد کے لیے کیوبا میں کسی بھی قسم کی جائیداد خریدنے کی ممانعت تھی۔ یہ اصلاحات کسانوں کے لیے بہت سود مند ثابت ہوئیں، زمینداری نظام میں تبدیلی کے اثرات ان کی معاشی خوشحالی کا سبب بنے تھے۔

جلد ہی کاسترو نے سیاحتی صنعت کی صدارت بھی حاصل کر لی۔ وہ کیوبا کو نسلی امتیاز سے مبرا 'منطقہ حاری کی زمینی جنت' بنانا چاہتا تھا لیکن ناتجربہ کاری نے کامیابی نصیب نہ ہونے دی۔ اس نے ججوں اور سیاست دانوں کی تنخواہوں میں کمی اور نچلے درجے کے ملازمین کی اُجرت میں اضافہ کر دیا۔

کیوبائی حکومت دھیرے دھیرے مارکس، لینن کے نظریات میں ڈھلنے لگی۔ حکومتی اور عسکری انتظامیہ میں بھی اشتراکیت در آئی تھی۔ چیگوارا کو مرکزی بینک کا گورنر اور بعد ازاں وزیر صنعت مقرر کر دیا گیا۔ مارکسی افکار حکومتی عہدیداران اور کاسترو کے درمیان خلیج پیدا کرنے لگے۔ یوروٹیا کو بھی ان کے بڑھتے تناسب سے کئی تحفظات تھے، جن کے اظہار نے کاسترو کو شدید مشتعل کر دیا۔ اسی طیش کے عالم میں اس نے استعفیٰ دے دیا۔ عوامی حلقوں میں اس نے یوروٹیا کو حکومتی معاملات میں پیچیدگیاں پیدا کرنے کا ذمہ دار قرار دے دیا۔

عوام اس استعفیٰ سے دلی طور پر بے چینی میں مبتلا تھی۔ کاسترو کے 500,000 حامیوں نے صدارتی محل کا گھیراؤ کر لیا۔ ان حالات کے پیشِ نظر اسے مستعفی ہونا پڑا۔

وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان کاسترو نے اپنے اختیار میں رکھا اور مارکسی نظریات کے حامی Osvaldo Dorticos کو صدارت کا تاج پہنا دیا گیا۔ کیوبا کی تاریخ نے ایک نئی مسافت اختیار کر لی تھی۔

☆☆☆

آتش فشانی مزاج کے حامل اور انقلاب کے داعی فیدل کاسترو کا دل اپنے عوام کی فلاح کے لیے بہت مخلص تھا۔ وہ اپنی قوم کے لیے پدرانہ جذبات محسوس کرتا۔ کیوبا اس کا خاندان تھا اور عوام اس کے اہلخانہ۔ انھیں ہر دکھ اور آزمائش سے محفوظ رکھنا گویا اس پر واجب تھا۔ کیوبا کے استحصال اور موجودہ حالت کا سبب صرف ایک تھا۔ حکمرانوں کی بزدلانہ حکومت۔

وہ سابق حکمرانوں کی امریکا نواز پالیسیوں کی بدولت ملکی دگرگوں حالات میں تبدیلی کا خواہاں تھا۔

عوام کا طرزِ زندگی بہتر اور معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے اس نے کئی ایک سماجی منصوبے مرتب کیے۔ معاشی حالات میں قدرے بہتری آئی تو وہ تعلیمی میدان میں اصلاحات کے لیے جت گیا۔ اس کی حکومت کے ابتدائی 30 ماہ میں پچھلی تین دہائیوں سے بھی زیادہ اداروں کا اجراء ہوا۔ پرائمری تعلیم کے نظام میں ایک نئی جہت متعارف کروائی گئی۔ طلبہ کے اوقاتِ کار دو حصوں میں تقسیم کر دیئے گئے۔ پڑھائی لکھائی کے بعد انھیں تخلیقی سرگرمیوں میں مشغول کر دیا جاتا تھا۔ طبی مراکز قومی تحویل میں لے لیے گئے۔ کیوبا کے طول و عرض میں کئی نئے شفا خانے کھولے گئے جہاں مفت طبی امداد فراہم کی جاتی۔ بچوں کی بیماریوں کے لیے ویکسی نیشن کے نئے نظام سے شیر خوارگی کی اموات میں حیرت انگیز کمی ہوئی۔

اس سماجی بہبود کا تیسرا اہم حصہ انفرااسٹرکچر کی بہتری تھی۔ نصف سال کے دوران جزیرے میں 600 میل لمبی سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا۔ 300 ملین ڈالرز پانی اور صحت و صفائی کے معاملات میں بہتری کے لیے مختص کر دیئے گئے۔ ہر ماہ 800 گھروں کی تعمیر ہوتی۔ بے گھر افراد کے لیے کاسترو کے یہ اقدامات نعمتِ غیر مترقبہ تھے۔ بچوں کے لیے ڈے کیئر سینٹر اور خصوصی نرسریاں بنائی جاتی رہیں۔ معذوروں اور عمر رسیدہ افراد کے لیے خصوصی مراکز نے کیوبا کی معاشرت کی ہیئت ہی تبدیل کر دی تھی۔

عوام سے براہِ راست رابطہ کے لیے اس نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو اپنا ہتھیار بنایا۔ سوالات و جوابات کے اس نئے سلسلہ سے حکومت اور عوام میں فاصلے تیزی سے کم ہوئے۔

کاسترو کا طرزِ حکومت کسانوں، کارکنوں اور طلبہ میں بہت مقبول ہو رہا تھا اور یہی افراد کیوبائی آبادی کی اکثریت میں شمار ہوتے تھے۔ البتہ درمیانی طبقہ اس سے قدرے ناخوش رہتا تھا۔ ہزاروں ڈاکٹر، انجینئر اور دیگر پیشہ وارانہ قابلیت کے حامل افراد زیادہ منفعت کی خاطر امریکی ریاست فلوریڈا نقل

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماء راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

مکانی کر گئیے۔ اس انخلاء سے ملکی معیشت پر بہت منفی اثرات تو مرتب ہوئے لیکن یہ آزمائش کاسترو کو جھکا نہ پائی۔ مخالفین نے واقعہ کو خوب اچھالا۔ وہ اسے ذہنی دباؤ میں لانا چاہتے تھے لیکن کاسترو کے ایک ہی بیان نے ان کی صفوں میں خاموشی اور ماتم پیدا کر دیا۔

''وہ سب بزدل تھے اس لیے وطن چھوڑ کر چلتے بنے۔ انھیں آسائشات درکار تھیں تعیشات 'غیر ملکی کاریں' چمک دمک اور ملکی وسائل کا بے دردی سے استعمال ان کے لیے مقصدِ حیات تھے۔ ان بے حس اور خود غرض افراد کی میری حکومت میں کوئی جگہ نہیں، میری سپاہ میں محض بے غرض اور قومی مفاد کو ترجیح دینے والے افراد کی قدر و قیمت ہے۔''

کیوبا سے ان جلاوطن کیے گئے افراد کے علاوہ امریکی خفیہ ایجنسی سی' آئی' اے نے بھی کاسترو مخالف سرگرمیوں میں مالی معاونت کا آغاز کر دیا۔ مقامی پہاڑیوں میں حکومت سے متوقع محاذ آرائی کے لیے گوریلائی طرز پر کئی خفیہ ٹھکانے بنا لیے گئے۔

فیدل کاسترو اپنی حکومت کے مشکل ترین وقت میں داخل ہو گیا تھا۔ مصائب کی عفریت اسے نگلنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔ معاشی نظام میں خلاء کے بعد اب یہ مخالفین ذاتی مخالفت پر اتر آئے تھے۔

کیوبائی گوریلا کے لیے ایک کڑے دور کا آغاز ہو چلا تھا۔

☆☆☆

اس شاندار وِلا کے سامنے گاڑی رکی اور ایک شخص انتہائی کروفر سے باہر آیا۔

درمیانی عمر کے عام سے حلیے اور انتہائی عام سے نقش و نگار کے حامل اس شخص کو دیکھ کر وِلا اور گاڑی میں اس کی موجودگی پر حیرت کے سوا کوئی دوسرا تاثر نہیں ابھرتا تھا۔ اس نے پُرسکون انداز میں کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر دوڑائی، وہ مقرر کردہ وقت سے ٹھیک دو منٹ پہلے اپنی منزل پر پہنچ گیا تھا۔

وِلا کے حفاظتی انتظامات سے گزرتے وہ ایک عالیشان اسٹڈی روم میں بھیج دیا گیا جہاں نیم شفاف سر بریدے کی طرح چھیدتی نظروں اور سفاک پتلے ہونٹوں والا ایک شخص اسی کا منتظر تھا۔ لبرل جمہوری ریاست امریکا کا بااختیار ترین ریاستی نمائندہ اور بدنامِ زمانہ تنظیم سی آئی اے کا ذہین ترین دماغ ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔

''آپ کا بے داغ سروس ریکارڈ مدنظر رکھتے ہوئے ریاست نے ملکی مفاد کے لیے ایک خصوصی مشن آپ کے ذمے لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔'' وہ عمر رسیدہ شخص فوری طور پر اصل مدعا پر آگیا۔

''شکار کے بارے میں تفصیلات؟'' نووارد نے استفسار کیا۔

''پہنچا دی جائیں گی۔''

''وسائل؟''

''13 ملین ڈالرز، شکار کو ہر ممکن طریقہ سے رستے سے ہٹانا ہے۔ مافیائی ایجنٹس سے بھی کام نکلوایا جا سکتا ہے۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''دشمن کا دشمن بہترین دوست ہوتا ہے۔ وہ بھی ہمارے ٹارگٹ سے بہت خار کھائے بیٹھے ہیں۔''

''او کے مسٹر پریذیڈنٹ!!! کام ہو جائے گا۔'' سی آئی اے کے اس ایجنٹ نے اپنے اسی مخصوص تکبر سے کہا جس کے لیے یہ تنظیم مشہور تھی۔

الوداعی اور خیرسگالی کلمات کے بعد وہ واپس اپنی گاڑی میں آیا تو ڈرائیونگ سیٹ پر ایک فائل موجود دیکھ کر اس کے سفاک چہرے پر چمک آگئی۔

اپنی رہائش پر پہنچتے ہی وہ اس فائل کی ورق گردانی میں مصروف ہو گیا۔ اس کے سامنے ایک جھاڑی دار داڑھی اور مضبوط قوت ارادی کی حامل چمکدار آنکھوں والا ایک شخص موجود تھا۔ فائل میں چند اخباری تراشے بھی موجود تھے جو اس کے 'گناہوں' کا منہ بولتا ثبوت تھے۔

بیئر کا گلاس تھامے وہ گہری دلچسپی سے اس عجوبہ روزگار انسان سے ایک نئے زاویہ سے متعارف ہو رہا تھا جس نے ایک سپر پاور کو محض تھوڑے ہی عرصہ میں تگنی کا ناچ نچا دیا تھا۔

اشتراکی ریاست سوویت یونین سے اس کے تعلقات تشویشناک حد تک بڑھتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ان اشتمالیوں سے گنے' ریشم اور کھالیں برآمد کرتا اور خام تیل' کھادیں اور صنعتی اشیاء درآمد کر کے اپنے جزیرہ نما ملک میں کئی عشروں سے قائم امریکی کمپنیوں کے کاروباری معاملات کو جڑ سے اکھاڑنے میں مصروف تھا۔ امریکی کارپوریشن کے زیر اثر Esso, Shell اور اسٹینڈرڈ آئل کو روسی خام تیل کے استعمال کے لیے مجبور کر دیا۔ ان کمپنیوں کے انکار پر اس نے ان تمام صنعتوں کو قومیانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس کی پیش قدمی روکنے کے لیے امریکی ریاست نے

Downloaded From http://paksociety.com

اس کی معیشت کو دھچکا پہنچانے کے لیے گنے اور چینی کے رہے سہے درآمدی سودے منسوخ کردیئے۔ انھیں یقین تھا کہ ماضی قریب ہی میں ہزاروں افراد کے انخلاء سے پیدا کردہ مسائل کے بعد وہ اس نئے جھٹکے کو سہہ نہ پائے گا اور بالآخران کے سامنے گھٹنے ٹیک دے گا۔

لیکن اس شخص کی ضد اور ہٹ دھرمی کی کوئی حد نہ تھی۔اس نے امریکی اثاثوں پر مشتمل باقی ماندہ ادارے، بینک اور شوگر ملز بھی قومی تحویل میں لے لیں۔

4مارچ 1960 میں ایک فرانسیسی جہاز La Coubre ہوانا کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا جس میں بیلجیم سے خریدا گیا ۷۶ ٹن گولہ بارود شامل تھا۔اس کارگو جہاز میں اچانک دھماکے کے بعد سینکڑوں ہلاکتوں اور مالی نقصان کا تمام تر ملبا بطور تخریب کاری اس نے امریکی حکومت کے سر ڈال دیا تھا۔اپنی شعلہ بیانی کے باعث اس نے اپنے عوام کے دلوں میں سپر پاور کے لیے مزید نفرت کے بیج بودیئے۔اس کی تقریر میں بارہا ایک ہی جملہ دہرایا جاتا۔ "Patria o Muerte!" (وطنی سالمیت یا موت)۔یہ خطرناک فقرہ اب وہاں زبان زدِعام تھا۔

یہ شخص محنتی، وطن پرست، مخلص اور فیاض دل تھا لیکن صرف اپنی قوم کے لیے۔مخالفین کے لیے اس کی ذات انتہائی کینہ پرور، انتقام جُو اور غیر متزلزل تھی۔جھکتا تھا نہ بکتا تھا۔ایک چھوٹے سے جزیرے کی حکومت سنبھالے دیو پیکر سپر پاور کے لیے ڈراؤنا خواب بن گیا تھا۔اس کا ہروار ان کے لیے کاری ضرب ہوتا۔

پانی اب سر سے اونچا ہو چلا تھا۔سپر پاور نے اس شخص کو اقتدار سے ہٹانے اور ہلاک کرنے کے لیے موت کے پروانہ پر دستخط کردیئے تھے۔

''بہت خوب!! فیدل کاسترو!!! تمھارا شکار واقعی ایک یادگار مہم ثابت ہوگی۔''اس ایجنٹ نے مسکراتے لبوں سے وہ فائل بند کرتے ہوئے خود کلامی کی۔

اس کے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب پانے لگا تھا۔

☆☆☆

میامی کے ساحل پر اس وقت خاموشی اور نیم تاریکی غالب تھی۔آسمان پر ابتدائی تاریخوں کا چاند بادلوں سے انکھیلیاں کرتا نظر آرہا تھا۔اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سام تیز تیز قدموں سے چلتا جارہا تھا۔اس کے ذہن پر کچھ دیر قبل ہونے والی ایک ملاقات کا ناخوشگوار تاثر اب بھی قائم تھا۔اس کے چیف نے سالانہ منافع میں واضح کمی پر اسے خاصی تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔اہانت اور بے بسی سے وہ اس صورتِ حال کے 'اصل ذمہ دار' کو تصور ہی میں جانے کتنی بار قتل کرچکا تھا۔

اسی پل نیم تاریکی سے ایک ہیولا اس کے سامنے آگیا۔سام ٹھٹک کر رک گیا۔

''ذہن میں پلنے والے غصہ اور طیش سے مخالف کو بھسم کرنا سیکھو سام!! ورنہ اس آگ کی تپش تمھیں خاکستر کردے گی۔''نووارد نے سرد لہجے میں کہا۔

''کک.....کون ہو تم؟''وہ اس نئی افتاد پر گھبرا گیا۔

''میں اے بی سی یا ایکس وائی زیڈ جو بھی ہوں لیکن تمھیں اس مصیبت سے نکلنے کا رستہ دکھا سکتا ہوں۔''اس نے بھرپور اطمینان سے کہا۔

''محض ہوا میں تیر چلا رہے ہو تم۔میرا رستہ چھوڑو۔''

''کیوبا میں تمہارے قحبہ خانے اور قمار خانے جبری طور پر بند کردیئے گئے ہیں۔سڑکوں پر آگئے ہو تم لوگ۔اور اس صورتِ حال کا ذمہ دار اب بھی تم جیسے ہزاروں لوگوں کو تباہ کرنے میں مصروف ہے۔''

سام سمجھ گیا کہ اس کے سامنے کسی خفیہ ایجنسی کا اہلکار ہی کھڑا ہے۔نہ جائے رفتن، نہ پائے ماندن کے مصداق اس نے گہری سانس لے کر استفسار کیا:

''مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

نووارد اسے ایک اوسط درجہ کے شراب خانہ میں لے آیا اور کہنے لگا:''تم اس کے ملکی حالات اور ذاتی شخصیت سے عملی واقفیت رکھتے ہو!! اسے عالم بالا کا ٹکٹ تھمانے کے لیے مجھے وہ معلومات مہیا کرو، جو عمومی نگاہ سے اوجھل ہیں۔ اس کا قتل تم کروگے، وسائل میں مہیا کروں گا۔''

''وہ انسان نہیں.....کوئی بھوت ہے.....خوف اسے چھو کر بھی نہیں گزرا.....اسے کسی گولہ بارود سے ہلاک کرنا ممکن نہیں۔اس کے محافظ اسی پل تمھیں ڈھونڈ کر جسم کا ایک ایک ریشہ الگ کردیں گے۔''اس نے جھرجھری لی۔''ہاں البتہ اسے کسی زہریلی دوائی یا کھانے سے..... ہلاک کیا جاسکتا ہے۔''

''او کے!تمھیں سائنائڈ گولیاں فراہم کردی جائیں گی۔''اس نے فوری ایک لائحہ عمل تشکیل دے دیا۔

ہوانا کے ہلٹن ہوٹل (سابق نام) میں اس سازش کے تمام تانے بانے تیار کیے گئے۔طے شدہ منصوبے کے مطابق

Downloaded From http://paksociety.com

انھیں یہ گولیاں کاسترو کے پسندیدہ مشروب چاکلیٹ ملک شیک میں تحلیل کرنی تھیں۔اس سارے عمل کی بارہا مشق کے باوجود عین وقت پر سب تانے بانے بکھر گئے۔

سائنائڈ کیپسول فریزر کے ایک خانہ میں پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ اور ملک شیک میں تحلیل کرنے کے لیے نکالنے کے دوران وہاں سے نکالتے ہوئے ٹوٹ کر بے کار ہو گیا۔

سی آئی اے کے بہترین دماغ قسمت کے نادیدہ تیر سے شکست کھا کر بہت تلملائے۔

انھوں نے ایک نئے منصوبہ پر عمل کا آغاز کر دیا اور دوسری جانب فیدل کاسترو امریکا کو مزید زک پہنچانے کی بھرپور تیاری میں تھا۔

☆☆☆

کیوبائی حکومت پر دباؤ بڑھانے کے لیے اکتوبر ۱۹۶۰ میں امریکا نے برآمدات کے خاتمہ کے بعد ڈھکے چھپے الفاظ میں 'عالمی معاشی پابندیوں' کا عندیہ دے دیا۔ جوابی کارروائی کے طور پر کاسترو نے مزید 166 امریکی کمپنیاں قومی تحویل میں لے لیں۔

اشتمالیوں کے ساتھ اس کی خوب گاڑھی چھننے لگی تھی۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں روسی صدر اور اس کی ذہنی ہم آہنگی قابلِ دید ہوا کرتی۔ وہ پولینڈ' مصر' بلغاریہ اور بھارتی سربراہان مملکت سے بھی روابط بڑھانے لگا تھا۔

کاسترو ذہنی طور پر کیوبا میں امریکی مداخلت کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ گذشتہ سال حکومت نے سوویت یونین' بلغاریہ اور فرانس سے ہتھیاروں کی خریداری کے لیے ۱۲۰ ملین ڈالرز خرچ کیے تھے اور رواں سال اس نے امریکیوں کے زیر اثر فوج میں کسی بھی قسم کی بغاوت سے نپٹنے کے لیے 'عوامی فوج' کی تیاری کا فیصلہ کر لیا۔

پہلے مرحلہ میں نصف لاکھ افراد کو جنگی تکنیکی مہارتوں کی تربیت فراہم کی گئی۔ ستمبر ۱۹۶۰ میں Committees for the Defense of the Revolution (CDR) قائم کی گئی... ملک بھر میں تربیت یافتہ عام شہریوں پر مشتمل یہ خصوصی تنظیم مقامی افراد کے بھیس میں پوشیدہ ہمسایہ ممالک کے جاسوسوں کو بے نقاب کرتی تھی۔ طبی اور تعلیمی نظام میں بہتری میں معاونت کے ساتھ یہ عوامی شکایات حکومت تک پہنچانے کے لیے ایک پُل کا کردار ادا کرنے لگی۔

اس موجودہ انتظامی معاملات کو کاسترو نے 'براہِ راست جمہوریت' قرار دے کر ملک میں آئندہ انتخابات غیر ضروری قرار دے دیے تھے۔ اس کی حکومت کسی بھی جدید جمہوری طرز حکومت سے بہت بہتر عوامی خدمات میں مشغول تھی۔ ترقی اور جدت کے اس موڑ پر اس کے عوام کو کسی بھی نئے نمائندہ اور نظام کی ضرورت نہ تھی' جس میں ایک مخصوص طبقہ ملکی وسائل پر قابض ہو کر دیگر طبقات کا استحصال کرتا۔

''سرمایہ دارانہ نظام میں محض ناخوشگواریت ہے۔ یہ گندگی اور بد اعتقادی کا ملغوبہ ہے۔ اس کا اطلاق جنگ' منافقت اور مسابقت بازی کے منفی رجحان پیدا کر کے ہر سُو انتشار پھیلا دیتا ہے۔

میں اپنے ملک کو اپنے ہاتھوں یہ زہر نہیں پلا سکتا.....''

امریکی سیکریٹری اسٹیٹ نے کاسترو کے اس طرزِ فکر پر بہت واویلا کیا۔ اشتمالیوں کے بعد اب کیوبا بھی اسی کے نقشِ قدم پر چل نکلا تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمہ کے بعد بظاہر اشاعتی اداروں پر پابندی' آزادئ رائے کی مخالفت' ٹریڈ یونین پر حکومتی قبضہ اور شہریوں پر دباؤ کے عوامل کے پس پردہ انھیں اپنی حکمرانی اب متزلزل دکھائی دینے لگی تھی۔

فیدل کاسترو کے اقتدار سنبھالنے سے قبل کیوبا میں امریکا کی حیثیت مسلمہ تھی۔ امریکی سفیر کیوبائی صدر سے بھی زیادہ طاقتور اور بااثر تھا۔ کٹھ پتلی حکمران اسی کی جنبشِ پلک کے تحت ہر کام کیا کرتے۔

لیکن اب۔

کاسترو تن تنہا اس ریاست سے برسرِ پیکار تھا..... اور اب کاسترو کے خلاف ایک اور ہتھیار تیار کیا جا رہا تھا..... ایک ایسا ہتھیار جو قرنوں سے بہت مہلک ثابت ہوتا آیا ہے۔

☆☆☆

وہ قتالہ عالم تھی۔

شہابی رنگت' نشیلی آنکھوں اور اپنی اداؤں سے کسی کو بھی بآسانی اپنی طرف مائل کر لیتی۔ عمر عزیز کی ابھی صرف اکیس بہاریں ہی دیکھی تھیں۔ ریاست فلوریڈا منتقلی سے قبل اس کی زندگی میں کافی مشکلات درپیش رہیں' جنھیں وہ اب کبھی یاد بھی نہ کرنا چاہتی تھی۔

وہ اس وقت سی آئی اے کے بلاوے پر یہاں موجود تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک کرخت صورت افسر کے سامنے موجود تھی۔

''ماریٹا لورینز!! جرمن نژاد...... باپ کمرشل بحری جہاز کا کپتان اور ماں ایک اداکارہ اور رقاصہ...... رائٹ؟'' اس افسر نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔

Downloaded From http://paksociety.com

"یس رائٹ! مجھے یہاں بلانے کا مقصد۔" ماریتا نے پوچھا۔

"فیدل کاسترو کے بارے میں کیا جانتی ہو؟" اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"دو سال ہوانا میں برلن سے پہنچنے والے ایک جہاز پر دیکھا تھا اس نے مجھے......"

"اور فریفتہ ہو گیا۔" وہ قطع کلامی کرتے بولا۔

"ہاں!! ہم کئی ماہ ایک ساتھ رہے تھے۔ میں حاملہ بھی تھی لیکن سات ماہ بعد ہمارا بچہ اس دنیا میں آنے سے قبل ہی ختم ہو گیا۔" اس نے ضبط سے کہا۔ "یہ اسقاط جبری تھا۔ مجھے اس کے لیے مجبور کیا گیا تھا۔"

"ہم!! اس کے بعد تم فلوریڈا آئیں اور کاسترو کے خلاف سرگرمیوں میں مشغول ہو گئیں...... لیکن تمھارا انتقام تو ادھورا ہی رہا۔" اس نے طنزیہ کہا۔

ماریتا خاموش رہی۔ وہ جانتی تھی کہ جلد ہی بلی تھیلے سے باہر آجائے گی۔ اور یہی ہوا۔

اس افسر نے اسے اپنی تنظیم میں شمولیت کا پروانہ تھماتے ہوئے فیدل کاسترو کی موت کا ہدف دیا تھا۔ اسے کچھ زہریلی گولیاں کاسترو کے کھانے میں تحلیل کرنی تھیں۔

کیوبا روانگی کے بعد کاسترو سے تجدید تعلق میں اس کے دل میں نہاں محبت ایک بار پھر بہت شدت سے جاگزیں ہو گئی۔ فرض اور محبت کی ایک شدید جنگ میں محبت جیت گئی۔

وہ اس شاندار انسان کو سازش اور انا پرست حکمرانوں کی بھینٹ نہ چڑھا سکی اور اسے اپنی آمد کا اصل مدعا بیان کر دیا۔ اس کے بعد ماریتا نے جزیرہ چھوڑ دیا اور تنظیم کے ارکان کو ناکامی کی من گھڑت کہانی سنا کر بمشکل اپنی گلوخلاصی کروائی۔

فیدل کاسترو کی خوش قسمتی نے اسے ایک نئی زندگی عطا کی تھی۔ اس سازش کے بعد اس نے امریکی حکومت کو مزید رگیدنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

جنوری 1961 میں اس نے ہوانا میں امریکی سفارت خانے کو اپنے کارکنان میں کمی کا حکم جاری کر دیا۔ اسے یقین کی حد تک شبہ تھا کہ یہ 300 افراد کیوبا میں غیر ملکی جاسوس ہیں۔ اس ذلت آمیز رویے کے بعد امریکا نے اس سے اپنے سفارتی تعلقات منقطع کر دیے۔

سی آئی اے کی پشت پناہی کی بدولت بندرگاہوں پر موجود جہاز، کانیں اور کارخانے مسلسل تباہی کا شکار ہو رہے تھے۔ اس ایجنسی کی حکمت عملی اور مداخلت Bay of Pigs کے تاریخ ساز معرکہ پر منتج ہوئی۔

اپریل 1961 میں امریکی صدر جان ایف کینیڈی کی توثیق کے بعد 1400 پیراملٹری فورس کے جوان طلب کیے گئے۔ اس سپاہ میں پانچ پیادہ اور ایک چھاتہ بردار لشکر تھا۔ گوئٹے مالا میں بنیادی منصوبے سے آگاہی کے بعد انھیں تیرہ اپریل کو ایک کشتی کے ذریعے کیوبا روانہ کر دیا گیا۔

دو دن بعد سی آئی اے کے آٹھ B-26 بمبار طیاروں نے کیوبائی فضائی حدود کی خلاف ورزی کرنے کے بعد کچھ نقصانات پہنچاتے ہوئے واپس لوٹ آئے، غالباً وہ بحری حدود کی طرف سے افواج کا ذہنی ارتکاز منتشر کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کاسترو امریکی عزائم بھانپ چکا تھا۔ اس نے اپنے عوام اور افواج سے برملا کہا:

"ہم نے غاصبین اور سرمایہ دارانہ نظام کی ناک تلے اشتراکی ریاست کے قیام کے بعد انھیں جو زخم دیا ہے، اس کی تڑپ انھیں مدتوں بے چین رکھے گی۔ طاقت کے نشے میں چور یہ سپر پاور ریاست ہماری یہ 'گستاخی' کبھی معاف نہیں کرے گی۔ یہ بہت جلد ہمیں تر نوالہ سمجھتے ہوئے ایک بھرپور حملہ کریں گے۔"

اور ہوا بھی یہی......

سولہ اپریل کی رات حملہ آور بے آف پگس میں داخل ہو گئے۔ ابتدائی طور پر انھوں نے ایک مقامی بے قاعدہ فوج کا گھیراؤ کر لیا۔ 'جوس ریمن فرنینڈس' کی قیادت میں کیوبائی فوج بھی میدان میں اتر آئی۔ کاسترو نے اس آپریشن کی کمان اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن عالمی افق پر امریکی مداخلت ظاہر ہوتی دیکھ کر صدر کینیڈی نے اس مہم کے لیے مزید فضائی امداد کی فراہمی سے انکار کر دیا۔

حملہ آور فوج کے جہازوں اور کمک پر بمباری کے بعد 20 اپریل کو کاسترو نے انھیں ہتھیار ڈالنے کے لیے مجبور کر دیا۔ 1189 باغی فوجیوں کی گرفتاری کے بعد انھیں صحافیوں کے ایک پینل کے حوالہ کر دیا گیا۔ وہ انھیں کسی خفیہ عقوبت خانے میں تفتیش کے لیے منتقلی کی بجائے ٹیلی ویژن پر براہ راست مواخذہ کے ذریعے عالمی برادری کے سامنے سچائی ظاہر کرنا چاہتا تھا۔

25 اپریل کے اس تاریخی مواخذہ کے بعد چودہ افراد کو مبینہ طور پر مقدمات کی سماعت کے لیے جیل بھیج دیا گیا اور باقی

Downloaded From http://paksociety.com

ماندہ 25 ملین ڈالرز کے مساوی خوراک اور ادویات کے بدلہ میں رہا کردیے گئے۔

اس واقعہ کے بعد فیدل کاسترو لاطینی امریکا کا ہیرو بن گیا۔عوام کے دلوں میں اس کی قدر و قیمت' احترام اور مقبولیت میں راتوں رات کئی گنا اضافہ ہوا تھا۔ بظاہر افسانوی نظر آنے والی اس کامیابی نے اس کا کردار مکمل واضح کردیا تھا لیکن اب بھی کیوبا میں ایک طبقہ ایسا موجود تھا جو اس سے ناخوش تھا۔حملہ کی تفتیش کے لیے کچھ مقامی مڈل کلاس افراد کی وقتی گرفتاری نے انھیں سیخ پا کردیا اور وہ اپنے اثاثے سمیٹے امریکا منتقل ہوگئے۔

ملکی سالمیت کے پیش نظر اس نے MR-26-7 اور پاپولر سوشلسٹ پارٹی کو سرکاری درجہ عطا کر دیا۔ Integrated Revolutionary Organizations (Organizaciones Revolucionarias Integradas – ORI), نے 1962 میں اشتراکی نظام کی تقویت کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کرنا شروع کردیا۔سوویت یونین سے کاسترو کے تعلقات میں ہر گذرتے دن کے ساتھ مزید گہرائی آتی جارہی تھی۔فیدل تو کاسترو کی تعلیم ماسکو ہی میں مکمل ہورہی تھی۔اشتمالی ماہر فنون کی جزیرے میں آمد کے بعد اسے Lenin Peace Prize سے نوازا گیا۔یہ خصوصی اشتمالی ایوارڈ 'ولاڈی میر لینن' کی تکریم میں امن وآشتی کے لیے کوشاں افراد کو دیا جاتا تھا۔اس نے مصلحت کا چولہ اتار دیا تھا اور اپنے مارکسی نظریات وافکار کا اب برملا اعتراف کرتا۔

''وہ اشتراکیت کو ناکام قرار دیتے ہیں لیکن کوئی مجھے بتلائے تو...... ایشیا' افریقا اور لاطینی امریکا میں سرمایہ داروں نے ترقی کے کون سے جھنڈے گاڑے ہیں؟''

فیدل کاسترو دیگر لاطینی امریکی ریاستوں میں بھی اشتراکی انقلاب کے لیے پر تولنے لگا۔امریکا نے اپنے اتحادی تجارتی ممالک پر دباؤ بڑھا کر کیوبا کو اس تجارتی تنظیم سے بے دخل کردیا۔چینی حکام نے کاسترو کے اس نئے اقدام کی بھرپور حمایت کی تھی ۔ چین اس گوریلا سے روابط بڑھانا چاہتا تھا مگر سوویت یونین کی جانب اس کا جھکاؤ بدستور برقرار رہا۔اشتمالی اسے بھرپور معاشی اور عسکری امداد فراہم کرتے تھے۔

☆☆☆

ORI کی محنت اور لگن سے کیوبا ایک نئے دور میں داخل ہورہا تھا اور سوویت یونین کے نقش قدم پر چلتے ملک میں اصلاحات اور تبدیلی کی ایک واضح لہر اٹھی۔ بدخواہوں کے لیے ترقی کا یہ تناسب کیوبا میں بنیادی انسانی حقوق کی پامالی تھی۔

کاسترو اپنے مخالفین کو نظر انداز کرنے کی علت کا قائل ہی نہ تھا' اس لیے ہر مخالف کی زبان بندی ترجیحی بنیادوں پر ہوتی۔

''اختلاف رائے رکھنے والے افراد کی ہلاکت میں جلد بازی مت کیا کرو فیدل!! یہ تمہارے شخصی تاثر کے لیے منفی اثرات پیدا کریں گی۔'' اس کے جانثار اکثر مشورہ دیتے۔

''ان مخالفین کی ڈوریاں کہیں اور سے ہلائی جاتی ہیں۔ میرے عوام مجھ سے بہت خوش ہیں۔اور جو خوش نہیں' وہ لازماً دل میں بغاوت کے ارمان دبائے بیٹھے ہیں، بغاوت کی سزا موت ہے،صرف موت۔'' وہ دوٹوک جواب دیتا۔

عوام اپنے اس نئے رہنما کی جرأت اور دلیری سے حقیقتاً بہت خوش تھے۔کیوبا میں ناسور کی طرح پھیلی سماجی برائیوں کا خاتمہ بھی اسی کی بے خوف فطرت اور مضبوط قوت ارادی کا کمال تھا۔اس نے سب سے پہلے عصمت فروشی پر بند باندھے۔

''یہ بے ضرر عورتیں تو خود معاشرے کی ستائی ہوتی ہیں۔ان کے کاروبار کو کیوں بند کررہے ہو؟'' راول نے استفسار کیا۔''صدیوں سے محض جنسی تسکین کا ایک ذریعہ رہی ہیں۔جنس جبلت ہے...... انسانی جبلت پر قدغن غیر فطری ہے۔''

''یہی تو ایسے ہے برادر!! اب یہ محض جنسی تسکین کا ذریعہ نہیں رہیں۔عیار اور کم ظرف دشمن انھی کو ہتھیار بنا کر ہمارے ملکی رازوں تک سرنگ بناتا ہے۔ان میں سے کئی ایک باقاعدہ تربیت یافتہ جاسوس ہوتی ہیں۔''

قحبہ خانوں کے بعد اس کا اگلا ہدف ہم جنس پرست افراد کے ہوش ٹھکانے لگانا تھا۔معاشرے سے اس ناسور کے خاتمہ کے لیے اس نے ان پر جبری مزدوری لاگو کردی۔

سماجی بہبود میں کامیابی کے برعکس اسے معاشی میدان میں بہت سی کٹھنائیوں کا سامنا تھا۔1922 میں کیوبائی معیشت شدید تنزلی کا شکار تھی۔دوسری جانب وہ ذاتی سطح پر بھی تنہائی کا شکار تھا۔اس کے مقرب خاص چیگوارا کا ذہنی میلان چین کی جانب ہونے لگا۔

''اشتمالی ہماری مدد تو کرتے ہیں فیدل!! لیکن انھیں

Downloaded From http://paksociety.com

اپنی طاقت کا بہت گھمنڈ ہے اور مجھے خدشہ ہے کہیں دو ہاتھیوں کی لڑائی میں ہماری ریاست متاثر نہ ہو جائے۔'' اس کی منطق سے کاسترو فی الوقت متفق نہ تھا لیکن اس نظریاتی اختلاف نے ان دونوں میں خاموشی کی ایک چادر تان دی۔

☆☆☆

چیگو ارا کا خدشہ بہت جلد حقیقت کا روپ دھار گیا۔

سوویت یونین عسکری لحاظ سے 'نیٹو' سے کمزور سمجھا جاتا تھا اور یہ کمزوری ان کے اعصاب پر بری طرح حاوی تھی۔ اس لیے وہ ایک نئی حکمتِ عملی لیے کاسترو کو قائل کرنے کی کوششوں میں مگن تھے۔

اشتمالی صدر نکیتا خرشف سوویت طرز R-12 MRBM جوہری میزائل کیوبا میں نصب کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ طاقت کا توازن قائم رکھا جا سکے۔ کاسترو اس معاملہ کی توثیق کے لیے قدرے متذبذب تھا تاہم خرشف اسے یقین دہانی کروانے میں بالآخر کامیاب ہو گیا کہ یہ اقدام اشتراکیت کو بہت تقویت دے گا۔

میزائل کی تنصیب مکمل طور پر خفیہ رکھی گئی تھی، کاسترو برادران کے علاوہ کیوبا کے سیکیورٹی چیف ہی اس صورتِ حال سے آگاہ تھے۔ لیکن امریکا کی جدید فضائی نگرانی سے میزائل اوجھل نہ رہ سکا۔ امریکی صفوں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ جوہری جنگ کا خطرہ سر پر منڈلاتے دیکھ کر انھوں نے اس معاملہ کو خوب اچھالا۔ عالمی برادری میں بھی سراسیمگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

خرشف نے اس موقع پر امریکی صدر سے خفیہ مذاکرات میں کاسترو کو مکمل نظر انداز کر دیا۔ کیوبا میں مزید دراندازی نہ کرنے کی یقین دہانی کے علاوہ امریکا اٹلی اور ترکی میں نصب اپنے MRBM میزائل ہٹانے کے لیے رضامند ہو گیا۔

اشتمالیوں کی اس طوطا چشمی نے کاسترو کا اعتماد پہلی مرتبہ مجروح کیا تھا۔ طیش اور غضب کے باوجود وہ مصلحتاً خاموش رہا۔ امریکا سے اس کی سرد جنگ کسی بھی طور کم نہ ہو رہی تھی۔ وہ متواتر کیوبائی حدود کی خلاف ورزی کرنے اور باغیوں کی تربیت میں مصروف تھے۔ معاشی پابندیوں میں بھی رتی بھر نرمی نہ آئی۔

مئی ۱۹۶۳ میں خرشف کی ذاتی دعوت پر کاسترو نے سوویت یونین کے چودہ شہروں کا دورہ کیا۔ اسے ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی سے اعزازی ڈاکٹریٹ ڈگری کے علاوہ Order Of Lenin ایوارڈ بھی دیا گیا۔ یہ خصوصی اشتمالی ایوارڈ' اشتراکی ہیرو' کو دیا جاتا رہا ہے۔ R-16 انٹرکانٹی نینٹل بیلاسٹک میزائل کے معاہدہ پر دستخط کے بعد وہ بہت سے نئے خیالات اور محرکات لیے وہ کیوبا واپس آ گیا۔ سوویت اخبارات کی طرز پر اس نے Revolución and Hoy کے متبادل Granma کا آغاز کیا۔ اس کے بعد کھیلوں میں سرمایہ کاری میں حیران کن اضافہ دیکھنے میں آیا۔

سرمایہ کارانہ نظام کے آلہ کار اس کی حکومت کمزور کرنے کے لیے شورشیں برپا کیے رکھتے۔ کاسترو ان مخالفین کو کسی قسم کی کوئی رعایت نہ دیتا۔ کئی ایک مذہبی پیشواؤں اور مبلغین کے امریکی حکومت سے خفیہ روابط سامنے آئے تھے۔ وہ عوام کو ملکی انتظامیہ کے خلاف بھڑکانے کے لیے مامور تھے۔ ان کے عہدے اور تکریم بالائے طاق رکھتے ہوئے فیدل نے انھیں قید کر دیا۔

زندگی کے اس موڑ پر حکومتی معاملات اور الجھنیں ہی کم نہ تھیں کہ ایک اور افتاد آن پڑی۔ اس کی والدہ نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ ماں کی جدائی عمر کے کسی بھی حصہ میں ہو، زندگی یکسر بدل دیا کرتی ہے۔ کاسترو بھی تبدیلیوں کی زد میں آ گیا۔ اس کی ذاتی زندگی کی بابت کیوبا پریس میں شائع ہونے والی یہ آخری خبر تھی۔

☆☆☆

1964 کا آغاز بہت سنسنی خیز تھا۔

دو ماہ قبل امریکی صدر جان ایف کینیڈی کا قتل ہو چکا تھا اور کاسترو بخوبی جانتا تھا کہ اس بہیمانہ ہلاکت کی ذمہ داری جلد یا بدیر اشتراکی حکومت پر ضرور عائد ہو گی۔ وہ سوویت یونین سے اس صورتِ حال کے متعلق ایک جامع لائحہ عمل تشکیل دینے کے لیے ماسکو روانہ ہو گیا۔ سوویت یونین کی طوطا چشمی سے قطع نظر ان کے تجارتی اور عسکری روابط میں کبھی تعطل نہ آیا تھا۔

وقت مزید کچھ آگے سرکا تو کیوبا کی خارجہ پالیسی میں مزید سختی در آئی۔

وہ اپنی ملکی سالمیت اور خود مختاری کے حوالے سے کسی قسم کے سمجھوتا کو غداری اور ملکی قدرتی وسائل سے مستفید ہونا محض اسی قوم کا حق تصور کرتا۔ کاسترو کے اس دلیرانہ بے خوف رویہ نے لاطینی امریکا کی دیگر ریاستوں پر بھی بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ غربت' استحصال' بدعملی' سرمایہ دارانہ نظام سے گھری یہ ریاستیں بد ترین حالت میں

Downloaded From http://paksociety.com

تھیں۔ بولیویا، ارجنٹائن، پیرو جیسے کئی ممالک میں اس نے اپنے گوریلا لشکروں کو روانہ کیا۔

افریقا سرمایہ دارانہ نظام کی سب سے کمزور کڑی تھی۔ اور کاسترو اسی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر جبر کی چکی میں پس رہے ان سیاہ فاموں کی زندگی میں انقلاب برپا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے چیگوارا کو کنشاسا روانہ کردیا تاکہ مغربی سامراجیت سے برسرپیکار گروہوں کو گوریلا جنگ کی تربیت دے سکے۔

کنشاسا کی مسافت چیگوارا کی زندگی کا آخری سفر ثابت ہوا۔ سی آئی اے کا وار اس دفعہ کامیاب رہا اور اکتوبر 1967 میں بولیویا کے باغی گروہوں نے کاسترو کے اس دست راست کا خاتمہ کردیا۔ اس کی موت کیوبا اور کاسترو کے لیے ناقابل تلافی نقصان تھی۔

لاطینی امریکی ریاستوں میں انقلابی شعور اجاگر کرنے کے لیے اس نے 'سہ براعظمی کانفرنس' کی بنیاد رکھی۔ افریقا' ایشیاء اور لاطینی امریکا پر مشتمل اس کانفرنس کا مقصد مغربی تسلط کے خلاف آگہی تھی۔ سرمایہ دارانہ نظام کسی جونک کی طرح ان ممالک کے وسائل کا خاتمہ کررہا تھا اور کٹھ پتلی حکمران خاموشی سے اپنے ہی آشیانے کی جڑیں کھوکھلی ہوتے دیکھ رہے تھے۔

بے باکی فیدل کاسترو کی ذات کا ایک ایسا وصف تھی جو اسے ہمیشہ باطل کے خلاف حق گوئی پر مائل رکھتی۔ امریکا کے بعد اس نے اشتمالیوں کی غلط حکمت عملیوں کو واضح تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ اس نے سوویت یونین کے اس جوہری معاہدے کی بھی کھل کر مخالفت کی جس کے تحت وہ پسماندہ ممالک کے دفاع کا واحد رستہ بھی بند کردینا چاہتے تھے۔

☆☆☆

مشکلات اس کے اقتدار کی دیرینہ ساتھی تھیں۔

جنوری 1969 میں اس کی حکومت نے ایک دہائی سفر کی تکمیل کرلی۔ اس سال سمندری طوفان کے باعث فصلوں کی تباہی نے ایک نئی مشکل کھڑی کردی۔ برآمدی کوٹہ مکمل کرنے کے لیے عوام نے اس کی درخواست پر اپنی تعطیلات میں بھی بہت محنت اور لگن سے کام کیا۔ لیکن ہدف تک رسائی نہ ہوسکی۔

فیدل کاسترو نے ایک عوامی اجتماع میں اس صورت حال کے بعد مستعفی ہونے کی پیشکش کردی۔ عوام نے یہ فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ وہ اس کے مداح تھے' اس کی لگن اور سماجی نظام میں اصلاحی تبدیلیوں کے بعد محض معاشی مسائل کے باعث اس جری رہنما سے محرومی ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔

اس کی کوششوں سے شرح خواندگی کے قابل رشک اضافہ' طبی میدان میں بہتری' سڑکوں اور گھروں کی تعمیر اور براہ راست جمہوریت کی پالیسی کے بعد غاصبین کی آنکھوں میں للکارنے کیوبائی قوم کو فخر اور ملی غیرت کے ایک نئے مفہوم سے روشناس کرایا تھا اور اب اس مشکل گھڑی میں وہ پوری قوت سے اس کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے تھے۔

☆☆☆

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی...' پیش کیا جارہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کرسکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہاکر سے بک کروالیں

Downloaded From http://paksociety.com

اغیار کی کینہ پروری اور سازشوں کے ساتھ کاسترو نے اپنوں سے بھی ہمیشہ کئی نقصانات برداشت کیے تھے۔ مبلغین، متوسط طبقہ کی بے حسی اور آسائشات کی خاطر ہجرت کرنے والے عوام کے بعد اب ایک ایسا طبقہ بھی اس کے مخالف آ کھڑا ہوا تھا جسے کسی بھی معاشرے میں حساس اور با شعور تصور کیا جاتا ہے۔ ہیبر ٹو پیڈیلا جیسے کچھ شاعر اپنے قلم کی کاٹ اشتراکی نظام کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کاسترو کا شخصی تاثر عوام کے دلوں میں بہت مضبوط تھا۔ اس نے پیڈیلا کو گرفتاری کے بعد قید میں بھیج دیا جس پر عالمی برادری اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔

پیڈیلا کو رہائی تو دے دی گئی لیکن مستقبل میں ایسے کسی بھی ناخوشگوار واقعہ سے بچاؤ کے لیے اس نے 'قومی ثقافتی کونسل' قائم کر دی تاکہ دانشور اور فنکار انتظامیہ کے زیر اثر رہیں۔

اشتراکیت کی مضبوطی اور کیوبا کو معاشی بحران سے نکالنے کے لیے وہ ہر ممکن کوشش میں جتا تھا۔ الجیریا، بلغاریہ، ہنگری، جرمنی، پولینڈ، چیکوسلواکیہ، سوویت یونین سے تعلقات میں بہتری اور معیشت کے استحکام کے لیے اس کے سرکاری و نیم سرکاری دوروں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ان ممالک کے عوام کے دلوں میں بھی اس کے لیے بے حد تکریم تھی۔ فیدل کاسترو بغاوت و جرات کی ایک عالمگیر علامت بن چکا تھا۔ اس کے حامی ممالک نے اسے کئی ایوارڈز دیے۔

ستمبر 1973 میں 'الجزائر' میں ہونے والی Non Aligned Movement کی چوتھی سربراہی کانفرنس میں اس نے کیوبا کی نمائندگی کے لیے شرکت کی لیکن کانفرنس کے کئی اراکین کو اس کی موجودگی پر تحفظات تھے کیونکہ تنظیم کے قانون کی رو سے کسی بھی 'پاور بلاک' سے منسلک ملک اس کا حصہ نہیں بن سکتا تھا۔ اس وقت کوئی بھی نہ جانتا تھا کہ وہ کس مقصد کے پیش نظر اس اجلاس میں شرکت کے لیے آیا ہے۔ اس کے ایک خصوصی اعلان اور مطمع نظر نے سبھی کو ساکت کر دیا تھا۔

فیدل کاسترو 'امریکی جبر اور لاقانونیت' کی ایک زندہ مثال 'اسرائیل' کو تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔ ان دونوں ممالک کے خصوصی روابط کے علاوہ اسے عربوں کی مظلومیت پر شدید تحفظات تھے:

''اس ملک کی بنیاد جبر، ظلم اور انسانیت کی بے حرمتی پر رکھی گئی ہے بلکہ میں تو اسے ملک کہوں گا ہی نہیں۔ یہ امریکی فرعونیت کا مجسم وجود ہے۔ فلسطینیوں پر اسرائیلی ظلم و تشدد کسی بھی قانون اور مذہب کی رو سے جائز نہیں۔ مجھے اور میرے ملک کے عوام کو اسرائیل سے سیاسی، معاشی، ثقافتی کسی بھی قسم کا کوئی تعلق درکار نہیں۔''

فیدل کاسترو کے اس فیصلہ، سوچ اور حق گوئی نے کئی عرب ممالک کا دل جیت لیا۔ لیبیا کے صدر 'معمر قذافی' سے اس کے گہرے دوستانہ تعلقات نمو پانے لگے۔ اکتوبر 1973 میں اسرائیل اور عرب اتحادی ممالک میں ہونے والی 'حرب تشرین' میں اس نے کیوبا سے 4000 افراد کا لشکر ملک شام کی اسرائیلی دراندازی سے سرحدی حفاظت کے لیے روانہ کیا۔

امریکا کے بعد اب اسرائیلی انتظامیہ بھی اس سے خار کھانے لگی تھی۔

☆☆☆

کئی سالوں سے جمود کی شکار کیوبائی معیشت میں بالآخر ایک ہلچل نظر آئی۔

1974 میں عالمی منڈیوں میں چینی کی قیمت کے اضافہ سے معاشی تنزلی ختم گئی۔ کینیڈا، ارجنٹائن اور مغربی یورپ سے تجارتی روابط میں بہتری کی صورت پیدا ہونے لگی۔ لاطینی امریکا کے کئی ممالک اب کیوبا کو Organization Of American States میں دوبارہ شامل کرنے کے خواہاں تھے۔ امریکی اسٹیٹ سیکرٹری 'ہنری کسنجر' کی سفارش پر 1975 میں یہ مطالبہ تسلیم کر لیا گیا۔

کیوبا اب سرکاری طور پر ''اشتراکی ریاست'' قرار دی جا چکی تھی۔ ملک میں ایک نیا آئین متعارف کروایا گیا جس کے بعد 'وزارت عظمٰی' اور 'صدارت' کا خاتمہ ہو گیا۔ نئے آئین کے تحت تشکیل پائی جانے والی حکومت میں بھی کاسترو ہی اختیارات پر غالب تھا۔ 'کونسل آف اسٹیٹ' اور 'کونسل آف منسٹرز' کی صدارت سنبھالنے کے بعد وہ 'ریاستی' اور 'حکومتی' سربراہ بن گیا تھا۔

ملکی سیاست کے استحکام کے ساتھ وہ عالمی سیاست میں بھی اپنا اثر و رسوخ بڑھانے لگا تھا۔ اس کا خصوصی ہدف افریقی ریاستیں تھیں، جہاں امریکی سرمایہ دارانہ نظام ان کے وسائل کا بھرپور استحصال کرتا آیا تھا۔ انگولا، موزمبیق، گنی بساؤ کے سربراہان سے اس کے تعلقات مثالی تھے۔ کسی بھی قسم کی عسکری صورتِ حال میں وہ ان ممالک میں اپنے تربیت یافتہ

Downloaded From http://paksociety.com

لشکر روانہ کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتا۔ الجزائر، تنزانیہ، لیبیا، صومالیہ کے عوام ہمیشہ اس کا والہانہ استقبال کرتے۔ غیر ملکی تسلط کے خلاف کاسترو کی مزاحمت ان کے لیے روشنی و ہمت کا ایک ایسا مینار تھی، جس کے زیرِ اثر ان کی زندگیوں میں مثبت اندازِ فکر اور بھرپور ہمت در آئی تھی۔

فیدل کاسترو غریب اور کچلے ہوئے طبقات کا 'ہیرو' بن چکا تھا۔

لاطینی امریکا میں انقلابی تحریکوں کے لیے اس کی عملی مدد میں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہا۔ امریکی حکومت کے لیے اب پانی سر سے بلند ہوگیا تھا۔ جولائی ۱۹۷۹ میں کاسترو کے مخالف عناصر نے اس کی عسکری معاونت کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

''کیوبا کی معیشت میں سالہا سال گذرنے کے باوجود استحکام پیدا نہیں ہوسکا۔ ایسی صورت میں قیمتی افواج کو اغیار کی خدمت کے لیے روانہ کر دینا سراسر ریاستی وحکومتی نا اہلی ہے۔'' مخالفین کا واویلا جاری تھا۔

''اقتدار کی مسند پر بیٹھا انسان اپنے گھروں میں دبکے عوام کی نسبت ان فیصلوں کے عوامل زیادہ بہتر جانتا ہے۔'' کاسترو اپنا چٹانی موقف برقرار رکھے ہوئے تھا۔

''تقریباً چودہ ہزار قیمتی عسکری جانیں پرائی آگ کا ایندھن بن چکی ہیں۔ فیدل کاسترو کیوبا کو یرغمال بنائے ہوئے ہے۔'' وہ ان افراد کو طفلِ ناداں سے زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا۔

دوسری جانب امریکا بھی اس کے ان اقدامات پر خوب بلبلا رہا تھا۔

''کاسترو کو ان اقوام کے ملکی معاملات میں مداخلت کا کوئی حق نہیں، ان کے ذاتی جھگڑوں میں کود کر وہ اپنے ہی مصائب میں اضافہ کر رہا ہے۔'' آئے روز کم وبیش ایسے ہی بیانات اخبارات اور برقی میڈیا کی زینت بنتے۔

''کیوبائی حکومت کو پند و نصائح سے بہتر ہے امریکا اپنے انتظامی معاملات پر نظر ثانی کرے۔ کیونکہ یہی مداخلت وہ خود بھی کئی ممالک میں کرتے رہتے ہیں اور کئی دہائیوں سے کرتے آرہے ہیں۔'' کاسترو کا دوٹوک موقف ان کے لیے واضح 'شٹ اپ کال' تھا۔

اور یہ 'جرأت' صرف وہی کرسکتا تھا۔

☆☆☆

1979 میں Non-Aligned Movement کا اجلاس 'ہوانا' میں منعقد ہوا اور کاسترو کو اگلے تین سال کے لیے اس تحریک کا صدارتی عہدہ تفویض کر دیا گیا۔ اسی سال اکتوبر میں اس نے کیوبا اور NAM کے صدر کی دہری حیثیت سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کی اور اپنے بے باک اندازِ گفتگو سے ایک تاریخی تقریر کی۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام کی عدم مساوات اور معاشرتی تفاوت سے شدید نالاں تھا۔ اس کے الفاظ پسماندہ ممالک کے عوامی کرب کا ایک نوحہ تھے۔

''انسانی حقوق کے بارے میں اکثر و بیشتر بحث و مباحثے کیے جاتے ہیں لیکن انسانیت کے حقوق کا کبھی کوئی ذکر نہیں کرتا۔ اس دنیا میں عدم مساوات کا کلیہ کیوں لاگو کر دیا ہے؟ ایک مخصوص طبقہ کو پُرآسائش کاروں میں سفر کے قابل بنانے کے لیے دوسرا طبقہ برہنہ پاؤں آبلہ پائی کی مشقت کیوں سہتا ہے؟

بااختیار لوگوں کی سترّ سالہ زندگی کے لیے بے بس افراد پینتیس سال میں ہی اپنی زندگی کی بازی کیوں ہار دیتے ہیں؟ ایک طبقہ کی تعیشات کی وجہ سے دوسرا طبقہ غربت کے انتہائی معیار سے بھی نچلی زندگی گذارتا ہے۔

آج میں ان بچوں کی جانب سے سوال کرتا ہوں جن کے پاس کھانے کے لیے روٹی کا ایک ٹکڑا تک نہیں، ان بیمار بچوں کی جانب سے مجسم سوال ہوں جن کے پاس دوائی اور طبی سہولیات موجود نہیں۔ ان کے حقوق اور انسانی وقار کی تردید کب تک کی جاتی رہے گی؟''

اس کے غیر جانبدار طرزِ فکر اور خیالات کو عالمی رہنماؤں کی طرف سے بہت پذیرائی ملی۔ NAM کو توقع تھی کہ وہ جنرل اسمبلی میں سوویت افغان جنگ کی بابت کوئی ایجنڈا پیش کرے گا لیکن اس تقریر نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

کیوبا کے تعلقات اب میکسیکن صدر 'لوئیس ایچیوریا'، کینیڈا کے وزیراعظم 'پیئر ٹروڈو' اور امریکی صدر 'جمی کارٹر' سے قدرے بہتری کی طرف مائل تھے۔ ماضی کے برعکس کارٹر نے کیوبا کے لیے باعزت طریقہ کار اختیار کیا تھا۔ دونوں ممالک کے تعلقات کا سرد گلیشیئر اب پگھلتا محسوس ہونے لگا تھا۔

جمی کارٹر کی کاوشوں کے ردِعمل میں کاسترو نے کیوبا سے جلاوطن کیے گئے افراد کو اپنے رشتہ داروں سے ملنے کا مجاز قرار دے دیا۔ اسے توقع تھی کہ امریکی صدر ان کی معاشی پابندیوں میں کمی اور سی آئی اے کے بے لگام اقدامات کا سد باب کرے گا لیکن امریکی انتظامیہ نے انہیں درخورِ اعتناء نہ

Downloaded From http://paksociety.com

سمجھا۔

اس دور میں چین اور امریکا کے بڑھتے تجارتی روابط کے باعث کاسترو اور چینی انتظامیہ کے تعلقات میں سرد مہری در آئی۔ وہ ان حکام کو مارکسی نظریات سے غداری کا مرتکب دینے لگا۔

☆☆☆

بیسویں صدی کی اسویں دہائی میں عالمی افق پر کئی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔

کیوبا بھی ان تبدیلیوں کی زد میں تھا لیکن یہ صورت حال ان کے لیے خوشگوار بالکل نہ تھی۔ عالمی منڈی میں چینی کی قیمتوں میں مندی کا رجحان تھا۔ ان کی فصلیں تہس نہس ہو رہی تھیں۔ بیروزگاری کے جن نے بوتل سے آزاد ہو کر بہت تباہی برپا کی تھی۔ ہزاروں نوجوانوں کو روزگار کی تلاش کے لیے حکومت نے دوسرے ممالک روانہ کر دیا۔

رقم کا حصول اب ناگزیر حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ انتہائی مجبوری اور بے بسی کے عالم میں کیوبائی حکومت نے سرکاری خزانہ میں موجود نایاب اور شاہکار تصاویر خفیہ طور پر بیچ ڈالیں۔ نہر پانامہ کے ذریعے امریکی برقی آلات کی ناجائز اور غیر قانونی تجارت بھی پروان چڑھنے لگی۔

کیوبا اور کاسترو ایک مشکل ترین وقت سے گذر رہے تھے۔

عوام الناس میں اضطراب اور مایوسی کی کیفیت تھی اور اسی مایوسی میں وہ ترکِ وطن کے لیے ہاتھ پاؤں چلانے لگے۔ دس ہزار مقامی افراد امریکا منتقلی کے لیے پر تول رہے تھے۔ امریکی انتظامیہ نے 3,500 افراد کی آمد کے لیے رضا مندی دے دی۔

کاسترو اس صورتِ حال سے ناخوش تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ ایسے حالات میں ہجرت کرنے والے یہ مقامی لوگ سی آئی اے کے لیے بہت آسان ہدف اور تر نوالہ ثابت ہوں گے اور وہ ان کی ذہن سازی کے بعد انھیں بطور ہتھیار کیوبا ہی کے خلاف استعمال کریں گے۔

امریکا کی جانب سے سینکڑوں ان گنت کشتیاں Mariel Port پہنچ گئیں۔ کاسترو ترپ کا پتا کھیلنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس نے 120000 ذہنی معذور، ہم جنس پرست اور ریاستی نقطہ نظر سے ناکارہ افراد ان کشتیوں پر فلوریڈا روانہ کر دیئے۔

جمی کارٹر کی حکومت واضح عدم استحکام کا شکار ہوئی تھی۔

1981 میں 'رونلڈ ریگن' نے صدارتی عہدہ سنبھال لیا۔ اس کی حکمت عملی اور سوچ کاسترو کے لیے بہت مہلک تھی۔ وہ کسی بھی طریقہ سے اسے کیوبائی حکومت سے بے دخل کر دینا چاہتا تھا۔ سی آئی اے کی سرگرمیوں میں بھی مزید تیزی آ گئی۔

نفرت اور انانیت نے انھیں حیاتیاتی ہتھیاروں کے ذریعہ اس ملک میں ڈینگی بخار اور اس جیسے کئی متعدی امراض پھیلانے کے لیے بھی مائل کر لیا تھا۔ کاسترو اور امریکا کی یہ جنگ ایک نیا موڑ لے چکی تھی۔

☆☆☆

اس مشکل وقت میں بھی اس کی جانب سے افریقا سمیت کئی دوسری ریاستوں کی عسکری امداد میں کوئی تعطل نہ آیا۔ ملکی خزانے اور معیشت پر دباؤ اور ایک مخصوص عوامی طبقہ کی کڑی تنقید کے باوجود اس کے ذہن میں اشتراکیت کا عالمی کھلاڑی بننے کی دھن سوار تھی اور یہ جنون صحرائی بگولے کی طرح اس کی زندگی کے نقش و نگار میں واضح تبدیلیاں لاتا رہا۔

سی آئی اے اہلکاروں اور ان کے جارحانہ عزائم سے اس کی آنکھ مچولی بھی جاری تھی۔ وہ اس کی معمولی نقل و حرکت پر بھی بہت گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان کا ہر نیا وار سابق کوشش کی نسبت کئی گنا مہلک ہوتا لیکن قسمت کی ذرہ نوازی ہر بار اسے یقینی موت سے معجزاتی طور پر بچا لیتی۔

کاسترو کو کیوبا کے شفاف پانیوں میں تیراکی بہت مرغوب تھی اور اسی کمزوری کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے پیراکی کا ایک خصوصی لباس پہنچایا گیا جس میں کلوسٹرائڈیم بوچولینم کے زہریلے اثرات شامل تھے۔ اس کے کیمیائی ردِعمل کے طور پر قبض، قے، آنکھوں اور حلق کا فالج ایک لازمی امر تھا۔

اس سازش کے متعلق اس کے 'جاسوسی نیٹ ورک' کی بدولت قبل از وقت آگاہی نے اسے ایک نئی زندگی عطا کی تھی۔

تقاریر کے دوران ایک مخصوص نلکی کے ذریعے زہریلی سوئی سے ہدف کو نشانہ لگانے کے قدیم طریقہ سے بھی وہ کئی بار بال بال بچتا رہا۔ زہریلے سگار، سنائپر رائفلز، بارود سے بھرے بیس بال، میڈیا رپورٹرز کے کیمروں میں پوشیدہ پستول کے علاوہ سرکاری دورہ کے دوران اس کے رہائشی ہوٹل پر بمباری کا منصوبہ بھی سی آئی اے کے شیطانی دماغ ہی کی پیداوار تھے۔

لیکن جسے اللہ رکھے......اسے کون چکھے۔

ان بے شمار کوششوں کے باوجود فیدل کاسترو نے اپنے

Downloaded From http://paksociety.com

اقتدار میں تین دہائیوں کی مسافت طے کرلی اور اس موقع پر اپنی تقریر میں حسب سابق اس نے امریکی حکومت کو رگیدتے ہوئے انھیں 'عصبیت پسند' اور 'جنگی جنون' میں مبتلا قرار دے دیا۔ اسی ضمن میں اس کا ایک انٹرویو بھی خاصا مقبول ہوا جس میں اس نے صدر ریگن کے اپنی ذات پر کیے گئے تبصرے کی دھجیاں اڑادی تھیں۔

ریگن اکثر و بیشتر کاسترو کو 'بے رحم آمر' اور 'ہوس اقتدار کا مریض' کا خطاب دیتا تھا۔ ایک رپورٹر نے آمریت کے متعلق اس سے سوال پوچھا تو اس نے اپنے مخصوص انداز میں اس سے چھیڑ خانی کرتے سوال کا رخ اسی کی جانب پھیر دیا؛

''اگر تمہارے خیال میں آمریت کا مطلب حکمناموں کے تحت حکومت کرنا ہے تو پھر پاپائے اعظم پر بھی یہی دلیل لاگو ہوگی۔ وہ بھی حکم ہی کے تحت حکومت کرتے ہیں وہ بھی آمر ہیں۔'' رپورٹر اس منطق پر ششدر اور لاجواب تھا لیکن کاسترو کے ترکش میں ابھی مزید تیر باقی تھے؛

''صدر ریگن کی بات کرتے ہیں۔ اگر اس کی جمہوری حکومت کو کسی راکشس کی مانند جوہری جنگ برپا کرنے کی اہلیت اور قوت حاصل ہے۔ تو میں تم سے پوچھتا ہوں؟

آمر کون ہے؟

ریاست متحدہ امریکا کا صدر یا میں؟''

اس کی شعلہ بیانی نے امریکی صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا۔ انھوں نے کاسترو اور کیوبا کے سب سے بڑے ہتھیار کو کند کرنے کی ٹھان لی۔

☆☆☆

1985 میں سوویت اشتراکی تنظیم کی کمان 'میخائل گورباشوف' کے سپرد کی گئی۔

بحیثیت مصلح اس نے پریس پر عائد پابندیوں میں کمی... کرتے ہوئے معاشی مرکزیت میں بھی تبدیلیاں پیدا کیں۔ کاسترو سوویت یونین کے ان اقدامات میں پنہاں عزائم بخوبی سمجھ رہا تھا۔ میخائل درحقیقت کیوبا کی مالی معاونت ختم کرنے کی دیرینہ امریکی خواہش تسلیم کر چکا تھا۔

اپریل 1989 میں کیوبا کے دورہ میں میخائل بدلحاظی کی ساری حدیں عبور کر چکا تھا۔

''ہمارا باہمی رشتہ تین عشروں پر محیط ہے اور اب یکدم اس رشتے میں سردمہری اخلاقی اور پیشہ وارانہ فرائض کے خلاف ہے۔''

''ہماری حکومت اس رشتے کا بوجھ اب مزید اٹھانے کی متحمل نہیں۔ افغان جنگ کے بعد کیوبا کو پہلے کی طرح امداد دیتے رہنا سوویت معیشت کے لیے صریح خودکشی ہے۔''

اس نے کاسترو کی ہر دلیل رد کر دی تھی۔ جن پتوں پہ تکیہ تھا وہی اب ہوا دینے لگے تھے۔

وہ بیرونی سازشوں کے علاوہ داخلی معاملات کے شدید بگاڑ سے بھی دوچار تھا۔ ماضی میں امریکی حکومت کئی ریاستوں میں ان کی افواج کے ذریعہ دھڑن تختہ کیا کرتی تھی۔ اسی خدشے کے پیش نظر وہ اپنے فوجی افسران پر عقابی نظریں رکھتا۔ چند فوجیوں کی بدعنوانی اور کوکین اسمگلنگ میں ملوث ہونے کے ثبوت ملتے ہی اس نے فوری پھانسی کا حکم جاری کر دیا۔ وہ گنہگار کو کسی بھی قسم کی رعایت دینے کا قائل ہی نہ تھا۔

انگولا کی رہائی کے لیے اس کی ذاتی دلچسپی اور کاوشیں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ کئی ملکی معاملات نظرانداز ہونے لگے۔

''اس ریاست پر اتنے مائل بہ کرم رہے ہو لیکن حاصل ضرب تو کچھ بھی نہیں ملا۔'' راول کاسترو نے دریافت کیا۔

''مستقبل میں ایک اشتراکی انقلاب ان کی زندگی کا رخ بدل دے گا اور اس کے ثمرات سے لامحالہ طور پر کیوبا بھی مستفید ہوگا۔ جس روز یہ اپنی اصل قوت سے آشنا ہو گئے، سرمایہ کارانہ نظام کی دھجیاں اڑادیں گے۔'' فیدل نے اپنے ذہن میں چلنے والے خیالات کو گویائی دی۔

لیکن عالمی رہنماؤں کو اس جنگ کے مثبت نتیجہ کی فکر تھی نہ ضرورت وہ اس خطے کو یونہی خانہ جنگی میں الجھائے رکھنا چاہتے تھے۔ گورباشف نے امریکی 'اشتمالی' جنوبی افریقی اور کیوبائی سرکردہ رہنماؤں کا ایک اجلاس طلب کیا اور ایک تجویز پیش کی جسے سن کر کاسترو کو پتنگے لگ گئے؛

''انگولا سے سبھی ممالک اپنی افواج واپس بلوا لیں۔ اپنے مسائل سے انھیں خود ہی نمٹنے دیا جائے تو بہتر ہے۔''

''یہ سراسر زیادتی اور ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی ہو گی۔'' کاسترو اپنا غصہ دباتے ہوئے بولا۔

''سیاست میں اپنا مفاد سب سے پہلے مدنظر رکھا جاتا ہے مسٹر کاسترو!! ہمیں اس وقت یہی سب سے بہتر نظر آرہا ہے۔'' اس نے رکھائی سے کہا۔

''تم نسلی امتیاز کی تپش میں جھلسنے والے ان افراد کا کرب اور دکھ نظرانداز کر رہے ہو۔''

''مجھے اس پر کوئی ملال بھی نہیں۔''

طاقت کے نشے میں چور اشتمالی اس وقت اپنے سر پر

Downloaded From http://paksociety.com

منڈلاتے خطرہ سے لاعلم تھے۔

☆☆☆

بیسویں صدی کی آخری دہائی کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔

مشرقی یورپی ریاستوں میں سرمایہ دارانہ نظام بہت تیز رفتاری سے اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔ عالمی تنہائی کے شکار کیوبا کی اشتراکیت کے خاتمہ کی قیاس آرائیاں بھی مغربی حلقوں میں زور پکڑنے لگیں۔

سوویت یونین سے تجارتی روابط میں تعطل سے کیوبا مزید معاشی بدحالی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ پٹرول کی رسد میں شدید کمی ہو گئی۔ ذرائع نقل و حمل کے لیے چینی ساختہ سائیکلوں کی درآمد کے بعد کاروں اور آٹو موبائلز کا استعمال یکسر ختم ہو گیا۔ غیر منافع بخش کارخانے بند کر دیے گئے۔ ٹریکٹر کی جگہ بیلوں نے لے لی۔ کھانا پکانے کے لیے لکڑیوں کا استعمال شروع ہوا اور بجلی روزانہ سولہ گھنٹے کے لیے منقطع کر دی جاتی۔

کیوبا یکسر پتھر کے زمانے میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ دور کاسترو کے لیے بدترین بحران لایا تھا۔ اس نے کسانوں کو بقاء زراعت کی طرف مائل ہونے کی تحریک دی۔ اس طریقہ زراعت میں محدود پیمانے پر صرف اپنے خاندان کی ضروریات کے مطابق غذائی اجناس اگائی جاتی ہیں۔

اگلے دو سال میں کیوبائی معیشت میں چالیس فیصد تنزلی ریکارڈ ہوئی۔ غذائی اجناس کے بعد دیگر بنیادی ضروریات کی بھی شدید قلت تھی۔

دسمبر 1991 میں سوویت یونین تحلیل ہو گئی۔ 'بورس یلسٹن' نے اشتراکیت کے خاتمہ کے ساتھ ہی ری پبلکن نظام حکومت کا اجراء کر دیا۔ اس نئے سربراہ مملکت کے جذبات کاسترو کے لیے بہت منفی تھے۔ اس کے لیے کیوبا سے تعلقات کی تجدید نو محض حماقت تھی۔ کاسترو کے لیے مغربی ممالک کی کیوبا آمد اور انھیں سرمایہ کاری کی ترغیب دینے کے علاوہ اب اور کوئی چارہ نہ تھا۔

1991 میں 'پان امریکی گیمز' کی میزبانی ہوانا کو ملی۔ کھلاڑیوں کے لیے ایک نئے اسٹیڈیم کی تعمیر بظاہر معیشت کے لیے سازگار معلوم نہیں ہوتی تھی۔ لیکن بعدازاں یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوا۔ عوام نے سینکڑوں غیر ملکی صحافیوں کے سامنے فیدل کاسترو کی حمایت میں نعرے بلند کر کے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ طلائی تمغوں کی دوڑ میں کیوبا 'امریکا' کو پیچھے چھوڑ کر یہ اعزاز پانے والی پہلی لاطینی امریکی ریاست بن گیا تھا۔

فیدل کاسترو کی عوامی مقبولیت اس بدترین معاشی بحران اور مشکلات کے باوجود تا حال برقرار تھی۔ اپنے عوام میں ۹۸ فیصد شرح خواندگی اور زندگی جینے کا ایک باوقار انداز سکھانے والا یہ شخص دلوں پر حکمرانی کرتا تھا لیکن گلوں کے ساتھ خار بھی ایک فطری امر ہے۔ کیوبا میں محدود پیمانے پر کاسترو کے خلاف تحریک کا آغاز ہو گیا۔ گلی کوچوں میں احتجاجی مظاہرے ہونے لگے۔ جلا وطن افراد جانے کب سے آس لگائے بیٹھے تھے کہ کسی 'فوجی آپریشن' کے ذریعہ اس اقتدار کا خاتمہ کیا جا سکے۔

اگست ۱۹۹۴ میں لگ بھگ تین سو نوجوان احتجاج کے لیے سڑکوں پر نکل آئے۔ کیوبائی تاریخ میں کاسترو کے خلاف اتنی تعداد میں مجمع کبھی بھی منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ مشتعل افراد پولیس پر سنگ زنی کرنے لگے۔ وہ اس معاشی گھٹن سے آزادی چاہتے تھے۔ امریکی ریاستوں کے دلنشین قصوں کے تصوراتی مناظر ان کی بصارت میں مقید تھے۔ میامی منتقلی میں سرکاری رکاوٹیں سہتے اب وہ بالکل ہی مایوس ہو گئے تھے۔

کچھ ہی دیر میں کاسترو کے حامی بھی اس صورت حال کا حصہ بن گئے۔ یوں لگتا تھا کی خانہ جنگی کی عفریت اب کیوبا کو بھی اپنی لپیٹ میں جکڑ لے گی لیکن فیدل ان نوجوانوں کی 'گمراہی' کی اصل وجہ بھانپ گیا تھا۔ بے روزگاری کے اس دور میں خام اور ناپختہ ذہن اس کے ازلی دشمن کے لیے آسان ترین ہدف ثابت ہوئے تھے۔ مستقبل میں ایسے کسی بھی باغی گروہ کے حملے روکنے کے لیے اس نے ایک نیا دفاعی منصوبہ مرتب کیا۔ ملکی بقاء کو لاحق سرمایہ دارانہ نظام کے گماشتوں کا جنگی جنون اپنے دفاع کی مضبوطی کا متقاضی تھا۔ اس نے بے روزگار نوجوانوں کو بنکرز کی تعمیر اور سرنگیں کھودنے کی اجرت پر مامور کر دیا۔

سرمایہ داری نظام عالمی تجارت پر اس قدر غالب ہو چلا تھا کہ اشتراکیت کی بقاء کو اب شدید خطرات لاحق تھے۔ کاسترو کی دور اندیش نظریں بھی اب کیوبائی سیاست میں کچھ تبدیلیوں اور اصلاحات کی ضرورت محسوس کر چکی تھیں۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد حکومتی سربراہی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اقتدار کا ہما اس سے کہیں کم عمر 'کارلوس لیج' پر مہربان ہوا۔ فیدل کاسترو اب صرف کیوبا کیمونسٹ پارٹی کی صدارت اور سرکاری افواج کے کمانڈر انچیف کا عہدہ سنبھالے ہوئے

Downloaded From http://paksociety.com

تھا۔

اُس کے علاوہ بھی کئی عمر رسیدہ ممبران نے اپنے عہدے کم عمر ہم منصبوں کے سپرد کر دیے۔نئی معاشی اصلاحات متعارف کروائی گئیں۔ چھوٹے پیمانے پرنجی کاروبار اورتجارت کے ساتھ امریکی ڈالرکو بھی قانونی حیثیت دے دی گئی۔ امریکا ہجرت کے لیے بے چین اور غیر مطمئن عوام کے لیے سرحدیں بھی کھول دی گئیں۔ ماضی کے برعکس قومی اسمبلی کے اراکین کا انتخاب صوبائی اسمبلی کی بجائے عوام کوسونپ کر ان کی 'جمہوریت پسندی' کو بھی خاطر خواہ تسکین فراہم کردی گئی۔

ان اقدامات پر تنظیم کے کئی افراد جز بز بھی ہوئے تھے۔

''یہ اصلاحات اشتراکی اقدار کو بہت نقصان پہنچائیں گی۔ برسوں سے ان اصول وضوابط کی خاطر جیتے رہے ہیں۔ اب یکدم اتنی تبدیلیاں کئی عشروں کی محنت پر پانی پھیر دیں گی۔'' ایک رکن نے کہا۔

''ہم ایک ایسی دنیا کے باسی ہیں جہاں سرمایہ دارانہ نظام اپنے پنجے مکمل طور پر گاڑ چکا ہے۔ اس کا یہ قطعی مطلب نہیں کہ ہم ہتھیار ڈال دیں گے لیکن ہمیں حقائق سے چشم پوشی بھی نہیں کرنی ہے۔ انتہائی تحمل سے یہ حقیقت اب تسلیم کرلینی چاہیے۔ ہمارے خیالات' اہداف اور نظریات ہمارا اثاثہ ہیں۔ مجھ پر اور اس حکومت پر اعتماد رکھو۔ یہ سب کچھ اشتراکیت کی بقاء کے لیے بہت ضروری ہے۔'' کاسترو کے موقف نے بے یقینی کی کیفیت میں واضح کمی کردی۔

معیشت کے استحکام کے لیے کیوبا میں بائیوٹیکنالوجی اور سیاحت میں جدت پیدا کردی گئی۔ ہزاروں ہسپانوی اور میکسیکن' کیوبا کے شفاف' خوبصورت قدرتی ساحلوں کی کشش لیے مقامی منفعت میں واضح اضافہ کا سبب بن گئے۔ ان افراد کی آمد سے طوائفوں اور جسم فروشوں کی خوب چاندی ہوئی۔ کاسترو نے سیاسی ردِعمل کے پیش نظر عصمت فروشی کی اس نئی لہر کے خلاف کریک ڈاون وقتی طور پر موخر کردیا۔

دکھ اور آزمائش کی گھڑیوں میں انسان جبلی طور پر اپنے پالنہار سے رجوع کرتا ہے۔ دنیاوی گورکھ دھندوں میں الجھی زندگی اسی کے تصور اور پناہ میں سکون پاتی ہے۔ کیوبا میں بھی معاشی مصائب و مشکلات نے مقامی افراد کو مذہب میں عافیت لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ کئی دہائیوں سے مذہب کو قدامت پسندی تسلیم کرنے والے فیدل کاسترو کے دل میں بھی ایک نرم گوشہ پیدا ہوگیا تھا۔ وہ رومن کیتھولک تھا لیکن مذہبی ٹھیکیداروں کو الہامی قوانین کے ساتھ کھلواڑ کرتے دیکھ کر وہ ایک دہریہ بن چکا تھا۔

اس نے پہلی مرتبہ کیمونسٹ پارٹی کے دروازے مذہبی اداروں اور افراد کے لیے وا کردیئے۔

نوے کی دہائی میں اس کا رجحان ماحولیات کی طرف بھی بڑھتا دکھائی دیا۔ وہ آلودگی اور گلوبل وارمنگ کا بہت مخالف تھا اور اس کے نقطہ نظر سے امریکی ریاست دنیا میں ماحولیاتی آلودگی کی بنیادی وجہ تھی۔ اس نے کیوبا میں ماحولیاتی آگاہی کے لیے ایک خصوصی وزارت قائم کی اور اپنے عوام کو قدرتی وسائل کے بے دریغ استعمال کی ممانعت کرتا رہا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اکیسویں صدی کے آغاز میں اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام میں پائیدار ماحولیاتی ترقی کی صف میں شمار ہونے والا واحد ملک صرف کیوبا ہی تھا۔

جنوبی افریقی سیاہ فام حریت پسند 'نیلسن منڈیلا' فیدل کاسترو کا بہت مداح تھا۔ نسلی امتیاز کے خلاف بے ریا جدوجہد اور موقف کے لیے وہ اس کی بہت قدر کرتا۔ کاسترو نے روئے ارض پر نسلی امتیاز کی زہریلی آبیاری کے لیے بھی امریکا ہی کو ذمہ دار تسلیم کیا تھا۔

کاسترو اور امریکا کی نصف صدی سے جاری اس جنگ نے ابھی کئی موڑ اور لینے تھے۔

☆☆☆

اکیسویں صدی کا سورج بظاہر بہت سی تمنائیں' خواب اور عزائم لیے طلوع ہو چکا تھا۔

لیکن اس دنیا میں کئی خطے اب بھی گذشتہ صدی کے مسائل میں ہی الجھے تھے۔ کیوبا کی معاشی بیڑیاں جوں کی توں برقرار تھیں۔ سوویت یونین کی کنارہ کشی کے بعد کیوبا اور کاسترو مخلص اور ہمدرد حلیف ملک سے تاحال محروم تھے۔ مگر اب اس صورتِ حال میں ایک خوشگوار تبدیلی کی رمق نظر آنے لگی۔

وینز ویلا کا صدر 'ہیوگو شاویز' بھی کاسترو ہی کی طرح سامراجیت کے سخت خلاف تھا۔ جلد ہی ان دونوں میں گہری ذہنی ہم آہنگی پروان چڑھ گئی۔ شاویز کے لیے کاسترو کا وجود 'گرو' اور والد کی طرح معتبر تھا۔ ان دونوں کا الحاق لاطینی امریکی کے لیے بہت سودمند ثابت ہوا۔ 2000ء میں انھوں نے ایک باہمی معاہدے پر دستخط کیے جس نے دونوں ممالک کو خوشحالی کے نئے مفہوم سے آشنا کروایا۔

اس معاہدہ کی رو سے کیوبا نے 20000 افراد پر مشتمل طبی عملہ وینز ویلا روانہ کیا اور شاویز نے انھیں یومیہ 53000 بیرل تیل کی فراہمی یقینی بنائی۔ اگلے چار سال میں

Downloaded From http://paksociety.com

یہ تناسب دگنا ہو گیا۔ 40000 طبی عملے کے افراد اور یومیہ 90000 بیرل تیل دونوں ہی ممالک کے حالات میں نا قابل یقین تبدیلیاں لایا۔ اسی سال ایک مشترکہ میڈیکل پروجیکٹ کی بنیاد رکھی گئی جس میں دونوں اقوام کے 300000 افراد کی آنکھوں کا شافی علاج اور آپریشن کیے جاتے رہے۔

شاویز۔ کاسترو اتحاد نے کیوبائی معیشت میں جادوئی کردار ادا کیا تھا۔ کاسترو نے زندگی میں کبھی بھی موڑ پر اپنے عوام کے صبر، برداشت اور اس پر قوی اعتماد کو کبھی فراموش نہیں کیا تھا۔ وہ حقیقتاً ان کی محبت اور تعاون کا قرضدار تھا اور اب معاشی استحکام کے اس دور میں وہ ان کی مشکلات میں آسانیاں پیدا کرنے کا خواہشمند تھا۔

مئی 2005 میں اس نے 1.6 ملین کارکنوں کی اجرت دگنی کر دی۔ پینشن میں اضافہ کے ساتھ کیوبا کے غریب ترین طبقہ کو باورچی خانہ میں استعمال ہونے والے نئے اوزار فراہم کیے۔ مسائل کا مکمل خاتمہ تو بہرکیف اب بھی ممکن نہ ہو سکا تھا۔ 2004 میں اسے اسٹیل پلانٹ، شوگر ملز اور کاغذ سازی کے 118 کارخانے بند کرنے پڑے تھے۔

عالمی برادری سے اس کے تعلقات میں اتار چڑھاؤ آتے ہی رہتے۔ اس کا اندازِ فکر اور ہٹ دھرم فطرت اکثر ممالک کے سربراہان بمشکل برداشت کرتے۔ بائیں بازو کی لاطینی امریکی ریاستوں سے خوشگوار روابط کے برعکس 2004 میں پانامہ سے اس کے تعلقات منقطع ہو گئے تھے۔ وجہ تنازعہ چار جلاوطن کیوبائی باشندے تھے جو کچھ سال قبل کاسترو کے قتل کی سازش میں ملوث رہے تھے۔ وہ کاسترو کے ہوٹل کو سی آئی اے کی ایما پر بمباری سے نابود کرنا چاہتے تھے

صدر Mireya Moscoso نے انہیں سزا سے بریت دے دی تھی۔ اور کاسترو کبھی کسی مجرم کی بریت کا قائل نہیں رہا تھا۔

فیدل کاسترو کی ذات درحقیقت سخت گیری اور انسان دوستی کا انوکھا ملاپ تھی۔

امریکی ریاست سے نظریاتی اختلافات اور کشمکش میں اس نے کسی بھی قدرتی آفت میں امریکی عوام کی ہمیشہ مدد کی۔ سمندری طوفان سے برپا ہونے والی تباہیاں ہوں یا ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ، کاسترو آزمائش کی ان گھڑیوں میں عوام کی عملی مدد کے لیے بھی کھلے دل سے تیار رہتا۔ القاعدہ کے ان اقدامات کی مذمت میں اس نے امریکی جہازوں کی ہنگامی لینڈنگ کے لیے کیوبا کے ہوائی اڈے کھول دیے تھے۔

وہ امریکا کا سب سے بڑا مخالف تھا تو امریکی خارجہ پالیسی کی ہر جنبش کو قبل از وقت بھانپ کر انہیں آڑے ہاتھوں لینے کی دلیری بھی کہیں کسی اور رہنما میں نہ تھی۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ کے بعد اس کی امریکی جارحیت میں اضافہ کی پیشگوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ عراق پر مسلط کی جانے والی جنگ کی اس نے کڑی مخالفت کرتے ہوئے اسے نیا بین الاقوامی 'جنگل کا قانون' قرار دیا۔

اسی قانون سے نصف صدی تک وہ بے جگری سے برسرپیکار رہتے اس نے اپنی عمر کی نقدی خرچ کر دی تھی۔

☆☆☆

کانفرنس روم میں شدید تناؤ تھا۔

دونوں افراد کے چہروں پر ضبط کے شدید دباؤ کی سرخی چھائی تھی۔

''اپنی ناکامی تسلیم کر لو اب...... حکومتی سرمایہ کاری ڈبونے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تمہاری تنظیم نے۔ ایک شخص کی ہلاکت کا بیڑہ اٹھایا تھا اور آج تک وہ شخص ہمارے سینوں پر مونگ دل رہا ہے۔'' ریاستی سربراہ نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔

''وہ انسان نہیں لوسی فر ہے، ہماری تنظیم سینکڑوں حملے کر چکی ہے مگر ہر بار وہ یقینی موت کو ایسے جُل دیتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔'' سی آئی اے ایجنٹ نے تلملاتے ہوئے جواب دیا۔

''پچھلی نصف صدی میں دسیوں صدور اس سے زچ رہے ہیں۔ اتنی کڑی پابندیوں میں کوئی بھی ملک گھٹنے ٹیک دیتا ہے لیکن گیارہ ملین عوام صرف اسی کی نظر سے دیکھتی ہے اسی کی سماعت سے سب سنتی ہے اور اسی کی زبان سے نکلے ہر لفظ پر عمل کرتی ہے، جادوگر ہے یہ شخص۔''

''ہم بھی نچلے نہیں بیٹھیں گے۔ فیدل کاسترو سے تمام تر سابقہ حسابات چکتے کرنے ہیں۔'' اس بدنام زمانہ تنظیم کی انا پر لگے زخم بہت کاری تھے۔

''خداوندا وہ وقت جلد ہی لائے۔''

کمرے کی فضا بوجھل ہو چلی تھی۔

☆☆☆

کیوبا کا شیر اب بوڑھا ہو گیا تھا۔

قویٰ کمزور اور اعصاب میں لرزش رہنے لگی لیکن جذبہ اور قوت ارادی میں آج بھی روز اوّل جیسا دم خم برقرار

Downloaded From http://paksociety.com

تھا۔مختلف بیماریوں نے اسے بری طرح گھیر لیا۔آنتوں میں جریانِ خون کے باعث اسے سرجری کا مشورہ دیا گیا۔ 31 جولائی 2006 میں اپنی صدارتی ذمہ داریاں اس نے راول کاسترو کے سپرد کر دیں۔

اس کی بیماری اور صدارتی عہدہ سے سبکدوشی مخالفین کے دلوں میں کسی پھوار کی طرح برسی۔سالہا سال اس کی موت کا سامان کرنے والے اس کی صحت یابی کی خبر سن کر اپنے تنفر اور جذبات پر قابو نہ رکھ پائے حسرتِ ناتمام ان کے الفاظ میں منعکس تھی۔

”یقیناً خداوند کریم کبھی ’کسی دن‘ کاسترو کو اپنے پاس بلا ہی لے گا۔“

فیدل کی بذلہ سنجی بھی اس بات پر عود آئی اور اس نے بھی طنزاً کہا:”میں اب سمجھ پایا ہوں کہ ان کے ان گنت قاتلانہ منصوبوں اور سازشوں سے کیسے بچتا رہا...... یقیناً یہ خداوند ہی کی کریمی تھی۔اگر قاتلانہ سازشیں اولمپک کھیل ہوتیں تو میں انھیں شکست دینے پر ان گنت طلائی تمغے حاصل کر چکا ہوتا۔“

فروری 2008 میں اس نے کمانڈر انچیف اور کونسل آف اسٹیٹ کے عہدہ سے بھی استعفیٰ دے دیا۔اس کے حامیوں نے اس امر سے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کا اصولی موقف حسبِ سابق دوٹوک تھا؛

”میرا ضمیر اس دھوکے اور خود غرضی پر مجھے ملامت کرتا رہے گا۔ان عہدوں سے وابستہ ذمہ داریاں نبھانے کی اب مجھ میں سکت نہیں رہی۔میری جسمانی حالت اس بھاگ دوڑ کی متحمل نہیں رہی۔“

صدارت کا یہ عہدہ قومی اسمبلی نے متفقہ طور پر راول کاسترو کے سپرد کر دیا‘ جو اس کی غیر موجودگی میں پیدا ہونے والے خلاء سے بہت مضطرب تھا۔

”اس ملک کو فیدل کے تجربہ اور مہارت سے محروم کرنا بہت بڑی حماقت ہوگی۔اسے اہم ترین امور پر مشورہ سازی کا اختیار تفویض کیا جائے تو ملک کے وسیع تر مفاد کے لیے بہت سودمند ہوگا۔“

راول کی اس تجویز پر 597 قومی اسمبلی اراکین نے متفقہ طور پر منظوری دے دی۔

☆☆☆

سالہا سال زیتونی سبز وردی میں ملبوس‘ ہاتھ میں سگار تھامے مخالفین کی سٹی گم کرنے والا یہ شخص اب زندگی کے ایک نئے پہلو سے روشناس ہونے لگا۔

سبکدوشی کی زندگی مشکل سہی‘ لیکن اس نے اپنے لیے نئی مصروفیات تلاش لی تھیں۔ Granma اخبار میں ذاتی تجربات و مشاہدات پر مبنی کالم Reflections کی اشاعت نے عوام میں بہت مقبولیت حاصل کی۔فیدل کاسترو اپنے عوام کی محبت اور اس کی صحت کے متعلق خدشات سے باخبر تھا۔اس لیے کبھی کبھار اجتماعات میں شمولیت اور خطاب کے دوران وہ اپنے وقتی غیاب‘ بیماری اور مستقبل میں یقینی موت سے خائف نہ ہونے کی بابت ذہن سازی کرتا رہتا۔

قومی اسمبلی سے وداع ہونے کے باوجود وہ اپنے قلب و روح کو وہیں محسوس کرتا۔اس کی زندگی ایک جنگ سے عبارت تھی اور عمر کے آخری حصہ میں بھی اس کا سپاہیانہ ولولہ ماند نہیں پڑا تھا لیکن حقیقت تو یہی تھی کہ بڑھاپا اب سب کچھ ختم کرنے کے درپے تھا۔19 اپریل 2011 میں اس نے کیوبا کمیونسٹ پارٹی کی صدارت سے بھی استعفیٰ دے دیا۔یہاں بھی اس کا جانشین راول ہی قرار پایا۔حکومتی انتظامیہ میں اب اس کا کوئی کردار باقی نہ رہا۔وہ محض ’مدبر سیاستدان‘ کی حیثیت سے برقی میڈیا اور پریس تک محدود ہو گیا۔

دسمبر 2014 میں چینی حکومت نے امریکا کے خلاف اپنی قوم کے مسائل کے پُرامن حل کے لیے ”کنفیوشس پیس پرائز“ سے نوازا۔امریکی انتظامیہ کے لیے اس کے جذبات میں اب بھی وہی شدت تھی۔مارچ 2016 میں ’باراک اوبامہ‘ نے باہمی تعلقات میں سرد مہری کے خاتمہ کے لیے کیوبا کا ایک دورہ کیا لیکن کاسترو نے اس سے ملاقات سے انکار کر دیا اور اسے ایک خط میں اپنا مدعا واضح بیان کر دیا؛

”ہم امریکی ریاست سے کسی بھی تحفہ نما خیرات کے متمنی نہیں ہیں۔“

اگلے ماہ وہ ایک بار پھر اپنی قوم سے ملاقات کے لیے عوامی اجتماع میں موجود تھا۔غالباً اس کی سماعتوں نے دھیرے دھیرے اپنی طرف بڑھنے والی موت کی آہٹیں محسوس کر لی تھیں۔اس لیے کمیونسٹ پارٹی کے اراکین سے اس کی گفتگو اور خطابات میں ایسے کئی واضح اشارے جھلکنے لگے۔وہ اپنے وجود میں روشن انقلابی آگ انھیں منتقل کر دینا چاہتا تھا؛

”عمر کی نو دہائیوں کی مسافت مکمل ہونے والی ہے اور ہر بشر کی طرح میرا یہ سفر بھی موت سے بغلگیر ہو کر اپنے انجام تک پہنچ جائے گا۔کارِ جہاں کبھی کسی کے چلے جانے سے نہیں رکتے، قافلے چلتے رہتے ہیں...... میرے بعد بھی اسی شدت‘ جذبہ اور لگن سے یہ سفر یونہی جاری رہنا چاہیے۔“

Downloaded From http://paksociety.com

زندگی اپنے اختتام سے قبل ہمیشہ اپنے نقطہ آغاز کی طرف پلٹنے کی خواہشمند رہتی ہے۔فیدل کاسترو بھی اس فطری خواہش سے مغلوب ہوگیا اور ہوانا کے ایک گھر منتقل ہوگیا۔
اس نے اپنا کوئی ذاتی گھر تعمیر نہیں کیا تھا۔نجی زندگی صحافتی نمائندوں سے پوشیدہ رہنے کے باعث اکثر قیاس آرائیوں کا بازار گرم رہتا کہ اس نے اپنے لیے کئی شاندار گھر، پرآسائش بجرے عوام کی نظروں سے اوجھل رکھے ہیں۔
وہ اپنی ذاتیات پر کسی بھی تبصرے سے گریز ہی کرتا۔

☆☆☆

کھڑکی سے باہر آسمان پر تاحد نظر بادل چھائے تھے۔
یادوں کا ایک ریلا تھا جو اسے اپنے سنگ بہائے لے جارہا تھا۔ان بادلوں میں اسے ان گنت شبیہات نظر آ رہی تھیں۔راولا در ریمن کے پیچھے بھاگتا دوڑتا ایک تندمزاج لڑکا اسے بہت مانوس لگ رہا تھا۔اس لڑکے کے چہرے اور آنکھوں سے جھلکتی ضد اس کے لبوں پر مسکراہٹ لے آئی۔
اگلے ہی پل وہ لڑکا اسے اپنے کئی دوستوں کے ساتھ کھیلتا کودتا دکھائی دیا۔اور اب بھی اس کی انفرادیت لمبی ریس کے ایک گھوڑے جیسی دکھائی دیتی تھی۔
عہد شباب میں ایک حسین عورت سے شادی اور پیارے سے بچے کی جھلک سے اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔اس کی زندگی میں بے شمار عورتوں سے جنسی تعلقات قائم ہوئے۔کچھ کے ساتھ رشتے کی طوالت صرف ایک رات تک محدود رہی۔محبت اور دیرپا رشتوں کے معاملے میں وہ تہی داماں رہا تھا۔
دور افق پر اسے آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں لیے ایک لڑکی دکھائی دینے لگی۔اس کے نقوش بھی بہت مانوس دکھائی دیتے تھے۔
''یہ کون ہے بھلا؟''اس نے اپنے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے خودکلامی کی۔اور پھر یکدم اس کے ذہن میں جھماکا ہوا اور ایک سرسراتی آواز لبوں سے برآمد ہوئی۔
''الینا فرینڈس۔''
مائرٹا سے علیحدگی کے بعد اس کے تعلقات 'نتالیہ' نامی عورت سے استوار ہوئے تھے۔الینا ان کے اسی تعلق کی نشانی تھی۔1993 میں ہسپانوی سیاح کے بھیس میں الینا نے کیوبا چھوڑ کر امریکا میں پناہ لے لی تھی اور اب بھی اپنے باپ کو سخت تنقید کا نشانہ بناتی۔بیٹی کی طرح اس کی بہن 'ہوانیتا' نے بھی ہمیشہ اس سے نفرت کا رشتہ استوار رکھا تھا۔

یادوں کا یہ سلسلہ دراز ہی ہوتا چلا جارہا تھا۔اپنوں کے چہرے اس کے پردہ بصارت پر اپنی جھلک دکھاتے اور کسی دھوئیں کی مانند تحلیل ہوجاتے۔جارج آنجیل کاسترو،فرانسیسکا کے بعد اسے اپنی دوسری بیوی اور بچے گدگدانے لگے۔انتونیو، آلیجاندرو، الیکس، الیگزینڈر، آنجیل کاسترو سے وابستہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں مگن وہ خودفراموشی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔
شب و روز کا ناقابلِ تغیر سلسلہ جاری تھا۔ایران، جاپان اور پرتگال کے وزراء اس سے ملاقات کے لیے آئے تو ایک اور بڑی تبدیلی نے اسے مضطرب کردیا۔اسے بے اختیار وہ دور یاد آنے لگا جب وہ سیاسی وفود سے رات کے آخری پہر میں ملاقات کرتا۔ان اوقات میں اعصاب پر طاری ہونے والا فطری بوجھل پن اسے مخالفین پر غالب رکھتا تھا۔اس کی اپنی ذات تو نیند جیسی فطری ضرورت سے بھی بآسانی جنگ جیت لیا کرتی۔
سائنائڈ کیپسولز، گولہ بارود، بمباری کے سائے تلے زندگی کی حفاظت کرنے والی موت ایک خوبصورت رتھ پر سوار اسے لینے آگئی تھی۔پچیس نومبر 2016 کی رات کیوبائی عوام کا ہردلعزیز El Caballo (گھوڑا) اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

راول کاسترو کا سرکاری ٹی وی پر اس کی موت کا مختصر اعلان ہزاروں دلوں کے لیے بیک وقت اداسی اور خوشی بن گیا تھا۔ریاست ایک گہرے سوگ میں ڈوب گئی۔لاکھوں افراد اپنے اس غیور رہنما کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے سڑکوں پر موجود تھے۔اور ہر فرد کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا
Yo Soy Fidel (میں فیدل ہوں)
Viva Fidel (فیدل زندہ باد)
فیدل کاسترو ایک سوچ کا نام تھا۔جبر و استحصال میں ابھرنے والی بغاوت کی ایک آواز تھی اور آواز کے نقوش کبھی ختم نہیں ہوتے۔گرد و پیش پر ہمیشہ ثبت رہتے ہیں۔فیدل کاسترو اسی آواز اور انقلاب کی صورت میں اب بھی زندہ تھا۔

ماخذات: وکی پیڈیا
Fidel Castro -Military Leader ,President -Biography.com
Fidel Castro Cuban Revolutionary Who Defied U.S.The New York Times

Downloaded From http://paksociety.com

ملک، ۔رخ میں آواز بلند کرنا خلاف قانون ٹھہرا، حکومتی جبر میں سانس لینا بھی دشوار بن گیا۔ تب وہ قلم کو بغاوت کا علم بنا کر آمروں کے خلاف سینہ سپر ہو گئی اس کی یہ جرأت حکومت وقت کوایک آنکھ نہ بھائی اور اسے ایک اندھی گولی نے ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا۔

عالمی پیمانے پر مشہور قلم کار کی زندگی کے پیچ وخم کا تذکرہ

وہ ایک تارا

سلمیٰ اعوان

’’بس کروانا۔ رک جاؤ۔ خدا کے لیے رک جاؤ۔ دشمنوں اور مخالفوں کے ڈھیر لگا لیے ہیں ہم لوگوں نے۔ اس درجہ ننگی سچائی کو ہضم کرنا ہمارے خود غرض اور مفاد پرست لیڈروں کے لیے بہت مشکل ہے۔‘‘ ہزاروں میل دور سے آتی اس آواز میں محبت بھری تلخی کے ساتھ ساتھ دکھ اور ملال کی بھی آمیزش تھی۔

وہ ہنسی تھی۔ پل بھر کی چھوٹی سی ہنسی جسے اس بیٹم آگالیف نے ہمیشہ کی طرح یوں ہی محسوس کیا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

جیسے Baglama کی تاروں سے بھرپور زندگی میں گندھے ہوئے، دل میں ہلچل مچانے والے، خوبصورت احساس کا سرا ابھی فضا میں بکھرا ہی ہو کہ ختم ہو جائے۔

وہ اس کی ہنسی کا کتنا دیوانہ تھا۔ جان بوجھ کر اسے ہنساتا اور پھر کہتا، تمہاری ہنسی مجھے میرے بچپن میں لے جاتی ہے۔ ان دنوں میں جب میرا دادا سردیوں کی لمبی راتوں میں آگ کے سامنے بیٹھ کر Baglama پرانا طولیہ کے قدیم گیت گاتا۔ پتا نہیں اس موسیقی اور تمہاری ہنسی میں کیا چیز مشترک ہے؟ میں یہ کبھی سمجھ نہیں پایا۔''

''اینا آج تمہاری برتھ ڈے ہے اور میں کئی دنوں سے چاہ رہا تھا کہ تم سے ڈھیر ساری باتیں کروں، پر ابھی تھوڑی دیر پہلے انٹرنیٹ پر تمہارا رمضان کیدروف پر تیر برساتا مضمون پڑھ کر میرے حواس گم ہو گئے ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے اب تمہاری تمنا گولی سے مرنے کی ہے کہ دنیا میں ڈنکا بج جائے کہ روس کی بہادر ترین اور بہترین جرنلسٹ حق سچ پر قربان ہو گئی ہے۔''

اس کے روم روم میں ایک لطیف سی سرشاری دوڑ رہی تھی۔ پیار، فکرمندی اور ڈانٹ ڈپٹ میں گھلا ہوا اس کا انداز ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔

''ہیثم آگالیف اتنے ظالم مت بنو۔''

''تو اور کیا کروں؟ کیسے تمہیں سمجھاؤں؟ ہر اہم غلط ملکی فیصلے پر تمہارے ایک مضمون کی لگائی ہوئی آگ ابھی مدھم نہیں پڑتی ہے کہ تم ایک اور دھما کا کر دیتی ہو۔'' چند لمحوں کے لیے وہ خاموش ہوا۔ سچ کی تلخی سے بھری ہوئی یہ گولیاں وہ اسے محبت کی شیرنی میں لپیٹ کر دیتا تھا۔

''اینا ایک بات بتاؤ مجھے۔ اینڈری کوزلوف کے قتل کا سراغ ملا۔ نہیں۔ کبھی ملے گا بھی نہیں۔ سینٹرل بینک کی مالی بے ضابطگیوں میں حکومتی مگرمچھ ملوث تھے اور وہ اس فراڈ کو بے نقاب کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اب پیوٹن کا وہ نمبر ون بدترین مخالف آئل کا ٹاپ بزنس مین میخائل خودورکوسکائے کی گمشدگی کا عنوان تمہارے ہاتھ آ گیا ہے۔ ہڑتالیں ہو رہی ہیں اور جلوس نکل رہے ہیں۔ ہونا کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ چند دن کے شور و غوغا کے بعد سب بیٹھ جائیں گے۔ یہی ہوتا ہے۔ ہر بڑے، چھوٹے ملک میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔''

''مجھے تو اپنا فرض پورا کرنا ہے۔ مجھے تو اپنے حصے کی شمع جلانی ہے۔ اندھیرا کتنا کم ہوتا ہے، وہ سوچنا میرا کام نہیں۔'' اسے محسوس ہوا تھا جیسے اس کا لہجہ بوجھل سا ہو گیا ہے۔ نمناک سا۔

اور اس ہیثم آگالیف سے تو یہ بھی برداشت نہیں ہوتا تھا۔ ''اچھا چھوڑو۔ چلو کینڈل جلاؤ۔ سامنے کیک رکھو۔ اسے کاٹو۔ میں ہیپی برتھ ڈے گاتا ہوں۔ پھر میں Live Long گاؤں گا۔''

''کیا کرتے ہو تم؟ مجھے یہ سب کرنا مشکل لگتا ہے۔ تم سے زیادہ مجھے کون سمجھتا ہے؟''

''اینا پتھر مت بنو۔ جو میں کہتا ہوں کرو۔ کہیں تو چند لمحوں کے لیے زندگی کی خوبصورتیوں اور رعنائیوں پر تمہاری آنکھ کو جمنا چاہیے۔ دیکھو میں کینڈل جلا رہا ہوں۔ کیک میرے پاس پڑا ہے۔ اس پر تمہارا نام ہے۔''

''کتنا مشکل ہو گیا ہے خود پر ضبط کرنا۔'' اس نے جیسے خود سے یہ کہا تھا۔ پھر اونچی آواز میں بولی۔ ''ہیثم ذرا ٹھہرو۔ میں چیزیں سیٹ کر لوں۔''

اپنے بھیگتے جذبات، اپنی بے چینی اور اضطراب پر قابو پانے کے لیے یہ بہانہ کتنا کارگر تھا۔

ان کے درمیان رابطے کا بڑا ذریعہ تو انٹرنیٹ تھا جہاں ویب کیم کے ذریعے بہت سی خواہشات کی سیر ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی ایک دوسرے میں اتنے مست ہو جاتے کہ یوں محسوس کرتے جیسے پاس پاس بیٹھے ہوں۔ ہیثم اس کے کھانے پینے سے لے کر پہناوے تک میں مداخلت کرتا۔ لیکن آج اس کا کیم خراب تھا اس لیے صرف وائس چیٹ کر رہی تھی۔

''مجھ سے کچھ نہیں ہوا۔ میں بہت اداس ہوں۔ تمہاری جدائی نے مجھے بہت زود رنج بنا دیا ہے۔ میں کس قدر حساس ہو گئی ہوں۔ ورنہ تو ہمیشہ ہی منہ پھاڑ کر کہہ دیا کرتی تھی۔ چلو چھوڑو ہیثم۔ نرے چونچلے۔ کوئی کام کی بات کریں۔''

''میں نے وہی لونگ اسکرٹ پہنا ہے۔ ارے بھئی وہی والا جو تم میرے لیے جارجیا سے لائے تھے۔ ہاں ہیثم اس کے ساتھ بلاؤز پھولوں والا ہے۔ میں نے بریسلیٹ اور انگوٹھیاں بھی پہن رکھی ہیں۔ کافی کا مگ میں نے بائیں ہاتھ پر رکھ لیا ہے۔ چھری میرے پاس رکھی ہوئی ہے۔ کیک سامنے ہے۔ شمع جل رہی ہے۔ لو میں نے کیک کاٹ دیا۔''

تالی کی آواز۔ ہیپی برتھ ڈے۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو مائی سویٹ اینا۔

ٹپ ٹپ کتنے ڈھیر سارے آنسو اس ادھڑے

Downloaded From http://paksociety.com

پدھڑے بدرنگے سے کارڈیگن کے دامن پر گرے تھے جو وہ کل شام سے پہنے ہوئے تھی۔ پینٹ کوئی تین دنوں سے ایک ہی چل رہی تھی۔

پھر اچھے دنوں کی ایک نوید بڑے میٹھے سروں میں اس کے کانوں میں اترنے لگی تھی۔ وہ ولادی میر مایا کوفسکی کو گا رہا تھا۔

وہ شاعری کا ہمیشہ سے رسیا تھا۔ اس کی آواز بھی خوبصورت تھی۔ اس کی گفتگو اکثر و بیشتر کسی شاعر کے خوبصورت شعروں پر ختم ہوتی۔ بہت دھیان اور توجہ سے منتخب کردہ یہ اشعار امید کا پیغام دے دیتے روح کو بھی اس میں بھگو دیتے تھے۔ شاعری سے اینا کا لگاؤ، اس ذوق میں نکھار اور گہرائی اسے ہیثم کی قربت نے دی تھی۔

اور اس وقت جب ماسکو کی کیرماوٹسکایا اسٹریٹ کے ایک فلیٹ اور انگلینڈ کے چیسٹر فیلڈ کے مابین کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک ہونے والی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوئے بھی خاصی دیر ہو چکی تھی وہ ابھی تک کرسی میں دھنسی خود کو ڈھیلا چھوڑے ہوئے کہیں دور منظروں میں گم تھی۔ وہ منظر جو ان بوجھل دنوں میں اس کے لیے امید اور سکون کا باعث تھے۔

جب وہ ایسا کرتی تھی، نہیں جانتی تھی کہ رات کے اس دوسرے پہر فراٹے بھرتی ایک جیپ مضافات سے اولڈ ماسکو میں داخل ہو رہی تھی۔ نیوار باط کی کشادہ شاہراہ سے نوونسکایا پر ٹرن لیتے ہوئے اس کی تیز رفتاری میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ پر وزارت خارجہ کی شاندار جاہ وجلال والی عمارت کے سامنے سے رستے اور سمولنسکایا چوک تک آتے ہوئے رفتار آہستہ ہو گئی تھی۔

ڈرائیو کرتے ہوئے سارجنٹ نے اک ذرا رخ پھیر کر ساتھ بیٹھے سیکیورٹی آفیسر کی طرف استفہامیہ انداز میں دیکھا تھا۔

”دائیں ہاتھ ذرا آگے Beljard ہوٹل ہے۔ وہاں سے بائیں طرف مڑنا۔ چرچ کے پاس رک جانا۔“

ماسکو کی راتیں یورپ کے شہروں کی طرح جوان رہنے لگی ہیں۔ اولڈ ار باط اسٹریٹ سے سیاحوں کے پرے مختلف ملحقہ سڑکوں پر بھی پھیلے ہوئے تھے۔

جیپ رک جانے پر تیس بتیس سال کی عمر کا نوجوان اترا اور سامنے ایک تین منزلہ فلیٹ کو بغور دیکھنے لگا۔ حافظے نے کہا تھا۔ ٹھیک پہنچے ہو۔

دوسری منزل پر رکنا پڑا تھا۔ غربی سمت کے گہرے براؤن رنگ کے بند دروازے پر لگی نیم پلیٹ پر لکھے گئے دو نام ہیثم آغا لیف اور اینا پولٹکوسکایا بڑے نمایاں نظر آئے تھے۔ اس نے فوراً بیل پر انگلی رکھ دی۔ اتنی جلدی اسے انٹر کوم پر جواب کی توقع نہیں تھی۔ مدعا بتایا اور بس چند لمحوں بعد دبلا پتلا ایک وجود یوں باہر نکل آیا جیسے وہ منتظر ہی بیٹھا ہو۔

یہ کیسا چہرہ تھا۔ متین سا، نرمی کی پھوار میں بھیگا بھیگا چہرہ جس کے نقوش میں کہیں سختی نہیں تھی۔ آنکھوں کے نیچے سرخی مائل حلقے تھے۔ آنکھیں چمکدار، ذہانت اور دلیری کی روشنی سے جیسے جگمگاتی سی بوائے کٹ براؤن شیڈ دیتے روکھے روکھے بکھرے بال۔ رائل بلیو پینٹ پر آف وائٹ موٹا ڈھیلا بے سرا سا پرانا کارڈیگن۔

اور جب وہ اس کے کاغذات چیک کر رہی تھی۔ سیکیورٹی آفیسر نے اپنے دل میں کہا تھا۔ ”تو یہ ہے وہ دھان پان سی پونے چھ فٹی عورت۔ چیچنیا کے لوگوں کی خیر خواہ۔ پیوٹن اور اس کی پالیسیوں کی بدترین ناقد۔“

کاغذات چیک کر کے وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی جیپ تک آئی اور اس کے پچھلے حصے میں بیٹھ گئی جو چاروں طرف سے بند تھی۔

اس وقت اسے احساس ہوا تھا کہ اس نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ میخائل خودورکوسکائے کی گمشدگی پر مضمون لکھنے میں ایسی جتی تھی کہ سلسلہ اس وقت ٹوٹا تھا جب ہیثم کی انگلینڈ سے کال آئی۔ اپنی ذات سے متعلق ہر بات وہ ہمیشہ سے نظرانداز کرنے اور بھولنے کی عادی تھی۔

اور اب سوچتی تھی کہ کیا تھا اگر وہ اس کی بات مان لیتی۔ اس وقت معدہ کتنا خالی خالی سا محسوس ہو رہا ہے اور کافی کی طلب کتنی بڑھ گئی ہے؟

جیپ ڈھلانی راستوں کے پیچ وخم سے گزرتی ہوئی ایف ایس بی سیکیورٹی سروس کی دنیا میں داخل ہو گئی جو کبھی کے جی بی کے نام سے جانی جاتی تھی۔ اب نام بدل گیا۔ تب آج کی نسبت مار دھاڑ زیادہ تھی۔ حربے تو آج بھی وہی ہیں بس ذرا انداز بدل گئے ہیں۔

ڈرائیور نے دروازہ کھول کر کسی قدر رعونت سے اسے باہر آنے کا کہا۔ سیکیورٹی آفیسر اسے عمارت کے مختلف حصوں سے گزارتا ہوا جہاں لے کر آیا، یہ اسٹیل اور سیمنٹ کے ملاپ سے بنے ہوئے عالیشان بلاک کا ایک

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
- ایڈ فری لنکس
- ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
- ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
- کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

حصّہ تھا جہاں ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک بڑی میز کے گرد کرسیوں پر چھ لوگ بیٹھے تھے۔

کمرے میں قبرستان جیسی خاموشی تھی۔ چھ کے ٹولے میں سے صرف دو نے نیم ایستادہ ہو کر اسے احترام دیتے ہوئے اس کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جو ساتویں اور غالباً اس کے انتظار میں تھی۔ بڑی تیکھی اور نوکیلی نظریں تھیں، جنہوں نے بار بار اٹھ اٹھ کر اسے دیکھا تھا۔ میز پر دیگر چیزوں کے ساتھ اس کی تینوں کتابیں پوٹین رشیا، لائف ان اے فیلنگ ڈیموکریسی اور لے ڈرائی وار کے ساتھ ایک موٹی فائل بھی پڑی تھی۔

''اس فائل میں یقیناً میرے نوایا Novaya Gazeta میں لکھے جانے والے مضامین ہوں گے۔'' اس نے سوچا تھا۔

اندر داخل ہونے اور بیٹھنے تک کے مرحلے میں اس نے برقی انداز میں سب دیکھ ڈالا تھا۔ داہنے ہاتھ پھر دوسرے نمبر پر بیٹھے ہوئے جس افسر نے سوال کیا تھا اس کا چہرہ ہی کرخت نہ تھا، لہجہ بھی پور پور حقارت میں ڈوبا ہوا تھا۔

''چیچنیا کے بارے میں ضرورت سے زیادہ حساس ہیں۔ ہمدردی کے پس منظر میں چیچن مسلمان سے محبت اور اس سے شادی نہیں ہے کیا؟''

سوال کرنے والا کتنے پانی میں ہے؟ اس پر پہلے ہی ہلّے میں ظاہر ہو گیا تھا۔

اس کی نظروں میں ٹھہراؤ تھا۔ گہرائی تھی۔ جیسے کسی لبالب بھرے پُرسکون سے تالاب میں کوئی جاہل پتھر مار کر سمجھے کہ اس نے پانی کو درہم برہم کر دیا ہے۔

''پہلی بات میں نے کسی مسلمان سے نہیں انسان سے محبت اور شادی کی ہے اور یہ میرا نجی معاملہ ہے۔ دوسرے گزشتہ چھ سالوں میں جتنے چوٹی کے جرنلسٹ قتل کیے گئے یا جیلوں میں سڑ رہے ہیں نہ وہ مسلمان ہیں اور نہ ان میں سے کسی نے بھی کسی مسلمان سے شادی کی۔ سچائی ان کا جرم تھا۔''

دفعتاً ڈائریکٹر جنرل کے موبائل کی بیپ سنائی دی۔ دوسری جانب سے استفسار یقیناً اسی کے بارے میں تھا۔ گفتگو کوڈ الفاظ میں تھی۔ ڈی جی کے چہرے پر بکھرے تاثرات اس جیسی زمانہ شناس عورت نہ سمجھتی بھلا کہیں ممکن تھا۔ گفتگو کا سلسلہ جب دوبارہ شروع ہوا۔ اس کا لہجہ نہ صرف حتمی تھا بلکہ اس میں سختی بھی تھی۔

''آزادی چیچنیا کے لوگوں کا حق ہے۔ تیل کے ذخائر ان کی ملکیت ہیں۔ کسی بھی لڑائی کو جیتنے کے لیے کوئی اخلاقی جواز ہوتا ہے۔ یہاں سرے سے ہی کچھ نہیں۔ مظلوم اور محکوم کمیونٹی وہ خواہ کوئی بھی ہو اس کی سپورٹ اخلاقی فریضہ ہے۔''

ڈائریکٹر جنرل یوری چیکانے قدرے رسان سے کہا۔ ''آپ روسی مفادات کے خلاف مت جائیے۔ روس کی ایک بہادر ترین اور بہترین جرنلسٹ کی حیثیت سے مجھے آپ کا بہت احترام ہے۔ مگر ہماری مجبوریوں کا کچھ خیال کیجیے۔ ہم پر حکومت کا شدید دباؤ ہے۔''

وہ خفیف سا ہنسی۔ ''کسی بھی پولیس کے لیے جرائم سے چشم پوشی کرنا گویا جرائم کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔''

''تم تو خود ڈاکو اور لٹیروں کی اولاد ہو۔ تمہارے آباء کوساک تھے نا۔'' تیسرے نمبر پر بیٹھنے والے کا لہجہ ترشی اور نفرت سے بھرا ہوا تھا۔

بڑا گھٹیا سوال اور تضحیکی رویہ تھا جو اس کی انا کو کچلتا ہوا اسے اس سوکھی لکڑی کی طرح چٹخا گیا جو آگ میں ڈالتے ہی بھڑ بھڑ جلنے لگتی ہے۔ اس کے لہجے میں زہر گھل گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے طنز بھرے تیروں کی بوچھاڑ نکلی جو ان کے کلیجوں میں ایک طرح پیوست ہو گئی۔ ''پڑھا کرو۔ تاریخ سے واقفیت تم لوگوں کے لیے بہت ضروری ہے تاکہ نالائقی ظاہر نہ ہو۔ یہ جس ماسکو میں تم بیٹھے بڑھکیں مار رہے ہو یہ میرے آباء کوساکوں کا زاروں کو دان پن تھا۔ جو تاتاریوں کے تلوے چاٹتے تھے۔ ویہود (خراج) ادا کرتے تھے۔ میرے بڑے بزرگ زاروں کے ہاتھوں کی وہ کنجیاں تھے کہ جن کے بغیر وہ مشرق کا دروازہ کھولنے کے اہل ہی نہ تھے۔''

اگر ڈائریکٹر جنرل وہاں موجود نہ ہوتا تو یقیناً بقیہ لوگوں نے اسے کسی ٹارچر سیل میں لے جا کر اس کی تواضع کرنی تھی اور اسے یوں پٹر پٹر بولنے کا مزہ چکھانا تھا پر ہلکی پھلکی تنبیہ کے ساتھ اسے رخصت کر دیا گیا۔

رات کا تیسرا پہر ختم ہو رہا تھا جب اس کی واپسی ہوئی۔ جیپ سے اتر کر اس نے اک ذرا رک کر پہلے آسمان کو دیکھا۔ عجیب سی بات تھی۔ ماسکو اور پیٹرزبرگ کی سفید راتوں میں اسے ہمیشہ ایک عجیب سا فرق محسوس ہوتا۔ وہ ماسکو کی راتوں کو کبھی سفید راتیں نہیں کہتی تھی۔

اس وقت سیاحوں اور لوگوں کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ سناٹا اور تنہائی تھی۔ ملگجا اجالا تھا۔ وہ فلیٹ میں داخل ہوئی۔ کچن

Downloaded From http://paksociety.com

میں گئی۔ کافی بنائی۔ چورنی خلیب کے بچے کھچے ٹکڑوں پر مکھن کی تہہ اور کیوئیر لگا کر لاؤنج میں آگئی۔

بالعموم اپنے اوپر لگنے والے اعتراضات پر وہ تلملایا نہیں کرتی تھی۔ ایسی پھبتیاں بھگتنے کی وہ عادی تھی۔ بہت کم اپنے دفاع میں بولتی، پر اس گھٹیا بات نے اسے رنجیدہ کیا تھا۔

بات کہنے کہنے میں کتنا فرق تھا۔ سالوں پہلے ہیثم آگالیف نے بھی ڈپارٹمنٹ لائبریری کی سیڑھیوں کے پاس یہ بات کہی تھی۔ پر ایک تفاخر بھرے انداز میں۔ ''اپنا تمہارے اندر دلیری، جرأت، سچ پر کھڑے ہونا اور غلط بات اور غلط فیصلوں کے خلاف ڈٹ جانے کی خوبیاں تمہارے اجداد کی نشانیاں ہیں۔ تم کوساکوں کی اولاد ہو نا۔''

اس کے لہجے اور انداز میں اس کے لیے جو فخر، مان اور اعزاز تھا اس نے اسے مسرور کیا تھا۔

اسے اپنے آباء کوساکوں پر بہت اعتراضات تھے۔ بیچارے ماسکو کے جاگیرداروں اور نوابوں کے غلام جنہوں نے تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ماسکو کو چھوڑ کر سرحدوں کی طرف ہجرت کر لی تھی۔ دشت ان کے ٹھکانے بن گئے تھے۔ تاتاریوں اور خانہ بدوشوں سے لڑتے، انہیں لوٹتے، شکار کھیلتے، دریاؤں کو پار کرنے کے لیے کشتیاں بناتے، اور علاقے فتح کرتے کرتے انہوں نے ایک زمانہ گزار دیا۔

پھر جانے کون سے احمق تھے جنہوں نے انہیں مشورہ دیا یا ان کی اپنی کم عقل کھوپڑیوں میں یہ بات گھس گئی کہ انہوں نے فتح کیے علاقے زاروں کو پیش کر کے خود کو ان کا دست راست بنا لیا تھا۔

کوئی ان عقل کے اندھوں سے پوچھتا تمہیں ایسی کیا پریشانی آپڑی تھی۔ بازو بیلنے میں آگئے تھے تمہارے۔ کوئی پریشانی تھی۔ کوئی تکلیف تھی۔ آخر کیا تھا۔ خود آگے بڑھ کر سر پر تاج سجانے میں کیا چیز حائل تھی؟ الو کے پٹھے زاروں کے لیے ہی مرتے رہے۔ ایک نئے حکمران خاندان کا اضافہ ہو جاتا تاریخ میں۔ آخر حرج ہی کیا تھا۔

اس کے پردادا نے خانہ بدوشی چھوڑی۔ کچھ عرصہ شمالی کا کیشیا کے سلسلہ ہائے کوہ کی وادی کارچائی میں جو آزر کا ساحلی شہر تھا میں رہائش کر لی۔

یہاں ہری بھری خوبصورت پہاڑیوں میں نیلے شفاف پانیوں سے لبالب بھری جھیلیں تھیں جن پر مرغابیوں اور چیلوں کی اڑتی قطاریں تھیں۔ میپل کی جھاڑیوں میں تیز رفتار ندیاں بہتی تھیں۔ گھنے جنگل اور نارنجی آسمان کے نظارے دل موہ لینے والے تھے۔

اس نے بڑی لمبی سانس بھری تھی۔ کافی کا آخری گھونٹ لے کر مگ تپائی پر رکھ دیا تھا۔ کارچائی سے نقل مکانی کیوں ہوئی اور دریائے کاما کے بائیں کنارے سولیکمسک شہر کے جنوب میں ایک چھوٹی سی بستی اوسولیے میں ڈیرے کیوں ڈالے گئے؟ اس کی وجہ کیا تھی؟ یہ وہ کبھی نہ جان سکی۔ یوں اس کا قیاس تھا کہ یہاں بہت بڑے بڑے جنگل تھے۔ جن پر انہوں نے قبضہ کر لیا۔ نمک کا نفع بخش کاروبار تھا۔ بہت جلد وہ اس علاقے کا ایک جاگیردار سا حکمران بن گیا تھا۔ پر اس کے دادا کی یادداشتوں سے کارچائی کبھی نہ نکل سکا۔ جب بات ہوئی اوسولیے اور کارچائی کا مقابلہ ہوا۔ یہ بھی خوبصورت جگہ تھی جو اسے تو بہت پسند تھی۔

وہ کھڑی ہوئی۔ اس نے سوچا سو جائے۔ تھکن سی محسوس ہو رہی تھی۔ پر بغیر کسی ارادے اور سوچ کے بالکونی میں آگئی۔ دفعتاً اسے عجیب سا احساس ہوا۔ جیسے ریڑھ کی ہڈی پر کنکھجورا سا رینگ جائے جو سارے جسم میں سرد برقی

اردو کتابوں کا پہلا اردو زبان میں آن لائن سٹور
کتابیں حاصل کرنا انتہائی آسان
گھر بیٹھے اپنی پسندیدہ کتب حاصل کریں
کتاب منگوانا اور تلاش کرنا انتہائی آسان
ذخیرہ کتب میں روز بروز اضافہ کیا جا رہا ہے
QR کوڈ کو QR Scanner سے سکین کریں یا
www.kitabidunya.com

Downloaded From http://paksociety.com

روو دوڑا دوے۔اس نے سر جھٹکا۔

''اُفوہ'' جھلا کر وہ خود سے بولی۔''باہر فضا بہت نکھری ہوئی اور روشن ہے۔ایسے میں ان بے تکی اور فضول سوچوں کا بھلا کیا کام۔تھیٹر والے حادثے کا اثر ابھی زائل نہیں ہوا،اوپر سے بیٹم کا لیکچر۔اس نے سر جھٹکا اور کمرے میں آ گئی۔

''مالی تھیٹر میں جو کچھ ہوا۔'' اس نے جھرجھری لی۔

''وہ دہشت گردی ہے۔یقینا ہے۔مجھے انکار نہیں۔مگر ایسا ہوا کیوں؟''

اس کا یہ سوال اپنے آپ سے تھا۔اس کے اندر سے جواب بھی آیا تھا۔

''جب بڑی طاقتیں چھوٹے لوگوں کی آزادی سلب کر لینے کے درپے ہو جائیں تو ان کے پاس ایسے ہی الٹے سیدھے ہتھکنڈے رہ جاتے ہیں۔''

مالی تھیٹر کے مناظر ایک کے بعد ایک آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے تھے۔اسے یاد آیا کہ وہ رات کا پہلا پہر تھا۔اور پروہ اس وقت اولڈ ارباط اسٹریٹ میں تھی۔کچھ کھانے پینے کے لیے آئی تھی۔آفس سے سیدھی اسی طرف نکل آئی تھی خود سے یہ کہتے ہوئے۔''چلو اکتوبر کی ان خوشگوار سی رتوں میں ڈنر ارباط میں کرتی ہوں۔ہمسائے میں رہتی ہوں اور سالہا سال گزر گئے ہیں اس تاریخی بازار میں جھانکے ہوئے۔''

پر جونہی داخل ہوئی یوں محسوس ہوا جیسے اس بے حد خوبصورت روشنیوں، رنگوں، خوشبوؤں اور حسن و رعنائیوں سے پر بازار میں کسی نے ہر سو خوف و دہشت کا اسپرے کر دیا ہو۔جن جن دکانوں میں ٹی وی تھے وہاں لوگوں کے ہجوم کھڑے تھے۔کھانے کا ارادہ چھوڑ کر وہ واپس گھر بھاگی۔ٹی وی کھولا اور ساکت ہو گئی تھی۔

ماسکو کے شہری ایک بدترین سانحے کا سامنا کر رہے تھے۔مالی تھیٹر میں ملٹری میوزیکل شو ہو رہا تھا۔کوئی ساڑھے سات سو تماشائی تھے جب مشین گنوں سے لیس چیچنیا کے جیالوں کے ایک گروپ نے تھیٹر کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔مطالبہ تو بڑا جائز تھا۔ماسکو چیچنیا میں جنگ کو بند کرے وگرنہ وہ لوگوں اور تھیٹر کو اڑا دیں گے۔

صورت حال کتنی ہولناک تھی۔اسپیشل فورسز نے تھیٹر کو اعصاب شل کر دینے والی گیس سے بھر دیا۔ایک کے بعد ایک لاشیں تھیٹر کے دروازے سے نکالی جا رہی تھیں اور عام روسی اپنے ٹیلی ویژنوں کے سامنے ساکت بیٹھے چیچنیا کے لوگوں کو لعن طعن کر رہے تھے۔ایک سو انتیس لوگ اور اکتالیس چیچن جنگجو مر گئے تھے۔

اب سچی بات لکھنا جرم بن گیا ہے۔وہ لیٹ گئی تھی۔پر نیند تو آنکھوں میں کہیں نہیں تھی۔پرانے مناظر نظروں میں تیرنے لگے وہ خود کو کلاس میں کھڑا دیکھ رہی تھی۔وہ سوال کر رہی تھی۔

''سر ہمارے حکمران اتنے کرپٹ اتنے لالچی ہیں۔اس برژنیف سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ کوئی کمی تھی اسے گاڑیوں کی۔اس نے کس منہ سے امریکا سے مونتے کارلو کی بات کی۔اس کا گیراج تو گاڑیوں سے بھرا پڑا تھا۔ایک سے بڑھ کر ایک عالیشان گاڑی۔رولز رائس، مرسڈیز، سیڈان، سٹرون اور اس کی نئی نویلی مرسڈیز ایس ایل 300۔اور وہ بڑا مہمان امریکا اسے تحفہ دیتا تھا اور یہ گاڑی کا نام بتاتا تھا انہیں۔ملسر بیئر، مغربی ملبوسات اور قیمتی زیورات تو پراگ سے اسے بھیجے جاتے تھے۔کتنا بے غیرت تھا۔اسے ملکی وقار کا ذرا احساس نہیں تھا۔''

کلاس کی ایک اور لڑکی نے لقمہ دیا۔''اس کی بیوی کے پاس فر کے معلوم ہے کتنے کوٹ ہیں؟ پورے سترہ۔''

پورے سترہ کو جس انداز میں کہا گیا اس پر کلاس میں زوردار قہقہے گونجنے لگے۔

جوزف اسٹالن کے دور کی زبان بندی جیسی سختی جھیلنے والا استاد گو اب قدرے بہتر فضا میں سانس لیتا تھا مگر وہ رفتہ رفتہ والی بات ضرور تھی۔دلداری کے لفظوں سے بہلاتے ہوئے بولا تھا۔''سربراہان مملکت کے لیے ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہوئے تحائف دینا اور لینا سفارتی ایٹی کیٹس میں شمار ہوتا ہے۔صدر نکسن نے ضرور پوچھا ہوگا۔اب بتا دینے میں حرج کیا تھا؟''

''نہیں سر۔''

پچھلی نشستوں سے ایک چھ فٹ کا خوبصورت لڑکا اٹھا اور بولنے لگا۔''آپ نے غالباً نکسن کے دورۂ روس کے تاثرات کے بارے میں نہیں پڑھا۔آپ کا کیا خیال ہے؟ امریکا کا صدر ایک خوشحال زندگی نہیں گزارتا ہوگا۔یقینا گزارتا ہوگا۔مگر وہ حیران ہوا۔برژنیف اور ہمارے اعلیٰ بیوروکریٹس کے لیونگ اسٹائل دیکھ کر۔''

یہ بیٹم آگالیف تھا۔کاکیشائی علاقے چیچنیا اینگوش کا۔

Downloaded From http://paksociety.com

کلاس کی فرسٹ ٹرم کے دوسرے ماہ کے آخری ہفتے کا تیسرا یا چوتھا دن تھا۔ دونوں کے انداز میں دور دراز علاقوں سے تعلق کا دیہاتی پن نمایاں تھا۔ مگر ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق آنے والے کل میں کیا روپ دھاریں گے اس کا پتا چلتا تھا۔ کلاس کے خاتمے پر دونوں ایک دوسرے کی طرف مقناطیسی انداز میں بڑھے تھے۔

ماسکو جیسے ترقی یافتہ اجنبی شہر میں ایک دوسرے سے مانوس ہونے میں انہوں نے دیر نہیں لگائی تھی۔

دونوں بس میں بیٹھ جاتے۔ باتیں کرتے۔ دائیں بائیں دیکھتے، کسی خوبصورت منظر پر فوراً ایک دوسرے کو متوجہ کرتے۔ ”دیکھو۔ دیکھو ذرا۔“

ایسی ہی نشستوں میں انہوں نے ایک دوسرے کے بارے میں جانا تھا۔

ہیثم اگالیف ترکوں کے سب سے بڑے خانوادے سلجوق کے اس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا جو صدیوں پہلے دریائے والگا کے شمالی خطوں بلغاریہ میں آکر آباد ہوئے تھے۔

گریجویشن اس نے Donetsk سے کیا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ ماسکو آ گیا۔

دونوں جب ماسکو کے گلی کوچوں میں پھرتے۔ مارکیٹوں میں گھومتے۔ اس کے محلوں کی سیر کرتے۔ اگر یہ جگہ ان کے لیے ایک پُرتحیر، خوبصورت اور بہت رومانوی سی دنیا تھی تو وہیں وہ گاہے بگاہے اس پر بھی دکھ کا اظہار کرتے کہ آخر ان کے علاقے اس درجہ ترقی یافتہ کیوں نہیں؟ پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے اس ضمن میں جو مسائل اور جو ترجیحات راستے میں حائل ہوتی ہیں۔ دونوں اپنی اپنی بحثوں کے دوران ان میں سے بہت سوں پر اتفاق رائے کر لیتے۔

ہیثم کو چیچنیا کی خود مختاری سے لے کر اسے اس کے تیل کے ذخائر پر روس کے جبراً قبضے پر شدید اعتراض تھا۔ معاشی اور دفاعی اعتبار سے وہ چیچنیا کی اہمیت سے آگاہ تھا اور دھیرے دھیرے اینا بھی اس سے آگاہ ہو رہی تھی۔

”چلو ہیثم ان چھٹیوں میں، میں تمہارے ساتھ کاکیشیا چلوں گی۔ اس علاقے کا حسن اور اس کے مسائل سے آگاہی تو بہت ضروری ہے۔“

وہ ہنسا اور بولا۔ ”میرا علاقہ پس ماندہ، غریب اور مسلمان ہے۔ جس کی اپنی روایات ہیں۔ وہاں ایسے گھومنے پھرنے کی آزادی نہیں ہوگی۔ تمہیں گھر کے اندر عورتوں کے ساتھ رہنا پڑے گا۔“

”تو کیا ہوا؟ رہ لوں گی۔ جب تک مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں سے بندہ آشنا نہیں ہوتا، اس کی نظر میں وسعت نہیں آتی۔“

”تو ٹھیک ہے میں اپنے گھر خط لکھ کر انہیں بتا دوں گا۔“

مئی کے دوسرے ہفتے کے پہلے دن نومئی کو وکٹری ڈے پر سرکاری چھٹی ویک اینڈ کے ساتھ مل گئی۔ دو تین چھٹیاں مزید لینے کا دونوں نے پروگرام بنا لیا اور چھوٹی موٹی خریداری کے لیے ریڈ اسکوائر کی مینز مارکیٹ پہنچ گئے۔

اور جب وہ ترکمانیہ کے خوبصورت کشیدہ کاری سے مزین اسکارف دیکھ رہی تھی۔ ہیثم اس کے قریب آیا اور فیروزی رنگ کا دلکش آویزہ اس کے داہنے کان سے چھوایا۔

”ارے۔“ وہ ہنسی پھر دونوں آئینہ کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ اس نے جھٹ پٹ آویزہ پہن لیا۔ پھر بولی۔ ”دیکھو تو کیسی لگتی ہوں؟“

اس نے میٹھی سی ستائش بھری نظروں سے اسے دیکھا اور کہا۔ ”اب انہیں خریدنا ضروری ہے۔“

ایلس ایلبینیا

ایلس ایلبینیا نے کیمبرج یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں گریجویشن کیا اور پھر جنوبی ایشیا کی تاریخ میں دلچسپی لینے کے بعد اردو سیکھی اور جنوبی ایشیا کی تاریخ میں ایم اے بھی کیا۔ یہ صحافی بھی ہیں اور حال ہی میں اپنی کتاب ”ایمپائرز آف دی انڈس“ سے انہوں نے خود کو ایک کہنہ مشق مصنفہ کے طور پر متعارف کروایا ہے۔ یہ مشاہدے اور محنت پر یقین رکھتی ہیں۔ ”ایمپائرز آف دی انڈس“ حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب نے بین الاقوامی حلقوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں بھی اس کو پسند کیا جا رہا ہے۔ ان کے خیال میں دریائے سندھ جنوبی ایشیا کی انفرادی تاریخ کی بجائے پوری دنیا کی تاریخ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے کیونکہ دنیا کے مختلف خطوں سے لوگ یہاں پر آئے۔

مرسلہ: نزہت آفرین، فیصل آباد

Downloaded From http://paksociety.com

اور جب وہ کافی بار پر بیٹھے کافی پیتے اور کلیا سا کھا رہے تھے تو ہیثم نے اسے پہاڑوں ، دریاؤں ، آبی راستوں اور سرنگوں سے ڈرانے کی کوشش کی ، وہ ہنسی ۔ ''تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ تم سے زیادہ دلیر ہوں ۔ اور ہاں رہی بات پہاڑوں ، آبی راستوں ، دریاؤں اور جنگلوں کی تو بھئی میری بھی ان سے پرانی شناسائی ہے ۔''

''دلیر تو تم واقعی بہت ہو ۔ اعتراف کرتا ہوں میں ۔'' ہنستے ہوئے ہیثم نے اسے دیکھا تھا۔

جس شام وہ ماسکو ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹیں خرید کر گاڑی کے انتظار میں ویٹنگ لاؤنج میں پاس پاس بیٹھے تھے ۔ ہیثم نے اس کی قدرے سرخی مائل تھکی تھکی آنکھیں دیکھ کر پوچھا ۔ ''خیریت؟''

''ہیثم میں ساری رات اس خطے کو جو بحر منجمد شمالی کی برفانی دلدلوں سے تبت اور ہمالیہ تک پھیلا ہوا ، کبھی کا دشت ایشیا اور آج کا وسط ایشیا کہلاتا ہے ، پڑھتی رہی ۔ یقین مانو اس کی دلچسپ تاریخ نے مجھے آنکھ نہیں جھپکنے دی ۔ وہی وحشیانہ انسانی جبلت ، گروہوں ، قبیلوں کی مار دھاڑ ، ایک دوسرے پر غلبے کی تمنا ، کہیں ستھین کہیں آریا ، کہیں ہن ، کہیں بابیان یعنی مغل ، کہیں ترک ۔''

بحث مزید طوالت اختیار کرتی کہ گاڑی آگئی اور وہ دونوں برتھ پر جا بیٹھے ، گاڑی چلی تو صبح کی روشن کرنیں ایک کے بعد ایک منظروں کا سارا حسن آنکھوں کے سامنے لانے لگیں ۔ کہیں پہاڑ تھے ، کہیں گھاٹیاں ، کہیں میدانوں میں ہری کچور فصلیں ، کہیں دریا اور کہیں طویل سرنگیں ۔ یہ سفر اگر نئی دنیائیں ، نئے لوگوں اور نئے واقعات سے روشناس کروانے جا رہا تھا تو وہیں یہ محبتوں ، چاہتوں اور نئے رشتوں میں گندھ جانے کا بھی تھا ۔ اس کی مسرت اور اشتیاق قابل دید تھا۔

نووا روسینک میں وہ اتر گئے ۔ اس وقت ایک بج رہا تھا ۔ لنچ کیا اور تازہ دم ہو کر انہوں نے شہر دیکھا ۔ دوسری جنگ عظیم کا شکار شہر ، جس نے گھمسان کی لڑائی لڑی اور سرخرو ہوا۔

ہیرو چوک میں شہدا کی یاد میں نہ بجھنے والا شعلہ جلتا ہے ۔ اسے دیکھنا اور نووا روسینکی گجر جیسے نغمے کو سننا بہت دل موہ لینے والا کام تھا ۔ یہ صرف دومنٹ کے لیے بجا ۔ آغاز میں گھنٹیاں بجیں ۔ پھر بڑی غمگین سی دھن بکھری اور اختتام فاتحانہ سمفنی آکسٹرا کی موسیقی سے ہوا۔

اس نے مسرت سے پلکیں جھپکائیں اور دہری ہو کر اس کی کلائی کو پکڑ لیا ۔ ''ہیثم یہ بڑا خوش کن منظر ہے ۔ یہاں رکتے ہیں ۔ ایک بار پھر اس سے لطف اٹھاتے ہیں ۔''

ایک گھنٹے بعد پھر وہی سین دہرایا گیا۔

اسے موسیقی میں سرشار ڈوبتے دیکھ کر اس نے پوچھا تھا ۔ ''جانتی ہو کس کی کمپوزنگ ہے؟''

اینا چند لمحوں تک کچھ سوچتی رہی پھر تذبذب ملے لہجے میں بولی ۔ ''شاید پروکوفیف کی ۔''

''اوں ہوں ۔'' ہیثم زوردار لہجے میں آواز نکالتا ہوا اس کی طرف دیکھ کر ہنسا ۔ ''ابھی تم موسیقی سمجھنے میں کچی ہو ۔ دمیتری شوستاکووچ ۔''

''اف ۔ ۔'' اینا کو جیسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا ۔ اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بول اٹھی ۔ ''یقین مانو پہلے یہی دماغ میں آیا تھا ۔ پر دیکھو ہیثم یہ اسٹالن کتنا بدبخت تھا ۔ روس کے اس عظیم فنکار کو کیسے ذلیل کیا ۔ اس کے اوپیرا The Lady Macbeth of Mtensk کو بین کر دیا تھا اس نے ۔''

''ایک شوستاکووچ پر کیا ، ادیبوں ، شاعروں ، مصوروں ، سبھوں کو ظلم و ستم کی سان پر چڑھایا گیا۔''

ہیثم یہاں سے ٹرین میں اب سیدھا اپنے گھر چچنیوا اینگوش جانا چاہتا تھا۔

اسٹیشن پر اترنے سے پہلے وہ باتھ روم میں گئی ۔ اس نے ٹخنوں تک کا لونگ اسکرٹ پہنا ۔ نیلے اسکرٹ سے ... ہمرنگ بینڈ سے بالوں کو باندھا ۔ بالوں کو اسکارف سے ڈھانپا اور جب وہ باہر آئی اس نے ہیثم کی طرف دیکھ کر کہا ۔ ''لو دیکھو ، اب تمہاری تسلی ہو جانی چاہیے ۔ میں تمہارے گھر کی دنیا میں داخل ہونے کے لیے پوری طرح تیار ہوں ۔ ہاں ہیثم مجھے یہ بتاؤ تم نے اپنے گھر والوں کو میرے بارے میں کیا کہا ہے؟''

''کیا کہنا تھا ۔ یہی کہ ماسکو یونیورسٹی کی ایک طالبہ کو علاقے پر ریسرچ کرنا ہے ۔ میری ڈیوٹی اسے یہ کام کرانے پر لگی ہے ۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی ۔ ''کسی حد تک بات غلط بھی نہیں ۔''

گروزنی چیچنیا کا مرکزی شہر جس سے تھوڑے فاصلے پر چیچنیو اینگوش تھا ۔

جب وہ اونچے محرابی گیٹ سے اندر ایک ایسے گھر

Downloaded From http://paksociety.com

انگلش اُبٹن ٹرمیرک کریم چہرے اور بدن کے لئے ایک منفرد کریم ہے جو قدرتی جڑی بوٹیوں، اُبٹن، صندل اور ہلدی سے تیار کی گئی ہے۔ یہ چہرے کو کیل، مہاسوں، چھائیوں اور داغ دھبوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس کے باقاعدہ استعمال سے جلد بے داغ، رنگت گوری اور نکھری نکھری ہو جاتی ہے۔ انگلش اُبٹن ٹرمیرک کریم پورے بدن پر استعمال کرنے سے جلد ریشم کی طرح نرم و ملائم ہو جاتی ہے۔ بدن میں خوشگوار مہک اور تر و تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ بہترین نتائج کے لئے صبح اور رات کو سونے سے پہلے استعمال کریں۔

Downloaded From http://paksociety.com

میں داخل ہونے والی تھی جس کے ایک اہم فرد سے وہ اپنے دل کا معاملہ طے کر بیٹھی تھی، اسے عجیب سے محسوسات کا احساس ہوا تھا۔ سماں جھٹ پٹا سا تھا۔ کشادہ آنگن کی دیواریں انگوروں کی بیلوں سے ڈھکی پڑی تھیں۔ چنا مناسا پھل کوئی ٹنوں کے حساب سے نازک سی بیلوں پر چڑھا ہوا تھا۔ بہت سارے لوگ نگل کران کے گرد اکٹھے ہوگئے تھے۔ سروں کو ریشمی اسکارفوں سے باندھے موٹے چنٹوں والے فراک جو ٹخنوں کو چھوتے تھے پہنے، انتہائی خوبصورت ہر عمر کی چھوٹی بڑی عورتیں اسے حیرت واستعجاب سے دیکھ رہی تھیں۔ داڑھیوں والے اور کلین شیو مرد اور لڑکے جنھوں نے اونی ٹوپیاں اوڑھ رکھی تھیں۔

امام شمل کی بڑی سی تصویر برآمدے میں آویزاں تھی۔ آزادی کی جنگ کا ہیرو۔ جسے روسیوں نے 1858ء میں شکست دی تھی۔ سترھویں صدی کا یہ منفرد روایات کا حامل، اسلامی تہذیب وتمدن کا گہوارہ، وسط ایشیا کا دل، جس پر روسیوں کی نظریں تھیں، یورپ والوں کی اس کے تیل کے ذخائر پر رالیں ٹپکتی تھیں، ابھی تک مسلسل اپنی جدوجہد میں مصروف تھا۔

ایک ہفتہ اس نے اس گھر اور اس ماحول میں گزارا جہاں بوڑھے اور کسی حد تک نوجوان بھی نماز پڑھتے تھے۔ قرآن کریم کی تلاوت ہوتی تھی۔ جہاں اونچے اونچے میناروں والی خوبصورت مسجدیں تھیں۔ جہاں آنکھوں کو تراوٹ دیتی سبزے کی چراگاہوں میں چراتے بھیڑ بکریوں اور ان گلوں کو پالتے سادہ دل جوان اور بوڑھے تھے۔ جہاں وادیوں اور پہاڑی سلسلوں کی سطح مرتفع پر جوار، باجرہ، مکئی اور گندم اگائی جاتی تھی۔ جہاں لڑکے کی پیدائش پر خوشی کا اظہار ہوتا۔ جہاں خاندان مل جل کر رہنے کو اپنے لیے ایک مسرت اور خوشی سمجھتے۔ جہاں مردوں کو پہلے اور الگ کھانا دیا جاتا تھا۔ پھر بچوں کی باری آتی اور آخر میں عورتیں اس بڑے سے باورچی خانے میں جہاں رنگ برنگے ڈیزائنوں والے دبیز نمدے نما قالین بچھے ہوتے، کھانا کھاتیں۔ چوبی ڈیزائن دار چھتیں آگ کے دھوئیں سے سیاہی مائل تھیں۔ دیواروں میں بنے طاقوں میں موم بتیاں جلتیں۔

یہاں اس نے بکرے کے گوشت میں بنے چاولوں کو کھایا۔ تازہ مکھن اور پنیر جسے Tvorog کہتے تھے اسے اور دنبے کی چربی سے بنے تازہ گرم نانوں کو قہوے کے ساتھ کھا کر لطف اٹھایا۔ سادہ دل لوگ جن میں محبت اور خلوص تھا۔ دلیری اور شجاعت تھی۔ سادہ کھانا کھانے، سادہ پہناوا پہننے اور سادگی سے رہنے والے جن پر سوویت یونین کے فوجی دستے اور خفیہ پولیس والوں نے بہت بار ظلم وستم کے پہاڑ توڑے۔ گھروں سے بے گھر کیا۔ ان کی زمینوں پر قبضے کیے۔ ان کی مسجدوں پر تالے چڑھا کر انہیں عبادت سے جبراً روکا۔

یہاں راتوں کو اس نے آگ کے گرد بیٹھ کران فوک کہانیوں کو سنا جو ان کی تاریخ، ان کے ہیروازم، ان کی بہادری وشجاعت کے قصوں کو سموئے ہوئے تھیں۔ اس نے اکارڈین سنا۔ ڈرم بجتے دیکھا۔

بکھما پر پرانے انا طولوی گیتوں نے اسے جس مسرت اور تحیر سے آشنا کیا وہ بیان سے باہر تھا۔

جب وہ واپس جا رہی تھی۔ ہیثم کی چلبلی سی بہن نے اس کے کان میں کہا۔ ''تم دلہن بن کر کب آؤ گی؟''

اس نے حیرت سے اس تیرہ چودہ سالہ زرافشاں کو دیکھا۔ اس کی کسی بھی حرکت سے کسی بھی تعلق کا کوئی اظہار نہ ہوا تھا۔ پرلڑکیوں کی حسیات کتنی تیز ہوتی ہیں؟ اس نے بے اختیار سوچا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''جب تمہارے خدا کو منظور ہوگا۔''

''آپ خدا کو نہیں مانتی۔''

''ہاں۔ شاید، تھوڑا بہت مانتی ہوں۔'' لڑکی گڑبڑا سی گئی تھی۔ اس نے اسے اپنی بانہوں کے کلاوے میں بھرلیا اور اس کے بالوں پر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔ ''ابھی میں پڑھ رہی ہوں۔ پڑھنے کے بعد تم لوگوں پر لکھنا ہے۔ شادی وادی کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔''

اس علاقائی سیاحت جس کا آغاز خوشی ومسرت اور سیر سپاٹے جیسے موڈ کے زیر اثر ہوا تھا۔ واپسی پر دکھ، ملال اور تاسف جیسے رنگوں سے بھر گیا تھا۔ علاقہ سونا دے رہا تھا پر عوض میں چاندی چھوڑ، پیتل چھوڑ، لوہا بھی نہیں لے رہا تھا۔ اس کے ذہنی افق نے وسعت اور کشادگی حاصل کی تھی اور چیزیں اپنے وسیع تناظر کے ساتھ سامنے آئی تھیں۔ پہلی بار اسے روس کی افغانستان میں فوج کشی پر شرمندگی اور ندامت کا احساس ہوا تھا اور اس نے دل سے سمجھا تھا کہ روس انتہائی فضول اور بے کار کی جنگ میں کودا ہے جس کا کوئی اخلاقی جواز نہیں۔

اور یہ بھی وہ اب سمجھی تھی کہ ہیثم کو کا کیشیا کے تیل اور

Downloaded From http://paksociety.com

گیس کے ذخائر پر روس کے قابض ہونے پر کیوں اعتراض ہے۔

تیل کے سونے سے مالا مال، قدرتی وسائل سے لدا پھندا۔ پر تعلیم اور صحت جیسے بنیادی مسائل میں بھی انتہائی پس ماندہ ہے۔

☆......☆

یونیورسٹی کے قیام نے ان کی ذہنی، فکری اور عملی تینوں طرح تربیت کی۔ مطالعہ کا تو انہیں شوق تھا ہی۔ اب عادی بھی ہو رہے تھے۔ لائبریری میں گھنٹوں بیٹھنا، نایاب اور اہم کتابیں پڑھنا، نوٹس لینے، سیاسی حالات پر ہفتہ وار، ماہانہ پرچوں اور ڈیلی اخبارات میں لکھنے کی چھوٹی موٹی مشق نے نہ صرف انہیں رواں کیا بلکہ تھوڑا سا قارئین سے متعارف بھی کروا دیا۔

دونوں بھرپور انداز میں میدان عمل میں اترے اور دن رات جدوجہد میں مصروف ہوئے۔

اینا کو آزاد اخبار ''نوایا'' میں سیاسی رپورٹر کی جاب مل گئی۔ ہیثم ''دی ماسکو نیوز'' میں چلا گیا۔

ایسے ہی دنوں میں سے ایک دن کوئی پانچ بجے ہیثم نے اپنی چابی سے فلیٹ کا بیرونی دروازہ کھولا۔ خیال نہیں تھا کہ وہ ہوگی پر گیلری سے آگے لاؤنج سے آتی روشنی نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ " گورکی " سے آچکی ہے۔ بے آواز چلتا ہوا جب وہ اور آگے بڑھا۔ اس نے دیکھا تھا وہ رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھی دنیا و مافیہا سے بے خبر لکھنے میں جتی ہوئی ہے۔ دروازے کی جانب اس کی پشت تھی۔

وہ اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا تھا۔ بڑے لیمپ کی روشنی میں کاغذ پر جو بکھرا ہوا تھا وہ ہائیڈروجن بم کے اہم روسی موجدوں میں سے ایک سخاروف کا انٹرویو تھا۔ جو ''گورکی'' میں نظر بند تھا۔ صفحے پر دردناک کیوں میں لتھڑے پتھرے سخاروف کی سوتیلی بہو بیٹی کے جذبات تھے جو باہر جانے کی خواہش مند تھیں اور جنہیں اجازت نہیں مل رہی تھی۔ دونوں میاں بیوی مطالبے کی منظوری کے لیے بھوک ہڑتال پر تھے۔

اس نے سر سیدھا کیا۔ لمبی سانس بھری۔ کھڑکی سے باہر دیکھا۔ کہر اور دھند نے شیشوں کو دھندلا دیا تھا۔ وہ پھر پلٹا۔ اس پر جھکا۔ اس نے اپنی ٹھوڑی عین اس کی چمکتی لمبی مانگ کے آخری سرے پر رکھ دی اور دونوں بازو اس کے گلے میں حمائل کرتے ہوئے گنگنایا۔ ''پہلے بم بناتے ہیں پھر امن کا پرچار کرتے ہیں۔''

وہ مسکرائی۔ اس نے اس کے بالوں سے پرصحت مند خوبصورت ہاتھ اور بازو کو اپنے ہاتھوں سے تھپتھپایا۔ پیار بھرا بوسہ دیا اور گردن اوپر کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکی۔ ''دیکھو ہیثم یہ ظلم کی انتہا ہے۔''

''یہ بھی آئن اسٹائن بن گیا ہے۔ پہلے دنیا کو مروا دیا۔ پھر دکھ اور تاسف کا اظہار شروع ہوگیا۔ خیر سے مغرب کے میڈیا کو تو موقع ملے روس کو لتاڑنے کا۔ پر یہ جب ایسے تباہ کن کام کرتے ہیں تب انہیں احساس نہیں ہوتا۔ حکومتوں کو تباہی کے سامان بنا کر سونپتے ہوئے انہیں دنیا پر چھا جانے کی ترغیب دینے کے یہ لوگ بھی مجرم ہیں۔'' وہ رکی۔ گہری سانس بھری پھر بولی۔ ''مت بھولو ہیثم جوانی جینیئس لوگوں کے جوش عمل، صلاحیتوں اور ٹیلنٹ کے اظہار کا وقت ہوتی ہے۔ انہیں کسی نہ کسی میدان میں کچھ نہ کچھ نیا دریافت یا ایجاد کرنا ہوتا ہے۔ دنیا اس سے کس انداز میں فیض یاب ہوتی ہے، یہ بعد کی بات ہے۔ اب اگر عمر کے کسی حصے میں غلطی کا احساس ہو جائے تو یہ بھی بڑی بات ہے۔

ہمارا سخاروف تو پھر قابل فخر ہے کہ اس نے صرف چھتیس (36) سال کی عمر میں ایٹمی ٹیسٹ بند کرنے اور جینئس سائنس دانوں کی اسلحہ ساز کارخانوں میں تعیناتی کے خلاف آواز بلند کر دی تھی۔ اب ایسا شخص امریکا روس ڈائیلاگ کی بات کرتا ہے۔ 67ء کی اسرائیل عرب جنگ میں روس کو مورد الزام ٹھہراتا ہے، افغانستان میں روسی فوج کشی کی سخت مذمت کرتا ہے تو وہ امن کا ہیرو ہے۔ کتنا ظلم ہو رہا ہے اس پر؟ اور ہاں دیکھنا یہ بھوک ہڑتال اسے بستر مرگ پر لے جائے گی۔

''چچ۔ چچ۔ چچ۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

اس دن وہ شام کو واپس آئی۔ ہیثم گھر میں موجود تھا۔ ٹانگیں میز پر رکھے کسی کتاب کے مطالعے میں گم۔ ڈائننگ ٹیبل پر دو بڑے سے پیکٹ پڑے تھے۔ وہ راہداری سے ہی شور مچاتی اندر آئی تھی۔ ''میں ارباط اسٹریٹ سے اسپیشل پیروشکی (روسی سموسے) لائی ہوں۔ اتنے خستہ اور لذیذ ہیں کہ کھاؤ گے تو مزہ آجائے گا۔''

وہاں کوئی نوٹس ہی نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ کتاب میں گم رہا۔

اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیاں اس کی آنکھوں کے سامنے نچاتے اور تمسخرانہ تاثرات چہرے پر بکھیرتے ہوئے

Downloaded From http://paksociety.com

وہ گھٹنوں کے بل جھکی اور بولی۔ ''عزت مآب توجہ فرمائیں گے۔'' اس نے سموسوں سے بھرا لفافہ اس کی آنکھوں کے سامنے نچایا۔ ''دیکھو تو میں کتنے مزے کی چیز لائی ہوں۔''
جواب پھر بھی نہ آیا تو وہ بولی۔ ''کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟ بولتے نہیں۔''
دفعتاً اس کی نظریں بے اختیار کھانے کی میز پر دھرے خوبصورت پیکٹوں پر پڑیں۔ اسے چھوڑ کر وہ فوراً ان کی طرف لپکی۔ اس نے ایک پیکٹ اٹھایا۔ پھاڑا۔ اندر سے بے حد خوبصورت پھولوں والا لونگ اسکرٹ، بلاؤز اور اسکارف نمودار ہوئے۔
اس نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔ ''کچھ بولو گے بھی۔''
''بس تیار ہو جاؤ۔ ابھی نکاح کے لیے چلنا ہے مسجد۔''
وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''ارے تم تو پکے بنیاد پرست مسلمان نکلے۔''
''اب جو تمہاری مرضی ہے سمجھو۔''
''پر تمہارے ہونٹوں کو تالے کیوں لگے ہوئے ہیں؟''
''دعائیں مانگ رہا تھا کہ یہ جنونی بلّی کی سی آنکھوں والی لڑکی خیر سے وقت پر گھر آجائے اور مجھے معزز امام کے سامنے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔''
''ہیثم اب اس کی کیا ضرورت تھی۔'' اس نے خوبصورت بلاؤز کو تنقیدی نگاہوں سے جانچتے ہوئے کہا۔ وہ نکاح کے بارے میں کہہ رہی تھی۔
''بھئی ہے اور بہت ہے۔ اب میں اپنے پانچ وقت نماز پڑھنے والے باپ اور ماں کے استفسار پر کہ نکاح کیا ہے یا ویسے ہی اس کے ساتھ رہ رہے ہو۔ جھوٹ نہیں بول سکتا۔''
''اور ہاں اس میں کیا ہے؟'' وہ اس دوسرے پیکٹ کو تو بھول ہی گئی تھی۔
''اس میں نکاح کا ضروری جز چھوہارے ہیں اور منہ میٹھا کرنے کے لیے کوئین آف اسپیڈ ہے۔''
چائے کے بعد ہیثم فون پر مصروف ہوا اور وہ تیار ہونے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ آکر اس کے پاس کھڑی ہوئی اور بولی۔ ''تم ابھی تک فون کے ساتھ ہی الجھے ہوئے ہو۔''

اس نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ چند لحوں تک دیکھتا رہا۔ پھر اس کے بالمقابل کھڑا ہوگیا۔ تھوڑا سا جھکا۔ کوہ یورال کی کانوں اور پہاڑوں کے ہیرے پتھر سے بنے انتہائی خوبصورت چھوٹے سے ہار اور بندوں کو اس کی گردن اور کانوں میں پہنانے کے بعد سیدھا ہوا۔ اپنی بانہوں کے کلاوے میں سمیٹے اسے لاؤنج کے بڑے آئینے کے سامنے لے آیا۔ اور مسکراتے ہوئے آئینے سے مخاطب ہوا۔ ''میں کچھ کہوں گا تو میری بات اس نے ہنسی میں اڑا دینی ہے۔ تم کہو گے تو شاید یقین کرے۔ ذرا اس سے پوچھو۔ یہ اینا جو اس وقت سامنے کھڑی ہے یہ تو پہچاننے میں نہیں آرہی ہے۔ سارا وقت اس اونگی بونگی اینا کو خود پر سوار کیوں رکھتی ہے؟ ایسے ہی سج سنور کر رہنے میں اسے کوئی تکلیف ہے کیا؟''
وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''کمال ہے ہیثم۔''
میرا پراسپکٹ کی مسجد میں کافی لوگ تھے۔ آرمینیائی، بلغاری، ازبک، روسی، بشکری اور قازق۔ خاصی تعداد تھی۔ سب بہت خوش ہوئے۔ معزز امام نے کلمہ پڑھایا پھر نکاح ہوا۔ چھوہارے اور مٹھائی کھائی گئی۔ ہاتھوں کو اٹھا کر کامیاب اور محبت بھری زندگی کے لیے دعائے خیر ہوئی۔ ''آمین'' کہنے میں بھی پُر جوش تھے۔ اینا نے اس ساری صورت سے بہت حظ اٹھایا۔
اگلے دن نینا کو ہنس ہنس کر تفصیل سنائی۔
دو ماہ بعد جب زیگ والا سلسلہ شروع ہوا۔ تب سب دوستوں کو بلانا پڑا۔ خوب محفل جمی۔ رات بہت دیر تک شراب نوشی، کھانا اور ڈانس ہوئے۔ یار لوگوں نے شادی میں نہ صرف بھرپور شرکت کی بلکہ خوب لطف بھی اٹھایا۔
صبح کوئی بارہ بجے وہ سو کر اٹھا۔ اینا نہیں تھی۔ شاید باہر ہو۔ اس نے سوچا اور لاؤنج میں آیا۔ سب یار دوست کوئی صوفوں پر، کوئی میٹرس پر اور کوئی کونے کھدروں میں اوندھے سیدھے قالین پر بکھرے پڑے تھے۔
اینا سارے گھر میں نہیں تھی۔ یہ کہاں چلی گئی ہے؟ اس نے تھوڑی کوفت اور بیزاری سے سوچا۔
ٹی وی کھولا تو جان گیا کہ وہ کہاں ہے؟ چرنوبل میں ایٹمی پاور پلانٹ پر زبردست حادثہ ہوگیا تھا۔ پلانٹ پر کام کرنے والے سینکڑوں افراد کی فوری ہلاکت اور قریبی جگہوں کے متاثرین کے بارے میں خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ کسی تخریب کاری کا نتیجہ؟ کسی بے احتیاطی کی وجہ یا کوئی تعمیراتی فالٹ۔ ابھی تو کچھ کہنا مشکل تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

پر تین بجے جب سب بیٹھے ناشتا کرتے تھے۔ان کی متفقہ رائے تھی کہ اب حکومت چاہے جو مرضی بیان بازیاں کرے۔ جوہری توانائی میں جس جدید ریسرچ اور پیش رفت کی ضرورت ہے سوویت انڈسٹری اور سوویت نیوکلیئر پاور اس میں پیچھے ہے۔ الٹے سیدھے تجربات کی ناکامی ماحولیات کی تباہی کا سبب بن رہی ہے۔

''اور اس بیوقوف اینا کو تو دیکھو۔ بھاگنے کی کیا جلدی تھی۔ یوکرائن کوئی ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔ عجیب جنونی ہے یہ لڑکی بھی۔ شادی کا ہنگامہ ابھی گرم ہے۔ گھر میں دوست ہیں اور وہ خود غائب ہوگئی ہے۔''

صرف دو دن بعد سب کچھ سامنے آ گیا تھا۔ پاور اسٹیشن پر غیر مستند تجربات ری ایکٹر میں آگ لگنے کی وجہ تھے۔آگ کنٹرول سے باہر ہو کر شدید ترین نقصان کا باعث بن رہی تھی۔

کوئی تین دن بعد وہ آئی۔ نڈھال تھکی تھکی۔ اتنی بھیانک تباہی پر ماتم کناں۔

اب نئی ایکٹویٹی شروع ہوگئی تھی۔اس حادثے نے چرنوبل سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ تشکیل دیا جس کا نصب العین مدد اور تحفظ ٹھہرا۔وہ نہ صرف اس سوسائٹی کی ممبر بنی بلکہ سرگرمی سے کام بھی کرنے لگی۔ایک دن جب وہ اس نئے پروجیکٹ پر کام کر رہی تھی اس نے کہنا ضروری سمجھا تھا۔

''اینا تمہیں تھوڑا وقت گھر کو اور اس غریب بندے کو بھی دینا چاہیے جو تمہاری نظر کرم کا محتاج رہتا ہے۔''

لاؤنج میں گیس پائپ کے عین اوپر دیوار پر سوویت یونین کا بڑا سا نقشہ ٹنگا تھا۔ ہیثم منہ دھو کر آیا تھا۔تولیے سے چہرہ صاف کرتا ہوا وہاں جا کر کھڑا ہو گیا۔

''دیکھو اینا......''اس نے نقشے کی طرف اشارہ کیا۔

''سوویت کتنا بڑا ہے؟ لوگ کیا تمہاری طرح دیوانے ہو گئے ہیں۔ زندگی میں توازن پیدا کرو۔کبھی تم نے جو کچن دیکھا ہو؟ کبھی کوئی اچھی ڈش بنائی ہو۔''

اس نے یہ سب سنا۔ تھوڑی دیر چپ رہی۔ پھر دھیرے سے بولی۔''ہیثم تمہیں یہ سب معلوم تو تھا کہ میں بس ایسی ہی ہوں۔''

''ہاں مجھے معلوم تھا پر اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ تم ساری زندگی اسی جنون اور اسی بے ترتیبی سے گزار دو۔ تھوڑی سی توجہ تو گھر اور شوہر مانگتا ہے۔''

وہ بڑبڑائی ضرور مگر زیادہ نہیں۔ اٹھ کر اس کے پاس آئی۔ اس کے گلے لگی۔ کچن میں گئی۔ بورشش Borshuss سوپ بنایا۔ بلینی بنائی۔ سویٹ ڈش کے طور پر آئس کریم فریج سے نکالی۔

چلو اس کی اس ذرا سی توجہ نے اس کا موڈ خوشگوار کر دیا۔

کچھ وقت اچھا گزر گیا۔ پھر ایک دن قدرے زوردار لڑائی ہوئی۔

اس نے روس کی خاتون اوّل رئیسہ گورباچوف کا انٹرویو کیا۔ فائنل کر کے کمپیوٹر سے اٹھی تو وہ بیٹھ گیا۔ سارا پڑھ چکنے کے بعد بولا۔''دیکھو یہ حصہ کاٹ دو۔''

''کیوں؟''اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

''وہ اگر کیڈی لک گاڑی میں سفر کرتی ہے۔ مہنگے ترین غیر ملکی کپڑے استعمال کرتی ہے تو تمہیں کیا؟''

''حد کرتے ہو ہیثم۔'' وہ چلائی۔''مجھے کیوں نہیں کچھ؟ مجھے تو سب سے پہلے اعتراض ہے۔وہ ملک کی نمائندہ خاتون ہے۔ماسکو یونیورسٹی میں لینن ازم اور مارکسزم پر لیکچر دیتی ہے اور حال اس کا یہ ہے۔کتنا تضاد ہے اس کے ہاں۔''

''تمہیں اگر پہننا اوڑھنا نصیب نہیں تو اوروں کو دیکھ کر برداشت کیوں نہیں؟ منگتوں کی طرح زندگی گزارنے کا انداز اپنا رکھا ہے۔کبھی جو ڈھنگ کے کپڑے پہنو۔کبھی جو چہرے کی زیبائش ہو۔''

وہ چند لمحوں کے لیے رکا۔اس کی آواز اندر کی تلخی سے بھڑکی ہوئی تھی۔''کسی ملک بھی گیا۔وہاں کی مارکیٹوں میں گھومتے پھرتے صرف اور صرف ایک چہرہ آنکھوں کے سامنے جھلملایا۔یہ رنگ سجے گا اس پر۔خرید لیا۔کیسا شاندار بریسلٹ ہے۔کلائی اور خوبصورت لگے گی۔گردن میں اچھی لگے گی یہ چین۔معلوم نہیں کن ڈبوں میں میرے وہ جذبات بند ہیں۔سنو اینا لوگوں کو جینے دو۔ان کے راستے بھی کھوٹے کرنے پر تلی ہوئی ہو۔''

وہ حد درجہ سفّاکی پر اترا ہوا تھا۔وہ ٹھیک کہتا تھا مگر وہ بھی تو ایسی باتوں کی عادی نہ تھی۔ بھونچکی سی ہو کر چند لمحوں اسے دیکھتی رہی۔شاکڈ کی سی حالت میں پھر چلائی۔''اف ہیثم یہ تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟''اب وہ اس پر چڑھائی کے لیے دوڑی۔

''اینا مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟ میں تم سے وقت چاہتا ہوں جو تمہارے پاس نہیں۔ میں تمہیں سجا سنورا دیکھنا چاہتا

Downloaded From http://paksociety.com

ہوں جس کی تمہیں فرصت نہیں ۔ میں بچہ چاہتا ہوں جس کے لیے تم تیار نہیں۔ تمہی بتاؤ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟''

وہ اس کی بانہوں کے حصار میں بہت دیر تک کسی چھوٹے معصوم سے بچے کی طرح سمٹی رہی۔ ''میں کیا کروں ہیثم ۔ مجھے اپنا اندر فریجیڈ محسوس ہوتا ہے۔ کبھی کوئی خواہش سر بھی اٹھاتی ہے تو ساتھ ہی قطار در قطار مسائل کے انبار آ کھڑے ہوتے ہیں۔''

''تم نے دنیا کا ٹھیکا نہیں اٹھا رکھا ہے۔ جس کا یہ کام ہے اسے کرنے دو۔ تم نے صرف اپنے حصے کا اتنا ہی کرنا ہے جو تمہارے لیے مخصوص ہے۔ حد سے بڑھ جاؤ گی تو نقصان ہوگا۔ اینا میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں پر یاد رکھو کہ میں ایک مرد بھی ہوں۔ محبت کرنے والا اور چاہنے والا ایک مرد۔''

کچھ وقت ٹھیک گزر گیا۔ پھر وہی قصہ۔ چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بڑے بڑے جھگڑوں میں بدلنے لگی تھیں اور انہی دنوں میں سوویت بھی ٹوٹنے پھوٹنے لگا تھا۔

☆......☆

ہوائیں ظالم و جابر لوگوں کی طرح چنگھاڑتی پھرتی تھیں۔ ٹھنٹھ درختوں کی ویرانی اور ان کی سیاہی سفید اور کہر سے بھرے منظروں میں خوفناک سی دکھتی تھی۔

تھکاوٹ بھی تھی اور نڈھالی بھی محسوس کر رہی تھی۔ جب کام سے لوٹی اور گھر میں داخل ہوئی تھی۔ آنے کے ساتھ ہی اس نے پرس کی سٹریپ کندھے سے اتار کر بیگ کو یوں صوفے پر پھینکا جیسے وہ نہایت بیکار اور فضول چیز ہو۔

ہیثم کی طرف دیکھا۔ اس وقت ہیثم کو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اسے بھی کوئی فضول اور بیکار شے سمجھتی ہو جو مفت میں آنکھوں کی راہ میں حائل ہو رہی ہو۔ کرسی پر بیٹھنے کے ساتھ ہی اس نے دونوں بازو میز پر پھیلاتے ہوئے سر ان کے درمیان رکھ دیا۔

کتنی دیر بیت گئی۔ لاؤنج میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ باہر دھند اتر رہی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشے دھندلا رہے تھے۔ اور اندر اس کا رویہ جذبات و احساسات کو دھندلا رہا تھا۔ وہ کوفت اور بیزاری سے کھڑا ہوا۔ کمرے میں چند چکر کاٹے۔ شیشوں سے سڑک پر کچھ دیکھنے کی کوشش کی پھر واپس آیا۔ ''اینا۔ کیا بات ہے؟''

اس نے سر اٹھایا۔ گھائل نظروں سے اسے دیکھا۔

کچھ کہنے کی بجائے ریموٹ کا بٹن دبایا۔ ٹی وی شور کی آواز سے آن ہوا۔ ابھی اسکرین پر دکانوں کے سامنے ڈبل روٹی اور واڈکا کے لیے لمبی قطاروں کا منظر ابھرا ہی تھا کہ اس نے کھٹ سے اسے دوبارہ بند کر دیا۔

وہ اٹھی ۔ کچن میں گئی۔ کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ باہر نکلی اور بولی۔ ''گھر میں تو کچھ بھی نہیں۔''

''گھر تمہارا بھی ہے، میرا ہی نہیں۔ اس کی ذمہ داری تم پر بھی ہے۔''

''اف''۔ اس نے لمبی سانس بھری تھی۔

باہر واڈکا کے لیے لمبی قطاریں، کھانے پینے کی چیزوں کے حصول کے لیے قطاریں، روبل کو ڈالرز میں تبدیل کرنے کے لیے قطاریں، ریگن اور دوسرے مغربی لیڈروں کی گورباچوف کی تعریفوں کی لمبی قطاریں، گورباچوف اور یلسن کے جھگڑوں کے لیے سلسلے۔ ان سب کے درمیان اس کے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کی قطاریں جو اب گھریلو مسائل کے علاوہ ملکی حالات پر بھی اختلاف کی صورت میں لمبے لمبے جھگڑوں کا باعث بننے لگے تھے۔

''تمہارے ساتھ چلنا کتنا مشکل ہو گیا ہے؟ تم کتنے ڈیمانڈنگ اور ظالم ہو رہے ہو۔ آج کل کتنی ٹینشن ہے؟ قوم کی بقا داؤ پر ہے۔ ملک بھی آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر جیسے کھڑا ہے۔ تمہیں کوئی پروا ہی نہیں۔''

''کس قدر افسوس ہے تم پر۔ کس حق سچ پر کھڑی ہو تم؟ میں تو غلام ہوں سوویت کا میری بلا سے۔ کل کا ٹوٹتا آج ٹوٹ جائے۔ مائی فٹ جو بویا تھا وہی کاٹنا ہے اسے۔''

اس وقت وہ بڑی ڈپریس سی تھی۔ کچھ زیادہ بولی نہیں۔ بس تھیلا اٹھایا اور باہر نکل گئی۔

وہ سوچوں میں گم صم بیٹھا تھا۔ پھر جیسے خود سے بولا۔ سوویت کے حالات کی طرح اس کی محبت بھی اس مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں کسی بھی لمحے کوئی دھماکا ہو سکتا ہے۔

وہ کافی دیر بعد آئی۔ کچن میں گئی۔ سوپ بنایا۔ کھانے کی میز پر رکھا اور اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا کر لائی اور جب وہ چھوٹی چھوٹی بائٹ لیتا اور سوپ پیتا تھا وہ بہت متاسف سا تھا کہ آخر اس نے ایسا کیوں کیا؟ کیا تھا جو وہ خود چیزیں لے آتا؟ کتنی مشکل اور تکلیف سے وہ یہ سب لائی ہوگی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب وہ اٹھا اس نے اس کے بالوں پر پیار کرتے ہوئے اپنے سینے سے بہت لمبی سی سانس نکالتے ہوئے کہا تھا۔ ''اینا شاید تم یہ کبھی نہ سمجھ سکو کہ میں تم سے کتنا

Downloaded From http://paksociety.com

پیار کرتا ہوں اور تمہاری توجہ کا کتنا منتظر رہتا ہوں۔''

وہ بھی بھری بیٹھی تھی۔ اس کے سینے سے لگی تو جیسے برسات سی ہوگئی۔

وہ ٹی وی پر سوویت یونین کی کونسل آف منسٹرز کے چیئرمین نکولائی رژکوف کے ساتھ سوال جواب میں گورباچوف کی گورنمنٹ کا تیا پانچہ کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔ اناج اور آلو وافر مقدار میں موجود مگر دکانوں پر کیوں نہیں؟ سگریٹ فیکٹریوں میں بکثرت موجود مگر دکانیں خالی۔ گوشت گوداموں میں سڑ رہا ہے مگر لوگوں کو مل نہیں رہا۔

رژکوف کی ہر بات تو وہ گاجر مولی کی طرح کاٹتی تھی۔ نظریاتی طور پر وہ سوشلزم کی حامی تھی۔ لینن محبوب لیڈر تھا۔ پر حالات جس نہج پر آگئے تھے وہاں کسی بھی ازم کا اب کوئی سوال نہیں رہا تھا۔ سرمایہ داری کے لیے سب راستے ہموار ہو رہے تھے۔ سوویت یونین کی ملحقہ ریاستوں کے حوالے سے بات ہوئی۔ بالٹک ریپبلکیں لتھوینیا، لتویا اور استھونیا میں ایجی ٹیشن اور 1940ء سے پہلے کے اسٹیٹس پر جانے کے مطالبے پر بات ہوئی۔ کاکیشائی ریاستیں اور ان کا مستقبل کھل کر زیر بحث آئے۔ مشرقی جرمنی چیکوسلواکیہ رومانیہ اور ہنگری کے حالات بھی نظرانداز کرنے والے نہ تھے۔

ڈیڑھ گھنٹے کے اس پروگرام کے بعد جب وہ گھر آئی ایک گرماگرم بحث اس کے انتظار میں تھی۔

''اینا اپنے نقطہ نظر میں ذرا وسعت پیدا کرو۔ لوگوں کے دل کی بات سنو اور سمجھو۔ اسٹالن کی طرح اپنے حقوق اور آزادی کے لیے ہلکی سی آواز بھی تم سے برداشت نہیں ہوتی۔''

''یشم تمہیں یہ بات نہیں کہنی چاہیے۔ ریاستیں اگر آزادی چاہتی ہیں تو یہ ان کا حق ہے۔ مسئلہ اگر ہے تو دنیا میں روسی عظمت، وقار اور مقام کا۔ لیکن ان کی غلط پالیسیوں کی تو میں خود سب سے بڑی نقاد ہوں۔''

''اب کوئی پوچھے کہ اس وقار کو داؤ پر لگانے والے کون ہیں؟ افغانستان میں پنگوں کی ضرورت تھی بھلا۔ دراصل مہم جوئی کا جنون چین لینے نہیں دیتا نا۔ کیوبا پر ضرورت سے زیادہ مہربانیاں۔ مشرقی یورپ پر عنایتیں۔ ریپبلکوں پر جپھے۔ ہتھیاروں اور میزائلوں کی دوڑ میں سبقت کا جنون۔

عام روسی بے چارہ تو لائنوں میں کھڑا ہے جس کی آدھی دیہاڑی ایک ڈبل روٹی کے حصول میں گزرتی ہے۔ وہ کیوں نہ چلائے اور کہے۔ اپنا آپ سنبھالو۔ چار سو بکھیڑے ڈالے ہوئے ہیں۔ دنیا کے آدھے رقبے پر قبضہ کیے بیٹھے ہو۔ اب جان چھوڑو ان سب کی اور اپنی نبیڑو۔

مغرب اور آئی ایم ایف کے ہتھکنڈے آنے والے سالوں میں دیکھنا تو سہی کیا کیا تماشے دکھاتے ہیں۔

بظاہر دونوں بڑے باریک بین تھے۔ امریکا اور دیگر مغربی ممالک معاشی اور اقتصادی میدانوں میں کن کن ذلت آمیز ہتھکنڈوں سے سوویت یونین کا گلا گھونٹنے اور اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

خود گورباچوف کیا چاہتا تھا۔ یلسن کے عزائم کیا تھے؟ ملک تیز رفتاری سے کس نہج پر جا رہا تھا۔ اسے سمجھنے میں یشم زیادہ تیز تھا۔ اس کے تجزیے حقیقت کے زیادہ قریب ہوتے۔

اینا کو یلسن سے زیادہ امید تھی۔ اس کے عوامی انداز اسے پہلے حکمرانوں سے مختلف لگے تھے۔ کم از کم اس کی صورت میں وہ ایک امید، روشنی کی ایک کرن ضرور دیکھتی تھی۔

یشم اس سے قطعی متفق نہیں تھا۔ وہ یلسن کو نرا فراڈ اور ڈرامابازخیال کرتا تھا۔ ان دنوں وہ اکثر اسے کہتا۔

''اینا یلسن کو ذرا گہرائی میں جاکر دیکھو۔ بڑے گھٹیا اور چیچڑے انداز ہیں اس کے۔ تم جیسی سمجھ دار بھی اس کے فریب میں آگئی ہے تو بے چارے عام روسی تو کسی گنتی میں شمار نہیں؟ لوگوں نے بڑی امیدیں وابستہ کرلی ہیں۔'' یشم ہنسا تھا۔ اس کے لب و لہجے کی نقلیں اتارنے لگا تھا۔ ''مجھے سرکاری گاڑی نہیں چاہیے۔ ڈرائیور کی ضرورت نہیں۔''

''اب وہ عام لوگوں کی طرح میٹرو سے سفر کرتا ہے۔ مارکیٹوں پر چھاپے مارتا ہے۔ تقریروں میں بیوروکریسی کے لتے لیتا ہے اور بلّے بلّے کے نعرے لگواتا ہے۔ کل دیکھنا۔ اسی بیوروکریسی کے بغیر وہ سانس بھی نہیں لے سکے گا۔ سورڈ لووسک کا یہ بورس یلسن پورا ایکٹر ہے۔ آنے والے دنوں میں اس کے رنگ دیکھنا۔ باپ ہے سب کا۔''

1990ء میں کوزنسک کے علاقے میں روسی کان کنوں کی ہڑتال اتنی ہمہ گیر اور شدید تھی کہ گورباچوف کی حکومت ہل کر رہ گئی۔

☆......☆

اگست کے تیسرے ہفتے کی وہ صبح بڑی روشن، چمکدار اور کھلی کھلی سی تھی۔ اینا نے سفید نیٹ کے پردے جھٹک کر

Downloaded From http://paksociety.com

اکٹھے کیے اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ سمولنسکایا چوک کا تھوڑا سا منظر اس کھڑکی سے نظر آتا تھا۔ سناٹا بکھرا پڑا تھا۔ دو ٹینک آہستہ آہستہ حرکت میں تھے۔

''تو پھر فوج نے بغاوت کردی ہے۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور لاؤنج میں آکر ٹی وی آن کردیا۔ اسکرین پر اہم خبر کی پٹی چل رہی تھی۔

گورباچوف شدید علیل ہیں۔ حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر ایمرجنسی نافذ کردی گئی ہے۔

وہ بیڈروم میں گئی۔ ہیثم سو رہا تھا۔ اس نے اس کا بازو ہلایا اس کی نیم وا کھلی آنکھیں دیکھ کر اس نے خبر سنائی۔

وہ خفیف سا ہنسا اور بولا۔ ''چلو جارج بش کا انتظار ختم ہوا۔ بیچارہ اپنے بیلی گورباچوف کو فون پر ڈرا ڈرا کر مار رہا تھا۔''

جب وہ دونوں چائے پیتے ہوئے کھڑکی سے باہر سڑکوں کی ویرانی دیکھ رہے تھے۔

ہیثم نے کہا۔ ''لو گورباچوف گیا اور ریلسن آیا۔''

ہیثم نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ایسا بالعموم نہیں ہوتا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو اس حد تک سمجھ چکے تھے کہ کسی بھی نازک صورت میں ایک دوسرے کے دل و دماغ میں اٹھنے والے سوالات و خدشات کو بغیر بتائے سمجھ لیتے تھے۔ چند لمحوں تک وہ اسے دیکھتا رہا پھر رسان سے بولا۔ ''اب امریکا اور مغرب کے سامنے کھکھیانے، جھکنے اور رینگنے سے ہمیں تو نفرت ہے۔ پر ان لیڈروں کو کون سمجھائے؟ فوج میں اضطراب اور بے چینی ہے۔ یلسن ان کے لیے انتہائی ناپسندیدہ ہے۔ اب تاریخ کے فیصلے کا انتظار کرو۔ یہ فوجی بغاوت کیا گل کھلاتی ہے؟ دیکھو۔''

اور جب ہیثم نہانے کے لیے گیا۔ اس کے ذہن میں الاؤ دہک رہا تھا۔ ملک بڑے خطرناک موڑ پر آگیا تھا۔ پتا نہیں اس وقت وہ کیوں بہت کمزور ہو رہی تھی۔ دل سے چاہتی تھی کہ جو کچھ بھی ہو ملک و قوم کے لیے بہتر ہو۔ سچی بات ہے ان ذلیل لیڈروں نے روس کی آن بان اور شان داؤ پر لگادی تھی۔

پشکن دل کے اندر سے نکل کر ہونٹوں پر آگیا تھا۔ ہر عہد اور ہر زمانے کا شاعر آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

پتا نہیں ضبط کیوں جواب دے گیا تھا۔ آنسو اک تواتر سے بہنے لگے تھے۔ ناشتا بنانے کے لیے کچن میں گئی تب بھی ہونٹوں پر پشکن تھا۔

ناشتے کے بعد دونوں کام پر نکل گئے۔

اینا جلدی آگئی۔ کھانا تیار کرنے کے دوران ہیثم بھی آگیا تھا۔ وہ کچن میں تھی۔ وہیں اس کے پاس آکر بولا۔ ''اینا ابھی کوئی تبصرہ، کوئی حاشیہ آرائی، کوئی بیان، کچھ مت دینا۔ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس مختصر سے احمقوں کے فوجی ٹولے نے بغیر کسی پلاننگ کے قدم اٹھالیا ہے۔ یلسن تو صدارتی عمارت میں موجود اور توڑ جوڑ میں مصروف ہے۔''

وہ چپ چاپ میز پر چیزیں رکھنے لگی۔ آج سارا دن اس نے جس صورتِ حال کا سامنا کیا وہ بے حد مایوس کن تھی۔ اس فوجی بغاوت کی قیادت وزیرِ دفاع یازوف اور گیناڈی کر رہے تھے۔ اوّل درجے کے ان بیوقوفوں کی منصوبہ بندی بودی اور مخالفین کے ساتھ بے رحمی سے نمٹنے کی صلاحیت سے قطعی عاری تھی۔

روٹی اور ضروریاتِ زندگی کے حصول میں الجھے ہوئے لوگوں کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے دونوں دھڑوں پر لعنت بھیجی تھی اور سڑکوں پر نکلنے کو پسند ہی نہیں کیا۔

اگلے چند دن بڑے کربناک تھے۔ جمہوریائیں ایک کے بعد ایک آزادی کا اعلان کرتی جارہی تھیں۔

جس دن یوکرائن نے اعلان کیا۔ ہیثم کھانے کی میز پر بیٹھا تھا۔ اس نے ڈونگے سے سوپ پیالے میں ڈالا اور سنجیدگی سے بولا۔ جمہوریہ یوکرائن تو چلو پھر بھی روسی دباؤ کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتی ہے مگر یہ بقیہ جمہوریائیں جن کی معیشتیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں، روسی ہتھکنڈے اور جھٹکے برداشت نہیں کر پائیں گی۔ ذرا یلسن کے پاؤں جمنے کی دیر ہے تماشے دیکھنا پھر۔ ابھی چیچنیا کی طرف سے بھی اعلان متوقع ہے۔

فوجی بغاوت ناکام، گورباچوف کا بوریا بستر گول اور یلسن بیوروکریسی کے اس دھڑے کے کندھے پر سوار جو کھلم کھلا سرمایہ داری کی بحالی کے لیے سرگرم تھا، اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہوگیا۔

اور اس دن اینا نے کہا۔ ''ہیثم تم ٹھیک کہتے تھے۔''

جس دن ٹی وی پر ایک اعلان دونوں نے ایک تسلسل کے ساتھ دیکھا اور سنا۔ ایک ٹیلیفون نمبر جو ہر خاص و عام کی اطلاع کے لیے کہ فوجی بغاوت کا ساتھ دینے والے آپ کے ہمسائے یا واقف کاروں میں اگر کوئی ہے تو مطلع کریں۔

Downloaded From http://paksociety.com

ہیثم نے اونچی آواز میں ہنستے ہوئے کہا۔ اینا ہم تو ہمیشہ سے حکومت کی ہٹ لسٹ پر ہیں۔ اب تیار ہو جاؤ۔ یا تمہیں پھانسی لگائیں گے یا مجھے۔

مراجعت کے اس سفر کو جو اس کے حسابوں بڑے روشن دنوں سے شروع ہو کر دھند بھرے دنوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس نے اسے مضطرب اور بے قرار کر رکھا تھا۔ کریملن پر سوویت کا جھنڈا اتار کر صرف روس کا جھنڈا لہرانے کے عمل کو دیکھنا لوگوں کے لیے مسرت اور انبساط سے بھرا ہوا تھا۔ ریڈ اسکوائر میں خلقت امنڈی پڑی تھی۔ لوگ دو انگلیاں لہراتے ہوئے وکٹری کا نشان بناتے تھے۔

فوجی بغاوت کی ناکامی پر مسرت و شادمانی کا اظہار تھا۔ ہتھوڑا اور درانتی سرخ جھنڈے سے یوں کاٹ پھینکی گئی تھی جیسے وہ کسی تحریک کا سمبل نہیں، کوئی اچھوت شے تھی۔ ہاں البتہ لینن گراڈ سے پیٹرز برگ کی واپسی پسندیدہ تھی کہ جس نے تاریخ بنائی، اسے اس سے محروم کر دینا بھی زیادتی تھی۔

ہر گزرتے دن ایک نیا شوشا جنم لیتا۔ ایک نیا روح فرسا منظر سامنے آتا۔ لتھوینیا کے کیپٹل سٹی ویلینس میں اس کے محبوب لیڈر لینن کے مجسمے کو ہٹائے جانے کا منظر کتنا دل خراش تھا۔ پر یہ بھی کتنا بڑا المیہ تھا کہ جنگ عظیم دوم کے جرنیل اپنے تمغوں کو سینوں پر سجائے ریڈ اسکوائر میں کھڑے روٹی اور روبل کے طلب گار تھے۔

زار شاہی دور کی طرف واپسی ستر اسی سالہ وقت کو منہا کرنے کی حماقتیں جو تھیں زور و شور سے جاری تھیں۔ زار شاہی کا زمانہ بہترین، آرتھوڈوکس چرچ ہمارا ایمان اور اسٹیٹ ایگل امتیازی نشان بحال۔ بڑے ظالمانہ دن تھے۔

☆......☆

گاڑی عام طور پر اینا کے پاس ہوتی تھی۔ ہیثم عام روسی مردوں کے برعکس زیادہ لبرل تھا۔ اس کے بہت اصرار کے باوجود کسی اشد مجبوری کے تحت ہی گاڑی لے کر جاتا۔

بالعموم وہ اکٹھے نکلتے۔ اینا اسے چھوڑتے ہوئے اپنے دفتر آ جاتی۔ آج گاڑی گیراج سے نکال کر وہ خود اسٹیئرنگ پر بیٹھا۔ اسے دفتر اتارتے ہوئے بولا۔ ”تین بجے تک اپنے کام نمٹا لینا۔ کہیں چلنا ہے۔“

وہ پوچھتی رہی۔ کہاں؟ کہاں؟ کہاں؟ لیکن اس نے جواب دینے کی بجائے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

ٹھیک تین بجے وہ آ گیا اور اسے ساتھ لے کر کلینک پہنچا۔ ڈاکٹر دونوں کی دوست تھی۔ دونوں کو دیکھ کر ہنس پڑی تھی۔ ہیثم نے بے تکلفی سے کہا۔ ”اپنی رپورٹ میں لے آیا ہوں۔ اسے چیک کرنا آپ کا کام ہے۔ میں بچہ چاہتا ہوں۔ اسے منائیں اور دیکھیں بھی۔“

پہلے وہ ہتھے سے اکھڑی۔ ”ہیثم کھانے کو روٹی نہیں مل رہی ہے اور تمہیں بچہ چاہیے۔“

”چلو چار پانچ نہ سہی ایک دو تو ہونے ضروری ہیں۔“ وہ اس کے غصے کو یکسر نظر انداز کرتا ہوا ہنسا۔

”اف چار پانچ۔ دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ ہاں بچہ تو چاہ رہے ہو اسے پالے گا کون؟“

”میں۔“ اس نے ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے گردن بڑے فدویانہ انداز میں جھکائی۔

ڈاکٹر ہنستے ہوئے حظ اٹھا رہی تھی۔

”چلو اٹھو چیک کروں تمہیں۔ عجیب ہو۔ عورتیں بچوں کے لیے مری جاتی ہیں۔“

واپسی پر وہ چپ تھی۔ کھانا کھاتے ہوئے برتنوں کو دھوتے اور انہیں سمیٹتے ہوئے اس نے کوئی بات نہیں کی۔ پر جب وہ اس کے ساتھ لیٹی تو اس نے کہا۔ ”تو اگر مجھ سے بچہ نہ ہوا تو؟“

”اینا تم بھی کمال کی عورت ہو۔ بھئی نہ ہوا نہ سہی۔ کوشش کرنی ضروری ہے۔“

یہ بھی محض اتفاق ہی تھا کہ اگلے دن نینا اپنے شوہر اور دونوں بچوں کے ساتھ ان کے گھر آ دھمکی۔ اس کا آنا کوئی نیا نہ تھا۔ پہلے بھی وہ آتی رہتی تھی۔ بچے بھی ساتھ ہوتے پر اس بار عجیب سی بات ہوئی۔

جیسے خاموش مدتوں سے بند پڑے ساز پر کوئی موسیقار اپنی انگلیاں چلا دے۔ سر نکال کر فضا میں بکھیر دے۔ کچھ ایسا ہی اس کے ساتھ ہوا تھا۔

جب وہ سب یلسن اور اس کی مخالف پارلیمنٹ پر زور و شور سے بحث کر رہے تھے۔ کلنٹن کی تڑپ اور اس کی بے چینی کا ذکر ہو رہا تھا۔ امریکن ایڈ اور جی 7 کی طرف سے امدادی پیکج کے دیئے جانے پر بات ہو رہی تھی۔

”مضبوط کرو یلسن کے ہاتھ، کلنٹن کو تو مصیبت پڑی ہوئی ہے۔“ نینا بولی۔

کچن سے نکل کر تولیے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اینا نے کہا۔ ”دیکھ لو پھر جی 7 کی طرف سے اس 42 بلین ڈالر کی امداد کا حشر کیا ہوا۔ رشوتوں کے زور پر ریفرنڈم جیت

Downloaded From http://paksociety.com

کر پارلیمنٹ کو تحلیل کر دیا نا یلسن نے۔''

سب کا خیال تھا کہ صدر اور پارلیمنٹ کے درمیان یہ محاذ آرائی زیادہ دیر نہیں چلنی چاہیے۔ یہ ملک کے لیے بہت نقصان دہ ہوگی۔

ان کے جانے کے بعد اس نے کہا۔

''ہیثم میں کتنی عجیب اور فضول عورت ہوں۔ نینا کے بچوں نے آج مجھے بہت بری طرح اس کمی کا احساس دلایا ہے۔''

''چلو تمہیں احساس ہوا یہی کافی ہے۔ اب تھوڑی سی توجہ تو کرو گی۔ پر مجھے یہ بھی بتاؤ کہ آج تم گرجی برسی کیوں نہیں۔''

''ارے۔'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنسی۔ ''کھانا بنانے میں جو مصروف تھی۔''

اپنے مزاج کے برعکس اس نے اپنے احساسات کا اعتراف تو ضرور کیا تھا۔ پر اندر خانے وہ جس طرح کے محسوسات سے دوچار ہوئی تھی۔ اس کو ظاہر کرنا کچھ اسے اچھا نہیں لگا تھا۔

☆......☆

یہ دن بڑے اہم تھے۔ یلسن اور پارلیمنٹ میں اقتدار کی رسہ کشی جاری تھی۔ پارلیمنٹ کا دھڑا جو بیوروکریٹوں، پرانے اسٹالنسٹوں اور فوج پر مشتمل تھا۔ حکمت عملی سے خالی تھا۔ عوام اور مزدوروں کو اپنی طرف مائل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ یلسن نے کے جی بی، پولیس اور فوج کے سرکردہ جرنیلوں کو ڈالروں کے بریف کیس دیئے اور وائٹ ہاؤس پر قبضہ کرلیا۔

ذاتی طور پر اس نے کبھی اس بات کو پسند نہیں کیا تھا کہ وہ کسی بھی چیز کو اسٹور کرے۔ ہمیشہ وہ روز مرّہ چیزوں کو اتنا ہی خریدتی جتنی اس کی ضرورت ہوتی۔ گزشتہ ماہ ہیثم گوشت کوئی مہینے بھر کا لے آیا تھا۔ چینی چاول میدہ وہ لے آئی تھی۔ کس دقّت سے اس نے یہ چیزیں خریدیں۔ اس کا احساس اسے قطاروں میں کھڑے ہونے سے ہوا۔ بالعموم وہ اپنے تعلقات کی بنا پر بلیک مارکیٹ سے خرید لیتے تھے اور اس کوفت اور تکلیف سے بچ جایا کرتے تھے جو ان دنوں متوسط اور غریب روسیوں کا مقدر بنی ہوئی تھی۔

گزشتہ چار ماہ سے اسے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ بہت سے نئے اخبار نکلے۔ انہوں نے اسے زیادہ بہتر آفر دی مگر اس نے سوچا دفع کرو۔ ماسکو نیوز کا ہی ایک نیا پرچہ Ogonyuk نکلا۔ جس کی آغاز کی اشاعت ہی تین لاکھ سے ہوئی تھی۔ گو پرچہ کی اشاعت اس وقت کوئی بیس لاکھ ہو چکی تھی۔ پر ملکی حالات کا اس پر بھی اثر تھا۔ ہیثم کی تنخواہ سے گزارہ ہو رہا تھا۔

حالات کا جبر شدید اور بے رحم تھا تو موسم بھی ایسی ہی بے رحمی پر سزا دے رہا تھا۔ جنوری کی برف باری ماسکو کے گلی کوچوں میں اپنی شدتوں سے اتری ہوئی تھی۔

اس دن اس کا آف تھا۔ ہیثم دفتر تھا۔ بارہ بجے تک تو سوتی رہی۔ پھر ناشتے کی ٹرالی کچن سے گھسیٹ کر لاؤنج میں لے آئی کہ چلو ٹی وی بھی دیکھتی ہوں اور ناشتا بھی ہو جائے گا۔

اسی وقت ہیثم کی کال آئی وہ پوچھ رہا تھا۔ ''تمہارے پاس کچھ دنوں کا گزارہ ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''ٹی وی کھولو اور دیکھ لو۔ اگر کچھ چیزیں خرید کر لاسکتی ہو تو لے آؤ۔ وگرنہ پھر فاقے تو ہیں ہی۔''

اس نے ٹی وی آن کیا، وہاں اس اچانک اعلان کی گونج اور دھمک سنائی دی تھی۔ حکومت نے اشیاء پر سے کنٹرول ختم کر دیا تھا۔

اس نے الٹا سیدھا ناشتا کیا۔ فل کوٹ پہنا۔ ٹوپی اوڑھی۔ تھیلا اٹھایا اور نکل کھڑی ہوئی۔ مارکیٹ سے اوّل تو چیزیں غائب تھیں جو مل رہی تھیں تو دس گنا زیادہ داموں پر۔ یہیں اسے معلوم ہوا کہ لوگ احتجاج کر رہے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں کو دفع دور کرتے ہوئے وہ روسی سپریم سوویت کی عمارت کی طرف بھاگی۔

لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ وائٹ ہاؤس، میئر ہاؤس اور ماسکو دریا کے کنارے کی سڑک سمولنسکایا تک لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ اس نے تھیلا کوٹ کی جیب میں ڈالا۔ تصویریں کھینچیں، رپورٹ بنائی اور دفتر بھاگ گئی۔

رسد زر قابو سے باہر، افراط زر کی شرح انتہائی بلندیوں پر۔ اچکے بدمعاش، بلیک مارکیٹیے، مافیا، سٹے باز، سب یلسن کے ساتھی دوست جن کے لیے صرف اپنے مفادات اہم۔ ان کے ڈالر محفوظ۔ انگلینڈ اور یورپی ملکوں میں خریدی گئی جائیدادیں محفوظ۔ عام لوگ اور ملک جائے بھاڑ میں۔

اگلے تین چار سالوں پر پھیلی ملکی کہانیاں بہت خوفناک تھیں۔ حکومت کے شرمناک کردار تھے۔ وہ جس ریپبلک

Downloaded From http://paksociety.com

میں چاہتی ہنگامے کروا دیتی جہاں چاہتی امن ہو جاتا۔

جارجیا میں ہونے والی ابخاز بغاوت اسی لمحے دم توڑ گئی تھی جب جارجیا کے صدر ایڈورڈ شیورڈ ناڈزے نے روس کی طرف سے پیش کردہ اس امن معاہدے پر دستخط کیے جس نے عملاً جارجیا کی آزادی کو ختم کر دیا۔ اندر کے ان شرمناک انکشافات پر دونوں نے لکھتے ہوئے بہت سفاکی سے کام لیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ دھمکیاں مل رہی تھیں بھلا وہ انہیں خاطر میں کیوں لاتے۔

چیچنیا لوہے کا چنا بن کر روس کے دانتوں تلے آگیا تھا۔ چبائے تو کیونکر۔ دانت ٹوٹنے کے لالے پڑ گئے تھے۔ پہلا حملہ اعلان آزادی کی سزا دینے کے لیے ہوا اور دوسرا طاقت کچلنے کے لیے۔ یہ حملے اتنے بھرپور اور شدید تھے کہ دونوں دکھی ہو گئے۔ دونوں نے جی داری سے لکھا۔

96ء کے صدارتی انتخابات سر پر تھے۔ ہیثم، اینا، نینا اور اس کا شوہر خروشیف بہت سے دوسرے نڈر اور بے باک صحافی میدان میں یلسن کے خلاف صف آرا تھے۔ اس وقت بھی ان دونوں کے ساتھ نینا اینا کے آفس میں تھی۔ ہیثم اس معرکے میں زیادہ کھل کر نمایاں ہوا تھا۔

غیر متوقع نتائج۔ سب سے زیادہ ووٹ چیچنیا سے ایک ایسے شخص کے لیے جس نے چیچن عوام کا قتل عام کیا اور ان کی سرزمین کو خون میں نہلا دیا۔

سینٹ پیٹرز برگ میں صبح تک تو پولنگ اسٹیشنوں پر کچھ بھی نہیں تھا حالانکہ شہر موجودہ حکومت کے حامیوں کا گڑھ تھا۔ شام چار بجے جیسے کسی نے الٰہ دین کے چراغ کی طرح کم ٹرن آؤٹ کو ایک بڑے ٹرن آؤٹ میں بدل دیا۔ علاقہ جتنا دور اور دشوار گزار تھا، صدر کی حمایت اتنی ہی زیادہ تھی۔

بشکریا کی مسلمان آبادی جو کمیونسٹوں کو سپورٹ کرتی ہے وہاں بھی حالات حیران کن تھے۔ زیوگانوف چلا تا رہا تھا۔

''اب چلانے کا فائدہ۔ الو کے پٹھے کو کہا بھی تھا کہ انتخابی مہم کو صحیح طرح منظم کرو۔ روسی بورژوازی اور مغرب نے کسی طور بھی تمہیں جیتنے نہیں دینا وہ تو جیتے جی مر جاتے یلسن اگر ہار جاتا۔'' ہیثم نے سگریٹ ایش ٹرے میں جھاڑی۔

''ہیثم تمہاری خیر نہیں۔ تم تو یلسن کی نظروں کا کانٹا بن گئے ہو۔''

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں ہمیشہ سے ایک خاموش کانٹا ہوں۔''

☆......☆

کوئی ڈیڑھ ماہ بعد کی بات ہے۔ اینا نے شام کو کام سے واپسی پر اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا۔ اسے اُمید تھی کہ ہیثم آچکا ہوگا۔ صبح اس نے کہا تھا۔ ہیثم مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ ذرا وقت سے آجانا۔

گھر میں اندھیرا تھا اور سناٹا بھی اس نے پورے گھر کی بتیاں جلائیں اور ہیثم کو کال کیا۔ اس کا موبائل بند تھا۔ چند لمحے وہ موبائل کو گھورتی رہی۔

ہیثم کبھی بے پروائی نہیں کرتا تھا۔ وہ البتہ ایسی ضرور تھی۔ شام کے بعد اگر اس کی کوئی مصروفیت ہوتی تو وہ ہمیشہ اسے مطلع کرتا۔

وہ کچن میں گئی۔ فریج کھولا۔ فش نکالی۔ سینڈوچ بنائے۔ کافی کا مگ بنا کر وہ میز پر آگئی۔ ایک بار پھر اس نے نمبر ملایا۔ کوئی جواب نہیں تھا۔ کافی پیتے اور سینڈوچ کھاتے ہوئے وہ سوچوں میں ڈوبی رہی۔

اس نے ماسکو نیوز کے آفس فون کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ تو سات بجے چلا گیا تھا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہیثم نہ صرف اپنے کام سے متعلقہ معاملات بلکہ گھر اور دیگر بھی امور میں انتہائی ذمہ دار اور فرض شناس تھا۔ اتنے سالوں کی ازدواجی زندگی میں شاذونادر ہی ایسا ہوا ہے۔

کیا بات ہے؟ اس نے خود سے کہتے ہوئے سر پشت سے ٹکایا تو جیسے تھکاوٹ آنکھوں میں نیند کی صورت اتر آئی۔

کوئی دو بجے آنکھ کھلی۔ ہیثم کہیں نہیں تھا۔ اس وقت جیسے خطرے کی گھنٹی بجی۔ اس نے اپنے بے تکلف دوستوں سے رابطہ کیا۔ انہیں اس افتاد سے مطلع کیا۔ ان کا خیال تھا کہ تھوڑا سا انتظار کیا جائے۔

اگلے دن شام تک صورت واضح ہو چکی تھی۔ پریس کانفرنس میں اس نے کھلم کھلا حکومت پر الزام لگایا کہ اس کے شوہر کو اغوا کرنے میں حکومت کا ہاتھ ہے۔ اس کے دلیر مارکسی ساتھیوں نے بڈھا، کھوسٹ، بیمار، پاگل یلسن کہتے ہوئے اس کی پالیسیوں خاص طور پر یوکرائن، جارجیا، مالدوویا اور چیچنیا پر زبردست تنقید کی۔

نعرے بھی بڑے بڑے تھے۔ روسی فوج کی ذلت آمیز شکست کا باعث کون؟ یلسن۔ چیچنیا کے مظلوم لوگوں کی

Downloaded From http://paksociety.com

ہلاکت کا باعث کون؟ یلسن جمہوریاؤں میں گڑبڑ کروانے اور انہیں ذلت آمیز معاہدوں پر مجبور کرنے والا کون؟ یلسن۔

جلوس نکلتے رہے، شور مچتا رہا۔ دن گزرتے رہے۔ مگر ہیثم کہاں تھا؟ کسی جیل کے خفیہ تہہ خانے میں، کسی قلعے کی تنگ وتاریک کوٹھری میں، سائبیریا کے برف زاروں میں یا آسمانوں پر۔ کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ اس کا سچا، کھرا، محبت کرنے والا، بےلوث ساتھی، اس سے بچھڑ چکا تھا۔

مجھے کبھی اندازہ نہیں تھا کہ میں اس سے اتنا پیار کرتی ہوں۔ وہ اپنی عزیز دوست نینا خروشیف سے بولی۔

یہی وہ وقت تھا جب اسے احساس ہوا کہ وہ بچے کے لیے کتنا متمنی تھا۔ کبھی جو میں نے اس کی اس خواہش کو ذرا سی بھی اہمیت دی ہو۔ گھسیٹ کر ڈاکٹر کے پاس لے گیا تب بھی کوئی خاص پرواہ نہیں کی۔ اور ستم ظریفی دیکھو کہ جب توجہ کی تو وہ نہیں تھا۔

کاش آج میرا بچہ ہوتا تو یوں میں اس تنہائی کے جنگل میں کھڑی نہ ہوتی۔ کہیں زندگی سے بھری ہوئی اس کی مسکراہٹ، اس کی معصومیت، اس کی دوسرا تھ مجھے اس کرب سے نکال لیا کرتی جس میں اس وقت میں گھری ہوئی ہوں۔

ایسے ہی پریشان کن اور مضطرب دنوں میں ایک دن اس نے اپنا بریف کیس پکڑا اور چیچنیا جانے کے لیے گاڑی میں سوار ہوگئی۔

وہ تو دنگ رہ گئی تھی ہزاروں میل دور بیٹھ کر تو تصویر کا صحیح رخ سامنے ہی نہیں آتا تھا۔

جنگ کے دنوں میں ہیثم یہاں آیا تھا اور اس نے بتایا بھی تھا۔ پر یہ سب جو وہ اب دیکھ رہی تھی کس قدر ہولناک تھا۔ یوں بھی دل چھالوں سے زخمی تھا۔ اوپر سے فطرت کی گود میں پلنے اور سانس لینے والا علاقہ جنگ کی ہولناکیوں کے ہاتھوں تباہ ہوا پڑا تھا۔

جلی ہوئی عمارتیں، ٹوٹے ہوئے پل، ادھڑی پدھڑی سڑکیں، بموں کے چرکے سہنے والے اسکول۔

اس کی آنکھوں سے ڈھیروں ڈھیر آنسو نکلتے رہے اور رخساروں پر بہتے گئے۔

وہ جگہیں جہاں کبھی زندگی ہنستی مسکراتی تھی۔ اب ویران تھیں۔ سرسبز چراگاہوں میں مست خرامیاں کرتے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ، جانوروں کے گلے، آسمان پر اڑتے پرندوں کی ڈاریں، سب جانے کن دیسوں کی طرف فرار ہو گئے تھے۔ وہ پہاڑی لوگ جن کے بارے میں کوئی اسے بتاتا تھا۔ یہ کارچائی ہیں، چرکسی ہیں، بشکیری ہیں۔ وہ جو بڑا محبت کرنے والا، اپنے ماحول سے بہت مختلف، دلبر سا ساتھی تھا۔ وہ بھی جانے کن دیسوں کی طرف اڑ گیا تھا۔ کیسے اس کی آنکھیں بار بار بھیگتیں۔

پھر وہ چیچنیو اینگوش گئی۔ اس گھر میں جہاں اس نے چند دن گزارے تھے۔ وہ گھر جو اس کا سسرال تھا۔ یہاں کیا تھا؟ اس گھر کا بڑا سا لکڑی کا دروازہ ٹوٹا پڑا تھا۔ انگوروں کی بیلیں سوکھی ہوئی تھیں۔ ملحقہ باغیچہ ویران تھا۔ بڑا سا صحن بھائیں بھائیں کرتا تھا۔

پھر وہ آگے بڑھی۔ اندر بڑے کمرے میں ایک پچاس پچپن سال کا مرد آگ کے سامنے بیٹھا تھا۔ یہ ہیثم کے باپ کا عزیز تھا۔ ہیثم کا خاندان اپنے عزیزوں کے پاس داغستان چلا گیا تھا۔

وہ بےآواز قدموں سے ان کمروں میں پھرتی رہی جہاں کبھی اس نے زندگی کو کلبل کلبل کرتے دیکھا تھا۔ جنگ کے المیے۔ اس نے لمبی سانس بھری تھی۔

اس نے قہوے کی پیالی پکڑی۔ گھونٹ بھرا اور اس بوڑھے کو سنا جو اسے بتاتا تھا کہ روس نے بہت ظلم کیا ہے۔ وہ ہمیشہ سے ظلم کرتا آیا ہے۔ سوویت کے زمانوں سے اب تک۔ اس نے پوچھا تھا کہ وہ کون ہے؟ اس نے ''جرنلسٹ'' کہہ کر بات ختم کردی۔ اس کے رشتے کی پہچان والا تو کوئی تھا ہی نہیں وہاں۔

اور جب وہ واپس آرہی تھی وہ انتہائی دل شکستہ تھی۔ روس کو کیوں زوال آیا؟ اس نے خود سے کہا۔ ''یہاں انصاف نہیں۔ سپریم کورٹ کیوں نہیں اس کا کھوج کرسکی۔''

وہ دنیا میں نہیں۔ اسے ختم کردیا گیا ہے۔

زمانوں بعد وہ چرچ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے جب اس نے اس کے لیے کینڈل جلائی۔ رات کو وہ میراپراسپکٹ کی مسجد میں گئی جہاں اس کا نکاح ہوا تھا۔ نماز کے بعد وہ نمازیوں کے درمیان بیٹھی زار زار روتی رہی۔ اس نے دعا کی استدعا کی اور جب گھر واپس آئی تھی اس نے کہا تھا۔

''چلو اچھا ہی ہے بچہ نہیں۔ وگرنہ تو اسے بھی گولی کا نشانہ بنادینا تھا۔''

اس نے ہیثم والے باب کو بند کیا۔ انصاف کی سربلندی اور قانون کی عملداری والے باب کو کھولا اور قلم کو مزید

Downloaded From http://paksociety.com

تیز کرلیا۔

وہ پہلے کیا کم تھی۔ پر اس سانحے نے بھڑکتی اور چنگاریاں چھوڑتی آگ بنا ڈالا تھا۔ قلم زہریلے ناگ جیسی پھنکاریں مارنے لگا تھا۔ اس دوران اس پر ایک اور انکشاف بھی ہوا تھا کہ اس کی ضرورت سے زیادہ حق گوئی وسچائی نے اس کے دشمن زیادہ پیدا کیے ہوئے ہیں۔

اس نے سر جھٹکا تھا اور اپنے آپ سے کہا تھا۔ ''اب اگر میں کہیں مزدوروں کی زیادتی محسوس کرتی ہوں تو اس پر قلم نہ اٹھاؤں تو یہ کہاں کا انصاف ہوا؟ کم از کم اپنا پولٹکوسکا یا سے تو یہ ممکن ہی نہیں۔''

☆......☆

ایک سال، دو سال، تین، چار، پانچ، چھ سال سے بھی زیادہ کا وقت بیت گیا تھا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں آس کا مناسا دیا پھر بھی اس کے سینے میں جلتا تھا۔

اس کا فون ٹیپ ہوتا۔ اس کی تمام سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جاتی۔ یہ پیوٹن کا دور تھا اور نوجوان پیوٹن سب کا استاد تھا۔ پانچویں سال کے وسط میں اسے پتا چلا کہ وہ جنوبی سائبیریا کی اومسک جیل میں ہے۔

وہ بھاگی بھاگی اومسک گئی۔ اس نے خفیہ رابطے کیے تو اسے معلوم ہوا کہ یہاں تو اسے کبھی لایا ہی نہیں گیا تھا۔

اس کے سینے سے لمبی سی آہ نکلی تھی۔ ''ایسے ہی بھٹکتی پھر رہی ہوں۔ وہ دنیا میں نہیں ہے۔ حکومت کے اگر ذرائع ہیں تو ہمارے بھی تعلقات ہیں۔ کسی چھوٹے کسی بڑے ذریعے نے کبھی خبر نہیں دی۔''

اور ایک دن جب وہ کسی سے ملنے منسک گئی واپسی پر کچھ دیر کے لیے قریبی پارک چلی گئی۔ ہریالیوں نیلے چمکدار آسمان کو دیکھتے ہوئے اس نے بے اختیار خود سے کہا۔ ''میں تو موسموں سے بھی بے نیاز ہوگئی ہوں۔ بہار کب آتی ہے؟ کب جاتی ہے؟ سردیاں، گرمیاں، ان کے حسن، ان کی سختیاں آنکھ سے اوجھل ہیں۔ آج برچ کے پیڑوں پر پھوٹتی کونپلوں نے مجھے جیسے یاد دلایا ہے کہ برفوں میں بھیگے دن چلے گئے ہیں۔ دراصل زندگی میں خزاں ڈیرے ڈال لے تو موسموں کی رنگینی کب یاد رہتی ہے؟''

گھر آئی۔ بیڈروم میں گئی۔ پتا نہیں کیا چاہیے تھا۔ اب وارڈ روب کا پٹ ہاتھوں میں تھامے کھڑی خود سے پوچھ رہی تھی۔ ''میں یہاں کیا لینے آئی تھی؟''

وارڈ روب نے تو ایک نیا پراگا ڈال دیا تھا۔ اس کے خانوں میں یادیں بکھری پڑی تھیں۔

ہینگروں میں ٹنگے کپڑے کسی کی چاہتوں کے رازدار تھے۔ کونے میں دھرا جیولری بکس جس میں بہت سے ملک اور محبتوں میں گندھے جذبات بند تھے۔ اس نے اٹھایا۔ ڈھکن کھولا۔ ہاتھ سے یونہی پھولا پھرولی کی۔ بہت خوبصورت انگوٹھیاں جو شاید فرانس سے خریدی گئی تھیں۔

وہ بیٹھ گئی تھی۔ اس نے ایک ایک کر کے ساری انگوٹھیاں نکالیں انہیں باری باری انگلیوں میں پہنا۔ ہاتھوں کو دیکھا۔ کتنے بوڑھے لگ رہے تھے۔ ابھری ہوئی نیلی نیلی نسیں ہتھیلی کی چھت پر کس کثرت سے بکھری ہوئی تھیں۔ ہاتھوں کا سارا حسن کیسے گہنا گیا تھا۔ اپنی اس سوچ پر اسے تمسخرانہ سی ہنسی آئی۔ ڈبے کو واپس رکھا۔

لاؤنج میں آئی۔ اپنی میلز چیک کرنے بیٹھی۔ دفعتاً اسے محسوس ہوا جیسے اس کا سارا وجود گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہلنے لگا ہے۔ مجھے ہیلوسینیشن ہوا ہے۔ میں اس کے سحر میں تھی نا شاید۔ آنکھیں تپتے بے آب وگیاہ صحراؤں میں نخلستانوں کی متلاشی ہوں تو ایسے ہی ہوتا ہے تاحدِ نظر پھیلی چمکتی ریت دریا کا گمان دیتی ہے۔

اس نے قریب پڑی تپائی پر رکھی بوتل کھول کر پانی کا بھرپور چھینٹا آنکھوں پر مارا۔ انہیں خشک کیا۔ پھر اسکرین کو دیکھا۔ پیغام روزِ روشن کی طرح تھا۔

یتیم اپنے زندہ ہونے کا پیغام دے رہا تھا۔

اس نے میل کا جواب دیا۔ یتیم پر آنے کا وقت، دن لکھا اور اٹھ گئی۔

کسی کا مذاق، کوئی شرارت نہیں۔ تردید پاس ہی تھی۔ وقت کا گزرنا جیسے قیامت ہوگیا۔ جذبات کا بہاؤ بے قابو تھا۔

ناقابلِ یقین بات ہے۔ وا ہے تکرار کرتے تھے۔ معجزہ ہے وہ زندہ ہے۔ آنکھیں یقین دلاتی تھیں۔ اگر آنسو بہتے تھے تو چند لمحوں کے لیے وجود میں خوشی و سرشاری کی لہریں بھی دوڑتی تھیں۔

وقتِ مقررہ پر اس نے لیپ ٹاپ کھولا۔ ہیڈ فون پہنا۔ آنسوؤں کی برسات میں چہرہ بھیگ رہا تھا۔ اس نے کسی چھوٹے بچے کی طرح ہتھیلی سے فوراً اسے صاف کیا کہ جیسے ڈرتی ہو کسی انہونی سے۔ اسکرین پر کوئی تھا۔

اس کا یتیم۔ آنکھیں جھپکیں۔ کتنا وجیہہ تھا وہ۔ سینکڑوں چھوڑ ہزاروں کے مجمع میں بھی نمایاں ہوتا۔ مگر اب!

Downloaded From http://paksociety.com

ہیرے جیسی چمک والی موٹی خوبصورت آنکھیں اندر دھنسی نظر آرہی تھیں۔ وجود ہڈیوں کی مٹھ سا بنا ہوا تھا۔

''اینا۔'' محبت میں ڈوبی ہوئی آواز تھی پر اس سے تو ہیثم کہا ہی نہ گیا۔ گلے میں جیسے گولے پھنس گئے تھے۔''اینا کھڑی ہو جاؤ۔ مجھے دیکھنے دو۔''

وہ کھڑی ہوئی۔ قدرے دور چلی گئی۔

''تم نے کیسے بدرنگے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ تم کتنی کمزور ہو رہی ہو۔'' بند ٹوٹ گیا تھا۔

اور اینا کے نام کی پکار تھی۔ وہ پکار جو زندگی تھی۔

اس نے دیکھا تھا۔ اس کی نچلی پلکوں میں دو موتی اٹکے ہوئے تھے۔ کمال ضبط تھا۔ گالوں پر بہے نہیں تھے۔

اس نے اس خبر کو نینا اور عبدالرحمٰن سیاف کے ساتھ شیئر کیا اور طے پایا کہ خبر کو ابھی سینے میں کسی راز کی طرح دبا دو۔ جب تک حکومتی سطح پر اس کا اعلان نہیں ہوتا۔

زندگی کیسے یکا یک ڈرامائی موڑ مڑی تھی۔ دن رات کتنے حسین ہو گئے تھے۔ وہ ان مصائب اور مظالم کی تفصیل اسے سناتا جس میں اس نے چھ سال کا طویل عرصہ گزارا۔

''اینا تم یقین کرو گی ایسے بھی لوگ تھے جو ہم سے پیار کرتے تھے۔ وہ ہمارے دیوانے تھے۔ تمہارے بھی اور میرے بھی۔ الیکٹرک شاک کے لیے لے کر جاتے تو وہاں شاکس لگانے کی بجائے گپیں لگاتے۔ مجھے سکھاتے کہ مجھے کیسے Pretend کرنا ہے۔ بہت بڑا ڈراما رچانا پڑا تھا ہمارے ان عاشقوں کو۔''

رابطہ ہو گیا تھا، ہر روز کال آنے لگی وہ اسے سمجھاتا۔

''اینا کچھ عرصے کے لیے اپنی سرگرمیاں روک دو۔ روس سے نکلنے کی کوشش کرو۔ بہت تھک چکا ہوں۔ کچھ وقت تمہارے ساتھ بہت سکون سے گزارنا چاہتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے انگلینڈ میں سیاسی پناہ بہت جلد مل جائے گی۔''

بلی تھیلے سے باہر آگئی تھی۔ اس کے جیل سے نکل بھاگنے کا راز کھل چکا تھا اور اس پر تحقیقات شروع ہو گئیں۔

اینا نے باہر جانے کے لیے درخواست دی۔ اس درخواست کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا۔ پیوٹن بھی اوّل درجے کا کایاں تھا۔ اپنے مخالفوں کو چن چن کر قتل کروا رہا تھا۔

وہ تو اب اس کوشش میں تھی کہ کب اسے اجازت ملے اور وہ روس سے باہر جائے۔ پر اجازت کا ملنا فی الحال کوہ گراں تھا۔

ایسے ہی ماضی کو دیکھتے ہوئے، اس میں جھانکتے اور تھوڑا سا انتظار اور میری جاں گنگناتے ہوئے اسے پتا ہی نہ چلا کہ کب اس کی پلکوں نے اس کی آنکھوں پر پردے تان دیئے تھے۔

جاگی تو بھوک بھی تھی۔ تھوڑی سی تازگی بھی اور رات والے واقعے کی تلخی میں کمی بھی۔ کمرے میں تھوڑی دیر پھرتی رہی۔ گھڑی دیکھی۔

''خاصی نیند لی ہے میں نے۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''چلو اچھا ہوا۔ آج جانا بھی نہیں۔''

بالکونی میں آئی۔ دھوپ کتنی روشن اور چمکدار تھی۔ دنیا کاروبار حیات میں گم سڑکوں پر رواں دواں تھی۔

عجیب سے احساس سے وہ پھر دوچار ہوئی۔ کچن میں گئی۔ کافی بنائی۔ لاؤنج میں آئی ٹی وی آن کیا۔ ایک نوعمر دلکش چہرے والی مغنیہ پشکن کی ''زندگی کی شام'' گا رہی تھی۔

گنگناتے گنگناتے مگ ہاتھ میں پکڑے وہ پھر بالکونی میں آگئی۔ تھوڑی سی کافی باقی تھی۔ وہ اسے ختم کرنا چاہتی تھی۔ اسی لیے وہ اسے دیکھ نہ سکی نیچے سرکاری جیپ میں بیٹھا کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ اس نے تو چھوٹا سا سپ لے کر نتھری ہوئی آنکھوں سے اپنے سامنے والے حصے پر تنے آسمان کو دیکھا تھا اور اپنے آپ سے صرف یہ پوچھا تھا۔''کب، کب اسے دیکھوں گی؟ اب بہت جی چاہتا ہے۔ وہ اگر تھک گیا ہے تو سچی بات ہے میں بھی تھک گئی ہوں۔''

تبھی سینے میں جیسے لوہے کی تپتی سلاخ اتر گئی تھی۔

ہاتھ میں پکڑا مگ فرش پر گرا۔ اس کے ٹوٹنے کی آواز تو کہیں اس کے اپنے درد میں گم ہو گئی تھی۔ پھر وہ تیورا کر گری تھی۔ چوکھٹ پکڑنے کی کوشش کی۔ پر آنکھوں کے آگے گھور اندھیرا تھا اور ہاتھ جیسے بے جان سے ہو رہے تھے۔

سینے سے خون ابل رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ اس فوارے کے منہ پر رکھنے کی کوشش کی۔ پیشانی دروازے سے ٹکرائی تھی۔ ایک فوارہ وہاں سے ابلا تھا۔ پل بھر کے لیے آنکھوں میں زندگی کی لو چمکی تھی اور نتھنے پھولے تھے۔ ہونٹوں سے ٹوٹی پھوٹی ایک آواز نکلی تھی۔

ہیثم...... ہیثم...... میرا...... اور تمہارا نام...... ہی زیب...... نظر ہو گا اور گردن داہنی سمت لڑھک گئی تھی۔

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

مارچ کی شخصیات

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے تیسرے مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنھوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنہیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

ایک ایسی تحریر جسے سب سے زیادہ پسند کیا جا رہا ہے

تبدیلی کی ہوائیں چل پڑی ہیں۔ موسم بدل گیا ہے۔ کہیں پت جھڑ ہے، کہیں خزاں۔ سردیاں جا رہی ہیں۔ پرانے پتے جھڑ جائیں گے۔ نئی کونپلیں پھوٹیں گی کہ بہار کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔ مارچ کا مہینا آگیا!

قارئین، مارچ گریگورین سال کا تیسرا مہینا ہے۔ شمالی نصف کرّے میں اس ماہ جاڑا رخصت ہو جاتا ہے۔ شمالی نصف کرے میں بہار پہنچتی ہے۔ جنوبی نصف کرہ میں خزاں انگڑائی لیتی ہے۔ قدیم روم میں یہ سال کا پہلا مہینا ہوا کرتا تھا۔ ڈیڑھ سو سال قبل مسیح تک مارچ کا مہینا رومن کیلنڈر کا پہلا مہینا رہا۔ تب اس ماہ مختلف مذہبی تہوار منعقد کیے جاتے تھے اور نئے سال کو خوش آمدید کہا جاتا۔ اس کا نام قدیم روم کے جنگ کے دیوتا ''مارس'' کے نام پر رکھا گیا۔

کئی ممتاز پاکستانی شخصیات نے مارچ کے مہینے میں آنکھ کھولی۔ شہنشاہ جذبات کہلانے والے پاکستان انڈسٹری کے بے تاج بادشاہ محمد علی کا تعلق بھی اسی ماہ سے تھا۔ 277 سے زاید فلموں میں اپنے فن کا جادو جگانے والا یہ فن کار 19 اپریل 1931 کو بھارت کے شہر رام پور میں پیدا ہوا۔ وہ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ شہرت کی بلند ترین چوٹی پر بسیرا کیا، مگر تکبر نام کا نہ تھا۔ کئی سربراہانِ مملکت سے ان کی دوستی رہی۔ بھٹو صاحب سے میاں نواز شریف تک، سب سے گاڑھی چھنتی تھی۔ 1962 میں فلم ''چراغ جلتا رہا'' سے انھوں نے کیریر کا آغاز کیا۔ فلم ''شرارت'' ان کی شناخت بنی۔ زیبا اور ان کی جوڑی بہت پسند کی گئی۔ ستّر سے زاید فلموں میں ساتھ دکھائی دیے۔ پھر رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔ وہ آخری برسوں تک متحرک رہے۔ 19 مارچ 2006 کو لاہور میں حرکت قلب بند ہو جانے سے اس لیجنڈ کا انتقال ہوا۔

سقوط ڈھاکا کا سبب بننے والے افراد میں ایک نام شیخ مجیب الرحمان کا بھی ہے۔ وہ 17 مارچ 1920 کو ضلع فرید پور میں پیدا ہوئے۔ دسمبر 1970 کے عام انتخابات میں عوامی لیگ نے شیخ مجیب الرحمان کی سربراہی میں بے مثال کامیابی حاصل کی۔ اس زمانے میں ان کے چھ نکات کا غلغلہ رہا۔ 1971 میں حالات قابو سے باہر ہو گئے۔ مشرقی پاکستان بنگلا دیش بن گیا۔ وہ بنگلا دیش کے پہلے وزیر اعظم بنے، تاہم ان کے دور اقتدار میں جنم لینے والی بے چینی نے جلد انتشار کی شکل اختیار کی۔ دسمبر 1974 میں صدارتی نظام نافذ ہو گیا۔ اس آمرانہ اقدام کے خلاف بغاوت ہو گئی۔ 15 اگست 1975 کو مجیب الرحمان اور ان کے اہل خانہ کو قتل کر دیا گیا۔

ممتاز ادیب، مترجم، محقق اور ناشر سید قاسم محمود، جنھوں

Downloaded From http://paksociety.com

نے انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا اور اسلامی انسائیکلوپیڈیا جیسے کارنامہ انجام دیے۔ 17 نومبر 1928 ضلع روہتک میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے پاکستان میں سستی کتب چھاپنے کا انوکھا سلسلہ شروع کیا تھا۔ مینار پاکستان پر نصب تختیوں کے وہ مدیر رہے۔ صحافت میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ سائنسی صحافت میں نئے رجحانات متعارف کروائے۔ مشہور زمانہ کتاب ''قائداعظم کا پیغام'' مرتب کی، جو ایک لاکھ سے زیادہ کی تعداد میں شائع ہوچکی ہے۔ سائنس میگزین کا اجرا بھی ان کا ایک کارنامہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اداروں کے کرنے کا کام اس تنہا شخص نے کیا۔ 31 مارچ 2010 کو ان کا انتقال ہوا۔

محمد علی کے مانند فلمی دنیا کے ایک اور لیجنڈ نثار بزمی کا تعلق بھی اسی مہینے سے تھا۔ انھیں پاکستان کے بہترین موسیقاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ انھوں نے ''رنجش ہی سہی''، ''اک ستم اور میری جاں ابھی ... باقی ہے''، ''دل دھڑکے میں تم سے یہ کیسے کہوں'' جیسے یادگار گیت انڈسٹری کو دیے۔ وہ یکم دسمبر 1924 کو نصیرآباد، بمبئی میں سید قدرت علی کے گھر پیدا ہوئے تھے۔ بمبئی ریڈیو سے اپنا سفر شروع کیا۔ جلد فلمی نگری تک پہنچ گئے۔ ''جمنا پار'' سے یہ سفر باقاعدہ شروع ہوا اور وہ بمبئی کے معروف ترین موسیقاروں میں شمار ہونے لگے۔ 1962 میں پاکستان آگئے۔ ابتدا میں چند مشکلات پیش آئیں۔ البتہ فضل احمد کریم فضلی کی ''ایسا بھی ہوتا ہے'' کی موسیقی ترتیب دے کر نئی شناخت حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ ''لاکھوں میں ایک''، ''صاعقہ''، ''خاک اور خون'' اور ''ہم ایک ہیں'' جیسی فلموں کے لیے یادگار موسیقی ترتیب دی اور کئی نگار ایوارڈ اپنے نام کیے۔ 22 مارچ 2007 کو اس عظیم فن کار کا کراچی میں انتقال ہوا۔ ان کی عمر 83 سال تھی۔

پاکستان ٹیلی ویژن کے معروف اداکار عابد علی بھی 17 مارچ 1952 کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے ''جھوک سیال''، ''وارث''، ''سمندر'' اور ''دہلیز'' جیسے یادگار ڈرامے کیے۔ ہدایت کاری کے میدان میں بھی خود کو منوایا۔ ''دوریاں'' پہلا ڈراما۔ پھر ''دشت'' کیا، جسے شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ ان کا فنی سفر آج بھی جاری ہے۔

اب اس مہینے کی دیگر معروف شخصیات پر نظر ڈالتے ہیں:

دراب بھائی پٹیل

پاکستان میں مسائل کی بھرمار اور وسائل کا فقدان ہے۔ جو وسائل ہیں بھی، انھیں گھن زدہ نظام اور کرپٹ حکمران نے نگل لیا۔ اسی باعث ہمارے ہاں روشن مثالوں کا فقدان رہا۔ ایسے لوگ نہیں ملے، جنھیں ہیرو سمجھ کر ان کی پیروی جائے، مگر یہ تاثر بھی درست نہیں کہ ہمارے ہاں قابلِ احترام ہستیاں سامنے نہیں آئیں، سچ تو یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں ایسے افراد موجود ہیں، جو قابلِ احترام بھی، قابلِ تقلید بھی اور قابلِ فخر بھی ہیں۔ فلاحی شعبے میں ایدھی صاحب ہیں، تو طب میں ڈاکٹر ادیب رضوی۔ کرکٹ میں عمران خان ہیں تو اسکواش میں جہانگیر خان۔ شاعری میں فیض صاحب، فکشن میں انتظار حسین۔ اسی مانند قانون کے شعبے میں بھی ہماری کئی اجلی مثالیں ہیں۔ ان ہی میں سے ایک نام جناب دراب بھائی پٹیل کا ہے۔ ایک انتہائی قابلِ احترام شخص، جن کے بنا پاکستانی عدلیہ کی تاریخ ادھوری ہے کہ انھوں نے جبر کے خلاف آواز اٹھائی۔ حق کا ساتھ دیا اور آمریت کے سامنے جھکنے سے انکار کردیا۔

وہ 17 جون 1924 کو کوئٹہ میں، ایک پارسی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اوائل میں وہ مختلف بورڈنگ اسکولوں میں زیرِ تعلیم رہے۔ پھر 1942 میں بمبئی یونیورسٹی کا حصہ بن گئے، یوں زندگی میں ایک موڑ آیا۔ وہیں سے انھوں نے ایل ایل بی کا مرحلہ طے کیا۔ 1945 میں وہ کراچی آگئے۔ یہ شہر سیاسی

اور معاشی طور پر تیزی سے ابھر رہا تھا۔ کچھ برس بعد ایک نومولود ریاست کا پہلا دارالحکومت بننے والا تھا۔ مزید علم حاصل کرنے کی خواہش انھیں برطانیہ لے گئی۔ ادھر وہ لندن اسکول آف اکانومکس کا حصہ رہے۔ 1948 میں انھوں نے اس مضمون میں ایم ایس سی کیا۔ اگلے برس ایل ایل ایم کی ڈگری حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ کسی بین الاقوامی جامعہ کے تحت پاکستان کے معاشی اور قانونی نظام پر اوّلین ریسرچ کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ اس زمانے میں برطانوی قانون دان طبقے سے خاصا رابطہ رہا۔ انھیں لنکن ان بار کی جانب سے خصوصی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ برطانیہ میں کام کرنے کی پیش کش ہوئی تھی، مگر وہ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد اپنے وطن

Downloaded From http://paksociety.com

لوٹ آئے۔ کراچی سے اُنھیں محبت تھی۔ ایک بار پھر اس شہر میں پریکٹس شروع کی۔ ان کی علمیت اور قابلیت نے جلد اپنے لیے جگہ بنالی۔

انھوں نے تیزی سے ترقی کے مراحل طے کیے۔ 1964 میں اُنھیں ہائی کورٹ بار کا سکریٹری منتخب کیا گیا۔ یہ بڑی کامیابی تھی۔ 1967 میں وہ مغربی پاکستان کے ہائی کورٹ کے جج ہوگئے۔ اِس حیثیت میں اُن کا کردار مثالی رہا۔ وہ سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بھی رہے۔ جنوری 1976 میں اُنھیں سپریم کورٹ کا جج مقرر کیا گیا۔

یہ وہ زمانہ ہے، جب ملک انتشار کا شکار تھا۔ بھٹو مخالفین سڑکوں پر تھے۔ احتجاج کا بے انت سلسلہ شروع ہو چکا تھا، حکومت پر دباؤ بڑھ رہا تھا، جس کا نتیجہ مارشل لا کی صورت نکلا اور بھٹو صاحب کو پھانسی دے دی گئی۔ لاہور ہائی کورٹ کے جس بینچ نے بھٹو کا کیس سنا تھا، ان میں دراب پٹیل بھی شامل تھے۔ ان سمیت تین جج نے پھانسی کے خلاف اختلافی نوٹ لکھا، مگر اکثریت کے باعث سزا برقرار رہی۔ کئی برس بعد جسٹس دراب پٹیل نے انکشاف کیا کہ انھیں اس کیس کی سماعت کے دوران محتاط رہنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔

وہ جبر کا زمانہ تھا۔ ہر شعبے میں موقع پرستی اور مصلحت پسندی عام تھی۔ بھٹو کی پھانسی کے بعد مایوسی بڑھ رہی تھی، مگر پاکستانی عدلیہ میں جلد ایک روشن مثال قائم ہونے والی تھی۔ یہ مارچ 1981 کا واقعہ ہے، جب نیا صوبائی آئینی آرڈر (پی سی او) بنایا گیا، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججز کو اس پر حلف لینے کا حکم دیا گیا۔ یہ ایک غیر آئینی اقدام تھا۔ جسٹس دراب بھائی پٹیل نے اس کی مذمت کرتے ہوئے حلف لینے سے انکار کر دیا اور یوں ان کا بے داغ کیریر ایک شان کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ (یاد رہے کہ اس وقت تین جج نے پی سی او پر حلف لینے سے انکار کیا تھا۔ باقی دو نام جسٹس انوار الحق اور جسٹس فخر الدین جی ابراہیم کے ہیں۔ جسٹس انوار الحق اس وقت چیف جسٹس آف پاکستان تھے، جب کہ فخر الدین جی ابراہیم سپریم کورٹ کے سب سے جونیئر جج تھے)

ماہرین متفق ہیں کہ اگر دراب بھائی پٹیل حلف لے لیتے، تو یقینی طور پر اگلے چیف جسٹس ہوتے۔ سرکار کا خیال بھی یہی تھا کہ اقلیتی برادری سے ہونے کے باعث شاید وہ پی سی او کی مخالفت نہ کریں، مگر انھوں نے اصولوں پر سمجھوتا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس باوقار شخص نے اپنی باقی زندگی قانون کی حکمرانی کے لیے جنگ لڑتے گزاری۔ وہ مظلوم کی آواز بنے اور یوں نہ صرف وکلا برادری، بلکہ پورے پاکستان کے لیے فخر کی علامت بن گئے۔

انھوں نے انسانی حقوق کے لیے ہر محاذ پر جنگ لڑی۔ ایشین ہیومن رائٹس کمیشن (AHRC) کے بانی رکن تھے۔ ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے قیام میں ان کا کردار کلیدی رہا۔ فقط دو ہی پاکستانیوں کو انٹرنیشنل کمیشن آف جسٹس (ICJ) کی خصوصی رکنیت دی گئی، ان میں سے ایک نام دراب بھائی پٹیل کا تھا۔ 15 مارچ 1997 کو عزم و ہمت کا استعارہ تصور کی جانے والی اس شخصیت کا انتقال ہوا۔ ان کی عمر 72 سال تھی۔

مستنصر حسین تارڑ

ادیب سیلیبریٹی نہیں ہوتا۔ ہاں، لوگ جھک کر ملتے ہیں، محبت کرتے ہیں، احترام کرتے ہیں مگر جو جنون کرکٹرز اور فلمی ستاروں کے مداحوں میں دکھائی دیتا ہے، وہ ادیبوں کے حصے میں نہیں آتا۔ البتہ چند ادیبوں کو استثنا حاصل ہے۔ جی ہاں، اگر کسی ادبی کانفرنس میں آپ کو ادیب کے گرد شائقین کا رش دکھائی دے، آٹوگراف کے لیے قطار لگی ہو، سیلفیاں بنائی جا رہی ہوں، تو سمجھ لیجیے، وہ کوئی اور نہیں، مستنصر حسین تارڑ ہی ہیں۔ ایک جانب یہ شکایت کی جاتی ہے کہ ادب پڑھنے کا رجحان ختم ہوگیا، مگر ناشر ان کی کتابیں دھڑا دھڑ چھاپ رہے ہیں۔ ہر سال نیا ایڈیشن آجاتا ہے۔ ادبی میلوں میں ان کا سیشن کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ عہد حاضر کے مقبول ترین لکھاری ہیں۔ ان کی شہرت کے کئی اسباب میں ٹیلی ویژن بڑی وجہ ہے۔ آج جن مارننگ شوز کا چلن عام ہے، ان کی طرح تارڑ صاحب ہی نے ڈالی تھی۔ صبح کی نشریات میں ان کا سکہ چلتا تھا۔ اس زمانے میں وہ چاچا جی کے نام سے معروف ہوئے۔ آج بھی لاکھوں ناظرین انھیں اسی نام سے پکارتے ہیں۔ انھوں نے ڈراموں میں اداکاری بھی کی۔ متعدد ڈرامے لکھے۔ البتہ جس شے نے انھیں اوج بخشا، وہ ان کے سفر نامے تھے۔ ان کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی

Downloaded From http://paksociety.com

ایک مہینا دو شاعر

اردو کے دو عظیم شعرا کا تعلق اسی مہینے سے ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں ہم عصر تھے اور دونوں نے لاکھوں دلوں کو گرویدہ بنایا۔ پہلا نام ہے افتخار عارف کا۔ وہ ایک باکمال شاعر، ایک باصلاحیت منتظم اور ایک زندہ دل انسان ہیں۔ زبان و ادب کے فروغ کے لیے انھوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ کئی اہم اداروں میں اعلیٰ ترین ذمے داریاں سنبھالیں۔ ادارہ ''قومی زبان'' کے صدر رہے۔ ''اکادمی ادبیات پاکستان'' کے چیئرمین کا منصب سنبھالا۔ ان کے دور میں مذکورہ اداروں نے خوب ترقی کی۔ لندن میں ''اردو مرکز'' کو منظم کیا۔ تہران میں ایک ثقافی ادارے کے سربراہ رہے۔ انھیں ہلال امتیاز، تمغۂ امتیاز اور تمغۂ برائے حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا

افتخار عارف اپنی نسل کے پختہ ترین شاعر تصور کیے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں روایت کی بازیافت ہوتی ہے، یعنی وہ روایت کو عصر سے جوڑ کر اُسے جدت عطا کرتے ہیں۔ غزل کے مصرعوں میں اپنا تجربہ یوں سمو دیتے ہیں کہ لوگ اش اش کر اٹھیں۔ ان کے ہاں فلسفہ بھی ہے، جمالیاتی بھی، روانی بھی۔ ان کا کلام دلوں کو آسودگی بخشتا ہے۔

یوں تو ان کی شاعری ہی مستند حوالہ مگر پی ٹی وی کا مقبول ترین پروگرام ''کسوٹی'' بھی ان کی شناخت کو مستحکم کرنے میں کلیدی رہا۔ یہ امر دلچسپ ہے کہ اس کوئز شو نے نہ صرف لاکھوں سامعین کی تربیت کی، بلکہ مقبولیت کی دوڑ میں بھی فاتح ٹھہرا۔ وجہ اس کا زبردست فارمیٹ تھا۔ ایکسپرٹس کا پینل بیس سوالات کے ذریعے جواب بوجھتا تھا۔ ہر سوال کے بعد تجسس اور دلچسپی بڑھتی جاتی۔ جو شخص اس پروگرام سے منسلک ہوا، دائمی شہرت اس کا نصیب بنی۔ قریش پور، عبیداللہ بیگ اور غازی صلاح الدین اس کی واضح مثال ہیں۔ افتخار عارف اس کی اوّلین ٹیم کا حصہ تھے۔ ان کے جانے کے بعد ہی غازی صلاح الدین اس میں شامل ہوئے تھے۔ اس پروگرام کو اوج بخشنے میں افتخار صاحب کا کردار کلیدی رہا۔

افتخار عارف 21 مارچ 1944 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے علمی و ادبی ماحول میں پروان چڑھے۔ مطالعے نے شعر کہنے کی جوت جگائی۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ ہجرت کے بعد کراچی چلے آئے اور ریڈیو پاکستان سے منسلک ہوگئے۔ ریڈیو پر صلاحیتوں کا جھنڈا گاڑھنے کے بعد پی ٹی وی پہنچے۔ کسوٹی کا حصہ بنے۔ پھر ''اردو مرکز'' سے وابستہ ہو کر لندن کا رخ کیا۔ لوٹ کر مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین بنے۔ اکادمی ادبیات کی ذمے داریاں سنبھالیں۔ شہرت کے اپنے مسائل بھی ہیں۔ وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے، بھلا کیسے ممکن تھا کہ متنازع نہ ٹھہرتے۔ ان پر لابنگ اور مصلحت پسندی کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ البتہ اس ماہ سے جڑے دوسرے شاعر پر اس نوع کا الزام عائد کرنا مشکل ہے۔ یہ ہیں جناب حبیب جالب، جنھوں نے کہا تھا:

گئیں۔ ان کے تیس سے زاید سفرنامے شائع ہوئے۔ بارہ صرف پاکستان کے شمالی علاقوں کے بارے میں ہیں۔ پاکستان کی بلند ترین چوٹی ''کے ٹو'' پر ان کا سفرنامہ اس قدر مقبول ہوا کہ دو ہفتے میں پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا۔ اِس علاقے سے ان کے تعلق کی بنا پر وہاں کی ایک جھیل کو ''تارڑ جھیل'' کا نام دیا گیا۔ کچھ حلقے اعتراض کرتے ہیں کہ ان کے سفرنامہ میں افسانوی رنگ غالب ہوتا ہے اور وہ سفرناموں کی تعریف پر پورے نہیں اترتے۔ ممکن ہے یہ رائے درست ہو، مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے سفرناموں نے لاکھوں پڑھنے والوں کو دنیا بھر کی سیر کروائی۔ ان کا فکشن بھی بے حد مضبوط ہے۔ انھوں نے بہاؤ، راکھ اور خس و خاشاک زمانے جیسے یادگار ناول لکھے، جن کا بڑا چرچا ہوا۔

اب ان کے حالات زندگی پر نظر ڈال لی جائے۔ مستنصر حسین تارڑ یکم مارچ 1939 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔

Downloaded From http://paksociety.com

یہ اعجاز ہے حسن آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

وہ عوام کی آواز تھے۔ ان کے اشعار محفل میں آگ لگا دیتے۔ سامعین میں چنگاریاں بھر دیتے۔ منظر ان کی گرجتی آواز سے لرز اٹھتا۔ موقع پرستوں اور مصلحت پسندوں کو وہ گراں گزرتے تو سبب یہی تھا کہ وہ کچلے ہوئے طبقے کی آواز بنے۔

حبیب جالب 1928 میں ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ دہلی سے دسویں کا امتحان پاس کیا۔ پھر پاکستان چلے آئے۔ اوائل میں صحافت کا پیشہ اپنایا۔ پھر ایک ٹیکسٹائل مل سے وابستہ ہوگئے۔ جلد ہی سیاست کی سمت آ گئے۔ معروف کسان رہنما حیدر بخش جتوئی کے ساتھ کام کیا۔ ترقی پسند تنظیموں سے تعلق رہا۔ علمی زندگی کا بڑا عرصہ لاہور میں گزرا۔ پہلا مجموعہ ''برگِ آوارہ'' 1957 میں شائع ہوا۔

کسی زمانے میں وہ جوش سے متاثر تھے۔ کراچی میں راغب مراد آبادی کے شاگرد رہے۔ البتہ انقلابی فکر نے جب زور مارا، تو وہ روایتی غزل کے کلیوں کو توڑتے ہوئے نظم کی سمت متوجہ ہوئے۔ جدیدیت کی تحریک کو اپنے فکر کے قریب پایا اور تجربات کی دنیا میں قدم رکھا، مگر جدیدیت کے تجربات انھیں عوام سے دور نہیں کر سکے۔ وہ پسے ہوئے انسانوں کا چہرہ بنے۔ آمریت کے شدید مخالف تھے۔ مارشل لا کے زمانے میں اُن کے الفاظ تلوار بن جاتے۔ مصرعے زبان زد خاص و عام ہو جاتے، بلکہ مطالبہ بن جاتے۔ اب ہر مشاعرہ ان کے نام ہوتا۔ 1958 میں پہلا مارشل لا لگا۔ 1962 میں اُسی کے تحت دستور پیش کیا گیا، تو جالب نے وہ نظم ''میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا'' کہی، جو امر ہوگئی۔ جب اُن کی للکار سے حکومت کو خطرہ محسوس ہوا تو انھوں نے اس شاعر کو توڑنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ انھیں قید و بند کی صعوبتیں دی گئیں، تشدد ہوا، مگر سرکار انھیں جھکانے میں ناکام رہی۔

ایوب اور یحییٰ خان کے ادوار میں اُنھیں متعدد بار گرفتار کیا گیا۔ قید کے زمانے میں جو شاعری کی، اسے ضبط کر لیا گیا مگر ان کے الفاظ پر روک لگانا اب مشکل تھا۔ انھوں نے مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن کی مخالفت کی اور خطرناک نتائج سے خبردار کیا۔ ان کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ جمہوری حکومت بھی ان کا سچ برداشت نہیں کر سکی۔ بھٹو حکومت کے لیے بھی درد سر بنے رہے۔ اسی زمانے میں یہ شعر کہا تھا:

قصر شاہی سے یہ حکم صادر ہوا
لاڑکانے چلو، ورنہ تھانے چلو

بھٹو دور میں انھیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ ضیا الحق کے مارشل لا میں رہا ہوئے، مگر مصلحت پسند نہیں تھے۔ نچلے نہیں بیٹھے۔ ''ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا'' جیسا لازوال مصرع اسی زمانے میں کہا۔ بے نظیر حکومت کو جب کرپشن کی دلدل میں دھنستے دیکھا، تو اسے بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ بعد کے زمانے میں انھیں بیماریوں نے گھیر لیا۔ البتہ انھوں نے کسی قسم کی امداد قبول نہیں کی۔ ان کا انتقال 13 مارچ 1993 کو ہوا۔ وہ تو جہان فانی سے کوچ کر گئے، مگر ان کے اشعار آج بھی زندہ ہیں۔ مشرف دور میں جب وکلا تحریک چلی، تو ان کا کلام زبان زد خاص و عام ہوگیا۔

والد، رحمت خان تارڑ گجرات کے ایک کاشت کار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ باپ نے بیٹے کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ بیڈن روڈ پر واقع لکشمی مینشن میں اُن کا بچپن گزرا۔ سعادت حسن منٹو پڑوس میں رہتے تھے۔ میٹرک کے بعد مستنصر حسین تارڑ گورنمنٹ کالج کا حصہ بن گئے۔ ایف اے کے بعد انھوں نے برطانیہ کا رخ کیا۔ پانچ چھ برس وہاں گزرے۔ ادھر فلم اور تھیٹر پڑھا۔ 1957 میں ماسکو پہنچے۔ اُس سفر کی روداد ہفت روزہ قندیل میں شائع ہوئی۔ یہ سفرنامہ کتابی صورت میں شائع ہوا، تو بیسٹ سیلر ثابت ہوا اور مستنصر حسین تارڑ کے کیریر کا آغاز ہوا۔

''پرانی باتیں'' سے فنی سفر شروع ہوا۔ بعد میں کئی یادگار کردار نبھائے۔ ڈراما نگاری کا آغاز ''آدھی رات کا سورج'' سے ہوا تھا، آنے والے برسوں میں ٹی وی پر انتہائی متحرک رہے۔ 1969 میں یورپی ممالک کا سفرنامہ ''نکلے تری تلاش

Downloaded From http://paksociety.com

ایک ماہ، دو وزرائے اعظم

پاکستانی سیاست میں وزیراعظم سب سے اہم عہدہ، مگر یہ عہدہ فقط اسی وقت اہم تصور کیا جاتا ہے، جب ملک میں جمہوریت نافذ ہو، اگر آمریت ہو، تو صدر کو کلیدی حیثیت مل جاتی ہے۔ وزیراعظم کا عہدہ نمائشی رہ جاتا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ جن دو وزرائے اعظم کا تعلق ماہ مارچ سے ہے دونوں نے اس زمانے میں منصب سنبھالا، جب ملک کی باگ ڈور ایک فوجی جنرل کے ہاتھ میں تھی۔ جی ہاں، جب محمد خان جونیجو وزیراعظم بنے، جنرل ضیاالحق طاقت کا محور تھے اور جب شوکت عزیز نے یہ عہدہ سنبھالا، تمام فیصلوں کا اختیار پرویز مشرف کے پاس ہوا کرتا تھا۔ آئیں، ان شخصیات کے سفرِ زندگی کا جائزہ لیتے ہیں۔

محمد خان جونیجو 18 اگست 1932 کو سندھ کے علاقے سندھڑی میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک قابل اور ذہین طالب علم تھے۔ ان کا گھرانا سیاسی شناخت رکھتا تھا، یہی وجہ ہے کہ برطانیہ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد اکیس سال کی عمر میں انھوں نے علاقائی سیاست میں قدم رکھ دیا۔ 1962 کے انتخابات میں کھڑے ہوئے تو سانگھڑ سے مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کے رکن بنے۔ یاد رہے کہ یہ ون یونٹ کا زمانہ تھا، مشرقی پاکستان ایک صوبہ، مغربی پاکستان دوسرا صوبہ تصور کیا جاتا تھا۔ 1963 میں وہ وزیر ہوگئے۔ آنے والے برسوں میں سیاسی سفر میں کئی اتار چڑھاؤ آئے۔ ایوب کی حکومت کا خاتمہ، سندھ میں پی پی کا عروج۔ پھر مشرقی پاکستان کی علیحدگی۔ 77ء میں مارشل لا۔ ضیاالحق کے خلاف سیاسی اور صحافی تحریک۔ ضیا الحق نے الیکشن کا جو وعدہ کیا تھا، اسے وفا ہونے میں کئی برس لگ گئے۔ پہلے انھوں نے ریفرنڈم کروا کر اپنے عہدے کو آئینی حیثیت دی۔ کہیں 1985 میں جا کر غیر جماعتی انتخابات کروائے۔ الیکشن میں بھی کامیابی کے بعد محمد خان جونیجو کے نام قرعہ فال نکلا۔ اسمبلی نے انھیں اعتماد کا ووٹ دیا اور یوں وہ آمریت کی چھتری تلے پاکستان کے دسویں وزیراعظم منتخب ہوگئے۔ ماہرین متفق ہیں کہ جونیجو دور امن و امان اور اقتصادی ترقی کے لحاظ سے پاکستان کا سنہری دور تھا۔ انھیں ایک ایمان دار سیاست دان کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

مخالفین بھی ذکر احترام سے کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ محمد خان جونیجو کو ان کی انکساری اور شرافت کے پیش نظر اس اُمید پر منتخب کیا گیا تھا کہ وہ کبھی صدر کے سامنے آواز نہیں اٹھائیں گے، مگر پہلی ہی ملاقات میں وہ صدر پاکستان سے یہ پوچھ بیٹھے کہ ملک میں جمہوریت کب بحال ہوگی۔ دیگر اقدامات کے باعث بھی اختلافات پیدا ہوئے۔ انھوں نے پروٹوکول کم کیا۔ وزراء کو مہنگی، بڑی گاڑیوں کے بجائے 800 سی سی گاڑیوں پر لے آئے۔ افغانستان سے فوج نکالنے کے لیے جنیوا معاہدہ کیا، اوجھڑی کیمپ کے

میں'' شائع ہوا، تو ان کی گنتی مقبول قلم کاروں میں ہونے لگی۔ اسے محمد خالد اختر نے خوب سراہا۔ اگلا سفر نامہ ''اندلس میں اجنبی'' بھی بہت پسند کیا گیا۔ خانہ بدوش، نانگا پربت، نیپال نگری، سفر شمال کے، اسنولیک، کالاش، پتلی پیکنگ کی، ماسکو کی سفید راتیں، یاک سرائے، ہیلو ہالینڈ اور الاسکا ہائی وے بھی بہت مشہور ہوئے۔ ناول نگاری میں بھی خود کو منوایا۔ یوں تو ان کے کریڈٹ پر ''راکھ'' اور ''بہاؤ'' جیسے بڑے ناول بھی ہیں، ''راکھ'' کو تو 1999 میں بہترین ناول کے زمرے میں وزیر اعظم ادبی ایوارڈ کا مستحق گردانا گیا، مگر یہ ان کا اولین ناول ''پیار کا پہلا شہر'' تھا، جس نے مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دیے۔ اب تک اس کے پچاس سے زاید ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

اردو کے ساتھ پنجابی میں بھی ناول نگاری کا تجربہ کیا۔ افسانے بھی لکھے۔ ان کی شناخت کا ایک مضبوط حوالہ کالم نگاری بھی ہے۔ وہ سب سے زیادہ پڑھے جانے والے کالم نگاروں میں سے ایک ہیں۔

ان کا شمار اپنے عہد کے مقبول ترین لکھاریوں میں ہوتا ہے۔ ان کے فیس بک پیج کو ہزاروں افراد فالو کرتے ہیں۔ مداحوں نے ریڈرز کلب کے نام سے ایک گروپ بنا رکھا ہے، جس کے ارکان کی تعداد دس ہزار سے زاید۔ اس فورم پر جس طرح تارڑ صاحب کی تخلیقات زیر بحث آتی ہیں۔ مداح ''تکیہ تارڑ'' کے نام سے ایک منفرد سرگرمی انجام دیتے ہیں، جہاں وہ اکٹھے ہو کر ان کی کتابیں پڑھتے ہیں اور ان کے

Downloaded From http://paksociety.com

سانحے پر کمیشن بنانے کی بات کی، بے نظیر بھٹو کو پاکستان آنے کی اجازت دے دی... ان اقدامات کا نتیجہ متوقع تھا۔ جنرل ضیاالحق نے 8 ویں ترمیم استعمال کرتے ہوئے جونیجو حکومت کو ختم کردیا۔ اب وہ گوشہ نشین ہوگئے۔ 16 مارچ 1993 کو ان کا انتقال ہوا۔

اب بات شوکت عزیز کی ہوجائے۔ وہ انتہائی قابل اور ذہین ماہر اقتصادیات تھے اور اس حوالے سے دنیا میں جانے جاتے تھے۔ مگر کسی کو توقع نہیں تھی کہ ایک دن انھیں پاکستان کا وزیراعظم بنا دیا جائے گا۔ شوکت عزیز 9 مارچ 1949 کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عزیز احمد اپنے وقت کے معروف بیورو کریٹ تھے۔ وہ وزیر بھی رہے۔ شوکت عزیز سینٹ پیٹرک ہائی اسکول، کراچی اور ایبٹ آباد پبلک اسکول کے طالب علم رہے۔ کچھ عرصہ قصور میں گزرا۔ 1967 میں گریجویشن، 1969 میں ایم بی اے کا مرحلہ طے ہوا۔ پیشہ ورانہ سفر میں ترقی کے مراحل تیزی سے طے کیے۔ ملازمت انھیں بیرونِ ملک لے گئی۔ انھوں نے برطانیہ، ملائیشیا، امریکا اور یونان میں ذمے داریاں نبھائیں۔ اس عرصے میں بین الاقوامی اداروں نے بھی ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا۔ ان کی شہرت نے پاکستانی سرکار کو بھی اُن کی سمت متوجہ کیا۔ کسی زمانے میں وہ میاں صاحب کے قریب تصور کیے جاتے تھے۔ نواز شریف کو برطرف کرنے کے بعد جب پرویز مشرف نے اقتدار سنبھالا، تو شوکت عزیز انھیں بھی متاثر کرنے میں کامیاب رہے۔ 1999 میں انھوں نے وزارت خزانہ کا قلمدان سنبھالا۔ ان کی پالیسیوں سے معیشت میں واضح بہتری آئی۔ البتہ سیاسی میدان میں ایک بحران جنم لینے کو تھا۔ حکومتی جماعت میں اختلافات بڑھ رہے تھے۔ 6 جون 2004 کو ق لیگ کے وزیراعظم میر ظفر اللہ خان جمالی کو استعفیٰ دینا پڑا۔ پرویز مشرف نے شوکت عزیز کو وزیراعظم بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے انھیں الیکشن لڑنا پڑا۔ اس عرصے میں چوہدری شجاعت قائم مقام وزیراعظم رہے۔ انھوں نے تھر سے الیکشن لڑا۔ اس دوران ان پر خودکش حملہ بھی ہوا، جس میں وہ محفوظ رہے۔

ان کی شہریت کا معاملہ متنازع رہا۔ اپوزیشن نے الزام لگایا کہ وہ پاکستانی شہری نہیں۔ اس حوالے سے لطیفے بھی چلے۔ ان کے پاس آخر تک امریکی پاسپورٹ رہا۔ اس معاملے پر اس وقت کے چیف جسٹس افتخار چودھری کی عدالت میں کیس چلا، مگر پھر 9 مارچ آگیا اور انھیں معطل کردیا گیا۔ 2007-8 کے انتخابات میں ق لیگ کو شکست ہوئی۔ سبکدوش ہونے والے وزیراعظم نے بوریا بستر لپیٹا اور بیرونِ ملک سدھار گئے۔ عالمی اداروں کے پاس اُن کے لیے کئی آفرز تھیں۔ بعد میں الزام لگا کہ ان کے دور میں جس اقتصادی ترقی کا دعویٰ کیا جاتا تھا، وہ قرضوں کے سہارے کھڑی تھی، جو کچھ ہی روز میں ڈھے گئی اور پاکستان معاشی مسائل میں گھر گیا۔

بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ ناقدین کے مطابق اگر ان کی تخلیقات کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے، تو نہ صرف ان کی رسائی بڑھے گی، بلکہ اردو ادب کو استحکام بھی ملے گا۔

عمران طاہر

گو ہمارے ہاں وسائل کم ہیں، مسائل کی بہتات ہے مگر پاکستانی کھلاڑی خود کو منوا ہی لیتے ہیں۔ کتنی ہی متاثر کن کہانیاں ہمارے سامنے آئیں۔ جب ہمارے نوجوانوں نے مشکل حالات کو شکست دے کر بین الاقوامی دنیا میں جگہ بنائی۔ البتہ اگر ایک انتہائی باصلاحیت کھلاڑی پاکستان میں پیدا ہوا ہو، یہیں پلا بڑھا ہو مگر اس کی قابلیت سے پاکستان کے بجائے کوئی اور ملک استفادہ کرے، وہ ہیرا غیروں کے ہاتھ لگ جائے، تو اسے ایک المیہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ یہی کچھ عمران طاہر کے ساتھ ہوا۔ یہ ہیرا پاکستان کی کان سے نکلا مگر ساؤتھ افریقا کی انگوٹھی میں جڑا گیا۔ یوں اس کا حقیقی فن دنیا کے سامنے آیا۔ یہ واقعی دکھ کی بات ہے کہ اس پاکستانی کھلاڑی کے فن سے غیر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

عمران طاہر نے 28 مارچ 1979 کو لاہور میں آنکھ کھولی۔ کرکٹ کا شوق بدرجہ اتم موجود تھا۔ اچھا اسپنر بننے کی بھرپور صلاحیت تھی۔ کلب کرکٹ میں خود کو منوانے کے بعد وہ پاکستان کی انڈر 19 ٹیم کا حصہ بن گئے۔ یوں لگتا تھا کہ جلد یہ کھلاڑی قومی ٹیم تک رسائی حاصل کرلے گا۔ فرسٹ کلاس

Downloaded From http://paksociety.com

مارچ اور دو سابق کپتان

عہد حاضر کے دو عظیم کرکٹرز... پاکستان کے دو سابق کپتانوں کی زندگیاں بھی مارچ کے مہینے سے جڑی ہیں۔ دونوں نے اسی ماہ آنکھ کھولی۔ پہلا نام ہے عظیم بلے باز انضمام الحق کا، جو انضی کی عرفیت سے مشہور تھے۔ اپنی زبردست بیٹنگ کے علاوہ اپنے جثے اور بھولپن کی وجہ سے بھی وہ خبروں میں رہے۔ انگریزی ایسے بولتے کہ محفل زعفران زار ہوجاتی۔

البتہ یہ مت سمجھیں کہ جارح مزاج انضمام فقط مخالف بالروں کے لیے قہر تھا۔ کبھی کبھار آف دی فیلڈ بھی غصے میں آجاتے۔ اور جب ایسا ہوتا، تو نتائج پریشان کن ہوتے۔ ایسے دو واقعات سن لیجیے۔ 1997 میں ٹورنٹو میں صحارا کپ کے دوران وہ ایک ہندوستانی تماشائی پر چڑھ دوڑے۔ اس کی درگت بنانے کے لیے ڈریسنگ روم سے بلا منگوالیا۔ بڑی مشکل سے حالات کو سنبھالا گیا۔ انضمام کا موقف تھا کہ اس شخص نے ان کے مذہب سے متعلق نازیبا الفاظ کہے تھے۔ دوسرا واقعہ 2006 میں ہوا۔ اول ٹیسٹ میں وہ کپتان تھے۔ ڈیرل ہیئر نے پاکستانی ٹیم پر بال ٹیمپرنگ کا الزام لگایا۔ انضمام کو اتنا غصہ آیا کہ چائے کے وقفے کے بعد وہ ٹیم کو لے کر میدان ہی میں نہیں آئے۔ امپائر نے طریقہ کار کے مطابق میچ ختم کرنے اور انگلینڈ کو فاتح قرار دینے کا اعلان کردیا۔ یہ ٹیسٹ کرکٹ میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا، جب کوئی ٹیم اس طرح شکست سے دوچار ہوئی ہو۔ واقعے پر بہت بحث ہوئی۔ گو ڈیرل ہیئر... پر بھی تنقید ہوئی، مگر ماہرین کے مطابق شکست کی وجہ انضمام کا غصہ بنا۔

3 مارچ 1970 کو ملتان میں پیدا ہونے والے انضمام الحق ٹیسٹ کرکٹ میں یونس خان اور جاوید میانداد کے بعد پاکستان کے دوسرے سب سے زیادہ رنز بنانے والے کھلاڑی ہیں۔ ایک روزہ کرکٹ میں پاکستان کی جانب سے سب سے زیادہ رنز انھوں نے اسکور کیے۔ جب آئی سی سی نے 2005 میں ورلڈ الیون بنائی، تو انضی ٹیسٹ اور ون ڈے دونوں میں شامل تھے۔ ناقدین کے مطابق اگر پاکستان کے پانچ عظیم بلے بازوں کی فہرست بنے، تو انضمام اس میں ضرور شامل ہوں گے۔

انضمام نے 378 ون ڈے کھیلے، جہاں انھوں نے 39.52 کی معیاری اوسط سے 11,739 رنز داغے۔ انھوں نے اس فارمیٹ میں 83 نصف سنچریاں بنائیں۔ سنچریوں کی تعداد دس۔ انھوں نے 120 ٹیسٹ میچز کھیلے۔ اس سفر کا آغاز 1992 میں انگلینڈ کے خلاف ہونے والی سیریز سے ہوا تھا۔ اس فارمیٹ میں 49.60 کی شان دار اوسط سے 8,830 رنز بنائے۔ 25 سنچریاں بنائیں، جن میں ایک ٹرپل سنچری بھی شامل تھی۔

انھوں نے 1991 میں ویسٹ انڈیز کے خلاف ون ڈے کیریر کا آغاز کیا۔ اسی سیریز میں پہلی نصف سنچری اسکور کی۔ پھر سری لنکا کے خلاف ایکشن میں نظر آئے۔ اس سیریز میں دو سنچریاں بنائیں۔ اسی کارکردگی کے باعث انھیں ورلڈ کپ کھیلنے والی ٹیم میں شامل کیا گیا۔ گو ابتدائی میچز میں ان کی کارکردگی مایوس کن رہی، مگر کپتان عمران خان کو ان پر مکمل اعتماد تھا۔ آخر کے دو میچز میں انھوں نے شان دار پرفارمینس دی اور پاکستان کو 1992 ورلڈ کپ جتوانے میں اہم کردار ادا کیا۔ سیمی فائنل میں 37 گیندوں پر 60 رنز کی اننگز لوگوں کو آج بھی یاد ہے۔ اب وہ ٹیم کا مستقل حصہ بن گئے۔ کئی اہم مواقع پر پاکستان کو فتح دلائی۔

2003 سے 2007 تک وہ پاکستانی ٹیم کے کپتان رہے۔ تیس ٹیسٹ میچز میں کپتانی کی، گیارہ میں فاتح ٹھہرے۔ ون ڈے میں کارکردگی نسبتاً بہتر رہی۔ البتہ کیریر کے آخر میں انھیں بڑے صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔ پاکستان 2007 ورلڈ کپ کے پہلے ہی راؤنڈ سے باہر ہوگیا۔ یہی غم کیا کم تھا کہ پاکستان کے کوچ، باب وولمر پراسرار حالت میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں مردہ پائے گئے۔ ان دو سانحات کے بعد انضمام کا کیریر اختتام کی راہ پر چل پڑا۔

میں بھی کارکردگی اطمینان بخش رہی۔ پھر ایک اشارہ ملا، انھیں پاکستان کی اے ٹیم میں شامل کرلیا گیا۔ چند ٹورز بھی کیے مگر صلاحیتوں کے اظہار کا بھرپور موقع نہیں ملا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت کے سلیکٹرز نے یہ کہہ کر عمران کو منتخب کرنے سے انکار کردیا تھا کہ فی الحال ٹیم کو لیگ بریک بالر کی ضرورت نہیں۔ اس وقت ثقلین مشتاق کا طوطی بول رہا تھا۔ محمد ارشد بھی ٹیم میں جگہ بنانے کے لیے زور مار رہا تھا۔ ایسے میں عمران کے لیے حالات ناسازگار تھے۔ مایوس ہوکر اس نے کاؤنٹی کرکٹ میں قسمت آزمائی۔ وہاں موقع ملا، مگر اس نے برطانیہ کو مستقل قیام گاہ نہیں بنایا۔ ایک خیرخواہ کے مشورے پر جنوبی افریقا کا رخ کیا۔ وہاں نہ صرف اُس کا کیریر چمکا بلکہ وہ خاتون بھی مل گئی، جو اس کی نصف بہتر بننے والی تھی۔ بھارتی نژاد سمعیہ

Downloaded From http://paksociety.com

آخر میں مذہب کی جانب اُن کا رجحان بڑھ گیا تھا۔ کپتان بنے تو ان کی مذہبی فکر کا اثر ٹیم پر بھی نظر آیا۔ جہاں اس رویہ کو قابلِ تعریف ٹھہرایا گیا، وہیں کچھ حلقوں نے یہ شکایت بھی کی کہ اس کا اثر ان کی پسند ناپسند اور کھلاڑیوں کے انتخاب پر پڑ رہا ہے۔ اس کا ذکر شہریار خان نے بھی اپنی کتاب میں کیا۔ البتہ جب شہریار دوسری بار چیئرمین بنے، تو اُنھیں چیف سلیکٹر کا عہدہ سونپا گیا۔

فہرست میں دوسرا نام شاہد خان آفریدی کا ہے، جو حقیقی معنوں میں ایک سپر اسٹار ہیں، جنھیں دنیا میں بوم بوم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ پاکستان میں جو شہرت عمران خان کے حصے میں آئی، اس کے قریب فقط شاہد ہی پہنچ سکے۔ اس کا سبب ان کا اعتماد اور جارحانہ مزاج رہا، جس کی پہلی جھلک ہی نے شائقین کرکٹ کی آنکھیں خیرہ کردی تھیں۔ یہ 1996 کا واقعہ ہے، جب پاکستان اور سری لنکا کے درمیان ہونے والے مقابلے میں اس نوجوان کھلاڑی نے ون ڈے کرکٹ کی تیز ترین سنچری داغ دی اور راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ اس ایک اننگز کے طفیل آفریدی نے برسوں پاکستان کرکٹ پر راج کیا۔ گو وہ اس طرح کی کارکردگی کبھی دہرا نہیں سکے، مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے متعدد میچز میں پاکستان کو فتح دلائی۔ وہ جے سوریا کے بعد دنیا کے دوسرے آل راؤنڈر ہیں، جنھوں نے ون ڈے کرکٹ میں 6000 ہزار سے زاید رنز بنائے اور تین سو سے زائد وکٹیں حاصل کیں۔ ایک روزہ کرکٹ میں سب سے زیادہ چھکے مارنے کا ریکارڈ آفریدی کے پاس ہے۔ جنوری 2006 میں اُنھوں نے بھارت کے خلاف ٹیسٹ میچ میں ہربھجن سنگھ کو لگاتار چار گیندوں پر چھکے رسید کیے۔ یہ کارنامہ ان سے پہلے صرف کپل دیو نے انجام دیا تھا۔ 2007 میں سری لنکا کے گیند باز ملنگا بندارہ کو ایک اوور میں 32 رنز دے مارے۔ یہ کرکٹ کا دوسرا مہنگا ترین اوور تھا۔ اور بھی کئی ریکارڈ بنائے۔

ان کا پورا نام صاحب زادہ محمد شاہد خان آفریدی ہے۔ وہ یکم مارچ 1980 کو خیبر ایجنسی میں پیدا ہوئے۔ البتہ شعور کی آنکھ کراچی میں کھولی۔ انھیں لیگ اسپنر کے طور پر منتخب کیا گیا تھا۔ اکتوبر 1996 میں کینیا میں ہونے والے ایک ٹورنامنٹ سے انٹرنیشنل کرکٹ میں قدم رکھا، مگر شہرت انھیں بطور بلے باز ملی۔ نیٹ پر انھیں وقار یونس اور سعید انور نے بلے بازی کرتے دیکھا، تو اگلے میچ میں اوپر کے نمبر پر آزمانے کا فیصلہ کیا۔ آگے جو ہوا، وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ صرف 37 گیندوں پر انھوں نے 102 رنز کی حیران کن اننگز کھیلی۔

ان کے کیریر میں کئی نشیب و فراز آئے۔ خراب کارکردگی کی وجہ سے انھیں ٹیم سے باہر کیا گیا مگر ان کی قابلیت اور شہرت انھیں جلد ٹیم میں واپس لے آئی۔ انھیں ٹیسٹ میں بھی آزمایا گیا۔ وہاں انھوں نے بھارت کے خلاف 141 رنز کی یادگار اننگز کھیلی، مگر وہ کبھی خود کو اس فارمیٹ سے ہم آہنگ نہیں کرسکے۔ ڈراپ کیا گیا، تو ناراض ہو کر انھوں نے اس فارمیٹ سے ریٹائرمیٹ لے لی، مگر سمجھانے منانے پر لوٹ آئے۔ ایک بار تو یوں ہوا کہ وہ ٹیسٹ سیریز ہی کے درمیان اکتا کر اس کپتانی سے الگ ہوگئے۔ یہ واقعہ 2010 کے دورہ انگلینڈ کے بیچ ہوا۔ یہ ایک غیر ذمے دارانہ فیصلہ تھا۔ پھر بھی اس کی سمت نہیں پلٹے۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ متلون مزاج شخص ہیں۔ اپنی مرضی کے مالک۔ غیر ذمے داری کا مظاہرہ وہ کرکٹ کے میدانوں میں بھی کرتے رہے۔ کبھی بچگانہ شاٹ کھیل کر آؤٹ ہوئے۔ کبھی بال ٹمپرنگ کرتے پکڑے گئے۔ کبھی گیند چبا ڈالی۔ ناقدین ان پر شدید تنقید کیا کرتے۔ مگر عوام کے دل آفریدی کے ساتھ تھے۔ 398 ون ڈے میچز میں اُنھوں نے 395 وکٹیں لیں اور 8,064 رنز بنائے۔ 82 ٹی 20 میچز میں وکٹوں کی تعداد 83 اور رنز 1,218 ہیں۔

ہر بڑے کھلاڑی کی طرح ان کے کیریر کا اختتام بھی الم ناک انداز میں ہوا۔ ٹی 20 ورلڈ کپ میں شکست کے بعد اُنھیں باہر کا راستہ دکھا دیا گیا۔ آفریدی نے کبھی دبے الفاظ، کبھی بے باک ڈھب پر الوداعی میچ کھلانے کا تقاضا کیا، مگر بورڈ کی جانب سے خاموشی رہی۔ گو انھوں نے اس فارمیٹ سے ریٹائرمیٹ نہیں لی، مگر انھیں تاحال منتخب نہیں کیا گیا ہے۔

دلدار سے ملاقات کے بعد اس کی قسمت کا ستارہ چمکا طاہر کی لیگ اسپین بولنگ نے جلد توجہ حاصل کر لی۔ جنوبی افریقا کی کلب کرکٹ میں جگہ بنانے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ کارکردگی متاثر کن تھی۔ البتہ وہ جنوبی افریقا کی فرسٹ کلاس کا حصہ نہیں بن سکتا، اُسے چار سال قیام کی شرط پوری کرنی تھی۔ 2009 میں یہ شرط پوری ہوئی، تو راستے کھلتے چلے گئے۔ جلد وہ جنوبی افریقا کے سلیکٹرز کی نظروں میں آگیا۔ 2010 میں جب انگلینڈ کی ٹیم نے جنوبی افریقا کا دورہ کیا، تو اُسے ایک غیر متوقع کال موصول ہوئی۔۔ کیمپ سے بلاوا آیا تھا۔ وہ دوڑا دوڑا گیا مگر ایک صدمہ اس کا منتظر تھا۔ ابھی قانونی طور پر وہ جنوبی افریقی ٹیم کی نمائندگی کا اہل نہیں ہوا تھا۔ اسے جنوری 2011 تک انتظار کرنا تھا۔ وہ خاصا مایوس تھا مگر دوستوں نے حوصلہ بڑھایا

Downloaded From http://paksociety.com

اور امید دلائی کہ آج نہیں تو کل وہ ضرور انٹرنیشنل کرکٹ میں اپنے جوہر دکھائے گا۔

جب وہ قانونی طور پر ٹیم کا حصہ بننے کا اہل ٹھہرا، جنوبی افریقا اور بھارت کے درمیان ون ڈے سیریز جاری تھی۔ اس کا نام سولہ کھلاڑیوں میں تھا، مگر وہ سیریز کی پلینگ الیون تک نہیں پہنچ سکا۔ دراصل اس وقت کے کپتان گریم اسمتھ کا خیال تھا کہ وہ انڈیا میں ہونے والے ورلڈ کپ میں موثر ہتھیار ثابت ہوسکتا ہے۔ کپتان کا اندازہ درست تھا۔ وہاں اس کی کارکردگی متاثر کن رہی۔ اگلے پانچ اہم مقابلوں میں یہ باصلاحیت کھلاڑی 14 وکٹیں لے اڑا۔ ٹیم میں اس کی جگہ پکی ہوگئی۔ جب ان پاکستانی سلیکٹرز نے اُسے کھیلتے دیکھا، جنھوں نے کچھ برس قبل اسے گھاس نہیں ڈالی تھی، تو حسرت سے ہاتھ ملتے رہ گئے۔ وہ ایک بیش قیمت ہیرا گنوا چکے تھے۔

امکان تھا کہ جلد ہی اُسے ٹیسٹ ٹیم میں آزمایا جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ نومبر 2011 میں اُسے آسٹریلیا جیسی مشکل ٹیم کے خلاف اتارا گیا۔ وہ خود کو منوانے میں کامیاب رہا۔

کارکردگی نے جلد اس فارمیٹ کا حصہ بنا دیا۔

دلچسپ صورتِ حال تب پیدا ہوئی، جب یہ کھلاڑی پاکستان ٹیم کے خلاف میدان میں اترا۔ یہ 2013 میں یو اے ای میں ہونے والی ٹیسٹ سیریز تھی۔ پہلے ٹیسٹ میں اسے موقع نہیں ملا، مگر اگلی بار جب کپتان نے اسے آزمایا، تو اس نے اپنے ہم وطنوں (پاکستانی ٹیم) سے کوئی رعایت نہیں کی اور ٹیسٹ میچ کے پہلے ہی دن پانچ وکٹیں لے اڑا۔

مختصر دورانیے کی کرکٹ میں وہ اپنے عروج پر دکھائی دیا۔ بالخصوص 2014 کے ورلڈ ٹی 20 میں 10.91 کی اوسط سے بارہ وکٹیں لے اڑا۔ اس نے تینوں فارمیٹ میں جنوبی افریقا کو فتوحات دلائیں۔ 2015 کا ورلڈ کپ بھی یادگار رہا، جہاں 26 رنز کے عوض چار وکٹیں حاصل کرکے اس نے مین آف دی میچ کا ایوارڈ حاصل کیا اور جنوبی افریقا کو سیمی فائنل تک پہنچایا۔ عمران نے جہاں کامیابی سمیٹی، وہاں چند منفی ریکارڈز بھی بنائے، جیسے 2012 میں اس نے آسٹریلیا کے خلاف 37 اوورز پھینکے مگر ایک بھی وکٹ حاصل نہیں کرسکا۔ یہ ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ کی بدترین کارکردگی تھی۔

وقت کے ساتھ عمران کا مذہب کی جانب رجحان بڑھتا رہا۔ یاد رہے کہ ممتاز جنوبی افریقی بلے باز ہاشم آملہ کی شہرت کا ایک سبب جہاں ان کی حیران کن کارکردگی ہے، وہیں شرعی داڑھی، مذہبی رجحان اور غیر اسلامی معاملات سے پرہیز کرنا بھی رہا۔ طاہر عمران کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ پہلے پہل وہ کلین شیو تھے مگر اب داڑھی رکھ لی ہے۔ اسلامی تعلیمات پر سختی سے عمل کرنے لگا۔

گذشتہ دنوں وہ اچانک اُس وقت خبروں میں آگیا، جب میچ میں وکٹ لینے کے بعد اس نے جنوبی افریقی ٹیم کی ٹی شرٹ اتاری۔ نیچے جو شرٹ پہن رکھی تھی، اس پر جنید جمشید کی تصویر تھی۔ یہ جنید جمشید کو خراجِ تحسین پیش کرنے کی کوشش تھی۔ اس پر آئی سی سی کی جانب سے اعتراض بھی کیا گیا۔

مولانا عبیداللہ سندھی

قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ تاریکی سے روشنی پھوٹتی ہے، لاعلمی کے ویرانے میں علم کی شمع روشن ہوجاتی ہے، آذر کے گھر ابراہیم پیدا ہوتا ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کی کہانی بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ پیدا تو وہ سکھ گھرانے میں ہوئے، مگر رب کائنات نے نصیب میں ہدایت لکھ رکھی تھی۔ قدرت نے انھیں اسلام کی خدمت کے لیے چن لیا تھا۔

مولانا عبیداللہ سندھی 10 مارچ 1872 کو اپل جٹوں کے سیالکوٹی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے وقت ان کا نام بوٹا سنگھ تھا۔ سکھ مذہب میں بھی توحید کا تصور موجود ہے، جسے اُن کے روشن باطن نے مزید نکھارنے کی سعی کی۔ حالاتِ زندگی کھنگالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مڈل تک کی تعلیم آپ نے جام پور ضلع ڈیرہ غازی خان میں حاصل کی۔ یہ مولانا عبید اللہ پائلی کی کتاب "تحفتہ الہند" تھی، جسے پڑھ کر ان کی کایا کلپ ہوئی۔ جب شاہ اسمٰعیل شہید کی "تقویت الایمان" ہاتھ آئی تو زندگی کا ایک واضح راستہ دکھائی دینے لگا۔ اسلام کو انھوں نے اپنا مقصد بنا لیا۔ قبول اسلام کے بعد اپنا نام اس کتاب کے مولف کے نام پر رکھا، جس نے دین فطرت کی سمت راغب کیا تھا، یعنی عبیداللہ۔

بوٹا سنگھ سے عبیداللہ بن کر اگر چپ ہوجاتے، نماز روزے میں زندگی گزار دیتے تو تاریخ انھیں بھول چکی ہوتی کہ روز ہی سیکڑوں افراد دائرہ اسلام میں شامل ہوتے ہیں، مگر

Downloaded From http://paksociety.com

انھوں نے اپنا رخ علم و تحقیق کی سمت موڑ دیا اور معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اس ضمن میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی صحبت نے کلیدی کردار ادا کیا۔ یہ دیوبند کا زمانہ تھا، جس نے ان پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ اس زمانے میں ریشمی رومال تحریک کا چرچا تھا، وہ اس کے لیے ہراول دستے میں شامل تھے۔ انھیں افغانستان کا محاذ سونپا گیا تھا۔ یہ ان کی پہلی ہجرت تھی جو نہ صرف ان کی بلکہ لاکھوں افراد کی زندگی بدلنے والی تھی۔

مولانا 1915ء سے 1939ء تک کا زمانہ افغانستان، سوویت یونین، ترکی اور سعودی عرب میں گزارنے والے تھے۔

ان ڈھائی عشروں میں انھوں نے افغان حکمرانوں کو پرکھا، سوشلسٹ انقلاب کا گہرائی سے جائزہ لیا، کمال اتاترک کے ترکی کا عمیق مشاہدہ کیا۔ اس تجزیے کے بعد انھوں نے لکھا: ”میں نے دہریہ روس سے مقدس حجاز تک حکمرانوں کو دیکھا ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ ہمارے انقلاب کو کوئی دوسرا ملک مدد نہیں دے گا کیونکہ ہر ملک کی اپنی اپنی خارجہ پالیسیاں ہیں۔ وہ اپنی خارجہ پالیسیوں کے تحت ہی انقلابیوں کو چکر دینے میں ماہر ہوتے ہیں۔ اگر ہم حقیقی تبدیلی چاہتے ہیں، تو اس کے لیے ہمیں اپنی عوام ہی پر بھروسا کرنا ہوگا، نہ کہ کسی بیرونی طاقت پر۔“

افغانستان کے امیر امان اللہ خان کو انگریزوں کے خلاف جہاد کے لیے مولانا سندھی ہی نے تیار کیا۔ جہاد افغانستان کی آبیاری کو ان کا اہم ترین کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ علوم قرآنی کی ترویج کے ساتھ جمعیت الانصار کا قیام بھی ان کی خدمات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ افغانستان سے انھوں نے روس کا رخ کیا۔ اب وہ ترکی پہنچے۔ اس عرصے میں وطن سے بھی غافل نہیں رہے۔ ہندوستانی سیاست پر ان کی گہری نظر تھی۔ آل انڈیا کانگریس کے حامی تصور کیے جاتے تھے، مگر مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی آف پنجاب کی جانب بھی جھکاؤ تھا۔ مہاتما گاندھی کی اس فکر سے متفق نہیں تھے کہ ہندوستان ایک قوم ہے۔ وہ اسے قوموں کا وفاق کہا کرتے تھے۔ انگریز سرکاران سے متنفر تھی۔ انھیں واپسی کی اجازت نہیں تھی، مگر فروری 1939ء میں سر عبداللہ ہارون کی کوششوں اور حکومت سندھ کی ضمانت پر انگریز سرکار نے مولانا کو واپس آنے کی اجازت دے دی۔

وہ وسیع تجربات و مشاہدات کے ساتھ لوٹے تھے۔ اس عرصے میں رجعت پسندی کو بھی قریب سے دیکھا تھا، جدید فکر کا بھی مطالعہ کیا۔ ان کے درس میں اجتہادی رنگ جھلکتا تھا، جس نے جمود پر کاری ضرب لگائی اور روایت پسندوں کو ان سے متنفر کر دیا۔ اوروں کے علاوہ اس زمانے میں دارالعلوم دیوبند کے چند حلقوں نے بھی ان پر تنقید کی۔ پھر انھیں جامعہ ملیہ دہلی اور جامعہ الازہر مصر کے سند یافتہ پروفیسر سرور کا ساتھ ملا۔ یہ پروفیسر سرور ہی تھے، جنھوں نے مولانا سندھی کے ملفوظات اکٹھے کیے اور کتابوں کی صورت ہم تک پہنچائے۔

مولانا کا انتقال 22 اگست 1944ء کو دین پور میں ہوا۔ ان کی زندگی ہی میں پروفیسر سرور ایک کتاب ”مولانا عبیداللہ سندھی: حالات، تعلیمات اور سیاسی افکار“ مکمل کر چکے تھے، جسے مولانا سندھی نے پڑھا بھی۔ آج عبیداللہ سندھی فاؤنڈیشن، لاہور سے یہ کتاب حاصل کی جاسکتی ہے، جس کے بیک فلیپ پر یہ عبارت لکھی ہے: ”اگر ہم نے بروقت مولانا سندھی جیسی شخصیات کی باتوں کو مدنظر رکھا ہوتا، تو آج جن انتہاپسندیوں کا ہم شکار ہیں، ان سے بچ سکتے۔“

قرآنی فکر میں وہ شاہ ولی اللہ کے معترف تھے۔ کتاب ”شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ“ میں لکھتے ہیں: ”قرآنی معارف و مطالب میں مجھے شاہ ولی اللہ دہلوی کے علاوہ کسی اور حکیم کے افکار سے مدد لینے کی ضرورت نہیں پڑی، میں نے قرآن سے جو کچھ اخذ کیا ہے، مجھے ان کے تعین اور تائید کے لیے شاہ صاحب کی حکمت سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔“

انھوں نے قرآن کی تفسیر بھی لکھی۔ ”الہام قرآن“ گو مکمل نہیں، مگر اس سے جویان علم نے خوب استفادہ کیا۔ اسے پڑھ کر مولانا کی علمیت اور ویژن کا اندازہ ہوتا ہے۔ کچھ حلقے ان کے افکار، بالخصوص حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق ان کے عقیدے پر تنقید کرتے ہیں۔ البتہ مستند محققین کا موقف ہے کہ متنازع امور کا ماخذ مولانا کی اصل تحریریں نہیں، دراصل یہ املائی تحریریں ہیں، متنازعات نے املا کرنے والے کی غلطی کے باعث جنم لیا۔

ان کے افکار پر سیاسی رنگ بھی غالب تھا۔ وہ تبدیلی اور ترقی کے خواہش مند تھے۔ اسی وجہ سے ان کے نظریات

Downloaded From http://paksociety.com

کو ہضم کرنا اس وقت کے روایتی علما کے لیے دشوار تھا۔ وہ کہا کرتے تھے: ہمارے موجودہ مذہبی طبقے ناکارہ ہو چکے ہیں۔ وہ آسانی سے رجعت پسندی کا آلہ کار بن جاتے ہیں۔ نیز اب تک مذہب کے نام سے ہمارے ہاں جو تحریکیں چلیں، ان سے خود مسلمانوں کے اندر افتراق اور جھگڑے پیدا ہوئے۔" ایک اور جگہ لکھا: "خالص اور بے میل انسانیت ہی قرآن کا صحیح اور مکمل نصب العین ہے۔ جو تعلیم عام انسانیت کے تقدم اور ترقی میں معاون ہے، وہ حق ہے اور جو تعلیم انسانیت کے ارتقاء میں حارج ہو، وہ تعلیم حق نہیں ہو سکتی۔"

دراصل وہ ہندوستان میں یورپی طرز کا تعلیمی اور صنعتی انقلاب چاہتے تھے۔ خواہش تھی کہ ان کے ہم وطن علم اور سائنس کی برکات سے مستفید ہوں۔ ساتھ وہ دینی اور روحانی فکر کے اس حصے سے جڑ جائیں، جس کا تعلق براہ راست خدا کی ذات سے ہے۔"

اُنھوں نے ساری زندگی قائد حریت کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1912 میں دلی نظارۃ المعارف نامی مدرسے کا قیام، ترکی میں تحریک ولی اللہ کا آغاز، آزاد ہند کے منشور کی تشکیل، افغانستان میں آل انڈیا کانگریس کی باضابطہ شاخ کا قیام ان کے نمایاں کارنامے رہے۔

عاطف اسلم

اگر قدرت آپ پر مہربان ہو، خدا آپ کے نصیب میں شہرت لکھ دے، تو مخالفین کتنا ہی زور لگا لیں، کتنے الزامات عاید کریں، گٹھ جوڑ کر لیں، آپ کا سفر روکنے میں ناکام رہیں گے۔ آپ بڑھتے چلے جائیں گے، کامیابیاں آپ کے قدم چومیں گی، مٹی میں بھی ہاتھ ڈالیں گے، تو وہ سونا بن جائے گی۔

کچھ ایسا ہی معاملہ عاطف اسلم کا ہے۔ کچھ روز قبل ایک ویڈیو انٹرنیٹ پر وائرل ہوئی، جس میں وہ کنسرٹ کے دوران حاضرین میں موجود ایک لڑکے کی سرزنش کرتے دکھائی دیتے ہیں، جو لڑکیوں کو چھیڑ رہا تھا۔ عاطف نے باقاعدہ گانا روک کر اُسے ڈانٹا۔ پھر انتظامیہ اس لڑکے کو وہاں سے نکال کر لے گئی۔ اس واقعے کے بعد عاطف پر تعریف کے ڈونگرے برسنے لگے۔ مگر یہ کوئی نئی بات نہیں۔ وہ جب قوالی کو جدید سازوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں، تب بھی اُسے لاکھوں لوگ یوٹیوب پر دیکھتے ہیں، ہندوستان جاتے ہیں، تو راتوں رات انڈسٹری پر چھا جاتے ہیں۔ بے شک شہرت کی ان سے گاڑھی چھنتی ہے۔

ناقدین متفق ہیں کہ اگر کسی پاکستانی فن کار کو حقیقی معنوں میں انٹرنیشنل آرٹسٹ کہا جا سکتا ہے، تو وہ عاطف ہی ہیں۔ بالیووڈ تو بالی ووڈ ان کی آواز ہالی ووڈ میں بھی سنی گئی۔

عاطف اسلم 12 مارچ 1983 کو وزیر آباد میں پیدا ہوئے۔ نو سال کی عمر میں وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ لاہور منتقل ہوئے۔ ڈویژنل پبلک اسکول میں داخلہ لیا۔ اسکول کی کرکٹ ٹیم کا حصہ رہے۔ کلب کرکٹ بھی کھیلی، مگر محنت کا ثمر نہیں ملا۔ وہ مایوسی کا زمانہ تھا۔ کسے خبر تھی کہ قدرت نے اُن کے لیے دوسرا شعبہ چن رکھا ہے۔ پی اے ایف کالج، لاہور کے زمانے میں موسیقی کی سمت متوجہ ہوئے۔ نجی محافل اور فنکشنز میں گانے لگے۔

کیریر کا باقاعدہ آغاز جل بینڈ سے کیا۔ ان کے ساتھ گوہر ممتاز بھی بینڈ میں شامل تھے۔ ان کے گانے "عادت" نے تمام ریکارڈ توڑ دیے، مگر جلد گروپ میں پھوٹ پڑ گئی۔ عاطف بینڈ سے الگ ہو گئے۔ کچھ ہی روز بعد ان کا البم مارکیٹ میں آ گیا۔ جو ریکارڈ تعداد میں فروخت ہوا۔ بینڈ کے رکن گوہر نے ان پر سرقے کا الزام لگا دیا۔ کچھ عرصے بعد گوہر نے بھی جل بینڈ کے تحت اپنا البم ریلیز کر دیا۔ عاطف اور گوہر کے البم میں چند گانے یکساں تھے۔ یہ معاملہ کورٹ تک گیا۔ عاطف کو تسلیم کرنا پڑا کہ ان کے مقبول گیتوں کی تیاری میں گوہر بھی شامل تھے۔ مگر یہ واقعہ ان کی شہرت کو داغ نہیں لگا سکا۔ ان کے گانوں کی شہرت ہندوستان پہنچ گئی تھی۔ وہ وہاں کے پروڈیوسروں کا اوّلین انتخاب بن گئے۔ ہندوستان میں ان کی مقبولیت پر وہاں کے گلوکار بہت چراغ پا ہوئے، مگر قسمت ان کے ساتھ تھی۔ وہ تمغۂ امتیاز حاصل کرنے والے کم عمر ترین شخص تصور کیے جاتے ہیں۔ آج وہ اپنے کیریر کے اوج پر ہیں۔ توقع کی جا رہی ہے کہ مستقبل میں وہ مزید ریکارڈ بنائیں گے اور پاکستان کا نام روشن کریں گے۔

Downloaded From http://paksociety.com

شکاگو

علیم شاهد

امریکا جیسے ترقی یافتہ ملک کے تقریباً تمام شہر اپنی ایک تاریخ رکھتے ہیں لیکن شکاگو کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ایک پاکستانی کی نظروں سے اس شہر کا احوال، قصہ بے مثال جس کی ہر سطر اہمیت کی حامل ہے۔

سیاحت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے تحفہ خاص

امریکا کے لیے لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ وہ ملک ہے جس میں کتنے ہی ملکوں کی صلاحیتیں جمع ہیں۔ دنیا کی ہر قوم موجود ہے اور مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے 4000 میل کے امریکا میں جہاں بھی لوگ آباد ہیں۔ انہوں نے اس ملک کو اپنی بہترین صلاحیتوں سے نواز دیا ہے، اتنی محنت جانفشانی سے کام لیا گیا ہے کہ ہر ہر قدم پر پتا چلتا ہے کہ شاید یہ جگہ دنیا میں سب سے اچھی ہے۔ سب سے بہتر ہے لیکن جب اگلے علاقے پر قدم جاتا ہے تو نیا

Downloaded From http://paksociety.com

رنگ نیا ڈھنگ اپنی پوری خوب صورتی اور رعنائی کے ساتھ نظر آجاتا ہے۔ سیلانی اس حیرت اور حیرانی کے حصار سے نکل نہیں پاتا، اس کی فیصلے کی اور مشاہدے کی قوت جواب دے جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی اپنے آپ کو بڑے فخر سے بڑے وثوق سے بڑی تحقیق سے خود کو دنیا سے مختلف قوم کہتے ہیں۔ امریکا کو Land of opportinty بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے پیشتر میں نے کیلی فورنیا کے شہروں سان یاگو، لاس اینجلس، سان فرانسسکو، سیکرامینٹو اور ایسٹ بے کے کئی سینٹرز کی سیاحت کی اور نیواڈا میں لاس ویگاس کی آنکھوں کو خیرہ کردینے والی چمک دمک بھی دیکھی۔ اس ناقابلِ یقین ماحول کو دیکھا، کچھ سمجھا کچھ اندازہ لگایا کہ یہ ترقی محنت اور تعمیر کی انتہا ہے شاید اس سے بہتر مشینی زینے دنیا میں نہیں ہے لیکن چونکہ میں نے امریکا کی دوسری ریاستوں کو نہیں دیکھا تھا لہٰذا میرا فیصلہ ادھورا تھا، نامکمل تھا۔

2015ء میں، میں امریکا آیا تو پروگرام میں صائمہ، عنیزہ، عمران اور آصف کی وجہ سے ریاست الی نوائے میں شکاگو کو پروگرام میں شامل کرلیا۔ فیصل نے 23 جولائی 2015ء کے لیے میری نجمہ اور دبیر کی ہوائی جہاز اور ہلٹن ڈبل ٹری سکوکی میں بکنگ کرادی۔ شکاگو کیلی فورنیا کے مشرق میں تقریباً دو ہزار میل آگے امریکا کے درمیان بڑا عظیم بڑا حسین شہر ہے۔

کارلوس نے ہمیں اوک لینڈ ایرپورٹ پہنچایا۔ یہ ایسٹ بے کا پرانا ائرپورٹ ہے۔ گھر سے قریب ہے۔ خاصا بڑا، کشادہ اور آرام دہ سہولتوں سے آراستہ ایرپورٹ ہے۔ ہم ایک بجے مقامی ائرلائن کے جہاز میں بیٹھ گئے۔ یہ امریکا کی معروف ڈومیسٹک فلائٹ تھی۔ جہاز چھوٹا تھا۔ امریکا میں اندرونِ ملک بے تحاشا لوگ سفر کرتے ہیں لہٰذا یہاں لگتا ہے جہاز میں نہیں بس میں سفر کررہے ہیں۔ ہر قسم کی مرمت اور دیکھ بھال ہوتی ہے لیکن وہ توجہ نہیں ہوتی جو انٹرنیشنل فلائٹس میں ہوتی ہے۔ بورڈنگ پاس میں سیٹ نمبر نہیں ہوتے جس کو جہاں جگہ مل جائے بیٹھ جائے لیکن نظم و ضبط قائم رہتا ہے۔ یہ سفر بھی چار گھنٹے کا تھا۔ جہاز میں صرف مشروبات مہیا تھے۔ اندرونِ ملک پروازوں میں کھانا نہیں دیا جاتا۔ بہرحال چار گھنٹے کے سفر کے بعد شکاگو ٹائم جو سان فرانسسکو سے دو گھنٹے آگے ہے ہم سات بجے مڈویسٹ ایرپورٹ شکاگو اُترے۔ ائرپورٹ حسبِ معمول بڑا کشادہ، جدید اور سہولتوں سے آراستہ پیراستہ ہے۔ ہم جیسے ہی لگیج حاصل کرنے بیلٹ کے قریب پہنچے محسن صاحب، بھابی صاحبہ، آصف عمران کوکو اور بچیوں نے ہمارا والہانہ استقبال کیا۔ اتنے لوگوں کو اچانک دیکھا، گلے ملے۔ خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اپنے ملک اپنے شہر سے ہزاروں میل دور محسن بھائی کی فیملی ہمیں جس محبت سے لینے آئی تھی تو مجھے اپنا علی گڑھ کا استقبالیہ یاد آگیا۔ سفر کی تھکن دور ہوگئی۔ یہ لوگ ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ مضافات شکاگو میں بہت بڑا، بہت عمدہ گھر۔ علاقہ پُرسکون ہر سہولت موجود۔ طبیعت خوش ہوگئی۔

محسن بھائی کا کھانے پر اصرار اور بھابی صاحبہ اور کوکو کے بنائے ہوئے کھانے بہت مزہ آیا اور ہماری پکنک شروع ہوگئی۔

عمران ہمیں ہلٹن ڈبل ٹری ہوٹل چھوڑ گئے۔ یہ ہوٹل ان کے گھر سے قریب ہے اور سکوکی میں ہی واقع ہے۔ ہم نے آرام کی نیند لی اور صبح 11 بجے عمران ہمیں ہوٹل سے گھر لے گئے۔ عمران چونکہ لیموزین سروس کے کاروبار سے وابستہ ہیں لہٰذا ہمیں بہترین گاڑیوں میں سفر کراتے رہے۔ گھر پر خاصے پُرتکلف ناشتے کا انتظام تھا۔ خاص طور سے بھابی نے روے، میدے کے روایتی پراٹھے بنائے تھے۔ پچھلے سال وسیم شاہد ان کے مہمان تھے۔ انہوں نے بھابی سے ان پراٹھوں کی فرمائش کی تھی اور پھر کراچی جاکر بہت تعریف کی تھی۔ لہٰذا اسی فرمائش کے اتباع میں یہ مزیدار ناشتا ہمیں بھی مل گیا۔ اب بھابی پر یہ ذمہ داری پڑگئی ہے کہ جو بھی پاکستان سے آئے گا وہ انڈے پراٹھے کے ناشتے کی پذیرائی قائم رکھیں گی جس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں ''یہ سلسلے چاہتوں کے ہیں۔ ہر ایک کو یہ رہگزر نہیں ملتی۔''

اگلے دن ہفتہ تھا۔ عمران ہمیں ہوٹل سے دیوان اسٹریٹ لے گئے۔ سکوکی سے کچھ فاصلے پر یہ ایک انتہائی منظم خوب صورت ڈاؤن ٹاؤن کی طرز کا کمرشل علاقہ ہے۔ نہایت صاف ستھری خاصی لمبی سڑک ہے۔ دونوں جانب دور تک گراسری اسٹور، ہوٹل، بوتیک اور ضروریات کے مختلف اسٹور ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ زیادہ اسٹوروں کے مالک ہندوستانی اور پاکستانی ہیں۔ اسٹور ضرورت کی چیزوں سے بھرے پڑے ہیں۔ لگتا ہے شکاگو میں نہیں کراچی کے طارق روڈ پر یا حیدری میں گھوم رہے ہیں۔ یہاں لوگ اپنے ملک کے روایتی لباس میں چہل قدمی کرتے ہیں اردو زبان میں بات کرتے ہیں۔ گراسری

Downloaded From http://paksociety.com

کراتے ہیں۔ یہاں بھانت بھانت کی دکانیں، جنرل اسٹور، کپڑوں اور ساڑیوں کی دکانیں اور بیوٹی پارلر ہیں۔ یہاں لوگ رشتے داروں، دوستوں سے ملاقاتیں کراتے ہیں۔ مل جُل کر نہاری، کباب، بریانی حلیم کھاتے ہیں۔ یہاں اپنے دیس کی آئس کریم اور پان بھی ملتے ہیں۔ ایک دکان پر بڑا سا بورڈ کتاب گھر اردو میں لکھا ہے۔ اس دکان میں اردو کے ناول، افسانے، اخبار، رسالے اور ڈائجسٹ ملتے ہیں۔ کتاب گھر کی مالکہ سے میں نے اپنی کتاب ''سفرنامہ امریکا'' کے لیے بات کی جسے رکھنے کے لیے وہ بخوشی راضی ہوگئیں۔

کھانے پینے کے روایتی ہوٹل اتنا عمدہ اور مزیدار کھانا مہیا کرتے ہیں کہ نہ صرف شکاگو بلکہ دوسرے شہروں کے سیاح بھی کھنچے چلے آتے ہیں اور طہورا کی مٹھائی کا تو جواب نہیں۔ مسافر جاتے ہوئے اس سوغات کو لے جانا نہیں بھولتے۔

عمران ہمیں ہوٹل سے لے کر دیوان پہنچے۔ وہاں بھائی محسن، بھابی صاحبہ، کوکو، بچیوں اور آصف کے ہمراہ ہماری منتظر تھیں۔ ہم کو طہورا کے شاندار صاف ستھرے وسیع ریسٹورنٹ میں لے گئے جہاں گرم گرم حلوا پوری، بھاجی، سموسے اور مٹھائی بڑے اہتمام سے پیش کیے گئے۔ گھر سے ہزاروں میل دور شکاگو اور دیوان اسٹریٹ اور طہورا ریسٹورنٹ میں یہ حلوا پوری کا ناشتا معدے میں نہیں، دل میں گھر کر گیا۔ اتنا مزیدار ناشتا ہر جگہ ہر شہر میں ممکن نہیں۔ ہم نے خوب دل جمعی سے سیر ہو کر ناشتا کیا۔ دیوان اسٹریٹ جو ہماری زیب النساء اسٹریٹ جیسی ہے اس پر چہل قدمی کی۔ موسم موافق تھا، بہت محظوظ ہوئے اور گاڑیوں میں بیٹھ کر محسن بھائی کے گھر آ گئے۔ شام کو کوکو اور آصف میاں کے بیٹے کے عقیقہ کی تقریب تھی۔ لہٰذا ہم ہوٹل آ گئے۔ آرام کیا۔ نہائے دھوئے۔ تیار ہوئے۔ ساڑھے آٹھ بجے عمران آئے اور ہمیں گھر لے گئے۔

گھر کے باہر دو طرفہ بڑا کھلا گراسی فرنٹ یارڈ ہے۔ وہاں شامیانہ لگا دیا گیا۔ میزیں کرسیاں لگا دی گئیں۔ لائٹیں جلا دی گئیں۔ ماحول جگمگانے لگا۔ زرق برق لباسوں میں ملبوس مرد و خواتین رشتے داروں اور احباب کی آمد شروع ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے محسن بھائی کی سکوتی کی حویلی کے جنگل میں منگل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد کھانا لے کر محسن بھائی آ گئے۔ محسن بھائی کھانے کے شوقین ہیں اس سے بھی زیادہ کھلانے

ٹوٹم

بعض قدیم مذاہب میں ایک اور رجحان ٹوٹم ازم ہے۔ ٹوٹم ازم کو پہلی مرتبہ اٹھارہویں صدی کے سفید فام لوگوں نے شناخت کیا جب انہوں نے امریکی انڈین میں اس رجحان کو دیکھا۔ دنیا کے دیگر علاقوں کے قدیم معاشروں میں بھی ٹوٹم ازم کا رجحان پایا گیا۔ لفظ ٹوٹم اوجیبوا (امریکی انڈین باشندوں کی زبان) لفظ اوٹوٹیمن کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ ٹوٹم بدیہی طور پر اس تعلق پر مبنی ہے جو انسانوں اور دوسری مخلوقات یا فطرت کے مظاہر کے مابین موجود ہے۔ دراصل یہ ارواح پرستی کی توسیع اور اظہار ہے۔ عموماً اسے قبیلے یا ایک نسلی گروہ اور ایک حیوان کے درمیان شناخت کی کسی شکل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگرچہ دنیا کے کچھ حصوں میں ٹوٹم کو سیاروں سورج، چاند اور ستاروں سے شناخت کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک قبیلے کا خیال بنیادی طور پر ریچھ سے ہے۔ ریچھ کو شاید اس قبیلے کا جد امجد مانا جاتا ہے۔ اس قبیلے کے افراد کا اعتقاد ہے کہ موت کے بعد انہیں ریچھ کی شکل دے دی جائے گی۔ اگر ریچھ اس قبیلے کا ٹوٹم ہے اس لیے لوگ اسے اپنے دفاع یا نہایت مقدس مواقع کے سوا کھاتے اور نہ مارتے۔ ایک دوسرے قریبی قبیلے کے افراد جن کا ٹوٹم ہرن ہے ممکن ہے کہ وہ ریچھ کا شکار کرتے ہوں اور اسے کھاتے ہوں جب کہ پہلے قبیلے کے افراد ہرن کا شکار کھاتے ہوں۔ انتہائی ترقی یافتہ معاشروں میں جو اگرچہ واضح طور پر اور مذہبی لحاظ سے ٹوٹم ازم سے وابستہ نہیں مگر اس رسم کی یادگاریں باقی ہیں۔ اقوام کو حیوانات جیسے عقاب، ریچھ یا شیر کی علامات دی جاتی ہیں اور اسکول اپنی اتھلیٹک ٹیموں کے ولولے کی علامت کے طور پر مبارک نشان منتخب کرتے ہیں۔ کچھ نہایت ترقی یافتہ مذاہب میں اب بھی مقدس مواقع پر جانوروں کی قربانی دی جاتی ہے۔ وہ اپنی برادریوں کو باہم متحد کرنے اور قدیم اقرار ناموں کی تجدید کی خاطر مقدس جانور کا گوشت کھاتے ہیں۔

مرسلہ: زاہدہ نور، لاہور

Downloaded From http://paksociety.com

کے شوقین ہیں۔ اپنی نگرانی میں بہترین کھانا پکوا کر لائے تھے۔ محفل خوشیاں بکھیر رہی تھیں۔ جگ مگ کر رہی تھیں۔ محسن بھائی مہمانوں سے مل رہے تھے اور ہمیں ملوا رہے تھے اور مسرت ان کے چہرے پر جھل مل کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد کھانا شروع ہوا جس میں قورمہ تھا۔ بریانی تھی۔ فرائی مچھلی تھی اور بہت مزیدار پوڈنگ تھی جو خانہ ساز تھی۔

کھانے کے بعد محسن بھائی کے سمدھی معین صاحب، بٹ صاحب، داماد صاحبان اور محلے کے دوست مل کر بیٹھے۔ کراچی اور شکاگو کے موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے اپنی کتاب بٹ صاحب کو نذر کی۔ بہت خوشی سے قبول کی گئی۔ نظم سنی بہت داد دی۔ اتنی اچھی طبیعت کے لوگ اتنے ملنسار اتنے خوش مزاج لوگ کراچی سے ہزاروں میل دور شکاگو میں اکٹھے بیٹھے ہوئے خوش ہو رہے تھے۔ یہ نعمت ہے خدا کی۔

وقت ہوا کے ساتھ گزرنے لگا۔ رات بھیگنے لگی، ہواؤں میں خنکی آگئی۔ رات دو بجے ہم لوگ ہوٹل آگئے جب کہ محفل فجر تک چلتی رہی۔ محسن بھائی نے اپنے شہر دل کی روایات، اپنے رشتے داروں کی پذیرائی، دعوت و خدمت کو اس دور دراز شہر میں زندہ رکھا ہوا ہے۔ اتوار کو عمران ہمیں ہوٹل سے لے گئے جہاں سے ہم سب لوگ شکاگو ڈاؤن ٹاؤن گئے۔ شکاگو ڈاؤن ٹاؤن شہر کا ریزیڈینشل کم کمرشل ایریا ہے لیکن جس خوب صورتی سے اس کی تعمیر و آرائش زیبائش کی گئی ہے یہ ایک خاص تفریح گاہ بن گئی ہے اس جگہ آئے بغیر شکاگو کی سیاحت مکمل نہیں ہوتی۔ یہ عجوبہ روزگار علاقہ ہے جہاں سیکڑوں اسٹریٹس ہیں۔ بڑی چوڑی سڑکیں ہیں جن پر قائم ہزاروں آسمان کو چھوتی ہوئی اور خوب صورتی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر عمارتیں قائم ہیں۔ لیک شور سے شروع ہوئی اور مشی گن جھیل کے کنارے سڑک کے دوسری جانب میلوں دور تک ایسا سماں پیدا کرتی ہیں کہ سیاح عمارتوں، ہائی رائز، اسکائی اسکریپرز کے خوب صورت جنگل میں کھو جاتا ہے۔ یہاں آئے بغیر سیاحت ادھوری رہ جاتی ہے۔ لیک مشی گن ایسی طویل جھیل ہے جو دیکھنے میں دریا بلکہ سمندر لگتی ہے۔ یہ جھیل کینیڈا کے گلیشیر پگھلنے سے رواں ہوتی ہوئی کئی سو میل کا سفر کرتی ہوئی شکاگو پہنچتی ہے۔ کناروں پر سبزہ زار ہے۔ درختوں کی چھاؤں ہے۔ عظیم فش ایکوریم ہے۔ فیملیوں کے لیے ہاٹ پکنک پوائنٹس ہیں۔ جھیل میں

کشتی رانی ہے۔ دنیا بھر کے سیاح ہیں۔ ایسا ماحول آنکھوں کی روشنی دل کا سرور بڑھتا رہتا ہے۔ سبزے کے ساتھ چوڑا فٹ پاتھ ہے۔ پھر چوڑی چوڑی آنے جانے والی جھیل کے ساتھ ساتھ لہراتی بل کھاتی سڑکیں ہیں جن کے کنارے میل ہا میل تک خوب صورت عمارتیں، شاندار اسٹریٹس مالز کیفیز اور اسٹورز بنے ہوئے ہیں۔ یہ کمال یہاں کے عظیم آرکیٹیکچر کا ہے۔ جس محنت جس چاہت جس سرمائے سے اس عظیم ڈاؤن ٹاؤن کے لیے سروے کیا گیا بہترین ذمہ دارانہ پلاننگ کی گئی۔ پھر سڑکوں کا جال بچھایا گیا۔ سرمایہ کی بارش کی گئی اور ہزاروں ایکڑ زمین کے چپہ چپہ کو اس محبت سے بنایا سجایا گیا کہ یہ سیاحت کے خاصے کی چیز بن گیا۔ شہر شکاگو میں 1908ء میں آگ لگی تھی جس میں یہ شہر جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ تباہ ہو گیا تھا۔ لوگ بے گھر ہو گئے تھے۔ اس بربادی کے بعد اصل میں لوگوں کو آباد کرنے، کاروبار کرنے کے لیے اس شہر نو کی بنیاد رکھی گئی۔ گزشتہ دور میں عمارتیں اونچی نہیں تھیں۔ دفاتر اور دکانیں شوروم اسٹور اتنے بڑے معقول اور خوب صورت نہیں تھے لیکن یہاں کے رہنے والے بہت قابل سمجھ دار تھے۔ دل میں شہر کو بسانے سنوارنے اور لوگوں کو آباد کرنے کا جذبہ تھا۔ انہوں نے سوچا، غور کیا اور ایک بہترین شہر کی جو امریکا کے بیچ میں واقع تھا بنیاد ڈالی اور قدرتی جھیلوں کے کنارے اسے لوگوں کی سہولت کے لیے آباد کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اونچی اونچی بلڈنگیں بنائیں جن میں زیادہ سے زیادہ فلیٹوں کی گنجائش رکھی گئی تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ شہر کے بیچوں بیچ آباد ہو سکیں۔ بے شمار دفاتر، اسٹور، دکانیں، بلڈنگوں کی نچلی منزلوں پر بنائے گئے تاکہ رہائش اور کاروباری علاقوں میں فاصلہ کم سے کم رہے۔ لوگوں کے لیے کمیونیکیشن اور ٹرانسپورٹیشن کو آسان بنایا گیا۔ ٹرین سسٹم بنایا گیا۔ ریلوے ٹریک زمین پر اور اوور ہیڈ بنائے گئے۔ اسٹیشن اور پلیٹ فارم ڈاؤن ٹاؤن کے دل میں عمارتوں کے درمیان بنائے گئے۔ ٹرین کو چھوٹی گلیوں تک سے گزارا گیا تاکہ کم سے کم وقت میں کم سے کم کرائے میں زیادہ سے زیادہ لوگ سفر کر سکیں۔ غرض جیسے جیسے یہ ڈاؤن ٹاؤن سٹی بنتا چلا گیا آیندہ بنانے والے اس میں جدت، سہولت، خوب صورتی، آرائش، زیبائش کا اضافہ کرتے گئے۔ یہاں آسمان کو چھوتی ہوئی سیرز ٹاور ہے۔ اور دنیا کا مشہور ٹرمپ ٹاور بھی ہے۔ یہاں میلینیم ٹاور مال اور گارڈن ہے۔ یہاں عظیم الشان

Downloaded From http://paksociety.com

میوزیم ہیں۔ آرٹ گیلریز ہیں۔ یونیورسٹیاں ہیں، میوزیم ہیں۔ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے جیولری شوروم ہیں، کار شوروم ہیں۔ یہاں وہ کچھ ہے جو عام آدمی کی سوچ سے بالاتر ہے۔

یہاں سیاحوں کی دلچسپی دل بستگی کے لیے ہر سہولت، ہر شعبدہ، ہر کلب، سنیما اور ریسٹورنٹ موجود ہیں۔ عمارتیں قدیم بھی ہیں، جدید بھی ہیں۔ نوادرات بھی تاریخ بھی ہے۔ سڑکوں پر گاڑیوں کے اژدھام ہیں۔ سڑک سے دو منزلہ اوپر ٹرین سروس بھی ہے۔ ٹرین فاسٹ ہے۔ گلیوں محلوں سے لہراتی بل کھاتی گزرتی ہے۔ عمارتوں کے بیچ تنگ جگہوں سے گزرتی ہے۔ شیشے کھلے ہوں تو ہاتھ بالکونیوں تک پہنچ جائیں۔ لیک شور درمیان سے راستہ کاٹ کر گلیوں میں گھس جاتی ہے۔ جھیل کے کناروں پر نفیس عمارتوں کے درمیان بجرے کشتیاں تیرتی رہتی ہیں۔ شام کے سہانے موسم میں آبادی کے بیچوں بیچ کشتی رانی سیاحوں کو دیوانہ کر دیتی ہے۔ جھیلوں کے کنارے یہ سبزہ زار یہ فٹ پاتھ یہ سڑکیں اور ان کے کنارے اس انداز سے بلڈنگیں، ہائی رائز اور اسکائی اسکریپرز ڈیزائن کی گئیں، تعمیر کی گئیں کہ یہ مصور کے حسین و جمیل کینوس بنتے چلے گئے۔ امریکا اور ساری دنیا سے آنے والوں کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ اگر شکاگو ڈاؤن ٹاؤن نہ دیکھا تو کچھ بھی نہ دیکھا۔

پیر کا دن راشد رحیمی کے ساتھ گزارنے کا پروگرام تھا۔ لہٰذا صبح ناشتے کے بعد انہیں فون کر دیا۔ وہ ساڑھے گیارہ بجے دن ہلٹن ہوٹل آ گئے۔ مجھے اور نجمہ کو ساتھ لے کر روسیل میں اپنی رہائش گاہ لے گئے۔ روسیل سکوکی سے 30-35 میل دور مضافاتی علاقہ ہے۔ شہر سے دور ہونے کی وجہ سے کافی کھلا ہوا صاف ستھرا علاقہ ہے لیکن بہت خاموشی اور تنہائی سمیٹے ہوئے ہے۔ اس طرح مجھے درجن بھر قصبے گاؤں سڑکیں بازار دیکھنے کا موقع ملا۔ راستے میں مجھے خیال آیا کہ ارشد بھائی کے گھر کے لیے کیک لینا ہے۔ میں نے ان سے کہا۔ انہوں نے فری وے سے گاڑی باہر نکالی۔ یہ چھوٹی سی پولش بستی تھی۔ اس میں پولینڈ کے مشہور بیکرز اینڈ کنفیکشنرز کی دکان تھی۔ راشد بھائی واقف تھے کہ ان کے کیک دور دور تک مشہور تھے۔ میں نے ایک خوب صورت کیک پسند کیا جو 40 ڈالر کا تھا حالانکہ اتنا بڑا کیک 5-10 ڈالر میں بھی دستیاب تھا لیکن یہ لوگ بڑی محنت سے عمدہ اجزاء سے ایسی روایتی چیزیں پیش کرتے ہیں کہ لوگ یاد رکھتے ہیں۔ کیک ہمارے سامنے ہی تیار ہو رہے تھے۔ یہی لوگ بناتے ہیں یہی فروخت کرتے ہیں۔ ہم نے کیک پیک کرایا اور آگے روانہ ہو گئے۔ راشد بھائی کے گھر پہنچے تو بھابی سوشیلا صاحبہ، بہو وجیہہ سے ملے۔ یہ لوگ مل کر بہت خوش ہوئے۔ دو بجے راشد بھائی مسجد لے گئے۔ مسجد الہدیٰ راشد بھائی کے گھر سے تقریباً پانچ میل دور ہے لیکن بڑی کشادہ اور صاف ستھری ہے۔ نماز کے بعد ہم منتظمین سے ملے جو ہندوستانی مسلمان تھے۔ واپسی پر راشد بھائی ہمیں اپنے بڑے بیٹے عمر سے ملوانے کے لیے لے گئے۔ ان کا مکان اچھا کشادہ گھر کے قریب تھا مل کر بہت خوش ہوئے۔ ہم گھر آئے بھابی صاحبہ نے اچھی ڈشیں تیار کی ہوئی تھیں اور ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ ہم سب نے مل کر کھانا کھایا۔ کچھ دیر کراچی کے موضوع پر دہلی علیگڑھ کے عزیزوں پر گفتگو ہوتی رہی۔ راشد بھائی نے نظمیں سنائیں۔ اپنی کتاب کا تازہ ایڈیشن پیش کیا۔ راشد بھائی شکاگو کی ادبی محفلوں کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ راشد بھائی کا کلام موزوں ہے۔ رواں ہے۔ ان کے حالات کی ترجمانی بھی ہے۔ خاندانی نایاب و یادگار تصاویر نے کتاب کو سجا دیا ہے۔ راشد بھائی نے تازہ غزل سنائی۔ میں نے بھی کچھ سنایا پھر اوپر راشد بھائی کے کمرے میں جا کر آرام کیا۔ چھ بجے تک تیار ہو کر نیچے آئے، چائے پی۔ راشد بھائی اور بھابی کا اصرار تھا کہ رات رک جائیں لیکن اگلے دن ہماری واپسی تھی۔ تیاری کرنی تھی۔ صبح ہوٹل چھوڑنا تھا لہٰذا راشد بھائی اور بھابی سوشیلا خوشی خوشی ہمیں ہوٹل چھوڑ گئے۔

منگل گیارہ بجے تک ہم نے ہوٹل چھوڑ دیا۔ عمران ہمیں گھر لے گئے۔ وہاں ہم سب سے ملے اور رخصتی کے موقع پر مجھے دہلی علیگڑھ یاد آ گیا۔ ہر دل موم تھا۔ ہر آنکھ میں آنسو تھے۔ سب سے زیادہ رنجیدہ کوثمی اور بچیاں بھی سہمی سہمی سی تھیں۔ عمران کو دیر سے جدا ہونے کا غم تھا۔ آصف میاں ہمیں چھوڑنے اس طرح آئے کہ پہلے دیوان کا چکر لگایا۔ پھر ڈاؤن ٹاؤن لیک شور کے کنارے کنارے مڈویسٹ کے قریب تک گئے۔ آخری مرتبہ شہر کی سیر بھی ہو گئی اور ہم ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ رات جب اوک لینڈ ائرپورٹ پہنچے تو فیصل راحت نے ہمارا استقبال کیا اور ہم ڈبلن پہنچ گئے۔

Downloaded From http://paksociety.com

سچا لیڈر

عبداللہ احمد حسن

وہ قوم ترقی کا معراج پالیتی ہے جسے ایک اچھا رہنما مل جائے۔ اس انتہائی پسماندہ ملک کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا شہزادہ ملک و قوم سے مخلص تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعدجب وہ اقتدار میں آیا تو اس نے اپنے ملک میں ترقی کے دروازے کھول دیئے۔ نتیجتاً ملک اب ترقی کی مثال بن چکا ہے۔

ایک شہزادے کی سعی مسلسل کا ذکر خاص

1970 سے قبل اگر کوئی کہتا تھا کہ ”میں مسقط جارہا ہوں۔“ تو سننے والا کہتا۔ ”موسکو رشیا جارہے ہو؟“

”نہیں نہیں بھئی عمان جارہا ہوں۔“

”اوہ سمجھا عمان، اردن جارہے ہو۔“

”ارے بھئی میں سلطنت مسقط وعمان جارہا ہوں۔“

”کیا؟ یہ کہاں واقع ہے؟“

یہ اس دور کا مکالمہ ہے جب عمان کا نام اتنا مشہور نہیں تھا یہ ایک چھوٹا سا غیر ترقی یافتہ ملک تھا۔

سلطنت عمان کو اردو میں عام طور پر سلطنت اومان لکھا جاتا ہے۔ یہ ملک ایک جزیرہ نما ہے، اس کا رقبہ تقریباً تین لاکھ نو ہزار پانچ سو کلو میٹر ہے۔ آبادی اس وقت پانچ لاکھ کے قریب تھی۔ اس جزیرہ نما کو ایک طرف سے عربین گلف نے جبکہ دوسری طرف سے بحیرہ عرب نے گھیر رکھا ہے۔ ساحلوں کی کل طوالت تقریباً تین ہزار ایک سو پینسٹھ کلو میٹر ہے۔ ایک طرف عمان کی سرحدیں متحدہ عرب امارات سے ملتی ہیں جن کی طوالت چار سو دس کلو میٹر ہے دوسری طرف یمن سے ملتی ہیں جن کی طوالت دو سو اٹھاسی کلو میٹر ہے۔ درمیان میں ایک پُر خطر ریگستان ہے جو ربع الخالی کے نام سے مشہور ہے جس کا سیدھا ترجمہ چوتھائی خالی ہوتا ہے۔ یہ ریگستان عمان اور سعودی عربیہ کے درمیان ہے۔ (اب یہاں سے ایک سڑک نکالی گئی ہے جو عمان سے براہِ راست سعودیہ جاتی ہے۔ اس سے مکہ تک کا فاصلہ جو ابھی امارات سے گھوم کر تقریباً دو ہزار چھ سو کلو میٹر بنتا ہے صرف ایک ہزار سات سو کلو میٹر رہ جائے گا) سعودی سرحد کی طوالت چھ سو چھہتر کلو میٹر ہے جس میں یہ ریگستان اور کچھ پہاڑی علاقہ شامل ہے۔

سلطنت عمان پر خاندان آل سعید کی حکمرانی 1744 میں شروع ہوئی بعد ازاں اس سلطنت میں زنجبار کے علاوہ افریقا کے کچھ علاقے، گوادر (جو بعد ازاں پاکستان کو فروخت کردیا گیا) اور بندر عباس وغیرہ بھی شامل ہوگئے تھے۔ اس وقت یہ سلطنت مسقط، عمان وزنجبار کہلاتی تھی۔ 1864 میں سلطان کے انتقال کے بعد ان کے دو بیٹوں نے ملک کو تقسیم کر لیا ایک نے سلطنت زنجبار کے نام سے افریقا کے ساحل پر حکمرانی کی دوسرے نے اپنے آبائی علاقے پر سلطنت مسقط و عمان کے نام سے حکومت کی۔ سلطنت زنجبار کا 1964 میں ایک خونی انقلاب کے بعد خاتمہ ہوگیا اور زنجبار کو ٹانگانیکا میں شامل کردیا گیا جو اب تنزانیہ کہلاتا ہے۔

18 نومبر 1940 کے دن اس وقت کے سلطان مسقط وعمان سعید بن تیمور کے ہاں ایک بیٹے کی پیدائش ہوئی جس کا نام قابوس رکھا گیا۔ وہ چھ سال کی عمر کو پہنچے تو ان کی ابتدائی تعلیم کا انتظام صلالہ میں کیا گیا۔ ان کے دو اساتذہ میں سے ایک استاد حسن الجمالی تھے جو محل کے عملے سے تعلق رکھتے تھے جبکہ دوسرے استاد ابراہیم الحکیم تھے۔ سلطان سعید بن تیمور کی خواہش تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو تعلیم کے لیے بیرون ملک بھیجیں مگر ان کی کم عمری کی وجہ سے اس پروگرام کو مؤخر کردیا گیا۔ اس وقت پورے ملک میں صرف تین اسکول تھے اور آبادی تقریباً پانچ لاکھ تھی۔ سلطان سعید نے مدرسۃ السعیدیہ کے ہیڈ ماسٹر حسن بن سالم الغسانی سے کہا کہ آپ کو مستقبل کے سلطان کو تعلیم دینی ہے، استاد الغسانی اپنے پیشہ ورانہ فرائض کے ساتھ ننھے شاگرد کی تعلیم و تربیت کے لیے طریقہ و نصاب مرتب کیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

ابتداء قرآن پاک سے ہوئی جس میں عربی حروف تہجی سے شناسائی بھی ہوگئی لکھنا پڑھنا آ گیا۔

قابوس بن سعید بچپن سے ہی ایک ذہین طالب علم تھے اس کے علاوہ انہیں گھڑ سواری کا بھی شوق تھا۔ وہ بہت کم عمر میں ہی ایک بہترین شہسوار بن چکے تھے، یہ شوق وقت کے ساتھ پروان چڑھتا رہا اور آج بھی برقرار ہے۔ استاد الغسانی نے اپنی ذمہ داری 1958 تک نبھائی جس کے بعد وہ برطانیہ روانہ ہوگئے وہاں ایک نجی ادارے سوفوک سے انہوں نے دو سال تک تعلیم حاصل کی۔ 1960 میں انہوں نے رائل ملٹری اکیڈمی سندھرسٹ میں آفیسر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی۔ یہاں انہوں نے دو سال تک حربی سائنس اور فن حرب کی تربیت حاصل کی، اس کے بعد عملی تجربہ حاصل کرنے کے لیے برٹش انفنٹری بٹالین میں شامل ہو کر مغربی جرمنی میں تعینات رہے۔

فوجی تعلیم کی تکمیل اور عملی تجربہ حاصل کرنے کے بعد وہ برطانیہ واپس آئے۔

یہاں سلطان قابوس نے ایک سال تک لوکل گورنمنٹ سسٹم کا مطالعہ کیا اور مینجمنٹ سے متعلق کچھ خصوصی کورسز کیے۔

اب وہ ہر طرح سے تیار ہو چکے تھے اس موقع پر ان کے والد صاحب نے ان کو تین مہینے تک دنیا کی سیر کی اجازت دی۔ جس کے بعد وہ 1964 میں وطن واپس پہنچے۔ اس دوران ترقی یافتہ ممالک میں وقت گزار کر ان کو یہ خیال ستانے لگا کہ آخر ہمارا ملک ان سے پیچھے کیوں ہے۔ ہمارے لوگوں کو وہ ساری سہولیات کیوں میسر نہیں جو دنیا کے دیگر ممالک کے لوگوں کو حاصل ہیں، اب ان کے اندر یہ جذبہ پروان چڑھنے لگا، انہوں نے اپنے آپ سے ایک وعدہ کیا کہ جب میں پاور میں آؤں گا تو اپنے ملک کو ان ممالک کے برابر لا کھڑا کروں گا۔ ہمارے لوگ بھی دستیاب سہولیات سے فائدہ اٹھائیں گے اور تعلیم حاصل کریں گے۔

سلطان قابوس کو تاریخ، ادب اور شاعری سے بھی بہت لگاؤ ہے اس کے علاوہ وہ آرٹ کے بھی بہت بڑے قدر دان ہیں۔ وہ مطالعہ کے شوقین ہیں اس لیے اپنی ایک ذاتی لائبریری بھی بنائی ہے۔

وطن واپسی کے بعد انہوں نے شیخ ابراہیم بن سیف الکندی سے رابطہ کیا اور ان کی نگرانی میں دین اور فقہ کا گہرا مطالعہ کیا۔

ان کا پرانا شوق برقرار تھا اس لیے وہ دن کا آغاز گھڑ سواری سے کرتے تھے اور ہمیشہ بہترین گھوڑے کا انتخاب کرتے تھے۔ اس کے بعد تعلیم مطالعہ اور دیگر مصروفیات چلتی رہتی تھیں۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

عمان کی بندرگاہیں صدیوں سے خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔ بابل، مصر، ہندوستان، افریقی ممالک یہاں تک کہ مشرق بعید کے تجارتی جہاز بھی یہاں سے ہوکر گزرتے تھے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے بھی اپنے سفرنامے میں عمان کا ذکر کیا ہے۔

عمان کی بندرگاہیں دسویں صدی میں اور زیادہ مشہور اور فعال ہوئیں، وہاں سے تجارتی جہازوں نے دور دراز کے سفر شروع کیے۔ وہ چین تک بھی پہنچے۔ بعد میں کچھ تعطل آ گیا لیکن اٹھارویں صدی میں سید سلطان بن احمد کے دور میں بحری تجارت پر خصوصی توجہ دی گئی اور جہازوں کی تعداد میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا، اس کے بعد جب سلطان قابوس بن سعید نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی تو انہوں نے دیگر شعبوں کے علاوہ اس طرف بھی خصوصی توجہ دی اور ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ پہلے ایک بندرگاہ ''میناء قابوس'' جو مطرح میں واقع ہے، سے ساری سروسز دی جاتی تھی، یہاں پسنجر جہاز اور کارگو ساری ہی سروسز فراہم کی جاتی تھیں مگر اب اس کو سیاحتی مقصد کے تحت کروز شپس کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ جبکہ سامان کی ترسیل کے لیے ایک نئی صحار پورٹ بنائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک بندرگاہ میناء الفحل ہے جہاں سے پیٹرول کی ترسیل کی جاتی ہے۔ ایک اور بڑی بندرگاہ دقم کے مقام پر بنائی گئی ہے جو کارگو کی ترسیل کے لیے ہے۔ میناء قابوس، میناء صحار اور میناء الفحل خلیج میں واقع ہیں جبکہ دقم بحر ہند میں ہے اس کے علاوہ بحر ہند میں ایک اور پرانی بندرگاہ صلالہ پورٹ ملک کے جنوبی حصے میں واقع ہے۔ یہ کروز شپس اور کارگو کی ترسیل دونوں مقاصد کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اب مزید نو چھوٹی بڑی بندرگاہوں کے منصوبے چل رہے ہیں جن میں سے کچھ پر کافی حد تک کام بھی ہو چکا ہے۔

صلالہ شہر ولائت ظفار میں ہے، مسقط سے اس کا فاصلہ ایک ہزار کلومیٹر ہے۔ یہاں کا موسم مسقط سے بالکل مختلف ہے۔ مسقط میں شدید گرمی پڑتی ہے، بارشیں کم ہوتی ہیں اور پہاڑ چٹیل ہیں جبکہ صلالہ میں گرمی کم پڑتی ہے، بارش ہمیشہ ہوتی رہتی ہے اور پہاڑ سوئٹزر لینڈ کی طرح سر سبز ہیں، ائرکنڈیشنڈ وغیرہ کی سہولیات سے پہلے یہ گرمائی دارالسلطنت تھا۔ صلالہ ایک تاریخی مقام بھی ہے یہاں ایک پہاڑ پر ایک قبر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ

ان کا ایک اور شوق ڈرائیونگ ہے وہ زیادہ تر اپنی گاڑی خود ہی ڈرائیو کرتے ہیں، سلطان بننے کے بعد بھی یہ عادت برقرار رہی۔

وقت کے ساتھ ساتھ ان کی خوبیاں سامنے آتی جا رہی تھیں ان کا حسن اخلاق نرم گفتاری و نرم خوئی ہر ایک کو گرویدہ بنا لیتی تھی۔ انہیں خود سے کیا ہوا وعدہ اچھی طرح یاد تھا اس لیے انہوں نے خود کو ایک حکمران سمجھنے کی بجائے ایک نگراں سمجھا۔ سلطان کے بجائے ایک شفیق باپ کی طرح قوم کو دیکھا اور ان پر حکومت کرنے کی بجائے ان کی خدمت کی اور اپنے سارے خواب پورے کیے۔

ایک بار ایک پریس ریلیز میں انہوں نے فرمایا کہ میرے والد محترم نے مجھے باصرار اس طرف متوجہ کیا کہ میں دین کا مطالعہ کروں اور ساتھ ہی ساتھ تاریخ اور عمان کی ثقافت کا بھی مطالعہ کروں، اس چیز نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا، اس سے نہ صرف یہ کہ میری سمجھ بوجھ میں اضافہ ہوا بلکہ میں اپنی ان ذمہ داریوں سے بھی پوری طرح آگاہ ہوا جو میرے لوگوں، انسانیت اور عمومی مسائل سے متعلق تھیں۔ اس کے علاوہ مغربی تعلیم نے بھی مجھے بہت فائدہ پہنچایا، میں نے عسکری تعلیم اور عملی تجربہ حاصل کیا، اس کے علاوہ میں نے دنیا بھر کے ماہرین سیاست و فلسفہ کا مطالعہ کیا اور ان کی کتابوں سے استفادہ کیا۔

وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال لیڈر بن کر ابھرے، ایسا لیڈر جس کے دل میں اس کی قوم کا حقیقی درد ہو جو اپنے لوگوں کے لیے کچھ کر گزرنا چاہتا ہو۔

بالآخر 23 جولائی 1970 کی تاریخ آئی جب قابوس بن سعید نے سلطان کی حیثیت سے حلف اٹھایا اور اپنی پہلی ہی تقریر میں لوگوں کو ایک نئے اور روشن عہد کی نوید سنائی۔ انہوں نے ملک کا نام سلطنت مسقط و عمان سے بدل کر سلطنت عمان کر دیا اس وقت عمان کا جھنڈا پورا سرخ رنگ کا تھا۔ انہوں نے جھنڈے میں بھی اصلاح کی اور نیا جھنڈا متعارف کروایا جس میں ڈنڈے کے ساتھ ایک عمودی سرخ لکیر ہے جس پر اوپر سرکاری نشان خنجر بنا ہوا ہے (یہ ایک خنجر اور پیچھے دو تلواروں پر مشتمل ہوتا ہے جو کراس ہوتی ہیں) ساتھ تین افقی لکیریں ہوتی ہیں اوپر سفید جو امن کی علامت ہے درمیان میں سرخ، سرخ رنگ جو خطے کے بیشتر جھنڈوں میں شامل ہے اور نیچے سبز جو ہریالی و شادابی کی علامت ہے۔

اب ان کا اصل امتحان شروع ہوا تھا۔ اب تک جوان

Downloaded From http://paksociety.com

حضرت ایوبؑ کی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور قبر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ نبی عمرانؑ کی قبر ہے ان کا ذکر قرآن پاک میں نہیں ہے مگر مقامی افراد کا یہی ماننا ہے۔ اس قبر کی طوالت تقریباً ایک سو پچاس فٹ ہے، مگر کہیں یہ مت سمجھ لیجیے گا کہ ان کا قد اتنا لمبا تھا، اصل میں لوگوں کو یہ پتا تھا کہ قبر اس حصے میں ہے مگر پکی نشاندہی نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے احتیاطاً اس پوری زمین پر قبر بنا دی جس پر شبہ تھا یوں اتنی لمبی قبر تیار ہوگئی۔ (جب بھی آپ کوئی ایسی لمبی قبر دیکھیں تو سمجھ لیں کہ یہی فارمولہ استعمال کیا گیا ہے، مثال کے طور پر ایک چھ فٹ لمبا آدمی اگر دبلا پتلا ہو تب بھی وہ ڈھائی فٹ چوڑا تو ہوگا ہی، اب آپ ان قبروں کو دیکھیں کیا ان کی چوڑائی ان کی لمبائی کے مطابق ہے؟ اگر نہیں تو سمجھ لیجیے کہ صاحب قبر کا قد لمبا نہیں تھا بلکہ قبر بنانے والوں نے پوری زمین جس پر شبہ تھا کہ قبر یہاں ہوگی پر قبر بنا دی ہے)۔ صلالہ سے دو سو کلو میٹر کے فاصلے پر ریگستان میں او بار شہر کے کھنڈرات ہیں۔ یہ قوم عاد کا شہر تھا جس پر اللہ کا عذاب نازل ہوا تھا۔ ان کھنڈرات کی بازیابی کی کہانی سرگزشت میں چھپ چکی ہے۔ ایک سڑک ہے جسے زیرو گریوٹی مقام کہا جاتا ہے اس سڑک پر اگر آپ گاڑی روک کر گیئر سے نکال دیں، ہینڈ بریک نیچے کر دیں تو گاڑی ڈھلوان نہ ہونے کے باوجود بھی چالیس کلو میٹر کی رفتار سے چلنے لگتی ہے۔ اور بھی کئی مقامات یہاں ہیں جو سیاحوں کو کھینچ کر لاتے ہیں۔ عمان کی آمدنی کا خاص ذریعہ تو پیٹرول ہی ہے مگر اب حکومت کوشش کر رہی ہے کہ پیٹرول پر انحصار کم کیا جائے اس لیے انڈسٹریز کے قیام پر توجہ دی جا رہی ہے اور خاص کر سیاحت کے شعبہ کو خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ مغربی سیاحوں کے لیے یہاں بہت کچھ ہے قدرتی مناظر، صاف ستھرے ساحل، خوش اخلاق لوگ اور حکومت کی طرف سے مکمل سہولیات ایک سیاح کو اور کیا چاہیے؟

مسقط میں جہاں شدید گرمی پڑتی ہے وہاں ایک پہاڑ ہے جسے جبل الاخضر یعنی سبز پہاڑ کہا جاتا ہے۔ اس کے برابر میں ہی جبل الشمس بھی ہے ان پہاڑوں پر سردیوں میں برف باری بھی ہوتی ہے۔

کے ذہن میں تھا اسے عملی جامہ پہنانا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی توجہ انہوں نے اسکولوں کے پھیلاؤ اور سڑکوں کا جال بچھانے پر دی۔ انہوں نے خود ان معاملات کی نگرانی کی۔ ان کی ذاتی دلچسپی اور توجہ کی وجہ سے کام غیر معمولی تیزی سے ہوا۔ اگلے مرحلے میں بجلی کی بلاتعطل فراہمی پر توجہ دی، نئے پاور ہاؤس بنوائے۔ عمان میں پانی کی کمی ہے سنہ ستر سے پہلے رات کو چند گھنٹے کے لیے لائنوں میں پانی چھوڑا جاتا تھا جسے لوگ مختلف برتنوں میں بھر کر رکھ لیتے تھے جو دوسرے دن خاصی احتیاط سے استعمال کرتے تھے، اس کے لیے سمندری پانی کو میٹھا کرنے کا پلانٹ لگایا گیا جس سے پانی کی کمی کی شکایت دور ہوگئی اور چوبیس گھنٹے لوگوں کو میٹھا پانی ملنے لگا۔

شہروں میں سہولیات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ خوشنما مناظر کے ذریعے شہروں کو خوبصورت بنایا گیا۔ سلطان قابوس بن سعید نے خود اسکولوں کے دورے کیے اور اپنی تقاریر کے ذریعے لوگوں پر تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا، انہوں نے نہ صرف یہ کہ عوام سے بچوں کو اسکول بھیجنے کی درخواست کی بلکہ بڑی عمر کے لوگوں سے بھی کہا کہ آپ لوگ بھی پڑھیں، تعلیم بالغان کے لیے انہوں نے یہ انتظام کیا کہ اسکولوں میں صبح بچے پڑھیں اور شام کو بڑے تعلیم حاصل کریں۔ لوگوں پر ان اقدامات کا ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے جوق در جوق بچوں کو اسکول میں داخل کروانا شروع کر دیا، اس کے علاوہ بڑے لوگوں جن میں خاصی بڑی عمر کے بوڑھے افراد بھی شامل تھے نے شام کے اسکولوں سے استفادہ کرنا شروع کر دیا۔ اگلے تین سال کے اندر اندر چھوٹے سے ہوائی اڈے کی جگہ شہر سے کچھ فاصلے پر نیا اور جدید ہوائی اڈا بنوایا جو اس مختصر عرصے میں بن کر کام بھی کرنے لگا۔ اب سب کچھ سیٹ ہو رہا تھا، سلطان قابوس نے بیرونی دنیا سے بھی نئے سرے سے تعلقات استوار کیے۔ اس دوران پاکستان میں اس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اسلامی سربراہی کانفرنس بلوائی تو سلطان قابوس نے بھی اس میں شرکت کی۔ ان کی رہائش کا انتظام معروف اداکار محمد علی صاحب کے گھر میں کیا گیا تھا۔

اب اگلے مرحلے میں سلطان قابوس نے سڑکوں کے ذریعے پورے ملک کو مربوط کرنے کی کوشش شروع کر دی، ان کا خواب تھا کہ ملک کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا گاؤں بھی ایسا نہ ہو جہاں تک بنیادی سہولیات نہ پہنچی ہوں۔ پہلے سڑکوں کے ذریعے ہر علاقے اور گاؤں کو چاہے وہ کتنا ہی اندر کیوں نہ ہو ملا دیا جائے۔ پھر ہر علاقے میں اسکول قائم کیے۔ بنیادی صحت کی

Downloaded From http://paksociety.com

سہولیات بہم پہنچائیں، مساجد بنوائیں۔ ہر شہر اور گاؤں تک بجلی پانی اور ٹیلیفون کی سہولیات پہنچائیں۔ سلطان قابوس نے انتھک اور بھرپور خلوص کے ساتھ کام کیا، جس کا مثبت نتیجہ نکلا اور ہر میدان میں ترقی کا سفر تیزی سے شروع ہوگیا۔ مسقط سے دبئی تک پہلے جو سڑک پہنچائی گئی وہ سنگل تھی پھر رفتہ رفتہ اسے ڈبل بنا دیا گیا پھر اسٹریٹ لائٹس لگائی گئیں۔ اسی طرح دوسرے علاقوں میں بھی کیا گیا۔ مختلف علاقوں میں طبی مراکز قائم کیے گئے ان کے علاوہ بڑے بڑے سرکاری اسپتال بنائے گئے جہاں ہر قسم کی طبی سہولیات مفت مہیا کی جاتی ہیں جس میں ہر قسم کے ٹیسٹ، ایکسریز، الٹرا ساؤنڈ اور دوائیں وغیرہ شامل ہیں۔

1976 میں عمان کلر ٹیلیوژن قائم کیا گیا جس کے لیے ابتدائی طور پر بیرونی ماہرین سے مدد لی گئی یہاں تک کہ پہلے اناؤنسر اور نیوز ریڈر بھی مصر سے منگوائے گئے مگر وقت کے ساتھ ساتھ عمانی لوگ بھی تعلیم اور ٹریننگ کے ذریعے اس شعبے میں داخل ہوگئے اب تقریباً پچانوے فیصد سے زیادہ مقامی لوگ تین سرکاری اور ایک نجی چینل چلا رہے ہیں۔ 1975 میں عمان کے پہلے اخبار کا اجراء ہوا جو انگریزی زبان کا ہفت روزہ تھا، ازاں بعد اسے روزنامہ بنا دیا گیا، رفتہ رفتہ دوسرے عربی اور انگریزی اخبار بھی آگئے جن میں روزنامے بھی ہیں اور ہفت روزہ اور ماہانہ رسالے بھی ہیں۔ ان کو بھی مقامی لوگ ہی چلا رہے ہیں ساتھ ہی ہندوستانی اور پاکستانی اسٹاف بھی ان کے شانہ بہ شانہ کام کر رہا ہے۔

سلطان قابوس بن سعید نے پہلے دن سے ہی اپنی خارجہ پالیسی ایسی مرتب کی کہ سب کے ساتھ امن و آشتی سے رہنا ہے۔ کسی سے دشمنی نہیں رکھنی اور ہر معاملے میں اپنی غیر جانبداری برقرار رکھنی ہے۔ اس کا مثبت نتیجہ نکلا اور سلطنت عمان ایک امن پسند اور غیر جانبدار ملک کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ سلطان نے یمن اور امارات کے ساتھ بارڈر کے معاملے کو خوش اسلوبی سے نمٹایا اور بغیر جنگ کے کامیاب مذاکرات کر کے ان مسائل کو حل کیا۔

اسکول پہلی کلاس سے بالکل مفت ہے کتابیں بھی حکومت دیتی ہے۔ گورنمنٹ کالج میں بھی پڑھائی مفت ہے، کتابیں مفت ملتی ہیں اس کے علاوہ کالج میں پڑھنے والوں کو ہر ماہ حکومت کی طرف سے اچھی رقم بھی وظیفے کے طور پر ملتی ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی بہت اچھے نمبر لیتا ہے تو اس کو بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجا جاتا ہے جس کا پورا خرچا حکومت اٹھاتی ہے اور طالب علم کو ماہانہ وظیفہ بھی دیا جاتا ہے۔ 1986 میں سلطان قابوس یونیورسٹی بنائی گئی جو اس وقت خلیج کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی۔ آج یہ ایک بڑا نام ہے اس سے پی ایچ ڈی بھی کی جارہی ہے۔

اس طرح وہ ملک جسے سنہ ستر سے پہلے کوئی جانتا نہیں تھا آج دنیا بھر میں مشہور ہو چکا ہے۔ جہاں کچی سڑکوں پر لینڈ روور راچھلتی کودتی دوڑتی تھیں وہاں آج تقریباً 62000 کلومیٹر سے زائد سڑکیں ہیں جن پر گاڑیاں روانی سے گویا تیرتی پھرتی ہیں۔ جہاں صرف تین اسکول تھے اور کچھ اساتذہ پرائیویٹ علم بانٹ رہے تھے طلبا کی تعداد نوسو کے قریب تھی، آج وہاں ایک ہزار سے زائد گورنمنٹ اسکولوں میں باون ہزار سے زائد طلبا تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ پرائیویٹ اسکول اور طلبا اس کے علاوہ ہیں۔ تیس سے زائد گورنمنٹ اور پرائیویٹ کالج اور یونیورسٹیز کام کر رہی ہیں۔ سنہ ستر سے پہلے جہاں پانچ لاکھ کی آبادی میں گنے چنے لوگ پڑھے لکھے تھے وہاں آج قریب تینتیس لاکھ کی آبادی میں خواندگی کا تناسب پچانوے (95) فیصد ہے۔

حالیہ سروے سے پتا چلا ہے کہ پورے خلیج میں سب سے زیادہ اچھے لوگ عمان کے ہیں ان کا رویہ سب سے دوستانہ ہوتا ہے۔ یہاں کے چمکتے صاف شفاف ساحل اور قدرتی نظارے خصوصاً مغربی ممالک کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں یوں ہر سال بیشمار سیاح یہاں کا رخ کرتے ہیں اور اپنے ساتھ ایک خوبصورت سفر کی خوشگوار یادیں لے جاتے ہیں۔

اب ہر شعبے میں مقامی لوگ کام کر رہے ہیں، ان کے لیے نصابی تعلیم کے علاوہ جن کو دلچسپی ہو ان کے لیے ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ بھی ہیں اس میں بھی سرکاری ادارے اپنے یہاں مفت ٹریننگ دیتے ہیں۔

سلطان قابوس بن سعید نے اپنا خواب اور اپنا وعدہ کامیابی سے پورا کر دکھایا، اور یہ سب صرف پینتیس سال کے مختصر عرصے میں کیا۔ ان کی ان خدمات کی وجہ سے عوام انہیں بہت چاہتے ہیں اور اب انہیں سلطان کے بجائے بابا قابوس کے نام سے پکارتے ہیں، یہ وہ پیار ہے جو عوام اپنے مخلص لیڈر سے کرتے ہیں۔ سلطان قابوس بن سعید حفظہ اللہ آج اس عمر میں بھی اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔

اگر کسی کو سچا لیڈر، اصل رہنما دیکھنا ہو جس نے انتہائی مختصر وقت میں اپنے ملک اور قوم کی حالت مکمل طور پر بدل دی ہو تو وہ سلطان قابوس بن سعید حفظہ اللہ کو دیکھے۔

www.paksociety.com

فلم نگری

بے چارہ

انور فرہاد

اس نے آواز کے جادو سے پاکستانی فلموں کو چار چاند لگائے لیکن مقام عبرت ہے کہ اس جیسے فنکار کی ہم نے قدر نہ کی۔ قسمت کا وار وہ بار بار سہتا رہا لیکن ہم نے مڑ کر بھی اس کی جانب نہ دیکھا۔

ایک معروف گلوکار کی زندگی پر طائرانہ نظر

”یہ کس کی آواز ہے؟ کون گنگنا رہا ہے؟“

”تمہارے لاڈلے کے علاوہ اور کس کی آواز ہو سکتی ہے۔“

کمرے میں جا کر پوچھا گیا۔ ”آپ کیا کر رہے ہیں بیٹے؟“

”جی...... کچھ نہیں۔“

”نہیں...... کچھ تو کر رہے تھے۔“

بچے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From http://paksociety.com

"تم گا رہے تھے...... گنگنا رہے تھے۔"
"جی ہاں...... جی نہیں......" بچے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کہے۔
"اچھے بچے فضول کام میں وقت برباد نہیں کرتے۔ اپنا وقت پڑھنے میں صرف کرتے ہیں۔ آپ اچھے بچے ہیں نا؟"
"جی ہاں...... جی ہاں......"
"آپ کو لکھ پڑھ کر بڑا آدمی بننا ہے نا؟"
"جی ہاں۔"
"تو پھر اپنے سارے وقت میں اچھے کام کریں۔ لکھیں پڑھیں اور کھیلنے کے وقت کھیلیں۔"
اب منے میاں بھی کیا کرتے۔ پڑھتے لکھتے تو تھے مگر ان کا جی گانے اور گنگنانے کو بھی چاہتا تھا۔ اس لیے جب ان کے اردگرد کوئی نہیں ہوتا تو گنگنانے لگتے۔
پھر جب ذرا اور بڑے ہوئے تو خود گنگنانے کے ساتھ دوسروں کے گائے ہوئے گانے سننے کا شوق بھی پیدا ہوا۔ اب وہ چھپ چھپ کر ریڈیو سے بجنے والے گانے بھی سننے لگے۔ کبھی کبھار مما انہیں گانا سنتے اور سر دھنتے دیکھ لیتیں تو پیار سے سمجھاتیں۔
"تمہارے پپا کو معلوم ہو گیا تو......"
"میری کھال ادھیڑ کر رکھ دیں گے مگر انہیں تب معلوم ہوگا نا جب انہیں آپ بتائیں گی۔"
"چلو...... میں نہیں بتاؤں گی مگر تم وعدہ کرو کہ ان فضولیات میں وقت ضائع کرنے کی بجائے لکھنے پڑھنے پر زیادہ توجہ دو گے۔"
"وعدہ۔"
اور اس نے واقعی زیادہ محنت اور لگن کے ساتھ اپنی تعلیم پر توجہ دینا شروع کر دی مگر وہ جو کہا ہے سیانوں نے کہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ تو لکھنے پڑھنے میں زیادہ توجہ دینے کے ساتھ ساتھ گانا سننے اور گانے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ کوئی بھی عادت جلدی نہیں چھوٹتی۔
اب وہ اپنے اسکول کا ایک اچھا طالب علم تھا۔ امتحان میں اس کے نمبر بہت اچھے آتے تھے۔ انہی دنوں کی بات ہے۔ یوم اقبال کے موقع پر اس کے اسکول میں ایک تقریب ہوئی تو اس میں اس نے بھی حصہ لیا۔ کلام اقبال سنایا تو اسے بہت پسند کیا گیا۔ اس کی آواز اور گانے کا انداز اتنا اچھا تھا کہ تمام حاضرین اور اساتذہ نے اس کی بڑی تعریف کی اور جب انعامات کا اعلان ہوا تو کلام اقبال سنانے اور گانے کا بہترین انعام کے لیے نام پکارا گیا۔
"آرتھر نیر کو اس کی بہترین آواز اور گانے کے انداز پر پہلا انعام دیا جاتا ہے۔"
وہ اپنا نام سن کر اس قدر حیران ہوا کہ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے جو سنا ہے وہ درست ہے یا غلط۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اس کے ساتھیوں نے اس سے کہا۔ "جاؤ اسٹیج پر جا کر اپنا انعام لو۔"
اب جب بھی اسکول میں کوئی پروگرام ہوتا آرتھر نیر سے کچھ نہ کچھ ضرور پرفارم کرایا جاتا۔ کوئی نظم...... گیت...... یا غزل اس سے گوایا جاتا۔
اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ کانوں میں رس گھولتی ہوئی دلوں میں اتر جاتی تھی۔ اس کے سنگی ساتھی اکثر اس سے فرصت کے لمحات میں کچھ سنانے کی فرمائش کرتے۔ یہ سب اسے بڑا اچھا لگتا تھا۔
"کیا میں واقعی اچھا گاتا ہوں؟" وہ اپنے آپ سے سوال کرتا۔ پھر خود ہی جواب دیتا۔ "اچھا گاتا ہوں۔ جبھی لوگ میری آواز سننا چاہتے ہیں نا۔"
اس کے اسکول میں ایک "بزم ادب" قائم تھی۔ اس بزم کے تحت اسکول میں جب بھی کوئی تقریب ہوتی، آرتھر نیر سے کوئی نظم یا کوئی ترانا ضرور پرفارم کرایا جاتا۔ اسکول کے ٹیچر اور بزم ادب کے آرگنائزر اس کی آواز سے بہت متاثر تھے اور بڑھ چڑھ کر اس کی سپورٹ اور سفارش کرتے۔
جو کچھ گھر سے باہر اسکول میں ہوتا تھا اس نے گھر میں اس کی ہوا لگنے نہیں دی تھی۔ والدین بہت مطمئن تھے کہ آرتھر بہت جی لگا کر پڑھ رہا ہے۔ امتحانات پاس کر رہا ہے۔ اسکول سے بھی اس کی شکایت نہیں آئی۔
اس کے والد نیر صاحب گورنمنٹ ملازم تھے۔ گورنمنٹ ملازموں کو ہمیشہ ایک ہی جگہ تعینات نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا ان کا تبادلہ بھی عارف والا سے لاہور ہو گیا۔
آرتھر کو یہاں سے جانے کی خوشی نہیں ہوئی کیونکہ اپنے اسکول میں وہ بہت پاپولر ہو گیا تھا۔ وہاں اس کے ساتھی اور ٹیچر اسے ایک اچھے طالب علم کے علاوہ ایک اچھا گانے والا بھی سمجھنے لگے تھے۔ لہٰذا اس بھریا میلے کو چھوڑنے کا اسے بہت دکھ ہوا تھا۔
لاہور آنے کے بعد اسے سینٹ فرانسس ہائی اسکول

Downloaded From http://paksociety.com

میں داخل کیا گیا، یہاں بھی اس نے ایک اچھے اسٹوڈنٹ اور اپنی خوب صورت آواز کی بنا پر جلد ہی ایک مقام حاصل کرلیا تھا۔ اسے یہ بھی احساس ہوگیا کہ یہ عارف والا سے بہت زیادہ بہتر جگہ ہے۔ یہاں فن اور فنکاروں کے قدر داں بہت ہیں۔ یہاں اس کے شوق کو پھلنے پھولنے کا زیادہ موقع ملے گا۔ یہاں بھی اسکول کی تقاریب میں اس نے آہستہ آہستہ اپنی مدھر آواز کا جادو جگانا شروع کیا اور اسکول اور اسکول سے باہر اسے لوگ ایک اچھی آواز کے گلوکار کی حیثیت سے جاننے پہچاننے لگے۔

سینٹ فرانسس ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد ایف سی کالج میں داخلہ لیا تو یہاں بھی جلد ہی اپنی دھاک جمالی۔ ایک ہونہار طالب علم کی حیثیت سے بھی اور اپنی غیر نصابی سرگرمیوں کی وجہ سے بھی۔ اس کی غیر نصابی سرگرمی اس کی گلوکاری تھی۔ اس کی دلوں کو چھو لینے والی آواز جس نے بھی سنی اس کا گرویدہ ہوگیا۔

کالج کے ایک فنکشن میں آرتھر نے پہلی بار ایک فلمی گیت گایا۔

''من تڑپت ہری درشن کو آج کو۔'' تو سامعین تڑپ اٹھے۔ ہر طرف سے داد و تحسین کی صدائیں آنے لگیں۔ یہ گیت اس دور کی مشہور فلم ''بیجو باورا'' کا تھا جسے کالج کے اسٹوڈنٹ آرتھر نیر نے اس طرح گایا تھا کہ اسے اس تقریب کا دولہا قرار دیا گیا۔ اسے اس گیت کی گائیکی پر بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے کچھ چاہنے والوں اور بہی خواہوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ریڈیو پر جاکر گلوکاری کرے تاکہ ہزاروں لاکھوں شائقین فن کے کانوں میں اس کی آواز کا شہد ٹپکے۔

اسے ریڈیو کی معجزہ نمائی کا علم تھا۔ ایک وقت تھا کہ وہ بھی اپنے گھر میں چھپ کر ریڈیو سنا کرتا تھا۔ ریڈیو سے گانوں کے پروگرام بڑی رغبت اور چاہت کے ساتھ سنا کرتا تھا۔

اور ایک دن وہ لاہور ریڈیو اسٹیشن پہنچ گیا۔

''کیا بات ہے۔ کیوں آئے ہو؟''

''میں ریڈیو پر گانا چاہتا ہوں۔''

''مگر اس کے لیے آپ کو پہلے آڈیشن دینا پڑے گا۔ یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ آپ کی آواز گانے کے قابل ہے بھی یا نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آڈیشن دوں گا۔''

زندگی نامہ ایک نظر میں

اصلی نام: آرتھر نیر

فلمی نام: اے نیر

ولادت: 17 ستمبر 1950ء

مقام: عارف والا

وفات: 11 نومبر 2016ء

مقام: لاہور۔ دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے۔

موت کے وقت عمر: 66 سال

پہلی ریلیز شدہ فلم: مٹی کے پتلے

آخری فلم: ناگ اور ناگن

فلمی گانوں کی تعداد: تقریباً 350

اولاد: ایک بیٹا اور تین بیٹیاں

تعلیم: سینٹ فرانسس ہائی اسکول لاہور سے میٹرک پاس کیا۔ ایف سی کالج لاہور سے انٹر اور بی اے کیا۔ موسیقی کی تعلیم استاد سیموئل ممتاز سے حاصل کی۔

مشہور گانے

☆ آئیں گے موسم جائیں گے موسم پیار ہمارا نہ بدلے گا (فلم ایک دن بہو کا۔ فلمبندی ایاز نائیک)

☆ آجا دشمن کریں دشمنی دوستی کا یہ زمانہ نہیں (فلم ہیرا پھیری۔ عکسبندی آصف خان)

☆ نہ نہ نہ سونا نہ خوابوں کی دنیا میں کھونا نہ (فلم بے نظیر قربانی۔ فلمبندی ایاز نائیک)

☆ تیرے سنگ جو لمحہ گزرا وہ لمحہ کتنا اچھا ہے (فلم رخصتی۔ فلمبندی معمر رانا)

☆ تیری نظر پہ میری ہی نظر ہے (فلم انتہا۔ فلمبندی ہمایوں سعید)

ایک سوال

اے نیر نے اپنے ایک آخری ٹی وی انٹرویو میں موجودہ دور میں بننے والی فلموں کی تعریف کی تھی۔ یہ قابلِ غور و فکر ہے کہ ان فلموں کے لیے اے نیر کی خدمات کیوں نہیں لی گئیں؟ کیا صرف اس لیے کہ فلم نگری میں صرف چڑھتے سورج کی پوجا کی جاتی ہے؟ یا پھر کوئی اور وجہ تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

اس نے آڈیشن دیا۔ کامیاب ہوا اور ریڈیو سے اس کے گانے کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ ایف سی کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران کالج کے ہر میوزیکل پروگرام میں آرتھر کو ضرور شریک کیا جاتا۔ اس کو بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اسے بڑے شوق سے سنا جاتا۔

کالج کے کچھ اساتذہ نے اس سے پوچھا۔ ''تم نے گانا کس سے سیکھا ہے؟''

''کسی سے نہیں۔''

''موسیقی میں تمہارا کوئی استاد نہیں؟''

''جی نہیں۔ بس گانے کا شوق تھا۔ گاتا چلا گیا۔''

''مگر پتر! گانا باضابطہ ایک فن ہے اگر اس فن میں کچھ کمال حاصل کرنا چاہتے ہو تو کسی گائیکی کے استاد سے اسے سیکھنا ہوگا۔''

اس نے سوچا۔ ''اگر بڑے اور سیانے موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں تو مجھے واقعی اس بات پر توجہ دینی چاہیے۔ گائیک کے لیے صرف گا لینا ہی کافی نہیں۔ اس کی تعلیم حاصل کرنا بھی ضروری ہے تو مجھے بھی اس کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے اور اس نے تھوڑی جستجو اور کھوج کے بعد استاد سیموئل ممتاز کو ڈھونڈ نکالا۔ ان کے پاس جا کر ان سے درخواست کی۔ ''استاد محترم! میں آپ سے گائیکی کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''پہلے کسی سے کچھ سیکھا ہے؟''

''جی نہیں۔ اب تک کسی سے کچھ نہیں سیکھا۔''

''دیکھو بھئی! میں کلاسیکی موسیقی کا استاد ہوں۔ کلاسیکی موسیقی کی تعلیم حاصل کیے بغیر موسیقی کا علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔''

''ٹھیک ہے، استاد محترم! جو تعلیم دے سکتے ہیں دیجیے۔ میں ایک مکمل گائیک بننا چاہتا ہوں۔''

اور استاد سیموئل ممتاز، آرتھر نیر کو موسیقی کے اسرار و رموز سے آگاہ کرنے لگے۔ آرتھر پیدائشی طور پر گلوکار تھا۔ اس کی آواز سونے پر سہاگا تھی۔ استاد کی رہنمائی میں اس کی گائیکی میں نکھار آنے لگا۔ استاد نے اسے گائیکی کا ہنر سکھانے کے ساتھ اسے یہ مشورہ بھی دیا کہ تم نامور اور بڑے گانے والوں کو بھی بڑے غور اور توجہ سے سنو۔

''اچھی بات ہے۔ استاد محترم! میں بڑے گانے والوں کو سنوں گا۔ سنتا تو بہت پہلے سے ہوں مگر اب ان کے گانے اور ان کے انداز پر بھی غور کروں گا۔ سوچوں گا۔''

''تم اب تک کن بڑے گائیکوں کو سنتے رہے ہو؟''

''کشور کمار، محمد رفیع، مہدی حسن، استاد امانت علی، لتا منگیشکر اور نور جہاں۔''

''اب ان کو سنو تو محض سر نہ دھنو۔ ان کی گائیکی پر غور و فکر کرو۔ دیکھو کہ انہوں نے گاتے وقت کن باتوں کو اہمیت دی ہے۔ ان کا کون سا انداز آپ کو اچھا لگا ہے۔ دیکھو پتر! ہر گانے والے کا اپنا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ ایک مخصوص اسلوب ہوتا ہے۔''

''اپنی اس بات کو آپ مزید وضاحت سے بتائیں گے؟''

''دیکھو پتر! گانا سنتے وقت گانے والا تمہارے پاس موجود نہیں ہوتا ہے مگر تم یا کوئی بھی شخص سمجھ جاتا ہے کہ یہ محمد رفیع گا رہا ہے۔ یہ مہدی حسن گا رہے ہیں۔ یہ گانے والی لتا ہے اور یہ مادام نور جہاں کی آواز ہے۔''

''جی ہاں...... جی ہاں...... ایسا تو ہوتا ہے۔''

''بس یہی ہر ایک کا مخصوص اسٹائل، اسلوب یا انداز ہوتا ہے۔ تم کو ایسی باتوں کا ادراک ہونا چاہیے۔'' استاد ذرا رک کے پھر بولے۔ ''کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی گانے والے کو سن کر لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ رفیع کے انداز میں گا رہا ہے یا یہ لتا کو کاپی کر رہی ہے۔''

''ایسا تو...... ایسا تو......'' آرتھر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''میرے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ اکثر لوگ مجھے پاکستانی کشور کمار کہتے ہیں۔''

''یعنی تم غیر محسوس طور پر کشور کمار کے اسلوب اور گانے کے اسٹائل کی کاپی کرتے ہو۔ اب تمہیں اسی بات پر غور و فکر کرنا ہے کہ کس کا اسلوب اور انداز کیا ہے۔''

نوجوان گلوکار آرتھر اپنے استاد کی رہنمائی میں گاتا رہا۔ دوسری طرف ریڈیو کے ساتھ ساتھ ٹیلی ویژن پر بھی قسمت آزماتا رہا لیکن کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ سب کو کامیابی کی دیوی کے درشن جلدی نصیب نہیں ہوتے۔ بہتوں کو بہت دنوں تک پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں مگر آرتھر اپنی اس ناکامی پر مایوس نہیں ہوا۔ دل برداشتہ ہو کر اپنی جدوجہد ختم نہیں کی۔ وہ باہمت اور حوصلہ مند نوجوان تھا۔ اس لیے اس امید کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا کہ کبھی تو قسمت مہربان ہو گی۔ ہمت نہ ہارنے والے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ آرتھر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ لاہور ٹی وی پر پروڈیوسر اطہر وقار عظیم نے اپنے پروگرام ''ہم سخن'' میں ایک خوب صورت

Downloaded From http://paksociety.com

گیت 'موسم بدلا رت گزری' کی گائیکی کی سنگت میں آرتھر کو بھی استاد امانت علی خان اور نیرہ نور کے ساتھ گوایا۔ جو لوگوں میں بے حد مقبول ہوا اور اس مقبولیت کے ساتھ ہی آرتھر کی قسمت کا ستارہ بھی جگمگا اٹھا۔ آرتھر کی شہرت کا بھی آغاز ہوگیا۔ ایک بار شہرت کی دیوی کی باہیں جس کے گلے کا ہار بن جائیں اسے پھر کون روک سکتا ہے۔ پھر یوں ہوا کہ آرتھر کے ایک دوست کی سالگرہ تھی۔ دوست نے اس سے اس موقع پر کوئی گیت سنانے کی فرمائش کی۔ گانے والا ہو یا شاعر ایسے موقع پر خوش ہوتا ہے کہ اتنے اچھے لوگوں کی موجودگی میں اس سے کچھ سنانے کی فرمائش کی گئی ہے۔ آرتھر نے بھی ایسی ہی خوشی میں سرشار ہوکر بھارتی فلم ''ہیر رانجھا'' کا یہ گیت سنایا

یہ دنیا یہ محفل میرے کام کی نہیں

ساری محفل جھوم اٹھی۔ اس کی آواز اور گانے کے رنگ میں سر دھننے والوں میں اتفاق سے اپنے دور کے مشہور و معروف مصنف و ہدایت کار ریاض شاہد بھی تھے۔ وہ بھی اس نوجوان گانے والے سے بے حد متاثر ہوئے۔ جہاں اور لوگوں نے اس سے مل کر اس کی تعریف کی وہاں ریاض شاہد نے بھی دل کھول کر داد دی۔ یہ ریاض شاہد کی بڑائی تھی کہ انہوں نے ایک گمنام گانے والے کی تعریف و توصیف میں کسی بخل سے کام نہیں لیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا۔ ''میری فلم میں گاؤ گے؟''

یہ پیشکش ایسی ہی تھی، جیسے کوئی کسی اندھے کو نئی آنکھ لگانے کو کہے۔ بھلا وہ کیسے انکار کرسکتا تھا۔ ''یہ میری انتہائی خوش نصیبی ہوگی کہ میں آپ کی فلم کے ذریعے فلم انڈسٹری میں متعارف ہوں۔''

ریاض شاہد ان دنوں اپنی فلم ''بہشت'' بنا رہے تھے۔ اس فلم کے لیے اس نئے گلوکار آرتھر نیر کو روبینہ بدر کے ساتھ ایک ڈوئیٹ گوایا گیا۔ جس کے بول تھے ''یونہی دن کٹ جائے یونہی شام ڈھل جائے''

اس کے شاعر تسلیم فاضلی تھے اور موسیقی کی دھنیں اے حمید نے ترتیب دی تھیں۔ جب کہ یہ گیت فلم میں ندیم اور نشو پر عکس بند کیا گیا۔

اس فلم ''بہشت'' کی تکمیل کے دوران ریاض شاہد بہشت، آشیانی ہوگئے۔ موذی مرض بلڈ کینسر نے انہیں مزید جینے اور اپنی آخری فلم مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اس طرح یہ فلم التوا کا شکار ہوگئی۔ جسے بعد میں ہدایت کار حسن

سولو گیت

اے نیر نے زیادہ تر ساتھی گلوکاراؤں اور گلوکاروں کے ساتھ گیت گائے مگر متعدد سولو گیت بھی ان سے گوایا گیا۔ ان میں سے چند منتخب نغمے۔

☆ ضد نہ کر اس قدر جانِ جاں (فلم نیا انداز۔ فلمبند شاہد)

☆ اپنے ہونٹوں سے چاہت کا اظہار ہوتا ہے (فلم ایسا بھی ہوتا ہے۔ فلم بندی، عارفہ صدیقی)

☆ یاری ہے پیار میرا یاری میری دوستی (فلم بارڈر بلٹ۔ فلمبند مصطفیٰ قریشی)

☆ تنہائیوں میں ڈھل جائیں گے میرے دن رات (فلم بندھن۔ فلمبند غلام محی الدین)

☆ او ہمدم او ساتھی مجھے تیری دوستی پر ناز (فلم ساتھی۔ عکسبندی آصف رضا)

☆ کرتا رہوں گا یاد تمہیں میں یونہی صبح و شام (فلم نقش قدم۔ فلمبندی غلام محی الدین)

☆ میں تو جلا ایسا کیا کوئی دیپ جلا ہوگا (فلم آگ۔ فلمبندی محمد علی)

☆ جی رہے ہیں ہم تنہا اور تیرا غم تنہا (فلم شرمیلی۔ عکس بندی ندیم)

☆ دیکھ ادھر اک نظر روٹھ کر جانے والے (فلم بڑا آدمی پکچرائزیشن شاہد)

☆ تجھ سے مل کر مجھے اکثر یہ گماں ہوتا ہے (فلم بڑا آدمی۔ فلمبندی طارق)

☆ کس کس کی نظر دیکھوں کس کس کی ادا دیکھوں (فلم مہک۔ عکسبندی فیصل)

☆ جانِ من تیری نشیلی آنکھوں کا میں عاشق ہوں پرانا (فلم کامیابی۔ فلمبندی ندیم)

☆ آنکھوں میں پیار لے کر دل کا قرار لے کر (فلم ہلچل۔ عکسبندی جاوید شیخ)

☆ یاد رکھنے کو کچھ نہ رہا بھول جانے کو کچھ بھی نہیں (فلم بارات۔ فلمبندی غلام محی الدین)

☆ ابھی مجھ کو پیار کرنے کی اجازت نہیں (فلم ایک دوجے کے لیے۔ فلمبندی ایاز نائیک)

☆ چاند تارے گھٹا پھول شبنم صبا چاندنی (فلم ساتھی۔ فلمبندی آصف رضا)

Downloaded From http://paksociety.com

طارق نے مکمل کیا مگر اس سے پہلے آرتھر نیر کے ایک گیت سے بجی فلم ساز ندیم اور ہدایت کار احتشام کی فلم ''مٹی کے پتلے'' ریلیز ہوگئی۔ یہ فلم 22 فروری 1974ء میں نمائش پذیر ہوئی اس کے بول تھے۔

بولو بولو ہم بنانا مانگتا
دل دل تم پہ لٹانا مانگتا

یہ گیت بھی تسلیم فاضلی نے لکھا تھا جس کی کمپوزیشن ایم اشرف نے کی تھی اور اسے اداکار قوی پر فلمایا گیا تھا۔ ''مٹی کے پتلے'' نے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کی۔ اسے آرٹ فلم کے زمرے میں قرار دیا گیا تھا اگرچہ ایسی بات نہیں تھی۔ یہ ندیم اور احتشام کی بنگالی فلم ''ماٹیر پوتل'' کی ری میک تھی اور ڈھاکے کی بنگالی فلمیں عام طور پر ایسے ہی سنجیدہ مسائل پر بنائی جاتی تھیں۔ یہاں پاکستان میں اسے نیم کلاسیکی فلم سمجھ کر باکس آفس پر فلاپ کر دیا گیا۔ اگرچہ یہ ایک اچھی فلم تھی۔ بہرحال نمائش کے حوالے سے یہ آرتھر کی پہلی فلم قرار دی گئی۔

''مٹی کے پتلے'' کی نمائش کے بعد اسی سال ''بہشت'' نمائش پذیر ہوئی اور اس نے خاص طور پر خواتین کو زیادہ متاثر کیا اور کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ آرتھر نیر نے فلم کی گائیکی شروع کی تو اس نے گائیک کے طور پر اپنا نام اے نیر استعمال کرنا شروع کر دیا۔

فلموں میں ناموں کی تبدیلی کی ایک روایت رہی ہے۔ ہندوستان میں یوسف خان نے دلیپ کمار کے نام سے فلموں میں کام کیا تو پاکستان میں موسیٰ رضا نے سنتوش کمار کا نام اختیار کیا۔ شاید یہ وقت اور حالات کا تقاضا تھا۔ غالباً آرتھر نیر نے بھی یہی بہتر سمجھا تھا کہ اگر آرتھر نیر کو اے نیر سے بدل دیا جائے تو اس کی عوامی مقبولیت پر زیادہ بہتر اثر پڑے گا۔

یہ بات بھی بتانے کی ہے کہ ''بہشت'' کا متذکرہ گیت ریاض شاہد کی زندگی میں ریکارڈ نہیں کیا جا سکا تھا کیونکہ اس سے پہلے وہ شدید بیمار ہوگئے تھے اس لیے گانے کی ریکارڈنگ رک گئی تھی۔ پھر اسی شدید علالت کے دوران ان کا انتقال ہوگیا تو اے نیر مایوس ہوگئے تھے مگر ریاض شاہد کے ہم زلف بابر بلال نے جو بہشت کے عکاس بھی تھے اے نیر کو گوا کر ریاض شاہد کا وعدہ پورا کیا۔

''بہشت'' بھی 1974ء میں ''مٹی کے پتلے'' کے بعد ریلیز ہوئی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب احمد رشدی، مہدی حسن، مسعود رانا اور مجیب عالم کے طوطی بول رہے تھے۔ یہ لوگ فلمی صنعت پر چھائے تھے۔ ان کی موجودگی میں کسی نئے گلوکار کا قدم جمانا بظاہر بڑا دشوار تھا لیکن جب رب راضی تو راستے کی سب رکاوٹیں آسان ہو جاتی ہیں۔ قسمت کی دیوی مہربان ہو جاتی ہے۔ 1975ء میں حسن طارق کی فلم ''اک گناہ اور سہی'' ریلیز ہوئی جس میں اے نیر کے دو گیت شامل تھے۔ یہ دونوں گیت ڈوئیٹ تھے اور ناہید اختر نے اس کے ساتھ گایا تھا۔ گیت کے بول تھے۔

1۔ مرنا تھا مر جاتے دنیا میں نام کر جاتے
2۔ میرا دل ہے اک کھلونا اور تیرا پیار ہے چابی

یہ دونوں نغمے رانی اور شاہد پر عکس بند ہوئے تھے۔ شاعری سیف الدین سیف کی تھی اور موسیقی نثار بزمی کی۔ حسن طارق کی یہ سماجی اور معاشرتی فلم نامور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے افسانے ''ممی'' سے ماخوذ تھی۔ اس فلم نے اوسط درجے کی کامیابی حاصل کی تھی۔

فلموں کی کامیابی سے نئے اور ابھرتے ہوئے آرٹسٹوں اور ہنرمندوں کی ساکھ پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ اے نیر کو بھی اپنے ان دو نغمات سے فلم انڈسٹری میں قدم جمانے کا بہتر موقع ملا تھا۔ پھر 1976ء میں ہدایت کار جمشید نقوی کی پہلی فلم ''خریدار'' کے ایک گانے ''پیار تو اک دن ہونا تھا ہو گیا۔ دل تو اک دن کھونا تھا کھو گیا'' نے اے نیر کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔ یہ اپنے دور کا اسٹریٹ ہٹ سونگ ثابت ہوا۔ یہ گیت اے نیر نے ناہید اختر کی ہمراہی میں گایا تھا اور بول کلیم عثمانی نے لکھے تھے جبکہ موسیقی ایم اشرف کی تھی۔ یہ وحید مراد اور دیبا پر فلمایا گیا تھا۔ اس گیت کی ملک گیر مقبولیت کے بعد اے نیر کو فلم انڈسٹری میں اپنے قدم جمانے کا نہ صرف سنہری موقع ملا بلکہ عوامی طور پر اسے پاکستانی کشور کمار کے نام سے بھی یاد کیا جانے لگا۔

ایک نئے اور ابھرتے ہوئے گلوکار ہونے کے باوجود اپنے دور کے ٹاپ گلوکاروں کے مدمقابل آ جانا کوئی عام یا معمولی بات نہیں تھی۔ ہر گانے والے کی منزل فلموں کی پلے بیک سنگنگ ہوتی ہے۔ اے نیر جیسا شوقیہ فنکار جس کا فلم انڈسٹری میں کوئی سپوٹر نہیں تھا، عزیز اور رشتے دار نہیں تھا۔ محض اللہ کے بھروسے اور اپنی آواز کے سہارے گائیکی کی دشوار گزار مسافت طے کرتے ہوئے فلم نگری میں پہنچا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

جب کہ ابتداء میں ریڈیو اور ٹیلی وژن سے بھی اسے خاطر خواہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ فلموں میں گانے کا پہلی بار موقع ملا تو چانس دینے والا چل بسا۔ فلم التوا کا شکار ہو گئی۔ اس دوران دوسری فلم میں گانے کا چانس ملا تو فلم ناکام ہوگئی۔ قدم قدم پر مایوسی اور ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا مگر اسی کے گائے ہوئے گیت کے بقول

پیار تو اک دن ہونا تھا ہو گیا
دل تو اک دن کھونا تھا کھو گیا

گویا اس کی محنت، لگن اور جدوجہد کو اک دن کامیاب تو ہونا تھا ہو گیا۔ سچ کہا ہے سیانوں نے کہ ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ کبھی کسی کی محنت رائیگاں نہیں جاتی۔ فلمی دنیا میں ایک بار کسی کی گاڑی چل جائے تو پھر چلتی ہی چلی جاتی ہے۔ ''خریدار'' کے گانے کی سپرہٹ کامیابی کے بعد فلمسازوں ہدایت کاروں اور موسیقاروں نے اے نیر کو گیتوں کی کامیابی کی ضمانت سمجھ کر اس پر خصوصی توجہ دینا شروع کردی۔ ''خریدار'' کی نمائش کے اگلے سال 1977ء میں اے نیر کی گائیکی سے آراستہ آٹھ فلمیں ریلیز ہوئیں۔ یہ فلمیں بلیک کیٹ، اپریل فول، جاسوس، شعلے پر شعلہ، یادوں کی بارات، بڑے میاں دیوانے، سلاخیں اور تیسری قسم تھیں۔

یہ روش اچھی اور سودمند بھی ہوتی ہے اور بسا اوقات نقصان دہ بھی۔ فلم ساز کے لیے بھی اور متذکرہ فنکار کے لیے بھی۔ ان فلموں کے ساتھ بھی ایسا ہی ملا جلا رجحان رہا۔ بلیک کیٹ باقر رضوی کی فلم تھی۔ وہی باقر رضوی جو دیبا کی پھوپی کے دوسرے شوہر کی حیثیت سے دیبا کی پرورش و پرداختہ میں اس کی پھوپی کے شریک تھے اور ان ہی نے دیبا کو اپنی ایک فلم کے ذریعہ فلم انڈسٹری میں متعارف کرایا تھا۔ بلیک کیٹ پہلے کالی بلی کے نام سے بنائی جارہی تھی۔ جنوری کے مہینے میں اس فلم کی نمائش ہوئی۔ اس فلم میں اے نیّر کا گیت تھا

سوچتی کیا ہے دل میں میرا پیار بسا لے
اللہ ٹھیک کرے گا مولا ٹھیک کرے گا

تسلیم فاضلی کے اس گیت کو موسیقار وجاہت عطرے نے موسیقی کی دھن سے سجایا تھا۔ اداکار شاہد پر فلمایا گیا تھا۔

اپریل فول، جون کے مہینے میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے فلمساز ہدایت کار اور نغمہ نگار محمد اکرام تھے۔ موسیقی تصدق حسین کی تھی۔ فلم کے ہیرو محمود خان تھے جو بعد میں طارق

وہ موسیقار جنھوں نے اے نیر سے گیت گوائے

اے نیر کو جن موسیقاروں کی بنائی ہوئی دھنوں میں گانے کا موقع ملا۔ ان میں اس وقت کے سبھی میوزک ڈائریکٹرز شامل ہیں۔ جن میں ایم اشرف، اے حمید، کمال احمد، وجاہت عطرے اور طافو سرفہرست ہیں جب کہ اے نیر کے عروج کے دور میں ہر موسیقار نے ان سے اپنی فلم میں گیت گوائے۔ نثار بزمی، روبن گوش، نذیر علی، تصدق حسین، چندر موہن، بخشی رام، کریم شہاب الدین، ایس یونس کے نام شامل ہیں۔

جن شاعروں کے لکھے گیتوں پر اے نیر نے گلوکاری کی

اے نیر کو اس بات کا اعزاز حاصل ہے کہ اپنے وقت کے خوش فکر فلمی نغمہ نگار تسلیم فاضلی کے بیشتر گیتوں کو اپنی آواز میں پیش کیا۔ تسلیم فاضلی نے اپنے ہم عصر شاعروں کے مقابلے میں فلموں کے لیے بے حد خوب صورت گیت لکھے جو بہت مقبول ہوئے۔ تسلیم فاضلی کے علاوہ سعید گیلانی نے بھی اے نیر کے لیے اچھی شاعری کی۔ ان کے لکھے ہوئے نغمے بھی مقبول عام ہوئے۔ فیاض ہاشمی، کلیم عثمانی، خواجہ پرویز، سیف الدین سیف، یونس ہمدم، یونس قیاسی اور قتیل شفائی کے تحریر کردہ گیتوں پر بھی اے نیر نے اپنی خوب صورت گائیکی کا مظاہرہ کیا اور اپنے کریڈٹ میں مقبول نغموں میں اضافہ کیا۔

جن اداکاروں پر اے نیر کے گیت فلمائے گئے

اے نیر نے اپنے دور کے تقریباً سارے ہی آرٹسٹوں کے لیے پلے بیک دیا۔ جن میں ندیم، وحید مراد اور شاہد پر زیادہ نغموں کی پکچرائزیشن ہوئی جب کہ محمد علی، غلام محی الدین، جاوید شیخ، آصف رضا میر، وسیم عباس، ایاز نائیک، فیصل الرحمٰن، عثمان پیرزادہ، راحت کاظمی، اظہار قاضی، قوی، ننھا، علی اعجاز، طارق، منصور، مصطفیٰ قریشی، ہمایوں قریشی، طارق شاہ، آصف خان، بدر منیر، فردوس جمال، اسماعیل شاہ، بابر خان، شیری ملک، وکی، نور نغمی، ظفر اقبال، شیوا، جان ریمبو اور معمر رانا پر اے نیر کے گیت عکسبند ہوئے۔

Downloaded From http://paksociety.com

شاہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ اے نیر کے اس فلم میں یہ گیت تھے۔

☆ ہم تمہارے تم ہمارے ہو گئے
نظریں ملیں دل ملے تو جان سے پیارے ہوگئے
(ہمراہ روشن۔فلمبندی، اورنگ زیب، محمود خان)

☆ پیار کریں گے پیار کریں گے
ساتھ جئیں گے ساتھ مریں گے
(ہمراہ مہناز۔عکس بندی آسیہ محمود خان)

☆ ایک میں ایک تو، ایک جسم ایک جان
یہ ملن ایک دن دیکھے گا سارا جہان
(ہمراہ ناہید اختر، فلمبندی آسیہ اورنگ زیب)

''جاسوس'' یکم جولائی کو نمائش پذیر ہوئی۔ یہ فلم ساز وہدایت کار اقبال یوسف کی فلم تھی۔ بول فیاض ہاشمی کے تھے جب کہ موسیقی کی کمپوزیشن طافو کی تھی۔

☆ او ہوا وہو ساتھی مجھے مل گیا
مل گیا
رسموں کو توڑیں گے
دنیا کو چھوڑیں گے
دل نے کیا فیصلہ
(ہمراہ ناہید اختر۔پکچرائزیشن، سلطان راہی، ممتاز)

☆ سب کچھ بن کے کچھ نہ بنا
سب پیار خدا نے بنایا
(ہمراہ ناہید اختر، فلم بندی سلطان راہی، ممتاز)

اسی سال اگست کے مہینے میں ایم اے رشید کی فلم شعلے ہی شعلے ریلیز ہوئی جو باکس آفس پر کوئی کارنامہ نہ انجام دے سکی۔ اس فلم کے لیے اے نیر نے شاعر یونس قیاسی کا ایک دو گانا نور جہاں کے ہمراہ گایا جس کی دھن موسیقار ایس یونس نے بنائی تھی۔

☆ مجھے ایسے نہ دیکھو جانے میرے دل کو کیا ہوتا ہے
(طلعت اقبال پر فلمایا گیا تھا)

اسی سال ستمبر کے مہینے میں ہدایت کار ممتاز علی خان کی فلم ''یادوں کی بارات'' ریلیز ہوئی۔ اے نیر نے چندر موہن، بیلی رام کی موسیقی میں سعید گیلانی کے یہ گیت گائے۔

☆ رت ہے نشیلی
تو ہی تو میرا پیار ہے
(ہمراہ مہناز آصف خان اور بندیا پر فلمایا گیا)

☆ آجا ہم دونوں پیار کریں
(فلم بندی آصف خان)

نومبر کے مہینے میں اسلم ڈار کی مزاحیہ فلم بڑے میاں دیوانے ریلیز ہوئی جو خاصی کامیاب رہی۔ یہ عیدالاضحیٰ کا موقع تھا۔ اس لحاظ سے بھی فلم کا بزنس اچھا ہوا۔ اے نیر نے اس فلم کے لیے یہ نغمہ گایا جس کے بول تسلیم فاضلی نے لکھے تھے اور طالش پر اسے فلمایا گیا تھا۔

☆ چھوڑ گئے جب یہ دنیا
یاد کرو گے پیار میرا

دسمبر کے مہینے میں ہدایت کار حسن عسکری کی کلاسک فلم ''سلاخیں'' ریلیز ہوئی جو 48 ہفتے تک تماشائیوں کی پسند کا مرکز بنی رہی۔ اے نیر نے مہناز کے ہمراہ کمال احمد کی موسیقی میں یہ ڈوئیٹ گایا جو قوی اور بابرا شریف پر فلمایا گیا۔

☆ ہم یونہی ہم سفر بن کر چلتے رہیں
ہم نہ بدلیں بھی دن بدلتے رہیں

دسمبر کے مہینے ہی میں ''سلاخیں'' کے ساتھ ممتاز علی خان کی فلم ''تیری قسم'' ریلیز ہوئی۔ موسیقار چندر موہن بیلی رام کی موسیقی میں اے نیر نے ناہید اختر کے ہمراہ سعید گیلانی کا یہ دوگانا گایا جو فلم میں اورنگ زیب اور نمی پر فلمایا گیا۔

☆ آؤ لے لو جینے کا مزا
گیت چھیڑ دو کوئی پیار کا

اگلے سال یعنی 1978ء میں بھی اے نیر پر گیتوں کی برسات ہوئی۔ اس برس اس کی ریلیز ہونے والی فلموں میں امبر، آبشار، پرکھ، بارات، شرمیلی، انسان اور شیطان، احتجاج، ہیرا پھیری، ایکسیڈنٹ، زندگی، بلے بوائے، دشمن ہو تو ایسا، خدا اور محبت، آواز اور دشمن کی تلاش شامل تھیں۔

یہ پندرہ فلمیں ہیں۔ جن میں زیادہ تر کامیاب فلمیں ہیں۔ ایک گلوکار کی ایک سال میں اتنی فلموں کی نمائش کوئی معمولی بات نہیں۔ اے نیرؔ جو ابھی نیا اور نوآموز گانے والا تھا اور جس کے مقابل بڑے بڑے اور توپ قسم کے گلوکار تھے۔ ان کی موجودگی میں اس کی یہ ڈیمانڈ اس بات کی دلیل تھی کہ اس کی آواز نے فلم انڈسٹری میں اپنا لوہا منوالیا ہے۔
ان فلموں کا ایک ایک گانا بطور نمونہ پیش کررہا ہوں۔

☆ ملے دو ساتھی، کھلیں دو کلیاں
دیوانا دیوانا دیوانا موسم

یہ فلم امبر کا گیت ہے۔ روبن گھوش نے اس کی موسیقی ترتیب دی۔ تسلیم فاضلی نے یہ گیت لکھا۔ اس کی عکس بندی

Downloaded From http://paksociety.com

اداکار ندیم پر ہوئی۔

☆ او میری جان وفا

وعدہ کریں پیار کا

یہ فلم آبشار کا نغمہ ہے جسے اے نیر نے مہناز کے ہمراہ گایا۔ موسیقار کمال احمد ہیں۔ گیت کے بول خواجہ پرویز نے لکھے۔ نوین تاجک اور طارق پر فلم بند ہوا۔

فلم پرکھ کے لیے اے نیر نے یہ نغمہ صدا بند کرایا۔

☆ ساتھی کوئی ایسا ملے

جو عمر بھر ساتھ دے

مہناز نے اس کے ساتھ گایا۔ اس کی موسیقی بھی کمال احمد کی تھی جب کہ گیت کے بول تسلیم فاضلی کے تھے۔ رانی اور وحید مراد پر اس ڈوئیٹ کی پکچرائزیشن ہوئی تھی۔

☆ یاد رکھنے کو کچھ نہ رہا

بھول جانے کو کچھ بھی نہیں

فلم ''بارات'' کے اس سولو گیت اے نیر نے ایم اشرف کی ترتیب دی ہوئی دھنوں پر گایا۔ اس کے شاعر تسلیم فاضلی تھے۔ غلام محی الدین پر اس کی عکس بندی ہوئی۔

☆ جی رہے ہیں ہم تنہا

تیرا ہر ستم سہا

یہ فلم شرمیلی کا گیت ہے جسے یونس ہمدم نے لکھا۔ کریم شہاب الدین اس کے موسیقار تھے۔ یہ گانا ندیم پر پکچرائز ہوا۔

☆ تو ہے میرا پیار

کہہ دے ایک بار

انسان اور شیطان کے اس گیت کو اے نیر نے مہناز کے ساتھ گایا۔ خواجہ پرویز اس کے شاعر اور کمال احمد موسیقار تھے۔ اس کی عکس بندی وحید مراد اور نجمہ پر ہوئی۔

☆ تجھ سے مل کر مجھے

اکثر یہ گمان ہوتا ہے

فلم احتجاج کے اس نغمے کے شاعر قتیل شفائی اور موسیقار ناشاد تھے۔ اداکار طارق پر اس کی فلمبندی ہوئی تھی۔

☆ آجا دشمن کریں دشمنی

دوستی کا یہ زمانہ نہیں

فلم ہیرا پھیری کے لیے اے نیر نے یہ گیت کمال احمد کی موسیقی میں گایا۔ گیت کے بول تسلیم فاضلی کے تھے۔ آصف خان پر اس کی فلمبندی ہوئی۔

ایک بڑا صدمہ

اے نیر کی تین بیٹیاں اور بیٹا تھا۔ تینوں لڑکیوں کی شادی انہوں نے کینیڈا میں کرا دی تھیں جہاں وہ سب اپنے بال بچوں کے درمیان ہیں۔ بیٹا شرون بھی بہت دنوں تک کینیڈا میں رہا۔ وہاں وہ ایک میوزک گروپ کے ساتھ گائیکی کے فن سے منسلک رہا۔ اے نیر نے اپنے بیٹے کو بھی موسیقی اور گلوکاری کی تربیت دی تھی۔ شرون کینیڈا میں اکثر بیمار رہتا تھا۔ وہاں اس کا بہت علاج کرایا گیا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ لہٰذا اے نیر اسے کینیڈا سے پاکستان لے آئے کہ اپنے پاکستان میں بھی اچھے ڈاکٹرز ہیں اور پھر اس کی دیکھ بھال کے لیے اس کے والدین موجود ہوں گے۔ مگر وہ صحت یاب نہ ہو سکا اور اس کا انتقال ہو گیا۔ یہ اے نیر کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا مگر اس نے اسے مشیت ایزدی سمجھ کر برداشت کر لیا کہ اللہ پاک نے اس کو اتنی ہی زندگی دی تھی۔

عروج و زوال

اے نیر کے عروج کا دور 80ء کی دہائی تھا۔ ہر سال متعدد فلمیں ریلیز ہوتی تھیں۔ ہر فلمساز اپنی فلم کی کامیابی کے لیے اپنی فلم میں ان کا گانا ضرور شامل کرتا تھا۔ پھر جب فلم انڈسٹری پر زوال آیا تو اے نیر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ بے کاری کے دنوں میں وہ کینیڈا چلے گئے جہاں ان کے بچے مقیم تھے۔ کینیڈا میں اس دوران انہوں نے موسیقی کے مختلف پروگراموں میں اپنی گائیکی کو جاری رکھا۔ اس دوران انہیں آرام کرنے کا بھی موقع ملا مگر چونکہ انہیں پاکستان سے بہت زیادہ محبت تھی اس لیے وطن واپس آگئے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہیں سپورٹ اور سہارے کی بہت ضرورت تھی مگر کبھی کسی سے مدد طلب نہیں کی۔ کسمپرسی کی حالت میں بیمار ہوئے۔ کچھ دن صاحب فراش رہے پھر دل کے دورے نے ان کی مشکل آسان کر دی۔ اپنے دیس میں یہی ہوتا ہے۔ سب چڑھتے سورج کے پجاری ہوتے ہیں۔ ڈوبتے ہوئے ستارے کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔

Downloaded From http://paksociety.com

☆ تیری میری میری تیری
آنکھوں کے لڑ جانے کا
کوئی تو سبب ہوگا؟

فلم ایکسیڈنٹ کا یہ گیت اے نیر نے مہناز کے ہمراہ گایا۔ خواجہ پرویز کے بول تھے کمال احمد کی موسیقی۔ غلام محی الدین اور نجمہ پر اس کی عکسبندی ہوئی۔

☆ جنگل میں منگل تیرے ہی دم سے
سب نے یہ شور مچایا ہے۔ سالگرہ کا دن آیا ہے

یہ سپر ہٹ گانا فلم ''زندگی'' کا تھا جو ندیم، بابرہ شریف اور طالش پر فلمایا گیا تھا۔ اے نیر نے اسے مہناز کی ہمراہی میں گایا تھا۔ موسیقی ایم اشرف کی تھی اور گیت کے بول تھے کلیم عثمانی کے۔

اس فلم کا ایک اور گیت۔ ''تیرے سنگ دوستی نہ توڑیں گے کبھی''

اس گیت کو بھی مہناز کے ساتھ اے نیر نے گایا تھا اور یہ بھی بے حد پسند کیا گیا تھا۔ اس فلم نے بھی زبردست کامیابی حاصل کی تھی۔

☆ دنیا ہے ایک پلے
اور میں ہوں پلے بوائے

پر فلم پلے بوائے کا ٹائٹل سانگ تھا جسے اے نیر سے گوایا گیا تھا۔ ایم اشرف اس کے موسیقار اور تسلیم فاضلی نغمہ نگار تھے۔ جب کہ یہ شمیم آراء کی کامیاب فلم تھی۔

☆ او گوری آجا رے
او گوری نہ جا رے

یہ فلم ''دشمن ہو تو ایسا'' کا گانا تھا۔ نذیر علی اس کے موسیقار تھے۔ تسلیم فاضلی نغمہ نگار اور یہ آصف خان پر عکس بند ہوا تھا۔

☆ اک بات کہوں دلدارا
ترے عشق نے ہم کو مارا

یہ ''خدا اور محبت'' کا بڑا لہکتا ہوا گیت تھا۔ اے نیر کی آواز میں سننے والوں کو مزا دے گیا۔ جب کہ وحید مراد نے اس کی پکچرائزیشن میں مزید جان ڈال دی تھی۔ بول فیاض ہاشمی کے بڑے خوب صورت تھے جب کہ طافو نے بڑی دلکش دھن ترتیب دی تھی۔

☆ سنو سنو شہر کے باسیو!
گاؤں سے آیا ہوں
نئی سوغات لایا ہوں

فلم کا نام ہے ''آواز'' موسیقار اے حمید، گیت کے بول سعید گیلانی کے یہ بھی وحید مراد پر فلمبند ہوا اور پسند کیا گیا۔

☆ او جانِ من!
میں تیری دیوانی

یہ ''دشمن کی تلاش'' کا نغمہ ہے جو اے نیر اور ناہید اختر نے مل کر گایا تھا۔ اس کی فلمبندی زمان خان اور بابرہ شریف پر ہوئی تھی۔

1979ء میں اے نیر کی خوب صورت گائیکی سے سجی گیارہ فلمیں نمائش پذیر ہوئیں یہ فلمیں تھیں۔ وعدے کی زنجیر، یہاں سے وہاں تک، نئی تہذیب، نقش قدم، نیا انداز، اب گھر جانے دو، عورت راج، موت میری زندگی، مس ہانگ کانگ، آپ سے کیا پردہ اور آگ۔

آگ، ہدایت کار حسن عسکری کی فلم تھی جس کی بہترین گلوکاری پر اے نیر کو سال کی بہترین نغمہ سرائی پر نگار ایوارڈ سے نواز ا گیا تھا۔ گیت تھا

☆ میں تو جلا ایسا جیون بھر
کیا کوئی دیپ جلا ہوگا

ایوارڈ کی بات چلی ہے تو یہ بتاتا چلوں کہ اے نیر کو اس کی بہترین گلوکاری پر یہ نگار ایوارڈز بھی ملے ہیں۔ 1985ء میں فلم ''جینے نہیں دوں گی'' 1988ء میں فلم ''غریبوں کا بادشاہ'' اور 1989ء میں فلم ''طاقت کا طوفان''۔

نگار ایوارڈ کے علاوہ بھی کئی ایوارڈ ملے۔ جن میں قومی صدارتی ایوارڈ، گریجویٹ ایوارڈ اور بولان ایوارڈز قابلِ ذکر ہیں۔

1980ء میں اے نیر کی یہ فلمیں نمائش پذیر ہوئیں۔ بندش، دامن، بندھن، آتش، صائمہ، ساتھی، اسمگلر، بدلتے موسم، بدنام، نہیں ابھی نہیں اور پیاری۔

اسی طرح 1981ء میں اے نیر کی گائیکی ان فلموں میں شامل ہوئی۔ بڑا آدمی، وطن، یہ زمانہ اور ہے، کھوٹے سکے اور کالا دھن گورے لوگ۔

1982ء میں اے نیر نے ان فلموں کے لیے پلے بیک سنگنگ کی۔ خوب صورت، بلیک وائٹ، میاں بیوی راضی، راجا صاحب، آہٹ، آئینہ اور زندگی، بیویاں ہائے بیویاں، نصیب، آس پاس، ایک دن بہو کا، آنگن، بیوی ہو تو ایسی، جانِ من، تھوڑی سی بے وفائی اور آئی لو یو۔ اس برس

Downloaded From http://paksociety.com

جولائی کے مہینے میں ایک پنجابی فلم دوستانہ بھی ریلیز ہوئی۔

اے نیر نے مسعود رانا، شوکت علی اور ناہید اختر کے ہمراہ یہ کورس گیت گایا تھا۔ جو اسٹیج پر اے نیر، مسعود رانا اور شوکت علی پر فلمایا گیا تھا جب کہ ان کے ساتھ انجمن نے بھی پرفارم کیا تھا۔ گیت کے بول تھے۔ نی پندران مریاں داں کچہری چڑھ کری، یہ حیدر چوہدری کی فلم تھی۔ خواجہ پرویز شاعر اور طافو موسیقار تھے۔ گیت کے بول تھے۔ نی پندران مریاں داں کچہری چڑھ کری۔

1983ء میں اے نیر کے دلکش نغمات سے سجی یہ فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ایک دوجے کے لیے، لو اسٹوری، کبھی الوداع نہ کہنا، نادانی، بارڈر بلٹ، ٹینا دو بھیگے بدن اور بدلتے رشتے۔

1984ء میں اے نیر کو ان فلموں کے لیے گیت گانے کا موقع ملا۔ ایسا بھی ہوتا ہے، شادی مگر آدھی، مس کولمبو، کامیابی، آندھی اور طوفان، نصیبوں والی، خوش نصیب، کرائے کے گوریلے اور لازوال۔

1985ء میں یہ فلمیں اے نیر کی گائیکی سے آراستہ رہیں۔ ہیرو، بے نظیر قربانی، مہک، ہلچل، پروانہ، مس سنگاپور، مشرق مغرب، جینے نہیں دوں گی، پلکوں کی چھاؤں میں، ڈائریکٹ حوالدار اور ہدایت کار حسن عسکری کی ہم اور تم۔

1986ء میں اے نیر کی ریلیز ہونے والی فلمیں تھیں۔ آوارہ، دھنک، بات بن جائے، وائٹ گولڈ، اگر تم نہ ہوتے، فیصلہ، نزدیکیاں اور فرسٹ بلڈ۔

1987ء میں اے نیر نے ان فلموں کے لیے گانے ریکارڈ کرائے۔ آگ اور شعلے، گریبان، لوان نیپال، زلزلہ، چوروں کی بارات، ایک سے بڑھ کر ایک، لیڈی اسمگلر، سن آف ان داتا، نجات، سونے کی تلاش، روکی دادا، سات سہیلیاں، بدلہ اور سید سلیمان کی لوان لندن۔

1988ء میں جینے کی آرزو، ایک جان ہیں ہم، طاقت کا طوفان، کرائے کے قاتل، منیلا کے جانباز، بارود کی چھاؤں، محبت ہو تو ایسی، آگ اور سہاگ اور اے حمید کی بطور موسیقار آخری فلم ڈسکو دیوانے۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کثرت استعمال کے بعد چیزوں کی اہمیت کم ہونے لگتی ہے۔ کبھی فلموں پر اثر پڑتا ہے کبھی فنکار متاثر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ہر فلم کے لیے اے نیر کو گوا کر اس کی خوب صورت آواز کے ساتھ زیادتی

سنگر ہاؤس

اپنے بے کاری کے دنوں میں اے نیر نے ایک ٹی وی انٹرویو میں کہا تھا۔ اپنے بھلے دنوں میں، میں نے اپنے گھر میں بیٹھنے کی ایک جگہ بنائی تھی۔ اس کا نام میں نے سنگر ہاؤس رکھا تھا۔ وہاں بڑی بڑی فلمی شخصیات آتی تھیں۔ ان میں گلوکار بھی شامل تھے۔ مہدی حسن، احمد رشدی، مسعود رانا، مجیب عالم، اخلاق احمد، شوکت علی، غلام عباس، غلام علی اور نیر حسین وغیرہ شامل تھے۔

اس انٹرویو میں انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کے ابتدائی دور میں دلدار پرویز بھٹی نے ان کی بہت مدد کی۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن تک لے جانے میں بہت تعاون کیا۔ مرحوم بڑے اچھے انسان تھے۔

کبھی کبھار کے ساتھی گلوکارائیں

اے نیر کی ہمراہی میں جن گانے والوں کو گوایا گیا ان میں ناہید اختر اور مہناز نے زیادہ تر نغمات میں ان کا ساتھ دیا۔ البتہ جن کو کبھی کبھار ہی گوایا گیا ان کی تعداد بہت کم ہے۔ ایسے ہی چند منتخب گیت۔

☆ اچھا اچھا لا گورے پیارا پیارا لا گورے (فلم بندش۔ نیرہ نور)

☆ صبح کہیں شام کہیں۔ زندگی ہے کیا اسی کا نام دوستو (فلم صائمہ۔ شازیہ خشک)

☆ میرا دل لے کے مجھ کو سہارا دیا شکریہ (فلم اسمگلر۔ شازیہ خشک)

☆ وہ زمانہ اور تھا یہ زمانہ اور ہے۔ کھیل نیا دکھائیں گے (فلم یہ زمانہ اور ہے۔ محبوب پرویز)

☆ دو اجنبی، یہ راستے، بکھری ہوئی خاموشیاں (فلم ہم اور تم۔ سلمیٰ آغا)

☆ سانسوں میں ہے تو اے جان وفا (فلم نیا انداز۔ نور جہاں)

☆ جنی تیری ہو گئی۔ پیار میں تیرے کھو گئی۔ تو آجا (فلم بے قرار۔ مسرت نذیر)

☆ ہم تمہارے تم ہمارے ہو گئے۔ نظریں ملیں دل ملے (فلم اپریل فول۔ روشن)

☆ یا قربان وئی وئی۔ تو ہے میری میں ہوں تیرا (فلم تاگ اور ناگن۔ عذرا جہاں)

Downloaded From http://paksociety.com

کی گئی۔ فلموں کی ناکامی کا کچھ نہ کچھ اثر اس کی ساکھ پر بھی پڑا۔ لہٰذا اس کا انجام جو ہونا تھا وہ ہوا۔ اب اے نیر فلموں کی گائیکی کے لیے کم لیے جانے لگے۔ اس جائزے سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ 1990ء میں ان کی فلمیں انسانیت کے دشمن، آسمان، لیڈر، بلندی، استادوں کے استاد اور کالا پانی منظر عام پر نظر آئیں۔ 1991ء میں صرف آندھی آئی۔ 1992ء میں پابندی، پامیلا اور چوڑیاں ٹوٹ گئیں، ناگن رانی، جینا چاہتی ہوں، میں پلے بیک دیا۔ 1993ء میں بہروپیا، خواہش اور قسم۔ 1994ء میں دھڑکن اور انداز۔ 1995ء میں آوارگی اور جینے دو۔ 1996ء میں محبت ہے کیا چیز، خطرناک حسینہ، صاحب جی اور واہ کیا بات ہے۔ سال 1999ء میں انتہا اور دل پاگل ہے۔ 2000ء میں مسعود بٹ کی پہچان۔ 2001ء میں شہزاد رفیق کی رخصتی اور زیبا بختیار کی بابو۔ 2002ء میں سید نور کی فلم شعلے۔ جب کہ دو سال کے گیپ کے بعد 2005ء میں ناگ اور ناگن میں عذرا جہاں کے ہمراہ سعید گیلانی کا لکھا ایک دوگانا گایا جس کی موسیقی ایم اشرف نے ترتیب دی تھی۔ گیت کے بول تھے۔

☆ دیا قربان دی وئی
تو ہے میری میں ہوں تیرا
کردے اعلان دی وئی

ناگ اور ناگن اے نیر کی آخری فلم بتائی جاتی ہے۔

قیاس اغلب ہے کہ اگر اس دلدارا کو فلم سازوں اور موسیقاروں کے عشق نے نہ مارا ہوتا تو زیادہ دنوں تک وہ بطور گلوکار اپنی ساکھ کو برقرار رکھ سکتا تھا۔ فلم والوں کا تو یہ وتیرہ ہے کہ جس کی مقبولیت عروج پر ہوتی ہے اس سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ ایسے مواقع پر جو فنکار گلوکار یا موسیقار دانشمند ہوتا ہے وہ خود اپنی حفاظت کرتا ہے۔ منتخب فلموں میں کام کر کے اپنی ساکھ کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اے نیر نے خود اپنی ساکھ کو برقرار رکھنے میں کوئی مثبت کردار ادا نہیں کیا تو یہ غلط نہیں ہوگا۔

اے نیر کی سب سے پہلی پنجابی فلم سید کمال کی اج دیاں کڑیاں تھی جو 1977ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ مسعود رانا اور ساتھیوں کے ہمراہ اس نے یہ گیت گایا تھا۔

''ٹھنڈی ٹھنڈی رت میں کوارے مرجاں گے''

حزیں قادری کے لکھے اس گیت کی دھن وجاہت عطرے نے بنائی تھی۔ یہ فلم 45 ہفتے چلی تھی اور اس کی کامیابی کے بعد سید کمال بھی پنجابی فلم سازوں اور ہدایت کاروں کی صف میں شامل ہوگئے تھے۔

فلم انڈسٹری سے وابستہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اے نیر چونکہ بہت ملنسار اور خوش اخلاق انسان تھے۔ اس لیے وہ فلم سازوں، ہدایت کاروں اور موسیقاروں کے آفرز کو یہ سوچ کر ٹھکراتے نہیں تھے کہ کہیں وہ ان کو انا پرست اور مغرور نہ سمجھیں۔ میرے انکار سے کہیں کسی کا دل نہ ٹوٹ جائے۔ اس لیے وہ اپنے پاس ہر آنے والوں کی ضرورت پوری کردیتے تھے۔ وہ جس طرح اپنے مداحوں سے خلوص اور انکساری کے ساتھ ملتے تھے اسی طرح فلم والوں کے ساتھ بھی پیش آتے تھے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اپنے عروج کے زمانے میں بھی وہ کسی پر اپنے معاوضے کے سلسلے میں دباؤ نہیں ڈالتے تھے۔ انسان کبھی کبھی مروت میں بھی مارا جاتا ہے۔ اے نیر نے بھی اپنی شرافت کی وجہ سے اکثر اپنے آپ کو نقصان پہنچایا۔

اے نیر اس خیال کے پیروکار تھے کہ

اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں
ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

اوروں کے کام آنے والے لوگ اکثر نقصان میں رہتے ہیں مگر وہ اپنی زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہوتے ہیں۔ ہمیشہ اچھے ناموں سے، عزت واحترام کے ساتھ یاد کیے جاتے ہیں۔ آج اے نیر بھی ہمارے درمیان موجود نہیں مگر آج ہم بھی انہیں ایک اچھے انسان اور اچھے فنکار کی حیثیت سے یاد کررہے ہیں۔

اے نیر بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ گانے تو سبھی گانے والے گاتے ہیں مگر اے نیر کو اپنے ہم عصروں میں اس بات پر فوقیت حاصل تھی کہ وہ اپنا گانا ریکارڈ کرانے سے پہلے پوچھتے تھے۔

''یہ گانا کس اداکار پر پکچرائز کیا جائے گا؟''

جس اداکار کا نام لیا جاتا وہ اس کی آواز سے ملتی جلتی آواز میں گاتے۔ فلم کی نمائش پر فلم بین کو ایسا لگتا جیسے اس اداکار نے خود ہی گلوکاری کی ہے۔ اس سلسلے میں ندیم، وحید مراد اور شاہد قابل ذکر آرٹسٹ ہیں جن پر فلمبند ہونے والے بیشتر گیت اے نیر کی آواز میں گوائے جاتے تھے۔ ویسے جن اداکاروں کے لیے انہوں نے پلے بیک دیا ان کی فہرست بڑی طویل ہے۔ ان میں محمد علی، وحید مراد، ندیم، شاہد، غلام محی الدین، جاوید شیخ، آصف رضا میر، زوہیب خان، وسیم

Downloaded From http://paksociety.com

عباس، ایاز نائیک، فیصل الرحمٰن، عثمان پیرزادہ، راحت کاظمی، طارق، منصور، اظہار قاضی، قوی، ننھا، علی اعجاز، سلطان راہی، مصطفیٰ قریشی، ہمایوں قریشی، طارق شاہ، آصف خان، بدر منیر، فردوس جمال، اسماعیل شاہ، بابر خان، شیری ملک، وکی، نور نعمی، ظفر اقبال، شیوا (نیپالی اداکار)، جان ریمبو، شان اور معمر رانا کے نام شامل ہیں۔

اے نیئر کو اس بات کا بھی اعزاز حاصل ہے کہ ان کے ہمراہ پانچ ایسے آرٹسٹوں نے بھی گلوکاری کی جو اپنے وقت کی فلموں کی ہیروئن بھی رہ چکی ہیں۔ یعنی میڈم نور جہاں، مسرت نذیر، سلمٰی آغا، بابرہ شریف اور عارفہ صدیقی۔

اے نیر خوش گلو ہی نہیں تھے خوش پوش، خوش شکل اور اسمارٹ نوجوان بھی تھے۔ ان کی اسی خوبی کے تحت ہدایت کار حسن طارق نے انہیں اپنی ایک فلم میں بطور ہیرو کاسٹ کرنے کا ارادہ بھی کیا تھا مگر ان کی زندگی نے وفا نہیں کی اور وہ اے نیر سے کیا ہوا وعدہ بھی پورا نہ کر سکے۔ مگر بعد میں ان سے کچھ لوگوں نے اداکاری کروا ہی لی۔ قصہ یوں ہے کہ ایک بار پی ٹی وی کے ایک ڈرامے "الٹ پھیر" میں پروڈیوسر نے گلوکاروں سے اداکاری اور اداکاروں سے گلوکاری کروائی۔ اس ڈرامے کے پروڈیوسر نصرت ٹھاکر نے اس انوکھے کھیل میں اے نیر، عارف لوہار، حامد علی خان، رجب علی اور شوکت علی سے اداکاری کروائی جب کہ نیلو بیگم، تانی بیگم، عارفہ صدیقی اور سہیل اصغر سے گلوکاری کروائی۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ ہدایت کاروں نے تقریباً ہر اداکار پر عکس بند ہونے والے نغمے اے نیر سے گوائے مگر وحید مراد پر اے نیر کے گیت بہت جچتے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وحید مراد کو شوخ نغمات کی پکچرائزیشن پر عبور حاصل تھا جب کہ اے نیر بھی اپنے شوخ گیتوں کی گلوکاری نمایاں خصوصیات کے حامل تھے۔ دونوں کی اس مشترکہ خوبی سے فلم والوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔

اے نیر کو ان کے جس گیت پر مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ فلم خریدار کا یہ نغمہ تھا۔

☆ دل تو اک دن کھونا تھا کھو گیا
پیار تو اک دن ہونا تھا ہو گیا

اتفاق کی بات ہے کہ یہ چلبلا گیت وحید مراد پر پکچرائز ہوا۔ وحید مراد کی شوخ و شنگ اداکاری نے اس میں چار چاند لگا دیئے۔ بس فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو ایک گلو

نوبل پرائز

مشہور زمانہ نوبل پرائز کا اجراء جس شخص نے کیا وہ سویڈن کا رہنے والا الفریڈ نوبل تھا۔ نوبل 1833ء میں اسٹاک ہوم میں پیدا ہوا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ ایک ماہر کیمیا دان تھا جس نے 1867ء میں ڈائنا میٹ ایجاد کیا۔ انیسویں صدی کی آخری چند دہائیوں میں دنیا بھر میں صنعتی ترقی کا آغاز ہو چکا تھا اور بیشتر ممالک زمین میں چھپے کوئلے اور تیل کے ذخائر دریافت کرنے میں مصروف تھے اس زمانے میں ڈائنامیٹ ایک نہایت کارآمد اور بروقت ایجاد تھی جو ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ ڈائنامیٹ کی تیاری اور فروخت کے سبب الفریڈ نوبل کا شمار دنیا کے امیر ترین آدمیوں میں ہونے لگا۔ ڈائنامیٹ کے علاوہ نوبل نے اسلحہ اور گولہ بارود کی فیکٹریاں بھی قائم کر لیں جس سے اس کی دولت میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا۔

مرسلہ: ارشد بٹ، لاہور

مل گیا کہ اگر اے نیر سے کوئی چہچہاتا ہوا گیت گوا کر وحید مراد سے لہکتی ہوئی اداکاری کروائی جائے تو اس گیت کی کامیابی یقینی ہو جائے گی۔ اچھی موسیقی اور اچھے گانے فلم کی کامیابی کے لیے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ہدایت کار جمشید نقوی کو ہرگز اس بات کی توقع نہیں تھی کہ اے نیر اور وحید مراد کی فنکارانہ خوبیوں کی وجہ سے یہ گیت اس قدر ہٹ ہو جائے گا کیونکہ یہ بطور ہدایت کار جمشید نقوی کی پہلی فلم تھی۔ اس لیے ابھی وہ ایسی باتیں سوچنے کے اہل نہیں تھے۔ بس ہونے والی بات تھی ہو گئی جس سے فلم کو بھی فائدہ پہنچا اور اے نیر اور وحید مراد کو بھی۔ وحید مراد اس فلم کے ہیرو تھے۔ اس لیے یہ ڈوئیٹ سانگ وحید مراد اور دیبا پر پکچر ائز ہوا اور یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ غیر متوقع طور پر بے حد مقبول ہو گیا۔

اس فلم کا ایک اور گیت

☆ تیرا میرا پیار امر
ساتھ رہیں گے جیون بھر

بھی پسند کیا گیا تھا۔ یہ بھی دوگانا تھا اور وحید مراد اور دیبا ہی پر فلمبند کیا گیا تھا۔ اس گیت میں بھی ناہید اختر نے

Downloaded From http://paksociety.com

اے نیر کا ساتھ دیا تھا۔ کہانی کی مناسبت سے یہ گیت بھی اہم تھا مگر ''پیار تو اک دن ہونا تھا ہو گیا'' جیسی پذیرائی اسے نصیب نہیں ہوئی۔ بہر حال ''خریدار'' کی کامیابی کو مستحکم بنانے میں اے نیر اور ناہید اختر کے گانوں اور وحید مراد اور دیبا کی جاندار اداکاری نے بہت اہم کردار ادا کیا۔

''خریدار'' 1976ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ دو سال بعد یعنی 1978ء میں اے نیر اور وحید مراد کی چار مشترکہ فلمیں نمائش پذیر ہوئیں جو یہ تھیں۔ پرکھ، آواز، انسان اور شیطان اور خدا اور محبت۔ ''پرکھ'' ہدایت کار جان محمد کی فلم تھی۔ جب کہ آواز ظفر شباب کی باکس آفس پر سپرہٹ فلم تھی۔ اس فلم کی موسیقی اے حمید کی ترتیب دی ہوئی تھی۔ اس کے سبھی گانے مقبول ہوئے تھے جن میں وحید مراد پر فلمبند اے نیر کا یہ خوب صورت گیت بھی شامل تھا۔

☆ سنو سنو اے شہر کے باسیو
گاؤں سے آیا ہوں
ایک نئی سوغات لایا ہوں

''پرکھ'' کے لیے اے نیر نے موسیقار کمال احمد کی دھنوں پر پانچ نغمات صدا بند کروائے۔ جن میں تین وحید مراد پر فلمائے گئے۔ ان میں ایک سولو گیت تھا۔

☆ پونچھ لے آنسو ان آنکھوں سے

یہ گیت فلم میں وحید مراد اپنی بہن کے لیے گاتا ہے۔

دوسرا نغمہ

☆ ساتھی کوئی ایسا ملے
جو عمر بھر ساتھ دے

اسے مہناز نے اے نیر کے ساتھ گایا تھا اور رانی اور وحید مراد پر پکچرائز ہوا تھا۔ تیسرا گیت بھی رانی اور وحید مراد پر فلمایا گیا تھا۔

☆ کب سے اکیلی ہوں، میں اک پہیلی ہوں
اپنا بنا لے گلے سے لگا لے مجھے

یہ ڈائیٹ بھی اے نیر اور مہناز نے گایا تھا۔ اسی فلم کا ایک اور نغمہ بھی جو اے نیر کا سولو گیت تھا وحید مراد پر عکسبند ہوا تھا جو کچھ یوں تھا۔

☆ رانی اور رانی میرے سپنوں کی رانی
لکھ دے میرے نام اپنی جوانی

ہدایت کار اقبال یوسف کی فلم ''خدا اور محبت'' اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت با مقصد فلم تھی۔ طافو اس کے موسیقار تھے جنہوں نے بلوچی دھنوں پر فیاض ہاشمی کا لکھا یہ گیت کمپوز کیا تھا۔

☆ اک بات کہوں دلدارا
ترے عشق نے ہم کو مارا

جو وحید مراد پر پکچرائز کیا گیا تھا اور مقبولیت کے لحاظ سے سرفہرست رہا تھا۔ اسی فلم میں بابرہ شریف نے پہلی بار اے نیر کے ساتھ گلوکاری کی جو اس پر اور وحید مراد پر عکسبند کیا گیا۔ اس گیت کے بول تھے۔

☆ اک لڑکی تم جیسی خوابوں میں آتی رہی
دل نہ دینا تم کسی کو مجھ کو سمجھاتی رہی
آتی رہی جاتی رہی، ہنستی رہی گاتی رہی
کہیں وہ، تم تو نہیں تم تو نہیں؟

''خدا اور محبت'' بھی اے نیر اور وحید مراد کی مشترکہ فلم کی حیثیت سے کامیاب رہی مگر ہدایت کار خلیفہ سعید کی فلم ''انسان اور شیطان'' کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے باوجود کہ اس کے ہیرو وحید مراد تھے اور گلوکاروں میں اے نیر بھی شامل تھے۔ دراصل خلیفہ سعید پنجابی فلموں کے حوالے سے اچھے ہدایت کار تھے۔ انہیں اردو فلموں کے موڈ مزاج کا بھرپور ادراک نہیں تھا۔ اس فلم میں اے نیر نے مہناز کے ساتھ جو ڈوئیٹ گایا تھا وہ وحید مراد اور نجمہ پر پکچرائز ہوا تھا۔ اس کے بول تھے۔

☆ تو ہے میرا پیار کہہ دے ایک بار
یہ رات یہ فضا میں
دیتی ہیں یہ صدائیں

وحید مراد اور اے نیر کی 1980ء میں مشترکہ فلمیں ''بدنام'' اور ''پیاری'' تھیں۔ ''بدنام'' ہدایت کار اقبال یوسف کی فلم تھی جو ناکامی سے دوچار ہوئی۔ اس فلم میں وحید مراد کی ہیروئن بابرہ شریف تھی۔ اے نیر نے اس فلم کے لیے یہ گیت گایا تھا جو وحید مراد پر پکچرائز ہوا۔

☆ کلیوں سے پھولوں کا ہے ایسا ناطہ

''بدنام'' کے مقابلے میں جمشید نقوی کی فلم ''پیاری'' نے کامیابی حاصل کی تھی۔ ناہید اختر نے اے نیر کے ساتھ یہ نغمہ صدا بند کرایا تھا۔

☆ نئے سال کی ابتدا
ہم کریں محبت سے

یہ گیت وحید مراد اور شبنم پر فلمبند کیا گیا تھا۔ اے نیر، وحید مراد اور شبنم کی وجہ سے یہ فلم باکس آفس پر گولڈن جوبلی کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

وقت

چاہتوں کے دل فریب گداز میں پل پل رنگ بدلتی فسوں خیز کہانی......ماں پر ہونے والے اندوہناک ظلم کا انتقام لینے پر تلا ہوا نوجوان اندر کی شرربار آگ میں جل رہا تھا۔ اسے حالات نے قہربار اور صف شکن بنا دیا تھا۔ ظلم کی چنگاریاں اس کے وجود میں ہولناک شعلوں کا روپ دھار چکی تھیں۔ وہ دشمنوں کو خاک وخون میں نہلا کر ساری رکاوٹوں کو روندتا جارہا تھا پھر اس کی شناسائی ایک سیمیں بدن، غنچہ دہن، شیریں سخن دوشیزہ سے ہوئی اور کیوپڈ کا تیر چل گیا۔ عزت سے رسوائی اور پھر سرخ روئی کے اس روح فرسا سفر میں وقت اس کے ساتھ تھا۔

سنسنی اور تحیر میں لپٹی دل گداز داستان

بہت جلد

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

کے صفحات پر ملاحظہ کریں

Downloaded From http://paksociety.com

اگلے سال 1981ء میں اداکار خان آصف کی فلم ''کالا دھندا گورے لوگ'' ریلیز ہوئی۔ جاوید سجاد اس کے ہدایت کار تھے۔ اس فلم کے موسیقار محبوب پرویز نے اس کے اکثر نغمے خود گائے جب کہ ایک نغمے میں اے نیر کا ساتھ دیا۔ اے نیر اور وحید مراد کے اشتراک سے سجا یہ نغمہ خاصا پسند کیا گیا۔ اس کے بول تھے۔

☆ یہ فضا یہ ہوا لے کے چلی کہاں
آسماں کے تلے پنچھی بن کے اڑا

وحید مراد کی آخری پروڈکشن ''ہیرو'' کے لیے بھی اے نیر اور مہناز کی آوازوں میں ایک گیت صدا بند کیا گیا تھا۔

☆ پیار کے وعدے او ساتھی بھول نہ جانا

مگر بوجوہ یہ نغمہ فلم میں شامل نہیں کیا جا سکا۔ تاہم وحید مراد کی 1987ء میں ریلیز ہونے والی آخری فلم ''زلزلہ'' ان پر فلمبند اس آخری نغمے کے لیے پلے بیک دینے پر اے نیر، وحید مراد کے آخری گلوکار قرار دیے گئے۔ وحید مراد کے ساتھ اے نیر کی مقبول ہونے والا پہلا گیت ''خریدار'' کا تھا اور آخری ''زلزلہ'' کا یہ نغمہ

☆ میں ہوں تیرے پیار کا دیوانہ
تیرا پیار مل گیا

اس کے شاعر سعید گیلانی تھے اور موسیقار وجاہت عطرے۔ جب کہ وحید مراد اور رانی پر اس کی فلمبندی ہوئی تھی۔

اے نیر شریف ماں باپ کی شریف اولاد تھے۔ اس لیے زندگی بھر بڑی صاف ستھری زندگی بسر کی۔ اپنے عروج کے دور میں بھی ڈس بیلنس نہیں ہوئے۔ نہایت انکساری اور عاجزی کا مظاہرہ کیا جہاں تک ان سے ممکن ہوا لوگوں کے کام آئے۔ کیا فلم والے اور کیا باہر والے جس کے لیے جو کر سکتے تھے کیا۔ دانستہ طور پر کسی کو دکھ نہیں دیا۔

جب فلمی صنعت کے زوال کا زمانہ آیا تو چپکے سے گھر بیٹھ گئے۔ اس دوران صبر آزما دور سے بھی گزرنا پڑا مگر ان کی خودداری نے کبھی کسی کے آگے دستِ طلب دراز کرنے نہیں دیا۔ ہماری فلم انڈسٹری کا یہ پرانا وتیرہ ہے کہ وہ فلم والوں سے لینا تو جانتی ہے دینا نہیں جانتی۔ جن فنکاروں سے لاکھوں کروڑوں کمائی ہے ان کے برے وقت میں انہیں اس طرح فراموش کر دیتی ہے جیسے انہیں جانتی پہچانتی بھی نہیں۔ اے نیر جس کی جادو بھری آواز کے سہارے بے شمار فلمیں کامیاب ہوئیں۔ ان کے فلم سازوں نے یہ دیکھنے اور پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ سنہری آواز کے شہنشاہ کس حال میں ہو؟

کہتے ہیں کہ دوست وہی اچھا ہوتا ہے جو برے وقت میں کام آئے۔ اس تناظر میں بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے۔ فلم انڈسٹری کسی کی دوست نہیں۔

اے نیر نے جو کمایا تھا جب سب جمع پونجی ختم ہو گئی تو کسمپرسی کی حالت میں بیماریوں نے آدبوچا۔ ایسی بات نہیں کہ فلم والوں کی سماعت میں ان کی اس بے کاری، بیماری اور مجبوری اور لاچاری کی خبر نہ پہنچی ہو۔ اس کے باوجود کسی نے اس کے لیے کچھ نہیں کیا۔ اس کا گایا ہوا ایک گانا تھا۔

☆ میں تو جلا ایسا جیون بھر
کیا کوئی دیپ جلا ہو گا

اپنے اس دکھی گیت کی طرح وہ اپنے دکھوں کی آگ میں جلتے جلتے خاکستر ہو گیا۔ 11 نومبر 2016ء کی شام کو سنہری آوازوں کا یہ دیپ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔

اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ جو اس دنیا میں آیا ہے اسے ایک دن یہاں سے جانا بھی ہو گا۔ دکھ اس بات کا ہے کہ ہمارے فلم والے اتنے کٹھور کیوں ہیں؟ اپنی فلموں کے لیے ایسے گیت تو لکھوا لیتے ہیں، انہیں فلما بھی لیتے ہیں کہ

اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں
ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

مگر اس پر خود بھی عمل پیرا نہیں ہوتے۔ کیسا تضاد ہے یہ!

اے نیر نے تو اپنے اچھے وقت میں ہی اپنے برے وقت کا ماتم کچھ ایسے کر دیا تھا۔

☆ زندگی کے ہاتھ میں آدمی کھلونا ہے
کسی کے گھر میں خوشیاں ناچے
کسی کے گھر میں رونا ہے

17 ستمبر 1950ء میں عارف والا کے مقام پر جنم لینے والا آرتھر نیر 11 نومبر 2016ء کو لاہور میں جمعۃ المبارک کے دن دل کا دورہ پڑنے پر دنیا چھوڑ گیا۔ وہ شخص جو ایک طویل عرصے تک دلوں کو ملانے، دلوں میں پیار کے دیپ جلانے کے گیت گاتا رہا اس کا اپنا دل اس سے دغا کر گیا۔ کرشن چندر نے ایک ناول لکھا تھا۔ ''دل کسی کا دوست نہیں'' یقیناً دل کسی کا دوست نہیں ہوتا اگر ہوتا تو ہمارے دلوں میں بسنے والے سنہری آواز کے اس شہزادے کو ہم سے کبھی جدا نہ کرتا۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایڈ فری لنکس

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر وکوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفرکہانی کا بارہواں حصہ

ہم اندر داخل ہوئے تو مایا اشوک کے پاس کھڑی تھی اور وہ اسے مبارک باد دے رہا تھا۔ سرجی نے سنا تو ترنت بولے۔ ''لگتا ہے اس کا رشتہ کہیں ہو گیا ہے جو اشوک اسے مبارک باد دے رہا ہے۔''

''اگر ہوتا تو اپنے شہباز کو تو ضرور خبر ہوتی۔'' میں نے شہباز کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

شہباز کا رنگ دوبارہ سے زرد پڑ گیا اور وہ اپنی خجالت مٹاتے ہوئے بولا۔ ''وہ کوئی بات تو کر رہی تھی مگر میں سمجھا

Downloaded From http://paksociety.com

ایسے ہی میرے پیار کو آزما رہی ہے۔"

شہباز کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے اس پر کوہ الم ٹوٹ پڑا ہو۔ چہرے پر غم والم کے بادل چھا گئے تھے۔ اس پر سرجی کی پریشانی۔ گویا وہ بھی شہباز کے غم میں شرکت پر کمربستہ تھے۔ انہوں نے اشوک سے پوچھا۔ "مایا کی بات کہاں پکی ہوئی ہے؟"

اشوک نے چونک کر انہیں دیکھا مگر سرجی نے اپنی بات جاری رکھی۔ "یا اللہ یہ کیا ہورہا ہے؟ ہم پر تو مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔"

مجھے معلوم تھا کہ سرجی بات کا بتنگڑ بنا کر مزے لے رہے ہیں۔ اس لیے میں نے کچھ کہا نہیں۔

اشوک کے چہرے پر حیرت کے آثار چھائے ہوئے تھے وہ سوالیہ انداز میں بولا۔ "کون سی بات پکی ہوئی ہے اور کیا مصیبتیں آ پڑی ہیں؟ اوپر والا اچھا کرے گا۔ آخر ہوا کیا ہے۔" وہ اب باقاعدہ پریشان نظر آرہا تھا۔

میں نے سرجی کی بات کا مطلب سمجھایا تو وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ "نہیں۔ آج اس کی برتھ ڈے ہے۔ آپ لوگوں نے تو مجھے دہلا ہی دیا تھا۔"

اشوک کی بات سن کر سرجی کے چہرے پر اطمینان ابھر آیا۔ وہ پھرکی کی طرح گھومے اور شہباز کو مبارک باد دی کہ ماشاء اللہ میرا خدشہ غلط ثابت ہوا۔ اور پھر بولے۔ "میرے تو پاؤں کے نیچے سے زمین ہی کھسک گئی تھی اور لگتا تھا کہ ابھی چکرا کر گر پڑوں گا۔"

شہباز نے سرجی کی مبارک باد انہیں اپنے گلے سے لگا کر بخوشی قبول کی اور پھر وہ دونوں خوش وخرم نظر آنے لگے۔

میں سرجی کی شرارتیں سمجھ رہا تھا اور اشوک بھی وہیں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ایک بندہ جو سمجھ نہیں رہا تھا وہ شہباز تھا۔ عشق کی کالی چادر اس کی عقل پر پڑ چکی تھی مگر دل مایا کی محبت میں روشن تھا۔

اسی اثناء میں نسرین سیاہ اسکرٹ اور شرٹ میں اپنی کھلتی رنگت اور گہری سیاہ آنکھوں سمیت کہیں سے نمودار ہوئی۔ بخدا یہ سچ ہے۔ اس پر اس خوش لباسی نے قیامت لا دی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بجلی بن کر ہر ایک دل پر گرنے کا اہتمام کر آئی تھی۔ میں خود بھی اسے دیکھتا رہ گیا۔ سرجی کہاں چپ رہنے والے تھے فوراً بولے۔ "آج تو قیامت ڈھا رہی ہے۔ اللہ شہباز کی نظر بد سے بچائے۔ اس کی نظر ماشاء اللہ بہت منحوس ہے۔"

شہباز نے انہیں گھور کر دیکھا وہ کچھ کہتا مگر اسی دوران نسرین قریب پہنچ گئی تھی۔ سرجی نے نسرین کو مایا کی سالگرہ کا بتایا اور کہا۔ "شہباز اس خوشی میں سب کے لیے سالگرہ کی دعوت کا اہتمام کررہا ہے۔"

شہباز بوکھلا گیا اور غصے کی حالت میں جلدی سے بولا۔ "کب بولا کہ میں کوئی دعوت دے رہا ہوں۔ اس پوری برائت کی دعوت کون کرے اور تم میری جمع پونجی اڑانے پر تلے ہو۔"

سرجی نے اس کی بات کو نظر انداز کردیا اور یہ کہتے ہوئے کلاس روم کی جانب لپکے کہ میں ابھی یہ خبر مایا کو دیتا ہوں مگر شہباز نے پیچھے سے ان کے کوٹ کے کالر کو پکڑ کر انہیں گھسیٹ لیا۔ "کیوں میرے سوڈیڑھ سو ڈالر مٹی میں ملواتے ہو اگر تم نے کوئی ایسی حرکت کی تو باہر برف میں دفن کردوں گا۔" شہباز باقاعدہ غصے میں تھا۔

سرجی بھی اکڑ گئے اور کہنے لگے۔ "بھلے قطب شمالی یا جنوبی میں دفن کردو مگر میں پیار کی توہین برداشت نہیں کروں گا۔"

شہباز سیخ پا ہورہا تھا۔ "پیار میرا اور مایا کا ہے، تو کیا اس کا ماما لگتا ہے۔"

"سرجی اب قسم کھا رہے تھے کہ میں ہر حال میں مایا کو بتاؤں گا کہ شہباز اس کی سالگرہ کی خوشی میں سب کی دعوت کررہا ہے۔"

شہباز دھمکیوں کے بعد سرجی کی منتیں کرنے لگا۔ میں اور نسرین دلچسپی سے یہ کارروائی سن رہے تھے۔

آخر سرجی نے یہ تجویز دی۔ "اگر شہباز ہمیں پیزا کھلا دے تو مایا کو نہیں بتاؤں گا۔"

میں نے شہباز کو سمجھایا کہ بیس ڈالر میں جان چھوٹ رہی ہے، اسی میں بھلائی ہے۔

وہ بے چارہ کہتا رہا کہ یہ زبردستی ہے اور آخر کار دو چار گالیاں دے کر پیزا کھلانے پر راضی ہوگیا مگر سرجی نے یہ شرط رکھ دی کہ روم کا پیزا کھائیں گے، سنا ہے بہت لذیذ ہوتا ہے۔

میں نے تصحیح کی "روم کا نہیں اٹلی کا پیزا مشہور ہوتا ہے۔"

وہ بولے۔ "روم بھی تو اٹلی میں ہے، بات ایک ہی ہے۔"

ہم اس تکرار کے بعد کلاس میں آئے۔ میں نے البرٹھ کو اپنے ہیومن ریسورس کے انٹرویو کا بتایا اور کہا کہ اس کا

Downloaded From http://paksociety.com

ریفرنس دیا ہے۔تو وہ خوشی سے بولی۔"نو پرابلم۔"

اتنے میں شہباز پر نظر پڑی وہ مایا کے ساتھ لگ کر کھڑا اسے سالگرہ کی مبارک باد دے رہا تھا۔سرجی ساتھ کھڑے تھے مگر شہباز ایک ہاتھ سے انہیں پیچھے دھکیل رہا تھا کہ کہیں وہ کچھ بول نہ دیں مگر سرجی کی دھکم پیل جاری تھی۔

میں اور نسرین ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ مارک میرے کان میں بول گیا۔"آج تو یہ بہت خوبصورت لگ رہی ہے۔"

نسرین نے پوچھا۔"کیا کہہ رہا ہے؟"

میں نے بتایا تو کہنے لگی۔"تمہیں خود نظر نہیں آرہا جو دوسرے آکر بتاتے ہیں۔"

میں اس کی بات پر شرمندہ سا ہوکر رہ گیا اور بولا۔"مصروف نہیں ہو تو ہمارے ساتھ پیزا کھانے چلو۔"

اس نے یہ کہہ کر انکار کردیا۔"ہجوم میں نہیں، پھر کبھی چلیں گے۔"

ہم اس زبردستی کی دعوت کے لیے چل پڑے۔ پیزا شاپ پر پہنچ کر ایک نیا جھگڑا کھڑا ہوگیا۔سرجی پانچ ٹاپنگ دلوا کر بھی راضی نہ تھے۔شہباز نے گالیوں کا طوفان بدتمیزی کھڑا کیا ہوا تھا۔سرجی اس پر بھی بضد تھے کہ مفتی کے لیے بھی لے چلتے ہیں اور شہباز کہہ رہا تھا کہ وہ تو ویسے بھی لے جانا تھا مگر اب تم مفتی کو کہتے رہو گے کہ میری وجہ سے آج یہ پیزا کھا رہے ہو۔

"سرجی اسے یہ دھمکی بھی دے رہے تھے کہ اب تم نے گالیاں دیں تو میں خان کو بھی بتادوں گا۔"

"سرجی میں تو آپ کو معصوم سمجھا تھا مگر آپ سے بڑا سیاپا کوئی نہیں۔"شہباز بالآخر جھنجلا اٹھا تھا۔

ہم پیزا شاپ کے ایک کونے میں شیشوں والی بڑی کھڑکیوں کے ساتھ رکھی رنگین کرسیوں اور گول میز کے گرد بیٹھے گرم پیزا سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ برف کے ڈھیر کھڑکی کے ساتھ پڑے نظر آرہے تھے۔ برف باری رکی تھی اور ہم پیزا کھا کر خود بھی گرم ہو چکے تھے۔سرجی نے اپنی جیکٹ اتارتے ہوئے کہا۔"ماشاءاللہ کتنی زیادہ بف (برف) پڑی ہے۔ لگے ہاتھوں کوئی سنو مین ہی بنا آتے ہیں۔" پھر ہمیں رشوت کی پیشکش بھی کی۔"اگر ٹھنڈ لگ گئی تو رات میں دونوں بھائیوں کو گرم دودھ میں جلیبیاں ڈال کر کھلاؤں گا۔"

شہباز کا پارہ چڑھ چکا تھا۔وہ دانت پیستے ہوئے۔"سرجی اب میں واقعی گستاخی کرنے والا ہوں۔آئندہ سے تم کو آپ نہیں بلکہ تم ہی کہوں گا (حالانکہ وہ پہلے ہی آپ سے تم پر آچکا تھا) اور ابھی باہر جا کر تم کو برف میں الٹا گاڑوں گا۔رات میں تم کو جلیبیاں بھی میں ہی کھلاؤں گا اور وہ بھی کھولتے ہوئے دودھ میں۔"

یہ سن کر سرجی نے مدد طلب نظروں سے میری جانب دیکھا تو میں بولا۔"یہ آپ دونوں بھائیوں کا مسئلہ ہے،آپ آپس میں ہی نمٹائیں۔"میں نے یہ کہہ کر اپنا واحد سلائس ختم کرلیا اور باہر جانے کے لیے اپنی جیکٹ پہننے لگا۔

سرجی کی بولتی بند ہوگئی تھی وہ منمنا کر کہنے لگے۔"میں تو قسم سے مذاق کررہا تھا۔"

ہم وہاں سے نکلے تو سیدھے سب وے اسٹیشن پر پہنچے۔ٹرین تیار کھڑی تھی۔اپنی ٹرین کے اندر جا بیٹھے ہمارے سامنے ایک مہذب گورا بیٹھا کسی کتاب کے مطالعے میں مکمل غرق تھا۔چمک دار شیشوں والی عینک اور صاف ستھرے لباس میں ہم سے بے نیاز بیٹھا کتاب میں کھویا تھا۔میری نظر اتفاقاً کتاب کے سرورق پر پڑی تو حیرت کا جھٹکا لگا وہ علامہ اقبال کو پڑھ رہا تھا۔میں حیرانگی کے ساتھ خوش بھی ہو رہا تھا کہ ایک غیر پاکستانی علامہ اقبال کی تحریروں میں اتنی دلچسپی لے رہا ہے۔

میں نے مداخلت کی اور اس سے پوچھا۔"آپ کیا پڑھ رہے ہیں؟"

اس نے اپنی کتاب کا سرورق مجھے دکھایا اور بولا۔"اقبال کو پڑھ رہا ہوں۔"

میں خاموش رہنے والا کہاں تھا۔ پھر پوچھا۔"آپ اقبال کو کیسے جانتے ہیں؟ وہ تو مشرق کا شاعر ہے۔"

وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا اور الٹا مجھ سے پوچھا۔"آپ شیکسپیئر کو جانتے ہیں؟"

میں بولا۔"ساری دنیا اسے پہچانتی ہے اور ہم تو نام کی حد تک اسے بہت جانتے ہیں۔"

وہ پھر بولا۔"مگر وہ تو مغرب کا لکھاری ہے۔آپ کیسے جانتے ہیں؟"

میں شرمندہ سا ہوگیا وہ پھر مجھ سے پوچھنے لگا۔"آپ کیا پاکستان سے ہیں؟"

میرے بجائے سرجی نے جواب دیا۔"ہم کچھ ماہ پہلے کینیڈا آئے ہیں، پہلے ہم پاکستان میں رہتے تھے۔"

اس نے اپنا سر ہلایا اور کہا۔"آپ کیا اسکولوں میں اقبال کو پڑھتے ہیں؟"

سرجی سے خاموش نہ رہا گیا اور بتانے لگے۔"پڑھتے تو

Downloaded From http://paksociety.com

نہیں مگر اس کی تصویر ہر کلاس روم میں لگی ہوئی ہے۔

وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ اسے کیا بتلایا جارہا ہے پھر خود ہی بتانے لگا کہ میں نے اقبال کی تمام شاعری اور فلسفہ پڑھا ہے۔ پھر کسی گہری سوچ میں ڈوبا اور دوبارہ سوچ سے نکل کر کہنے لگا۔ ''اس سے بڑا مفکر دنیا میں آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔''

شہباز میرے کان میں بولا۔ ''یہ کوئی سیاپا لگتا ہے اور ہمیں متاثر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر یہ ہمارا دماغ چاٹنے گا۔''

میں نے شہباز کی بات سنی ان سنی کر دی۔ اس سے کچھ پوچھنے والا تھا کہ کیپلنگ سب وے کا اسٹاپ آگیا۔ اسے بھی وہیں اترنا تھا۔ میں نے اس سے درخواست کی۔ ''کیا ہم کچھ دیر سب وے کی کسی بنچ پر بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟''

اس نے اپنی گھڑی دیکھی اور پھر اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ''میرے پاس پندرہ منٹ ہیں۔''

سرجی اور شہباز نے کہا۔ ''ہم تو نہیں رکیں گے۔ یہ کوئی خبطی ہے۔''

میں تو خود بھی یہی چاہتا تھا اس لیے فوراً میں نے جواب میں ان دونوں کا اس مہربانی پر شکریہ ادا کیا۔ وہ دونوں بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

اقبال کی شاعری تو میں نے پڑھ رکھی تھی مگر اس کے کسی فلسفے کی مجھے کچھ بھی آگہی نہ تھی۔ میں نے اقبال کے بارے میں اسے اپنی کم مائیگی کے بارے میں سچ سچ بتا دیا۔

ہم دونوں ایک بنچ پر بیٹھے تھے۔ آتی جاتی ٹرینوں کا شور تھا اور میں اسی شور میں اس سے پوچھ رہا تھا۔ ''اقبال کے فلسفے میں آپ کس چیز سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں؟''

وہ بول رہا تھا اور میں سننے کے ساتھ سمجھنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ جو کچھ میں سمجھا تو اپنے پڑھنے والوں کو بتا رہا ہوں۔

وہ بتانے لگا۔ ''آپ اقبال کو تب تک سمجھ ہی نہیں سکتے جب تک آپ اسے شاعر کے علاوہ ایک بڑا مفکر نہیں مانتے۔ آپ اقبال کو پڑھنے سے پہلے اس کا فلسفہ پڑھیں۔ تب اس کی شاعری سمجھ میں آئے گی۔ اقبال کا جذبہ احساس شدت کا تھا۔ وہ پہلے محسوس کرتا تھا اور گہرائی سے سوچتا تھا۔ میرے خیال میں اقبال ایک بڑا شاعر تو ہے ہی ایک بڑا مفکر بھی تھا۔ اقبال نے ایک ترتیب اور توازن سے انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کا احاطہ کیا ہے۔ اس کے فلسفہ خودی کو مغرب کے لوگ مسلمانوں کا تکبر اور غرور سمجھتے ہیں مگر وہ غلط ہیں۔

اقبال کی خودی کا مطلب خود شناسی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اندر ان صلاحیتوں کو پہچانے جو اسے انسان کا رتبہ دیتی ہیں۔ اپنی ذات کی اہمیت کا احساس کرنا ہی خودی ہے۔ اقبال کے نزدیک خدا کی پہچان کے لیے پہلے انسان کو اپنے آپ کو پہچاننا لازم ہے۔ پہچاننے سے مراد یہ نہیں کہ وہ یہ دیکھے کہ اس کا رنگ، نسل کیا ہے بلکہ یہ کہ اس کے اندر کون کون سی قابلیتیں ہیں اور وہ ان سے کیا کام لے کر انسان کے مرتبے تک پہنچ سکتا ہے۔ اپنی صلاحیتوں کی پہچان اور پھر اس کا اظہار دراصل اقبال کے نزدیک عمل ہے اور عمل ہی زندگی ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان میں خودی اس وقت بیدار ہوتی ہے جب اس کے دل میں بلند مقصد کے پانے کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔ اقبال کا فلسفہ آپ کو ان چیزوں سے روکتا ہے جس سے خودی کمزور پڑے۔ دوسروں سے مانگنے اور جھولی پھیلانے سے خودی کمزور ہوتی ہے جب کہ عشق اس کو مضبوط کرتا ہے۔ اقبال ہر ایک فرد کی اہمیت کے بارے میں بتاتا ہے اور اس فرد کے معاشرے میں دوسرے افراد سے ایک مضبوط رشتے میں جڑ جانے کی بھی تاکید کرتا ہے۔''

وہ بول رہا تھا اور میں خاموش بیٹھا حیرت سے اسے تک رہا تھا۔ اس نے بہت کچھ کہا تھا مگر میں اتنا ہی سمجھ سکا تھا۔ جتنا میں نے لکھا ہے۔

مجھے چپ سی لگ گئی تھی کیونکہ میرے پاس کہنے کو ایک لفظ بھی نہ تھا۔ میں بھی خودی کو اپنے مسلمان ہونے پر تکبر کو سمجھتا تھا اور وہ کچھ اور بتا رہا تھا۔ جب اس نے یہ کہا تھا کہ خدا کو سمجھنے کے لیے انسان پہلے اپنے آپ کو کھنگالے تو میرے ذہن میں اقبال کے یہ اشعار تھے۔

تیری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود تیرا
وجود کیا ہے؟ فقط جوہرِ خودی کی نمو

میں وہاں سے اٹھا تو معلوم ہوا کہ ہمیں بیٹھے ہوئے ایک گھنٹے سے زائد کا وقت گزر چکا ہے۔ نہ میں نے اس کا نام پوچھا اور نہ اس نے میرا۔

میں سب وے سے نکل رہا تھا تو آتی جاتی ٹرینوں کا شور کہیں دب چکا تھا کیونکہ میرے دماغ میں سوچوں کی تند لہریں موجزن تھیں۔

گو خودی کو میں کچھ اور نظر سے دیکھتا ہوں جو اس گورے نے بتایا وہ بھی ایک تشریح ہو سکتی ہے مگر میں یہ سمجھتا

Downloaded From http://paksociety.com

ہوں کہ خودی اللہ کے علاوہ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانے کا نام ہے۔صرف رب کے سامنے جھکنے سے آپ میں جو اعتماد آتا ہے وہ خودی کی بنیاد ہے۔رب کے سامنے جھکنا کوئی ایک عام فقر نہیں کیونکہ اگر آپ سوچیں تو اس میں غلامی سے آزادی تک کا سفر ہے۔اسی لیے اقبال نے کہا۔

خودی کا سر نہاں لاالہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ
کیا ہے تو نے متاع غرور کا سودا
فریب سود زیاں لا الہ الا اللہ

جب میں پرائمری میں تھا تو ان دنوں ہمارے محلے میں ایک بیوہ عورت سرداراں بی بی رہتی تھیں۔ وہ آٹھ جماعت پاس تھیں۔ میری ماں پڑھنے کے لیے مجھے اس کے گھر بھیج دیتیں۔ میں اس کا سودا سلف بھی لاتا اور اپنی پڑھائی بھی کرتا۔ یہ نہیں کہ وہ لاوارث تھی۔ گھر کی دیوار کے پار اس کے پانچ جوان بیٹے رہتے تھے مگر وہ خود اکیلی رہتی تھیں۔ بیٹے پڑھ لکھ کر اچھی نوکریوں پر تھے اور بیوہ ماں سے کہتے کہ آپ ہمارے ساتھ آ کر رہیں۔ وہ منت سماجت کرتے مگر یہ منع کر دیتی وہ ماں کو خرچ دینے کی سعی کرتے اور وہ انکار کر دیتی۔ گھر اس کے نام پر تھا اور اس نے بیچ میں دیوار کھینچ کر دوسرا حصہ اپنے بیٹوں کو کرائے پر دے رکھا تھا اور اسی کرائے سے اپنا گزر بسر کرتی۔ وہ ماں ہونے کے ناطے دینے کی کوشش بھی کرتے تو وہ سختی سے انکار کر دیتی اور کہتی میری خودی اس کی اجازت نہیں دیتی۔ ان دنوں میں خودی کو نہیں سمجھتا تھا مگر آٹھ جماعت پاس سرداراں بی بی اقبال کو سمجھتی تھی۔ وہ مجھے نصابی تعلیم سے زیادہ اقبال پڑھایا کرتی۔ بال جبریل اور بانگ درا میں نے پرائمری میں پڑھ لی تھیں۔

اقبال کا کلام وہ مجھے زبانی یاد کراتیں۔ خود گھر کا کام کر رہی ہوتیں اور میں سُر میں ان کے ساتھ باآواز بلند اقبال کا کلام پڑھتا رہتا۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاج سرداراں

مجھے اس قسم کی نظمیں زبانی یاد تھیں اور میں انہیں ترنم کے ساتھ سنایا کرتا۔ وہ بوڑھی ہوتی گئیں اور میں جوان۔ ایک دن اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ان کو جب دفنایا تو مٹی تلے سرداراں بی بی تھیں مگر کتبہ خودی سے سر اٹھائے قبر کے اوپر سر بلند کھڑا

سکھر... اولیاء اللہ کی سرزمین

سکھر تجارتی اعتبار سے صوبہ سندھ کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے پر واقع اس شہر کی تاریخ کا اندازہ محمد بن قاسم کے دور سے لگایا جاسکتا ہے۔ پرانا سکھر، نیا سکھر، دریائے سندھ، روہڑی کا شہر، تاریخی عمارتیں، پرانا قلعہ وغیرہ کے بعد پتا چلتا ہے کہ یہ شہر قدیم سے شہر جدید بننے تک کتنا سفر طے کر چکا ہے۔ اس شہر سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر پرانا شہر دوڑ ہے۔ مسلمان سپہ سالار محمد بن قاسم کے ہاتھوں راجا داہر کی شکست سمیت اس شہر نے کئی دور دیکھے۔ سلاطین غلاماں خلجی اور تغلق دور، ارغون اور ترخانہ کا دور، مغلیہ کلہوڑوں سیروں اور تاپروں کا دور، انگریز سرکار کا دور اور اب پاکستان کا دور۔ سکھر شہر دریائے سندھ کے کنارے آباد ہے۔ یہاں ہابیلا ہندوؤں کا بڑا مندر ہے۔ ریلوے لائن کے قریب ”بتوں کا تھان“ کے نام سے پرانی قبریں ہیں جو تاریخی حیثیت کی حامل ہیں۔ پرانا شہر اور روہڑی شہر یہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر واقع ہیں۔ پرانے دور میں ان پہاڑوں کے اپنے نام تھے۔ ان میں ایک آدم شاہ کلہوڑو کی پہاڑی ہے۔ یہاں آدم کی قبر بھی اسی پہاڑی پر واقع ہے۔ محمد بن قاسم جب سکھر کے قریب پہنچے تو یہاں کی گرم آب و ہوا کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے کہا سقر، سقر عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں دوزخ۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ سکھر میں اتنی گرمی پڑتی ہے کہ انسان کے منہ سے آواز نکلتی ہے۔ ”گرمی ہے یا دوزخ؟“ تاریخی کتب میں بہت سے نام ہیں۔ سکھر سندھی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں شریف، صحت مند، فارغ البال، یہ شہر پیروں، فقیروں اور اولیاء اللہ کی سرزمین ہے۔ اس لیے روہڑی شریف کہتے ہیں جہاں نیا سکھر ہے وہاں انگریز سرکار سے پہلے پھلوں اور کھجوروں کے باغات تھے۔ سکھر کا قلعہ سو گز لمبا اور تین سو گز چوڑا تھا جو دریائے سندھ سے 45 فٹ اونچا تھا۔ قلعے کی دیواریں 30 سے 35 فٹ بلند تھیں۔

مرسلہ: نوشین ملک، لاہور

Downloaded From http://paksociety.com

تھا۔ میں اپنے پڑھنے والوں سے درخواست کروں گا کہ ایک بار درود پاک پڑھ کر ان کی مغفرت کے لیے اپنے ہاتھ اللہ کے آگے اٹھالیں۔

میں اپارٹمنٹ پہنچا تو میرے دونوں ساتھی مجھ پر ہنس رہے تھے اور میں آج ان کی ہنسی کا برا نہیں منا رہا تھا۔

☆......☆

آج مجھے یا ان دونوں کو جاب پر نہیں جانا تھا۔ ہم اپارٹمنٹ میں بیٹھے گرم چائے پی رہے تھے جو ابھی میں نے بنا کر سب کو پیش کی تھی۔ شہباز بولا۔ ''آج جشن مناتے ہیں۔''

سرجی جنھوں نے اپنے دونوں گھٹنوں کو بازوؤں سے جکڑ کر سینے سے لگایا ہوا تھا اور چائے کا کپ کارپٹ پر رکھے خاموش نظروں سے ڈور وال کے باہر معلوم نہیں کیا دیکھے جا رہے تھے۔ جشن کے نام پر اچانک چونک پڑے۔ چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور وہ رازدارانہ لہجے میں بولے۔ ''پر مفتی کو معلوم نہ پڑے۔''

''کیا معلوم نہ پڑے؟'' شہباز بولا۔

''یہی جشن کا...... جشن میں کیا کیا ہوگا؟'' وہ اب ذرا قریب کھسک آئے تھے۔

میں بولا۔ ''بھلے ساری بلڈنگ کو خبر ہو جائے اور یہاں زیادہ سے زیادہ کون سا جشن منایا جا سکتا ہے؟'' پھر میں نے شہباز سے پوچھا۔ ''کیسا جشن منانا چاہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''یہ سرجی کوئی پشتو فلموں والا جشن منانا چاہتے ہوں گے، پر میرا مطلب یہ تھا کہ آج بھنا قیمہ بنا لیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اپنے بھوکے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

سرجی ڈھیلے پڑ گئے اور پھر دوبارہ ڈور وال کی کھڑکی کے سہارے بیٹھ گئے مگر اپنا تبصرہ جاری رکھا۔ ''بھنا قیمہ تو ماشاء اللہ آپ کی بھابی کو بہت پسند تھا۔''

''کیا بہت اچھا بناتی تھیں؟'' میں نے سوال کیا تو بولے۔

''نہیں! بناتا تو میں تھا، وہ تو ماشاء اللہ صرف تناول کرتی تھیں۔''

اب جو ہنسی کا طوفان ہمارے منہ سے پھوٹا تو سرجی کے باقاعدہ ناراض ہونے تک نہیں تھما۔ ہم نے پہلے منایا۔ بھابی کے واسطے دیئے۔ تب کہیں جا کر وہ راضی ہوئے اور پھر فوراً کچن میں جا کر پیاز چھیلنے لگے۔ بھنا قیمہ بنایا پھر دسترخوان بچھایا۔ پلیٹیں سجائیں اور دیگچا لانے سے پہلے ایک بڑے مرتبان میں دودھ کے اندر جلیبیاں بھی ڈال کر لے آئے۔

شہباز نے جلیبیوں کا شوربہ کھانے سے انکار کر دیا جب میں نے وجہ پوچھی تو بولا۔ ''تاثیر بہت گرم ہوتی ہے۔ میں آج نہیں کھاؤں گا بلکہ کبھی بھی نہیں کھاؤں گا۔''

سرجی نے سنا تو قیمے کا دیگچا واپس کچن میں لے گئے اور وہیں کھڑے کھڑکی سے منہ نکال کر بولے۔ ''اگر جلیبیاں نہیں کھانی تو قیمہ بھی نہیں ملے گا۔''

شہباز نے چیخنا چلانا شروع کر دیا لیکن سرجی نے اس کی آہ و بکا پر کان تک نہ دھرے۔ آخر شہباز بادل نخواستہ جلیبیاں کھانے پر راضی ہوا مگر سرجی نے پہلے اس سے قسمیں اٹھوائیں اور پھر مسکراتے ہوئے وہ دیگچا کچن سے اٹھا کر لیونگ روم میں لے آئے۔ میں نے سرجی سے پوچھا۔ ''کیا واقعی ان کی تاثیر گرم ہوتی ہے؟''

وہ بولے۔ ''پہلے بھی بتایا تھا کہ صرف باتیں بنی ہوئی ہیں۔ مجھے تو کچھ نہیں ہوتا۔''

شہباز بولا۔ ''آپ کو ایک من سلاجیت بھی کھلا دی جائے تب بھی کچھ نہیں ہوگا۔''

سلاجیت پر مجھے نانگا پربت ٹرپ کے ساتھ شاہ جی یاد آ گئے اور ایک مسکراہٹ میرے لبوں پر پھیل گئی۔

مجھے اب ہیموسال کی طرف سے کال کا انتظار تھا۔ ریفرنس مانگ لینا جاب ملنے کی ایک طرح سے گارنٹی ہوتی ہے۔ میں اپنی جانب سے یہ جاب اپنی ہی سمجھ رہا تھا۔

رات میں مفتی آیا تو ہم تینوں خاموشی سے بیٹھے مفتی کا پسندیدہ ٹی وی شو دیکھنے لگے۔ مفتی بھی کھانے کے بعد ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''آج کوئی نئی بات یا کوئی خبر؟''

''خبر اچھی نہیں ہے؟'' وہ بولا۔

''ہیموسال کی پراڈکٹ تو ابھی ریسرچ کے مراحل میں ہے اور انویسٹر اپنا سرمایہ لگا رہے ہیں۔ اب فنڈنگ رک گئی ہے اور شاید وہ نئے لوگ نہ رکھیں۔'' مفتی نے جواب دیا۔

میں پریشان ہو گیا۔ سرجی نے ٹی وی بند کر دیا۔ شہباز ہانپنے لگا اور مفتی بے چارگی سے مجھے دیکھنے لگا۔ مجھے یقین نہ آ رہا تھا کہ میرا اپنا یقین کیسے کمزور ہو سکتا ہے جو مجھے اپنے رب پر تھا کہ یہ جاب مجھے ملے گی۔ مفتی کی سنجیدگی دیکھ کر میں ذرا سا لڑکھڑایا مگر پھر تیزی سے سنبھل گیا۔ مجھے اپنا بھروسا کمزور نہیں کرنا تھا۔ اتنے لوگوں کو رزق صرف ہیموسال سے تو نہیں مل رہا تھا۔ مجھے بھی جہاں سے ملنا ہے وہیں سے ہی ملے گا مگر مفتی کی خبر مجھے بے چین کر رہی تھی۔ کل دوبارہ کیبن سینٹر جانا تھا۔ میں

Downloaded From http://paksociety.com

اپنی پریشانی بھگانے کی کوشش کرتے ہوئے سونے چلا گیا لیکن میں سویا ہوا بھی جاگ رہا تھا۔ وسوسوں کے ناگ مجھے ڈسنے لگے تھے۔

میں ایک ہفتے سے طارق سے پوچھ رہا تھا کیا ہیومن سالوں والوں نے فون کیا ہے؟ تو یہی جواب ملتا، آجائے گا۔ وہ صاف صاف ''نہیں'' بھی نہیں کہتا تھا۔ مگر یہ ضرور کہتا کہ جاب جوائن کرنے سے پہلے نیو یارک ضرور آجانا۔ کین سینٹر میں نسرین بھی یہی سوال کرتی، جو میں طارق سے کررہا تھا اور میں ''نہیں'' کہہ کر بات وہیں ختم کردیتا۔ وہ خاموش ہوجاتی۔ وہ مجھے سمجھنے لگی تھی کہ آگے کوئی بھی بات میرا دل دکھائے گی۔

میرے خیال میں تو ثمارا نے ریفرنس مانگنے کے بعد دوسرے دن اپنے رابطے شروع کردیے تھے مگر اب ایک ہفتہ ہونے کو آیا ہے اگر ایک بار انکار کردیتے تو میں بھی مطمئن ہوجاتا مگر اب تو میں بیچ میں آپھنسا تھا۔ ہر دن اسی امید سے شروع ہوتا کہ آج شاید کوئی خبر کہیں سے مل جائے اور دن مایوسی پر ختم ہوجاتا۔ اسی دوران میں کین سینٹر بھی جارہا تھا اور ہولڈنگ سینٹر میں جاب بھی جاری تھی۔ زندگی ٹھہری گئی تھی۔ زندگی کی موجوں میں اضطراب نہ تھا دنیا پھیکی لگنا شروع ہوگئی تھی۔

ایک دن میں کین سینٹر سے واپس آیا تو دوسری فارما کمپنی سے میرے لیے کسی کا پیغام تھا۔ میں نے اسی وقت فون ملایا تو ان کی ہیومن ریسورس کے کسی کارندے سے بات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ کل جمعہ کے دن انٹرویو پر آسکتے ہیں؟

میں جا تو سکتا تھا مگر پچھلے دو دنوں سے شور مچا تھا کہ اس جمعہ کو بہت بڑا برفانی طوفان آنے والا ہے۔ میری اپنی گاڑی تو نہ تھی اور بسوں کا شیڈول طوفان میں خراب ہوجاتا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے درخواست کی۔ ''کل تو سنو اسٹارم ہے اگر آپ پیر کے دن یہ انٹرویو رکھ لیں؟''

میں یہ سوال کرنے کے بعد پچھتا رہا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے ڈراپ ہی نہ کردیں مگر ادھر سے انتہائی خوش دلی سے جواب آیا۔ ''کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ پیر کو دو بجے سہ پہر آجائیں۔''

میں نے جواب سن کر سکھ کا سانس لیا اور حیران بھی تھا کہ میں یہاں ان کے لیے کوئی اہم حیثیت نہ رکھتا تھا۔ وہ مجھے یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ ہم دوبارہ فون کرلیں گے اور پھر کبھی فون نہ کرتے اس حالت میں، میں کیا کرلیتا۔

جب سے میں کینیڈا آیا تھا تو ہر دوسرا ملنے والا ایک مشورہ ضرور دیتا کہ یہاں کے تین ڈبلیو پر کبھی اعتبار نہ کرنا۔ ایک دو من Woman، دوسرا Weather اور تیسری چیز Work یعنی جاب۔ تینوں کسی وقت بھی آسکتے ہیں اور کسی وقت جاسکتے ہیں یا تبدیل ہوسکتے ہیں۔ عورت یا جاب کا ابھی تجربہ نہ ہوا تھا مگر موسم یہاں ایسا تھا کہ ایک دن بعد چالیس درجے کا فرق پڑسکتا ہے۔ آج پلس بیس ہے تو صبح منفی بیس بھی ہوسکتا ہے۔ آج موسم قدرے بہتر تھا اور کل منفی چالیس تک گررہا تھا۔

شہباز کو کین سینٹر والے کسی OP-CO پروگرام میں بھیج رہے تھے۔

OP-CO جاب پانے کا ایک بہترین نظام ہے۔ کین اور اس جیسے سینٹر تارکین وطن کو کینیڈا کے نظام، بولنے سننے، چلنے اور بات کرنے کے ہنر سکھاتے ہیں اور پھر ان کے Resume مختلف کمپنیوں کو بھیج دیتے ہیں۔ اگر کمپنی کو ضرورت ہوتی ہے تو وہاں لگ بھگ دو تین ماہ بلا معاوضہ کام کرنا پڑتا ہے۔ ٹریننگ بھی دی جاتی ہے اگر کمپنی کو آپ کا کام پسند آیا تو وہ آپ کو جاب کی آفر کردے گی۔ ورنہ آپ کے تجربے میں یہ بات لکھی جاسکتی ہے۔ زیادہ تر لوگوں کو اسی پروگرام کے تحت جاب مل جاتی ہے۔ شہباز کو کسی کیمیکل کمپنی کی لیبارٹری میں اسی پروگرام پر بھیجنے کی بات ہورہی تھی۔

سرجی کو شاید کسی بھی جاب سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ سیکیورٹی کی جاب کررہے تھے۔ اتنا کمالیتے کہ خرچے کے بعد بھی بچا لیتے۔ وہ جاب ڈھونڈنا تو درکنار اس بارے میں سوچنے کا تردد بھی نہ کرتے تھے۔ وہ اپنی موج میں جی رہے تھے اور اس موج کے باہر دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ اسی دوران وہ میرے پیچھے پڑ گئے کہ اگر میں نیو یارک جاؤں تو انہیں بھی ساتھ لے جاؤں۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ کیا کریں گے؟''

جواب میں فرمانے لگے۔ ''فیض صاحب سے ملنے کا تو بہانا ہے ورنہ نیو یارک دیکھنے کا شوق تو مجھے بچپن سے ہے۔'' کبھی یہ کہتے۔ ''آپ کے ساتھ نیو یارک دیکھنے کا شوق مجھے سالوں سے ہے۔''

میں کہتا۔ ''ہماری پہلی ملاقات چار ماہ پہلے ہی ہوئی ہے اور یہ سالوں کی بات کہاں سے آگئی؟''

ہار ماننا تو انہیں آتا ہی نہ تھا۔ بولے۔ ''انسان خواب دیکھ کر بھی تو آرزوئیں پال لیتا ہے۔''

یعنی وہ خوابوں میں اپنے آپ کو میرے ساتھ نیو یارک

Downloaded From http://paksociety.com

میں گھومتے دیکھا کرتے تھے۔

شہباز کہنے لگا۔ ''آپ دونوں جا رہے ہیں تو کیوں نہ میں بھی اپنے بھائی سے ملنے چلا جاؤں؟''

مفتی رات نو بجے اپارٹمنٹ پہنچا تو سرجی نے اس سے پوچھا۔ ''آج بھی ہیموسال کے فنڈ نہیں آئے؟''

یہ سوال سرجی اس سے ہر روز پوچھتے اور وہ ہر روز تنگ آکر یہی کہتا۔ ''مجھے کیا معلوم۔ کیا مجھے وہ ہر روز کی خبر دیتے ہیں یا میں کوئی فنانس ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتا ہوں۔''

آج مفتی نے پوچھ ہی لیا۔ ''آخر آپ ہر روز ہیموسال کی فنڈنگ کی ٹوہ میں کیوں رہتے ہو؟''

کہنے لگے۔ ''فنڈنگ آئے گی تو جاب آفر ہوگی اور جب جاب آفر ہوئی تو میں امریکا گھومنے جاؤں گا۔''

مفتی بھی شدید پریشان تھا۔ وہ نقطے ملاتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔ ندیم کو جاب آفر ہوگی تو سرجی امریکا کس طرح سے جائیں گے؟

مفتی کے سوال پر سرجی نے میرا امریکا جانے کا پروگرام گوش گزار کردیا۔ شہباز ہمیشہ کی طرح کارپٹ پر بنیان پہنے لیٹا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اسی دھونکنی سے دم زدہ آواز آئی۔ ''میں بھی جاؤں گا۔''

اب سرجی کی باری تھی۔ ''پوگرام (پروگرام) تو میں نے بنایا ہے، کسی اور کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا، معلوم نہیں کہیں ہم بھی نہ پھنس جائیں؟''

میں اور مفتی اب دلچسپی سے ان کی گفتگو سن رہے تھے۔

سرجی کے بولنے پر وہ لیٹے لیٹے غضب ناک ہوا، اپنی سانسیں درست کیں اور پھر گالیاں دینے لگا۔ ہمیشہ کی طرح سرجی نے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں۔ گالیوں کے بعد بولا۔ ''میرے جانے سے تم کیسے پھنسوگے؟''

سرجی نے طوفان کا رخ میری جانب موڑ دیا اور بولے۔ ''ندیم کہتا ہے کہ غیر قانونی طریقوں سے جو لوگ کینیڈا آتے ہیں وہ ہو بہو شہباز کی طرح کے ہوتے ہیں۔'' پھر معصومانہ انداز میں کہا۔ ''ہمیں کیا معلوم کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ میری امیگریشن آٹھ ماہ میں ہوئی۔ اللہ جانے وہ اصلی ہے یا نقلی؟''

سرجی نے عذاب مجھ پر ڈال دیا تھا۔ شہباز کی سرخ آنکھیں میری جانب لپکیں اور میری سرجی کی طرف، جواب انجان بنے بیٹھے تھے۔ میں نے گڑگڑا کر سرجی کی منت کی۔ ''اللہ کے واسطے بتادو کہ تم نے مذاق کیا ہے، ورنہ یہ درندہ مجھے پھاڑ کھائے گا۔''

وہ شہباز کی غلط فہمی دور کرنے کی خاطر کہنے لگے۔ ''یہ نہیں کہا تھا کہ وہ شہباز جیسے ہوتے ہیں، بلکہ یہ کہا تھا کہ اس جیسے فراڈی لگتے ہیں۔''

مفتی کے قہقہے لیونگ روم میں گونجنے لگے اور وہ اسی قہقہوں میں سرجی کو تکیے سے پیٹتا رہا تھا اور سرجی دہائیاں دے رہے تھے۔ ''مجھے اس تشدد سے بچاؤ..... بچاؤ.....''

اب شہباز جان چکا تھا کہ سرجی اس کی ٹانگیں کھینچ رہے ہیں وہ دوبارہ سے ایک دو گالیاں دے کر لیٹ گیا۔

کچھ دیر ہم ہنستے رہے اور پھر سرجی کا روئے سخن میں بنا۔ ''کیا کل کی تیاری نہ کرلیں؟''

میں حیران ہوا کہ کل کیا ہے جس کی تیاری کرنی ہے۔ پھر خیال آیا کہ جمعہ نماز کی بات کر رہے ہوں گے۔ میں نے استفسار کیا تو بولے۔ ''ماشاء اللہ کل بہت بڑا طوفان آرہا ہے۔ بہت برف باری ہوگی۔'' پھر شہباز کی جانب دیکھ کر بولے۔ ''کوئی دعوت کا پوگرام (پروگرام) ہونا چاہیے۔''

شہباز جو ابھی تک خفگی کی حالت میں پڑا چھت کو تک رہا تھا، دوبارہ سے بپھر گیا۔ ''اٹاوا سے لے کر بفلو تک ایمرجنسی لگادی گئی ہے اور آپ جشن منانا چاہتے ہیں۔''

سرجی اس بات پر بضد تھے کہ زندگی میں پہلی بار اتنا بڑا برفانی طوفان دیکھنے کو مل رہا ہے اور آپ لوگ اللہ کی نعمتوں کے منکر ہو رہے ہو۔ یہ کہہ کر ڈور وال کی کھڑکی کا پردہ کھسکایا۔ باہر جھانکا اور بولے۔ ''طوفان کے آثار نظر بھی آرہے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''برف گر رہی ہے؟''

بولے نہیں۔ ''اندھیرا سا چھا گیا ہے۔''

مفتی نے اپنے میٹرس سے دہائی دی۔ ''رات ہے۔ اندھیرا نہیں تو کیا سورج چمکے گا۔''

ہلکے سے خفا ہوئے اور کہا۔ ''میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا تھا، ہر کوئی میری بات پکڑتا ہے۔''

شہباز نے پھر ایک لمبی ٹھنڈی آہ بھری اور بے دست و پا سا ڈھیر ہوگیا۔

صبح سو کر اٹھا تو دس بج رہے تھے۔ سنو اسٹارم کی وجہ سے کین سینٹر بھی بند تھا۔ آج میری ہولڈنگ سینٹر میں جاب بھی نہ تھی۔ راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ چھٹی والے دن دیر تک سونا بھی ایک نعمت سے کم نہیں۔ ایک آسودگی میں آپ اٹھتے ہیں۔ خمار سے جاگتے ہیں۔ تادیر بستر سے الگ ہونے کو دل نہیں کرتا۔ سرجی اور شہباز دونوں ابھی تک سو رہے تھے۔ سر

Downloaded From http://paksociety.com

جی نے اپنے آپ کو کمبل میں اس طرح لپیٹا تھا کہ خدانخواستہ کوئی قبر سی بنی محسوس ہو رہی تھی۔ ان میں ذرا سی بھی جنبش نہ تھی۔ میں ڈر سا گیا کہ کہیں اللہ نہ کرے برفانی طوفان دیکھے بغیر گزر تو نہیں گئے۔

شہباز خونخوار قسم کے خراٹے لے رہا تھا۔ میں اپنے دل میں کئی خدشات لیے آہستگی سے کسی بلی کی طرح سرجی کی طرف رینگتا ہوا گیا اور ڈرتے ڈرتے سرجی کے کمبل کو پکڑ کر ذرا سا ہی کھینچا تو کمبل سے آواز آئی۔ ”بف باری ہو رہی ہے کیا؟“ پھر وہ اٹھ بیٹھے اور میں دوبارہ اپنے میٹرس پر کھسکتا ہوا آیا اور سر پکڑے لیٹ گیا تھا۔

سرجی اٹھے اور سوتے ہوئے شہباز کو خوا مخواہ میں ہلکی سی لات ماری تو وہاں سے نازیبا قسم کے الفاظ نکلے اور پھر دوبارہ خراٹے شروع ہو گئے۔

سرجی بولے۔ ”یہ نیند میں بھی گالیاں بکتا ہے۔ ہم اللہ کا نام لے کر اٹھتے ہیں اور یہ نازیبا کلمات کہتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ نے بھی تو اٹھتے ہی برف باری کا پوچھا۔ اللہ کا نام تو نہیں لیا؟“

کہنے لگے۔ ”بف باری بھی تو اللہ کا عطیہ ہے۔“

میں بھنا گیا اور ان کی بحث کو ختم کرنے کی خاطر کمرے کی ڈور وال کا پردہ ذرا سا ہٹایا تو شیشوں سے باہر ایک عجیب سا منظر تھا۔ برف باری رات کے آخری پہر شروع ہو چکی تھی۔ گرتی برف کی تیز رفتاری نے منظر کو اوجھل کر رکھا تھا۔ زمین، آسمان اور درخت سب کے سب برف کی سفید چادروں میں لپٹے مزید برف کو سہہ رہے تھے۔ چہار جانب ایک اجلی سفیدی تھی جو آسمان سے ہو کر فضا اور زمین پر پھیلی تھی۔ سرجی بھی دم بخود ڈور وال کے پار دیکھے جا رہے تھے۔ ان کا منہ کھلا تھا اور......اور دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھے حیرت سے باہر کا منظر دیکھتے ہوئے سبحان اللہ، سبحان اللہ کہے جاتے تھے۔

آج میں بھی ان کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ کیونکہ آج ہماری سب کی چھٹی تھی۔ ہمیں باہر کہیں نہیں جانا تھا اور اپنے اپارٹمنٹ میں بیٹھے یہ منظر جتنا دلکش تھا وہ بیان سے باہر ہے۔

شہباز بھی جاگ چکا تھا۔ لیٹے لیٹے اس نے باہر جھانکا اور یہ کہتے ہوئے کروٹ بدل کر پھر سو گیا۔ ”باہر سیاپا شروع ہو گیا ہے؟“

سرجی یہ خوش خبری دینے تیزی سے لیونگ روم کی جانب بھاگے کہ مفتی کو یہ منظر دکھلا کر داد سمیٹ سکیں۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے آیا کہ کہیں سوتے ہوئے مفتی کو جگا کر کوئی نیا فساد شروع نہ کر دیں مگر شکر ہوا کہ وہ بھی جاگ رہا تھا۔ باہر بچھی اور گرتی برف کو تنقیدی نگاہ سے دیکھ کر بولا۔ ”ایسا اسٹارم بہت سالوں بعد آیا ہے۔“

سرجی بولے۔ ”کیسا طوفان ہے کہ آندھیاں بھی نہیں چل رہیں۔“

مفتی بولا۔ ”یہاں آندھیاں نہیں چلتیں بلکہ صرف برف گرتی ہے۔“

سرجی بولے۔ ”اگر برف باری کے دوران آندھی بھی چلے تو لطف دوبالا ہو جائے۔“

مفتی نے غصے سے انہیں دیکھا تو وہ جلدی میں یہ کہتے ہوئے کچن میں گھس گئے۔ ”آج سب کے لیے گرم چائے میں بناؤں۔“

ہم گرم چائے کی چسکیاں لیتے باہر زمین بوس ہوتی برفوں کو دیکھ رہے تھا۔ اتنے میں شہباز بھی بڑبڑاتا ہوا اٹھ آیا۔ باہر شدید برف باری کو غور سے دیکھ کر بڑبڑاتا ہوا واش روم میں جا گھسا۔

میں اور سرجی نے مل کر ناشتا بنایا۔ جب سے کچن کا انتظام میرے ہاتھ میں آیا تھا تب سے گوشت بھی بننے لگا تھا۔ میں آٹے کا تھیلا بھی لے آیا تھا۔ سرجی بیلنا ڈھونڈھ لائے تھے۔ توا شہباز ماموں کے گھر سے چرا لایا تھا۔ اب ہم روٹیاں بھی بنا لیتے تھے۔ چھٹی ہو تو سرجی پراٹھا بنانے کی مشق کرتے پائے جاتے۔ رات کے سالن اور پراٹھوں سے ناشتا کیا جاتا۔

شہباز نے سب کے لیے دوبارہ چائے بنائی۔ ہم نے بیس فٹ لمبی ڈور وال سے سب پردے ایک جانب کھسکا دیے تھے۔ باہر متواتر برف گر رہی تھی اور ساتھ تیز ہوا بھی تھی۔ وال کے ساتھ والی جھاڑیاں برف میں چھپ چکی تھیں۔ سرجی لیونگ روم کے دوسرے کونے میں کمپیوٹر ٹیبل کے ساتھ اپنے کمبل میں لپٹے باہر نظریں جمائے چائے پی رہے تھے۔ شہباز چائے پی کر دوبارہ کسی ڈپریشن میں کارپٹ پر کراہ کراہ رہا تھا۔ مفتی ٹی وی دیکھ رہا تھا اور میں چائے پیتے ہوئے سب کو دیکھ رہا تھا۔

میں نے شہباز سے پوچھا۔ ”کیا واقعی تم نیویارک جانے کا پروگرام بنا رہے ہو؟“

”ہاں! آپ دونوں جا رہے ہیں تو میں یہاں اکیلا بور ہوں گا۔ اسی بہانے نیویارک بھی دیکھ لوں گا اور بھائی سے بھی

Downloaded From http://paksociety.com

ملاقات ہوجائے گی۔'' شہباز نے جواب دیا۔

کونے سے سرجی کی آواز آئی۔''تو مایا کو کیا بتا کر جاؤ گے؟''

''مایا کو کیا بتانا ہے؟ کیا وہ میرے نکاح میں ہے؟'' شہباز غرایا۔

سرجی نے ایک اور فقرہ اس کی جانب پھینکا۔''آج نہیں تو انشاءاللہ کل نکاح ہوجائے گا۔'' یہ کہہ کر چائے کا ایک لمبا گھونٹ بھرا اور زبردستی کی ایک ڈکار بھی ماری۔

''کیا میں اس سے شادی کروں گا؟'' شہباز نے اپنی بات جاری رکھی۔''کچھ وقت سنوائی کا ہوتا ہے۔منہ سے اچھی بات تو نکالنی چاہیے۔''

سرجی بولے۔''ایک تو سنوائی کا ٹائم مغرب کی اذانوں کا ہوتا ہے اور دوسرا یہ بتاؤ کہ اتنے دن سے اس معصوم نشائی کو دھوکا کیوں دے رہے تھے؟''

بات آگے بڑھ رہی تھی کہ میں نے مداخلت کی۔''یہ سنو فال تھے تو باہر شہباز سائز کا سنومین بنائیں گے۔''

یہ سن کر سرجی بولے۔''پھر تو شرنگ کا سامان لانا پڑے گا۔'' اس پر لیونگ روم پھر قہقہوں سے گونج اٹھا اور پھر سے سرجی تکیے سے مفتی سے پھر پٹ رہے تھے۔اب کی بار حیرت انگیز طور پر شہباز بھی ہنس رہا تھا۔

ایک دو گھنٹے تو ہم یہ برف باری دیکھتے رہے۔پھر سرجی کے علاوہ ہم بور ہونا شروع ہوگئے۔اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ وقت تھم سا گیا تھا اور یہ اپارٹمنٹ کوئی قید خانہ محسوس ہونے لگا تھا۔باہر بھی نہ نکل سکتے تھے۔درجہ حرارت اتنا نہیں گرا تھا مگر ونڈ چل (برفانی ہواؤں) نے ہر چیز کو منجمد کردیا تھا۔جو برف گرتی، وہ وہیں آئس بن جاتی۔یہ سلسلہ جو رات میں شروع ہوا تھا، شام تک جاری رہا۔میں کبھی سوتا، کبھی جاگتا، کبھی سرجی کو اور کبھی شہباز کو چھیڑتا مگر وقت گزر نہیں رہا تھا۔ مجھے کل ہولڈنگ سینٹر بارہ بجے دن میں جانا تھا۔سرجی اور شہباز کو بھی اپنی اپنی جاب پر جانا تھا۔ہم نے رات کا کھانا کھایا اور سو گئے۔معلوم نہیں رات کے کس پہر برف باری رکی۔میں نیند میں تھا اور اسی نیند میں کچھ مشینیں چلنے کی آواز بھی باہر سے آرہی تھیں۔

صبح جلدی بیدار ہوگیا۔باہر جھانکا تو راستے پر سے رات ہی کو برف ہٹادی گئی تھی۔دونوں جانب برف کے پہاڑ کھڑے نظر آرہے تھے۔چیڑ کے درخت برفوں سے ڈھکے ایک شاندار منظر تخلیق کررہے تھے۔چھتیں، زمین، درخت گاڑیاں سب کچھ سفیدی میں ڈھکا ہوا تھا۔قدرت کی صناعی ہر جانب نظر آرہی تھی۔ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہاں ڈوروال نہیں بلکہ ایک جاذب نظر پینٹنگ دیوار پر لگی ہے۔

اسی اثناء میں فون بجا تو میں نے ہی اٹھایا۔میں حیرت سے اچھل پڑا کیونکہ دوسری جانب پاکستان سے میرے ناناپربت کے ساتھی شاہ جی تھے۔وہ سوال پر سوال پوچھ رہے تھے۔''ہمیں بھول گئے ہو کیا؟''

میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کو بھول جائیں۔''

پھر آواز آئی۔''استاد والی نوکری کررہے ہو؟''

''ہاں کسی کو سبق پڑھا رہا ہوں اور کسی سے بہت کچھ پڑھ رہا ہوں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

وہ ذرا پریشان ہوکر بولے۔''تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں، کیا حرام چیزیں تو نہیں پینے لگ گئے؟''

''نعوذ باللہ! شاہ جی کیا میں ایسا لگتا ہوں آپ کو؟''

''لگتے تو نہیں تھے مگر ان کافروں کے ملک میں کسی کا کیا پتا چلتا ہے؟'' پھر بولے۔''چلو اس بات کو چھوڑو، یہ بتاؤ پاکستان کب آرہے ہو؟'' میری آواز دکھ و درد میں ڈوب گئی اور بولا۔''معلوم نہیں شاہ جی، آپ دعا کریں کہ کٹ جائیں یہ عذاب سارے، یہ خواب سارے۔''

وہ پھر پریشانی سے بولے۔''حرام چیزوں سے محفوظ رہنا، مجھے فکر ہورہی ہے کہ کہیں پینے پلانے تو نہیں لگ گئے۔''

میں نے انہیں تسلی دی۔ دوسرے سوال پوچھنے لگے۔''برف باری ہوتی ہے؟ گلیشیر بھی بہت بڑے بڑے ہوں گے۔کیا پہاڑ بھی ہنزہ سے بڑے ہیں؟''

میں نے کہا۔''یہاں پہاڑ نہیں ہیں۔ سارا میدانی علاقہ ہے۔''

دوسری جانب سے وہ بولے۔''یار! مذاق نہ کرو۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ پہاڑ بھی نہ ہوں اور برف بھی پڑے؟ یہاں ڈیرہ میں تو برف نہیں پڑتی حالانکہ میدانی علاقہ ہے۔'' پھر تشویش بھرے انداز میں کہنے لگے۔''محسوس ہوتا ہے کہ تم کچھ حرام چیزیں پینے لگے ہو جو اتنی بے تکی باتیں کررہے ہو۔''

میں نے قسمیں کھا کر ان کی تسلی کروائی تو وہ مطمئن ہوئے۔

وہ کینیڈا کا پوچھتے اور میں دریا سندھ کا پوچھتا، جس کے کنارے ہم رات گئے بیٹھے رہتے تھے۔میں اس چاندنی کا پوچھتا جو دریا کے پانیوں پر جھلمل جھلمل کرتی اور میں مدہوش

Downloaded From http://paksociety.com

بیٹھا اس چاندنی کو ڈولتے دیکھتا تھا۔ میں ان ہواؤں کا پوچھتا جو دریا کنارے درختوں کے اوپر اوپر چلتیں تو پتے ہم سے سرگوشیاں کرتے تھے۔ میں ان دوستوں کا پوچھتا جو جاڑوں کی بھیگتی راتوں میں دریا کنارے ٹھڈوے ہوٹل کی کرسیوں پر اپنی گرم چادروں میں لپٹے بیٹھے بمشکل ہاتھ باہر نکال کر گرم چائے کا کپ اٹھاتے تھے۔ میں اس دھند کا پوچھتا جس کا کوئی اندازہ نہ ہوتا تھا کہ یہ کناروں سے نیچے دریا میں گر رہی ہے یا دریا کی سطح سے اٹھ کر کناروں سے لپٹتی ہے۔ میں اس کچی مٹی کی خوشبو کا پوچھتا جو اپنے رب کو سجدہ کرتے وقت میرے نتھنوں سے ٹکراتی تھی۔ میں ان سرسوں کے رنگوں کا پوچھتا جو ان دنوں میرے شہر کے کھیتوں میں بکھرے پڑے ہوں گے۔ میں ان بچوں کا پوچھتا جو ان دنوں گنوں سے بھری ٹریکٹر ٹرالیوں کے پیچھے لٹکتے ہوئے گنے کھینچ کھینچ کر سڑک پر پھینکتے ہوئے شور مچاتے ہوں گے۔ میں اس منے کڑھائی گوشت والے کا پوچھتا جس کو ایک بار کڑھائی کا آرڈر دیا تھا اور اس نے کہا کہ ایک گھنٹے میں تیار ہوگی۔ پھر ہم دریا کنارے آبیٹھے اور بھول گئے کہ منے کو تو آرڈر دیا تھا۔ جب یاد آیا تو رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ ہم وہاں پہنچے تو پورا بازار سنسان پڑا تھا، جس میں وہ اکیلا بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

شاہ جی کا فون کب سے بند ہو چکا تھا اور معلوم نہیں میں یہ سوال لپیٹے ہوئے اپنی سوچوں میں کس سے پوچھتا چلا جا رہا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ میرے ان سوالوں کے جوابات بھی مجھے مل رہے تھے کیونکہ میرا چہرہ گرم آنسوؤں سے تر تھا اور باہر منجمد برف ابھی تک گر رہی تھی۔

دوسرے دن میں جاب کے لیے نکلا تو ڈکسن تک پہنچنا مشکل ہوگیا۔ بسیں تو چل رہی تھیں مگر ہر جگہ پھسلن تھی۔ سڑکیں اور فٹ پاتھ صاف تو کر دیے گئے تھے مگر زمین پر ہلکی سی تہہ آئس میں تبدیل ہو چکی تھی۔ یہاں سیکیورٹی شوز کام آ رہے تھے۔ کل کی برف باری نے چاروں جانب کا نقشہ ہی تبدیل کر دیا تھا۔ ہر چیز ساکن اور مطمئن تھی مگر ہر انسان خوف زدہ اور محتاط نظر آتا تھا۔

ہولڈنگ سینٹر میں باجوہ، گرنام اور بٹ صاحب بھی تھے۔ میں جب بھی بارہ بجے دن کو ہولڈنگ سینٹر آتا تو وہ وقت لنچ بریک ہوتا تھا۔ سب گارڈز اور قیدی وہیں لنچ روم کے ہال میں موجود ہوتے۔

بٹ صاحب جو یہاں گارڈ تھے ان سے مل کر مجھے آفاقی صاحب کے دوست بٹ صاحب اور خان صاحب یاد آجاتے، جن کے قصے پڑھ پڑھ کر میں بڑا ہوا تھا۔ ادھر میرے والے بٹ صاحب بھی کسی سے کم نہ تھے۔ مجھے دیکھا تو ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ہاتھ ملایا اور انہوں نے دوسرے ہاتھ سے اپنی کسی جیب سے اپنے بنائے ہوئے ”آرٹ کے نمونے“ نکال لیے۔ گرنام سنگھ اخبار اپنے چہرے کے آگے رکھے، اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا مسکراتا تھا۔ بٹ صاحب نے مجھے اپنے شاہکار دکھائے اور پھر داد لینے کی غرض سے میری جانب دیکھنے لگے۔

آج ایک اسکیچ میں کسی عورت نے چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”بٹ صاحب! آپ نے عورت کو پردہ کروا دیا؟“

وہ چونک کر بولے۔ ”نہیں تو۔“ پھر وہی پیپر میرے ہاتھوں سے جھپٹ کر اسے دیکھا اور قہقہہ لگا کر بولے۔ ”تمہیں تو فن کی قدر ہی نہیں...... یہ چادر نہیں بلکہ کسی مرد کی بانہوں میں ہے۔“

میں مسکرا دیا اور دوبارہ وہی کاغذ ان سے لے کر بولا۔ ”سوری......! دراصل میں اسے ایک بار پھر الٹا دیکھ رہا تھا۔“ یہ الٹا دیکھنے کا بہانا میں پہلے بھی کئی بار کر چکا تھا لیکن اب وہ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ میں اسے غل دیے جا رہا ہوں۔ آج باہر برف پڑی تھی۔ نہ کسی قیدی کا کوئی ملاقاتی آیا تھا اور نہ انہیں باہر گراؤنڈ میں لے جانا تھا۔ اسی لیے ہم ریلیکس بیٹھے تھے۔ ڈائننگ ہال کی کھڑکیوں کے باہر ایک ہی منظر ٹھہرا ہوا تھا۔ ائرپورٹ روڈ اور اس پر چلتی ٹریفک اور سڑک کے پار ایئر کینیڈا کی بڑی سی ایک عمارت۔ منظر ایک تھا مگر اس کے رنگ بدلے ہوئے تھے۔

پچھلے کچھ دنوں سے غیر قانونی طور سے پاکستانی زیادہ آرہے تھے اور انہیں سیدھا ہولڈنگ سینٹر بھیج دیا جاتا وہ یہاں پناہ لینے کا کوئی ڈراما لکھ کر آتے اور اسٹیج یہاں کرتے تھے۔ پڑھے لکھے کم تھے۔ اکثر میں ان کی درخواستیں انگریزی میں لکھ دیا کرتا تھا۔ کوئی اپنے آپ کو پیپلز پارٹی کا کہلواتا اور یہ لکھواتا کہ حکومت مجھ پر ظلم کر رہی ہے۔ مسلم لیگ کا نام استعمال کرنے والے یہ کہتے کہ نئی فوجی حکومت ہم پر بہت ظلم توڑ رہی ہے۔ کوئی فرقہ بندی یا مذہب پر پناہ مانگتا اور کوئی سیاسی بنیادوں پر یہاں رہنے کی بھیک مانگتا اور مجھے معلوم تھا کہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔ کئی ایک تو پاکستان میں کام کرنے والی این جی اوز سے اپنا کیس تیار کروا کر لاتے اور انہیں بھاری رقم بھی دیتے۔ وہ این جی اوز ان پر معاشرتی، مذہبی یا سیاسی ظلم کی

Downloaded From http://paksociety.com

داستانیں تیار کر کے دیتیں۔ ایک نے تو اپنا ایک اسکول کھولا اور اسکول کا نام رکھا۔ ''واشنگٹن پبلک اسکول'' پھر اپنے اسکول پر پیسے دے کر فائرنگ کروائی۔ اخباروں میں خبریں لگوائیں۔ انہی اخباروں کے تراشے کاٹ کر اور فائرنگ کی رپورٹ پر ایک کیس تیار ہوا اور مذہبی انتہاپسندی کی آڑ میں یہاں آ بسے۔ اب یہاں حکومت سے ماہانہ وظیفہ بھی لیتے ہیں اور کیش پر کوئی چھوٹی موٹی جاب بھی کر لیتے ہیں۔

خود تو آ گئے مگر ایک بدنامی کا داغ ملک پر لگا آئے۔ یہ نہیں کہ پاکستان میں مذہبی انتہاپسندی نہیں ہے مگر اس کی آڑ میں جھوٹے کیس بنا کر آنا تو ملک کو بدنام کرنے کے مترادف ہے۔ اب یہ ملک بھی یہ سارا گیم سمجھ چکی ہے اور اس لیے صحیح پناہ گزینوں کے دروازے بھی یہاں بند ہو گئے۔

میں کئی بار انگلینڈ گیا ہوں۔ وہاں لوگوں سے بات ہوتی رہتی ہے۔ سیاسی بنیادوں پر وہاں جتنا فراڈ ہوا ہے، دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں ہوا۔ اب وہ فراڈ یہاں کینیڈا میں بھی شروع ہو رہا تھا۔

آج سب پاکستانی ایک گول میز کے گرد بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میں بھی انہیں اپنا سمجھ کر گپ شپ کرنے ان کے پاس چلا گیا۔ ایک نیا لڑکا مجید آیا ہوا تھا۔ کسی نے اس سے میرا کہا کہ یہ تمہاری امیگریشن ڈیپارٹمنٹ کو درخواست لکھ دے گا۔ نوجوان تھا اور مدد طالب نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''کچھ سوچا ہے کہ اپنا کیس کس طرح بناؤ گے؟''

''سب نے کسی نہ کسی سیاسی پارٹی کا حوالہ دیا ہے، تم کس پارٹی کا دو گے؟''

کہنے لگا۔ ''سیاسی کیس بہت زیادہ ہیں، میں دوسرا راستہ نکالوں گا۔''

میں چونک پڑا اور کہا۔ ''کون سا؟''

وہ اپنے آپ کو غیر مسلم بنا کر پیش کرنا چاہتا تھا اور یہ کیس بنانا چاہتا تھا کہ مسلمان شدت پسند ہیں اور مجھے غیر مسلم ہونے پر قتل کرنا چاہتے ہیں۔ میں مذہب کا نام نہیں لکھ رہا تاکہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ میں نے پوچھا۔ ''نام سے تو مسلمان لگتے ہو۔ کیا نہیں ہو؟''

جواب دیا۔ ''الحمدللہ! میں مسلمان ہوں۔''

میں نے تنگ کر کہا۔ ''تو تم یہ کہو گے کہ پاکستان میں تم کو غیر مسلم ہونے کی وجہ سے اپنی جان کا خطرہ تھا؟''

میرے سوال پر وہ مجھے ستائشی نظروں سے دیکھ کر مجھ سے داد وصول کرنا چاہتا تھا۔ میں کھول کر رہ گیا۔ اگر وہ غیر مسلم ہوتا تو شاید میں اس کی مدد بھی کرتا مگر ایک مسلمان اپنے آپ کو غیر مسلم بنانا چاہتا تھا اور مسلمانوں کو بدنام بھی کر رہا تھا۔ یہی کچھ یہاں پر ہو رہا تھا۔ ایسے بہت سے لوگ ایسے ہی یہاں آ بسے تھے۔ ان کا ڈیٹا بعد میں یہاں کی حکومتیں اکٹھا کرتی ہیں اور پھر پاکستان کو غیر مسلم کے لیے خطرناک ملک قرار دیا جاتا ہے۔ اس ڈیٹا کی بنیاد پر کئی این جی اوز وجود میں آتی ہیں اور وہ پھر لبرل ازم کی تبلیغ پر ان ممالک سے پیسے بٹورتی ہیں۔ پاکستان اور مسلمانوں کی بدنامی علیحدہ ہوتی ہے۔

میں نے بہت غور کیا کہ پاکستان کو اس مقام پر آنے کے وجوہات کیا ہیں۔ ایک تو میں نے اوپر بیان کی ہے، جس سے پوری دنیا میں پاکستانی اور ان کا ملک بدنام ہو رہا ہے۔ دوسری اور ایک بڑی وجہ ناانصافی ہے۔ کچھ سرکاری نوکریوں پر لگے اہلکار اور سیاستدان دیکھتے ہی دیکھتے کرپشن کر کے پیسے والے ہو گئے جو پیچھے رہ گئے انہوں نے بھی تیزی سے پیسا بنانے کی کوشش کی۔ کچھ تو کامیاب ہوئے اور زیادہ تر ناکام اور پھر وہ ناکام غربت میں گرتے چلے گئے۔ انہی میں سے کچھ کی سوچ ردِعمل کے طور پر باغیانہ ہوئی اور کچھ نے بندوق پکڑ لی۔ اگر کرپشن کرنے والوں کو سزا ملتی تو بندوق بھی نہ اٹھتی۔ ہر ایک کو اس کا کچھ نہ کچھ حق ملتا رہتا مگر انصاف نہ تھا تو نوجوان باغی بن رہے ہیں اور معاشرہ اپنے پر شدت پسندی کا لیبل لگائے آگے بڑھ رہا ہے۔

میں نے مجید کو صاف جواب دے دیا کہ ایسی کوئی درخواست تمہارے لیے میں نہیں لکھ سکتا۔ میں اندر سے کرب میں مبتلا ہو گیا تھا کہ میرا ملک کس سمت میں جا رہا ہے۔ میں ڈر گیا تھا۔ اس کے دو سال بعد میں نے وہ سب کچھ ہوتے دیکھ لیا جس کا خوف مجھے مجید سے بات کر کے ہوا تھا۔ آج جو پاکستان کی حالت ہے اس کی سب سے بڑی وجہ ناانصافی ہے۔ طاقتور کے لیے کوئی قانون نہیں اور غریب اور کمزور کے لیے لاتعداد قوانین ہیں۔

مجید نے میرا رویہ بدلتا دیکھا تو منتیں کرنے لگا۔ میں نے بات بڑھانی مناسب نہ سمجھی اور دوبارہ بٹ صاحب کے ساتھ آ بیٹھا۔ اس نے پھر اپنی جیب سے کچھ اسکیچ نکالے مگر میری چبھتی نگاہیں دیکھ کر انہیں دوبارہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

رات ایک بجے اپارٹمنٹ پہنچا تو سب سو چکے تھے۔ شہباز اور سرجی بھی جاب سے آ کر لمبی تانے سوتے تھے۔ مفتی

Downloaded From http://paksociety.com

کروٹیں بدل رہا تھا مگر اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ میں بھی کچھ کھا کر سو گیا۔

صبح اٹھا تو وہی اپنا میٹرس، وہی چھت، وہی سوچ، وہی موسم، وہی لوگ اور وہی دیوار پر لگا کلاک مگر تاریخ بدل چکی تھی اور کلاک کا ٹائم بھی آگے جا چکا تھا۔ میں یہی محسوس کر رہا تھا کہ وقت ایک محور میں گھوم کر پھر وہیں آ جاتا ہے جہاں پہلے تھا مگر ایسا نہ تھا پھر بھی دماغ کی سوئی ایک جگہ پر اٹکی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کائنات تھم چکی ہے۔ سب رک گئے ہیں اور میں کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا ہوں۔ میں اس رکے زمانے میں کیا کر رہا ہوں؟ یہ میں نہ جانتا تھا۔ بس یہی جان سکا تھا کہ وہی کر رہا ہوں جو مجھ جیسے عام انسان کو ان حالات میں کرنا چاہیے۔

مانگ لے کوئی یاد پتھر سے
وقت پتھرا گیا ہے پتھر سے

معلوم نہیں مجھے آج جون ایلیا کا یہ المیہ کیوں یاد آ رہا تھا۔

گیارہ بجے مجھے دوبارہ ہولڈنگ سینٹر جاب کے لیے نکلنا تھا اور پھر دوبارہ رات ایک بجے آنا تھا۔ پرسوں میرا ایک فارما انڈسٹری میں دوپہر دو بجے انٹرویو تھا۔ مجید کے جواب کی وجہ سے میں ٹوٹ سا گیا تھا۔ اس برف کے پتھریلے شہر میں پتھر کا ہو گیا تھا۔ وہ بھاری پتھر جو مدتوں سے ایک جگہ پر پڑا تھا۔ نہ کوئی حرکت اور نہ ہی کوئی جنبش۔ سب سمجھتے تھے کہ میں حرکت میں ہوں، پر میں تو زمین میں گڑا تھا اور نہ جانے کب سے اپنے بھاری وجود میں دھنس چکا تھا۔

سب لیونگ روم میں تھے مگر آواز کوئی نہ تھی۔ میں باہر آیا تو جیسے سب مردہ تھے۔ ناآشنا خالی نظروں سے ایک دوسرے سے جدا خلاؤں میں تک رہے تھے۔ معلوم نہیں ان سب کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ سب میرے جیسے ہو چکے تھے یا میں ان جیسا...... سب ویران تھے، برباد تھے، کوئی قہقہہ نہ تھا، کوئی زندگی نہ تھی۔ یہ کیفیت اپارٹمنٹ کے اندر نہ تھی بلکہ باہر بھی تھی۔ اچھا ہوا کہ آج سب اپنے خولوں سے باہر نکل آئے تھے اور کھنڈرات کی صورت ایسے ویران تھے جیسے ویرانے شام کے بعد دکھتے ہیں۔

نہ میں نے پوچھا کہ سارے کے سارے آج اداس کیوں ہیں اور نہ کسی نے میری برستی آنکھوں میں جھانکا کہ میں آج اتنا مضمحل اور نڈھال کیوں ہوں۔

میں تیار ہونے لگا۔ اپنا ناشتا بنایا تو کسی نے یہ نہ کہا کہ میرے لیے بھی چائے بنا دو اور نہ میں نے کسی سے پوچھا کہ کچھ چاہیے؟ آج قیامت کا ماحول تھا۔ میں نے کچھ نہ کچھ زہر مار کیا۔ دو آلو ابالے اور وقت سے پہلے اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا اور پتھروں کے شہر میں اپنا سر مارنے لگا۔

بارہ گھنٹے جاب پر گزارے۔ سب گارڈز اور قیدی موجود تھے۔ ڈائننگ حال کے شیشوں سے باہر دیکھا کہ سرد ہوائیں چل رہی تھیں اور گرتی برف کا سفوف لہروں کی صورت سڑکوں پر ناگوں کی طرح پھنکار رہا تھا۔

معلوم نہیں یہ سب کیا تھا۔ ویرانگی میرے اندر تھی اور سب مجھے دلگیر نظر آتے تھے۔ اچھا تھا کہ یہ کیفیت مجھ پر اتر آئی تھی۔ آج محسن نقوی کا یہ شعر یاد آ رہا تھا

ہر وقت کا ہنسنا تجھے برباد نہ کر دے
تنہائی کے لمحوں میں کبھی رو بھی لیا کر

آج میں اندر کی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر اندر ہی اندر رو رہا تھا۔ میں آج اس حالت میں تھا جس سے ہم سب گاہے بگاہے گزرتے رہتے ہیں۔ پھر یہ کیفیت اس وقت مدھم پڑ چکی تھی جب میں رات کو دوبارہ اپارٹمنٹ پہنچا۔

میرا انٹرویو دو بجے تھا لیکن میں ایک بجے ہی پہنچ گیا۔ ایک بڑے اور پھیلے ہوئے ریسیپشن پر بیٹھا اپنے انٹرویو کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک فائل میں اپنی تمام ڈگریاں اور اعزازات سنبھال کر بیٹھا تھا۔ ماربل کے اس گیلے فرش کو دیکھ رہا تھا جو میرے آگے بچھا ہوا تھا۔ وہ ایک بڑی فارما انڈسٹری تھی پھر فرش کیوں گیلا تھا؟ میں پریشان بیٹھا یہی سوچ رہا تھا۔ حیرت کا جھٹکا تب لگا جب یہ معلوم ہوا کہ یہ فرش گیلے ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی صفائی کی وجہ سے چمک رہا ہے۔ میں ششدر تھا کہ کوئی بھی فرش اتنا چمکیلا ہو سکتا ہے کہ اس میں اپنا وجود بھی آئینے کی صورت نظر آئے۔

میں ایک گھنٹا اسی حیرانی میں بیٹھا رہا کہ ایک صاحب سوٹ میں ملبوس میرے پاس آئے اور مجھے لے کر ایک کمرے میں بٹھا دیا۔

ایک لمبی اور بیضوی میز کے گرد بہت سی کرسیاں تھیں اور میں خاموش بیٹھا تھا۔ وہ مجھے بٹھا کر خود چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ پہلے والا دو عدد دوسرے اصحاب کے ہمراہ اس کمرے میں داخل ہوا۔ سب نے خیریت دریافت کی۔ موسم پر تبصرے کیے، مسکرائے، ہاتھ ملائے اور پھر خاموش ہو کر مجھے دیکھنے لگے اور میں بھی یہی کرنے لگا۔ کچھ لمحے اسی حالت میں گزرے اور دوبارہ سے مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا اور سوالات و جوابات کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ یہاں کیپسول، سیرپ اور گولیاں بناتے

Downloaded From http://paksociety.com

تھے۔ میں نے کراچی اور جامشورو میں یہ کام تین سال تک کیا تھا۔ اس کے علاوہ پاکستان کی اس وقت تک کی سب ملٹی نیشنل فارما انڈسٹری کا ایک ایک عمل دیکھ اور سمجھ چکا تھا۔ وہ کچھ بھی پوچھتے تو میں ایک دو لائنوں کی بجائے پورا پیرا ان کے سامنے بیان کر دیتا۔ وہ میرے تجربوں کی سرٹیفکیٹس دیکھ کر مرعوب ہو کر پہلے ایک دوسرے کو دیکھتے اور پھر مجھے۔ میں نے سوچا کہ یہ مجھے جاب دینے سے انکار کر بھی نہیں سکتے۔ پھر انہوں نے زیادہ تیکھے تکنیکی سوالات پوچھے اور میں نے نہایت ہی عمدہ طریقے سے جوابات دیے۔ یقین کریں کہ وہ مجھے مرعوب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں اب خود اعتمادی سے کرسی پر فخر سے بیٹھا انہیں زیادہ متاثر کر رہا تھا۔ انٹرویو ختم ہوا تو وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر مجھے بیٹھنے کا کہہ کر اجازت لے کر باہر گئے۔ میں چوڑا ہو کر کرسی پر بیٹھا اپنی کامیابی پر شاداں تھا۔ وہ واپس آئے اور اپنی اپنی کرسیوں پر ایسے بیٹھے کہ جیسے میں ان کا باس ہوں۔ مجھے جھٹکا اس وقت لگا جب ایک نے اپنی نظریں جھکائے مجھ سے یہ کہا۔ ''ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس جاب کی آفر آپ کو نہیں کر سکتے۔''

میرے بولنے سے پہلے دوسرا معذرت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ جاب آپ کی قابلیت، تجربے اور تعلیم کے معیار کی نہیں اور آپ اس چیز کے مستحق نہیں ہیں کہ آپ یہ جاب کریں۔''

میری ساری خود اعتمادی کافور بن کر اڑ گئی۔ پھر تیسرا بولا۔ ''جب بھی کوئی آپ کے معیار اور حیثیت کی جاب آئی تو ہم آپ کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کریں گے۔''

یہاں مجھ سے ایک بار پھر غلطی ہو گئی تھی کہ میں جاب کے لیول سے بہت اوپر جا کر جوابات دے بیٹھا تھا۔ جاب تو ٹیکنالوجسٹ کی تھی اور میں جوابات ریسرچ کے لیول کے دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے مجھے مین گیٹ پر لا کر باعزت طریقے سے باہر دھکیل دیا۔ اب میں باہر سرد ہواؤں میں کھڑا اس انڈسٹری کی عظیم و شان عمارت کو دیکھ رہا تھا جہاں کی جاب میں نے اپنی کھال سے باہر نکلنے پر گنوادی تھی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

گرتا پڑتا اپارٹمنٹ پہنچا تو شام ڈھل رہی تھی۔ سردیوں کی شام بھی جو جلدی آگھیرتی تھی۔ اپارٹمنٹ خالی تھا۔ سب اپنی اپنی مشقتیں اٹھانے گئے ہوئے تھے۔ میں خوش ہوا کہ آرام سے اپنے میٹرس پر لیٹ کر اس خاموشی سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔ میں نے گرم پانی کا تیز رفتار اور بدن کو چیرتا شاور لیا اور آسودگی کے عالم میں اپنے کمرے کی ڈوروال کے پردے ہٹا کر میٹرس پر لیٹ گیا۔ باہر شام کا اندھیرا اتر رہا تھا۔ آسمان ہمیشہ کی طرح دھواں دھار تھا۔ برف نے جیسے سارے جہان کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ میں گرم چائے بنالایا تھا اور مزے سے اس کی چسکیاں لے رہا تھا۔ مجھے آج جاب نہ ملنے کا ذرہ برابر بھی دکھ نہ تھا۔ میں ایک طرح سے نئے تجربے سے گزرا تھا جو اضطراب کل تھا وہ آج نہ تھا۔

میں مطمئن تھا۔ میرا دل سینے میں آہستگی سے مجھے تھپکی دے رہا تھا۔ تادیر میں اسی کیفیت میں آنکھیں موندھے پڑا رہا۔ پھر کسی خیال کے تحت کچن میں چلا آیا اور مسور کی دال کے ساتھ چاول ابالے۔ میں نہ جانے آج کیوں اتنا خوش تھا کہ سرجی نازل ہو گئے۔ وہ تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ نڈھال سے تھے مگر آتے ہی پوچھا۔ ''کل آپ اتنے اداس کیوں تھے؟''

''آپ سب لوگ بھی تو اداس تھے۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ قسمیں اٹھانے لگے۔ ''ہم تو نہیں تھے۔'' اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''میں تو آپ سے کل ہی پوچھ رہا تھا مگر شہباز نے اشارہ کیا کہ خاموش رہوں۔ شاید بچے یاد آرہے ہوں گے۔''

''شاید کل پوری فضا بے رونق اور اداس تھی۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

وہ یہ کہتے ہوئے کمرے میں چلے گئے۔ ''ابھی تبدیل کر کے آتا ہوں تو بات کرتے ہیں۔''

ڈوروال کے ساتھ ہیٹنگ ڈکس سے گرم ہوا کمرے کو حدت میں رکھ رہی تھی اور میں اسی ڈکس سے ٹیک لگائے بیٹھا گرم ہوا کے لمس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ آئے تو لڈو بھی ساتھ اٹھا لائے۔ ہم نے گیم شروع کی تو وہ بے ایمانی پر بے ایمانی کرنے لگے۔ ایک آدھ بار میں نے ہلکا سا احتجاج کیا تو لگے شور مچانے۔ میں مصلحتاً خاموش رہا کیونکہ میں کسی بحث کے موڈ میں نہ تھا۔ اتنے میں شہباز بھی سردی کا مارا داخل ہوا اور سلام کرنے کے بعد ہمیشہ کی طرح کینیڈا اور اس کی سردی کو گالیاں دینے لگا۔ وہ کپڑے تبدیل کر کے اپنی عین عادت کے مطابق کارپٹ پر ڈھیر ہو گیا۔

سرجی بولے۔ ''اتنی سردی میں پائے بنانے کا موڈ کر رہا ہے۔''

''گلاٹی سے سور کے پائے ملتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

Downloaded From http://paksociety.com

"کہو تو ابھی لے آؤں۔"

شہباز کارپٹ پر لسبا لیٹا تھا، یہ سن کر اٹھ بیٹھا۔ "کیا حرام کھلاؤ گے ہمیں؟"

سرجی موج میں تھے بولے۔ "سور کا گوشت تو حرام ہے۔ کیا پائے بھی حرام ہیں؟" وہ آج زیادہ معصوم بن رہے تھے۔ پھر شہباز سے پوچھنے لگے۔ "کیا گدھا بھی حرام ہے؟"

اب ایک نئی بحث چل پڑی۔ سرجی کہتے کہ گدھا مکروہ ہے مگر حرام نہیں۔ وہ جب بھی گدھا کہتے تو اپنی نظریں شہباز پر گاڑ لیتے اور لگاتار مسکراتے۔

شہباز چڑ گیا۔ "یہ گدھا کہتے ہوئے میری جانب کیوں گھورتے ہو؟"

سرجی بولے۔ "دل میں چور ہو تو ہر کوئی اپنے آپ کو چور سمجھتا ہے۔"

اب بحث اپنے دائرے سے نکل کر جھگڑے میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ میں نے بیچ بچاؤ کرایا تو سرجی کہنے لگے۔ "گدھے کی بات ختم اب بیل کے پائیوں پر بات کرتے ہیں۔" سرجی معلوم نہیں کیا سوچ بیٹھے تھے کہ شہباز کو متواتر تنگ کر رہے تھے۔

شہباز بولا۔ "بڑے کے پائے میں نہیں کھاتا، دماغ میں شیطانی خیالات آتے ہیں۔" پھر وہ ٹکٹکی باندھے سرجی کو متواتر دیکھتے ہوئے بولا۔ "بکری کے مل جائیں تو بھیجے پائے والا بھی شرما جائے گا۔"

اب بکری پر سرجی لگے جھگڑا کرنے۔ میں نے پوچھا کہ آپ بکری کہنے پر بگڑ کیوں رہے ہیں تو سر جھکا کر بولے۔ "وہ دراصل جب چھوٹا تھا تو مجھے سب بکری کہہ کر چھیڑتے تھے۔"

مفتی خاموشی سے آیا اور خاموشی سے واش روم میں گھس گیا اور پھر اسی خاموشی سے اپنے میٹرس پر پہنچ کر ٹی وی دیکھنے لگا۔ سرجی نے دسترخوان لگایا اور سب مل کر خاموشی سے ڈنر کرنے لگے۔ کل ہم سب کو کین سینٹر جانا تھا۔ پچھلے کئی دنوں کی غیر حاضری تھی۔ سرجی اٹھ کر استری اسٹینڈ تک گئے اور اپنے کپڑے استری کرنے لگے۔ شہباز انہیں دیکھنے لگا اور میں اپنے کمرے میں جا کر ڈائری لکھنے گیا۔

سرجی آج نئے نکور ہو کر تیار ہوئے۔ انہوں نے رات اپنے سوٹ کیس سے ایک شرٹ نکالی تھی۔ بہت دیر دیکھتے رہے اور پھر استری کی۔ ایک ڈریس پینٹ نکالی اور اپنی جین کی پینٹ سے نجات پائی۔ تیار ہوئے تو ہم سے آنکھیں نہیں ملا رہے تھے۔ میں نے شرمانے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔ "دل کی ہر بات نہیں بتائی جا سکتی۔" میں نے تائید میں سر ہلایا تو بولے۔ "اگر اصرار کرتے ہو تو بتا دیتا ہوں۔"

میں نے مسکرا کر انکار کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں! آپ نہیں بتائیں...... کیونکہ دل دی لگیاں نوں کون جاندا...... یا دل جاندا یا رب جاندا۔"

یہ سن کر وہ بولے۔ "اب آپ رب کا واسطہ دے رہے ہیں تو بتا دیتا ہوں۔" پھر خود ہی گویا ہوئے۔ "آج ین پر آخری ٹرائی کروں گا۔"

شہباز جو ابھی تیار ہو کر آیا تھا اور ہانپ رہا تھا وہ یہ کہہ گیا۔ "پہلی یا آخری ٹرائی؟"

"پہلی سمجھو یا آخری اگر آج بھی داؤ خالی گیا تو پھر مایا پر قسمت آزماؤں گا۔" سرجی نے شیشے میں اپنی شکل دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر اپنی منحوس نظر اس معصوم پر ڈالی تو وہیں پیس کے رکھ دوں گا...... باز ہی رہنا۔" شہباز انہیں تنبیہ کرتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے آج تم بھی آخری ٹرائی کر لو اور ٹرائی کرنے سے پہلے وہ دو درجن برگر اس کے لیے لیتے جانا جو پچھلے ڈیڑھ ماہ میں اپنے پیٹ کی جہنم میں پھینک چکے ہو۔" سرجی بولے تو شہباز نے اپنے پھولے پیٹ کو دیکھا اور پھر اپنے دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھ کر مجھ سے کہنے لگا۔

"یہ سیاپا آخر ہم نے ائرپورٹ سے اٹھایا ہی کیوں تھا، اسے وہیں برف میں مرنے دیتے۔"

ہم ناشتا کر کے باہر نکلے تو ان کی یہ بحث جاری تھی۔ شہباز کہہ رہا تھا کہ مایا پر بری نظر نہیں ڈالنی ہے اور سرجی منطق دیتے تھے کہ کیا تم نے اس کا انتقال اپنے نام پر کروایا ہوا ہے۔ پھر دونوں نے مل کر یہ جھگڑا اس طرح طے کیا کہ سرجی مایا کی بجائے نسرین پر قسمت آزمائی کریں گے۔

سرجی نے اجازت طلب نظروں سے میری جانب اس طرح دیکھا جیسے بھیک مانگ رہے ہوں۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں خود تمہارے سامنے نسرین سے بات کروں گا کہ سرجی کو آج صبح آتے ہوئے تم سے عشق ہو گیا ہے۔"

وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئے مگر پھر دوبارہ سے مایا پر اپنا حق جتانے لگے اور بولے۔ "یہ عشق کی بات ابتدا میں مت کرنا، بس یہ پوچھنا کہ شاہد صاحب آپ کو کیسے لگتے ہیں؟"

Downloaded From http://paksociety.com

''وہ تو کسی شاہد صاحب کو نہیں جانتی، وہ آپ کو سر جی کے نام سے جانتی ہے۔'' میں بولا۔

''یہ سر جی کس نے اسے بتایا؟'' وہ بولے۔

میں نے انگوٹھے سے پیچھے آتے شہباز کی جانب اشارہ کیا تو بولے۔'' مجھے شک تھا کہ یہ سیاپا بھی اس سیاپے نے ڈالا ہوگا کیونکہ کل الزبتھ بھی مجھے سر جی کہہ رہی تھی۔''

دراصل سر جی کو کلاس میں کوئی ایک بھی ان کے اصلی نام سے نہیں پکارتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ الزبتھ کیا کہہ رہی تھی تو آہستگی سے سر جھکا کر بولے۔'' کہہ رہی تھی کہ اگر جاب ڈھونڈنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے تو یہاں آتے ہی کیوں ہو؟''

کین سینٹر میں داخل ہوئے تو الزبتھ کاؤنٹر پر اشوک کے ساتھ کھڑی اسے کچھ کہہ رہی تھی۔ ہمیں دیکھا تو بولی۔'' ابھی تک ریفرنس کے لیے تمہارا فون نہیں آیا۔ بہت دن ہوگئے ہیں۔'' پھر کچھ سوچ کر بولی۔'' اگر اس ہفتے نہیں آتا تو اگلے ہفتے انہیں فون کرنا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ جس طرح میرا انٹرویو ہوا تھا تو میری اُمید بندھ گئی تھی کہ شاید تیسرے روز ہی مجھے بلوا لیں گے مگر یہاں دو ہفتے ہونے کو آئے تھے اور کوئی سندیسہ نہ آیا تھا۔ دوسری جانب مفتی بھی دل دہلا رہا تھا کہ کمپنی کی فنڈنگ ختم ہوگئی ہے۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ سر جی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح چل پڑے۔ الزبتھ سے فارغ ہوا تو دیکھا کہ وہ خوف زدہ ین کو نرغے میں لیے کھڑے ہیں۔ وہ مدد طالب نظروں سے اردگرد دیکھ رہی ہے۔ موٹے شیشوں کی عینک کے پیچھے اس کی سہمی ہوئی آنکھیں تھیں۔ وہ سر جی کو غل دے کر نکلنا چاہتی تھی اور وہ اس کے رستے میں آجاتے تھے۔ میں قریب پہنچا تو ین نے جیسے مدد طلب نظروں سے میری جانب دیکھا اور میں نے سر جی کا بازو تھاما، انہیں ہمیشہ کی طرح گھسیٹتا ہوا لے گیا۔ وہ فریاد کرنے لگے۔'' ین کو برا لگے گا۔ وہ کیا سوچے گی۔ خود تو نسرین کے ساتھ لگے رہتے ہو...... آج تو اس کا دل پگھل رہا تھا۔'' وغیرہ وغیرہ۔

میں نے انہیں کلاس روم میں شہباز کے ساتھ بٹھا دیا جو خود مایا کے پہلو میں بیٹھا اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور مایا نے اپنے بیگ کو مضبوطی سے دبوچا ہوا تھا۔ میں نسرین کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔ جب ہم گرم جوشی سے ہاتھ ملا رہے تھے تو سامنے شہباز مجھے خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا اور سر جی اپنی آنکھوں، سر، ہاتھوں اور اپنے چہرے کے اشاروں سے مجھے یاد دلا رہے تھے کہ نسرین سے ان کی بات کروں۔ میں نے بھی نسرین کی جانب جھک کر صرف یہ پوچھا کہ سنو اسٹارم کو انجوائے کیا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ سر جی ہماری جانب دیکھ رہے تھے۔ نفی میں سر ہلتا دیکھ لیا تھا اور پھر میں نے اشارہ کر کے جواب میں یہ بتایا کہ جواب نہ میں ہے۔ وہ خاموش ہوئے، مایوس نظر آئے اور پھر اردگرد کچھ تلاش کرنے لگے اور آخر ان کی نظر عنایت دوبارہ ین پر ٹک گئی۔

کلاس شروع ہوئی تو الزبتھ نے شہباز سے کہا۔'' جس لیب کو Op-Co کے لیے آپ کا Resume بھیجا تھا۔ انہوں نے اگلے ماہ کی ہامی بھرلی ہے اور وہ حتمی فیصلہ دو ہفتے بعد بتائیں گے۔ اس پر سب نے شہباز کے لیے تالیاں بجائیں اور شہباز نے شرما کر مایا کا ہاتھ خوشی میں پکڑنا چاہا تھا کہ سر جی نے شہباز کو بازو سے کھینچ لیا۔

کافی کا وقفہ ہوا تو سر جی، شہباز اپنے اپنے مشن کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے اور میں نسرین کو لیے اشوک کے آفس میں آبیٹھا۔ اشوک سے اپنا یارانہ بن گیا تھا اور وہ میری اس جسارت پر کوئی مزاحمت بھی نہ کرتا تھا بلکہ ہم دونوں کو دیکھ کر مجھے اشارہ کر دیتا کہ آفس میں بیٹھ جائیں اور پھر خود اپنے آپ کو مصروف کر لیتا۔

ہم آفس میں آبیٹھے۔ وہ مجھے اپنی سیاہ آنکھوں کے پیچھے حیرت سے تک رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔'' آج کیا بات ہے؟''

''بہت دنوں سے بات نہیں ہوئی تو......!''

''میں نے شکایت تو نہیں کی؟'' وہ بولی۔

میں خاموش ہوگیا تو وہ خود بولی۔'' تمہاری کال ابھی تک ہیموسال سے نہیں آئی؟ بہت دن ہوگئے ہیں۔ ان سے بات تو کرو۔''

میں نے اپنی طرف سے بے پروائی دکھائی اور بولا۔'' جاب ملتی ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ اللہ کوئی اور سبب بنا دے گا۔''

میرا دایاں ہاتھ میز پر رکھا تھا۔ وہ اسے تھام کر بولی۔'' ایسا مت کہو۔ یہ جاب تمہیں ہی ملے گی اور میں نے پہلے دن یہی تو کہا تھا۔''

میں نے اپنا ہاتھ نہیں چھڑوایا اور بولا۔'' اتنا تمہارا یقین ہے تو پھر کال ضرور آئے گی۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنا بایاں ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا اور اسے تھپکنے لگا۔

Downloaded From http://paksociety.com

پھر میں نے اسے ہولڈنگ سینٹر پر کلب ڈانسر والا ماجرا بیان کیا۔ درمیان میں وہ مسکرا کر بولی۔ ”کیا اپنے آپ کو پرنس چارمنگ سمجھتے ہو؟ غور سے کبھی آئینے میں اپنا حلیہ تو دیکھو۔ بکھرے ہوئے بڑے بال، کمزور پڑتا چہرہ اور اس پر موسموں کی سختیوں کے آثار!“ میں خاموش بیٹھا مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بات جاری رکھی۔ ”نہ ٹھیک سے ڈریسنگ کرتے ہو، نہ کوئی پرفیوم عام سی شکل وصورت اور سمجھتے ہو کہ ہر لڑکی تم پر مرمٹی ہے۔“

”پہلے پوری بات تو سنو۔“ کہہ کر جب میں نے پورا واقعہ سنایا جو عظمت کی جاب ختم ہونے تک تھا تو حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”تو ہاں! تم کیا کہہ رہی تھیں؟“

وہ اب خاموش تھی۔ میرے تھپکتے ہاتھ پر اس نے اپنا دوسرا مرمریں ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”تمہاری نظروں میں وہ آرزو نہیں جو سب میں ہوتی ہے اور جو کچھ میں نے ابھی تمہارے بارے میں کہا ہے وہ اگر سچ بھی ہو تو سب پر تمہاری فطرت بہت بھاری ہے۔“

اب اس بھاری فطرت کا بوجھ میں نہ اٹھا سکتا تھا۔ اسی لیے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے دوسرے ہاتھ پر رکھ دیا تو وہ مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازہ کھلا اور سرجی کا صرف چہرہ اندر آیا۔ ان کی مونچھیں تک مسکرا رہی تھیں۔ وہ بولے۔ ”خود یہاں چھپے بیٹھیں ہیں اور ہمیں ین سے دو بول بھی نہیں بولنے دیئے۔“ یہ کہہ کر ان کا چہرہ مونچھوں سمیت رخصت ہوگیا اور نسرین کے چہرے کا رنگ شفق کی لالی کی طرح جگمگا اٹھا۔ کچھ دیر مجھے غور سے دیکھتی رہی اور پھر ہنس کر بولی۔ ”اپنے سر کے یہ بے ہودہ بال تو کٹوا لو۔“

ہم ہنستے ہوئے باہر نکلے تو نہ جانے کیوں اشوک بھی کاؤنٹر پر جھکا مسکرا رہا تھا۔

الزبتھ کا دربار دوبارہ سج چکا تھا۔ وہ لہک لہک کر کوئی بات کررہی تھی۔ میری توجہ کا مرکز سرجی تھے۔ ان کی آنکھیں کبھی ین کی جانب لپکتیں اور کبھی بھکاری والی نظروں سے مایا کو دیکھتے تھے۔ نسرین میرے ساتھ بیٹھی تھی اور جب اپنا سر جھٹکتی تو اس کے ملائم بال میرے کندھے کو چھو جاتے۔ اس حالت میں الزبتھ کیا فرما رہی تھی، وہ کس کو معلوم تھا؟ شہباز اب ہارے ہوئے سپاہی کی طرح مایوس بیٹھا تھا کیونکہ مایا اب مارک کے پہلو میں مطمئن بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

دروازہ کھلا اور اشوک نے اندر جھانکتے ہوئے الزبتھ سے کہا۔ ”آپ کا فون ہے۔“

الزبتھ بل کھاتی باہر نکل گئی۔ نسرین قریب ہو کر بولی۔ ”آج تمہاری نظریں الزبتھ سے ہٹ ہی نہیں رہیں۔“

میں نے کہا۔ ”کیوں! جلن ہو رہی ہے؟“

ہنستے ہوئے وہ بولی۔ ”بڑی خوش فہمی ہے؟ اپنی فطرت کو چھوڑ کر ذرا اپنی شکل شیشے میں دیکھو اور اپنے ان بکھرے بالوں کو بھی دیکھو۔ بالکل جنگلی لگ رہے ہو۔“

میں نے سرجی اور شہباز کو جلانے کے لیے تھوڑا سا مزید اس کے قریب ہوا اور بولا۔ ”وہ تو میں لگ رہا ہوں، پر الزبتھ تو نہیں۔“

اتنے میں باہر سے الزبتھ کی آواز اندر آنے لگی۔ وہ زور وشور سے کسی سے بات کررہی تھی۔ ”وہ بہت اچھا اسٹوڈنٹ ہے۔ ہر بات بہت جلد سمجھ جاتا ہے۔ سب کے ساتھ اس کا رویہ بہت دوستانہ ہے۔ بہت مؤدب اور وقت کا پابند ہے۔“ اور بھی اسی قسم کی باتیں تھیں جس میں کسی کی تعریف ہو رہی تھی۔ میرے کان کھڑے ہوگئے۔

نسرین نے میری جانب مسکراتی نظروں سے دیکھا اور بولی۔ ”لگتا ہے کہ تمہارا ریفرنس کا فون ہے۔“

اتنے میں الزبتھ اپنی بات ختم کر کے دوبارہ ہال میں داخل ہوئی تو اس نے اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور دونوں ہاتھ کندھوں سے اوپر تھے۔ چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ آتے ہی پُرجوش لہجے میں بولی۔ ”ندیم کا کمپنی سے ریفرنس کا فون تھا۔“ پھر میری جانب دیکھ کر اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو بلند کر کے ایک قسم کی مبارکباد دی۔ میں نے انبساط کی فراوانی میں نسرین کا ہاتھ پکڑ لیا اور اگر سرجی کی گھورتی نظروں کی زد میں نہ ہوتا تو شاید چوم ہی لیتا۔

وہ بھی بہت خوش تھی، کہنے لگی۔ ”دیکھا! ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ کال ضرور آئے گی۔“

مایمبو اور مارک دور سے مجھے مبارکباد دے رہے تھے، حالانکہ یہ تو صرف ریفرنس چیک کرنے کی کال تھی اور ابھی جاب آفر کا مرحلہ باقی تھا۔

کلاس ختم ہوئی تو سوچا کہ طارق کو فون کر کے معلوم کرلوں کہ کیا اسے بھی کوئی کال آئی ہے۔ میرے ساتھ شہباز، سرجی کے علاوہ نسرین بھی تھی۔ اشوک کو معلوم تھا کہ ریفرنس کی کال تھی تو اس نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور جھٹ کی

Downloaded From http://paksociety.com

جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''او پروالا اچھی خبر دے گا۔''

میں نے کہا۔ ''نیو یارک فون کرنا ہے؟'' تو مسکرا کر بولا۔ ''آفس سے کرو گے یا یہیں سے؟''

میں نے کہا۔ ''اس جلوس کے ساتھ آفس میں کیا ہوگا؟ یہیں سے کرلیتا ہوں۔''

اس نے فون آگے بڑھا دیا۔

فون ملا تو طارق چھوٹتے ہی بولا۔ ''ابھی ثمارا کا فون بند ہوا ہے۔ وہ مجھ سے کہہ رہی تھی اگر تمہارے پاس جاب ہو تو کیا تم ندیم کو جاب کی آفر کرو گے؟'' پھر خود ہی بتانے لگا۔ ''میں تو اسے کئی ماہ سے کہہ رہا ہوں کہ میرے پاس آجاؤ مگر کہتا ہے کہ نہیں۔ میں اپنے بل بوتے پر جاب لینا چاہتا ہوں۔''

ظاہر ہے طارق نے میری تعریف بڑھا چڑھا کر کی ہوگی۔ طارق پھر کہنے لگا۔ ''تم نے جاب جوائن کرنے سے پہلے نیو یارک ضرور آنا ہے۔'' میں نے بھی ہامی بھر لی کیونکہ امریکا دیکھنا میرا بہت پرانا خواب تھا جو اب پورا ہونے جا رہا تھا۔

فون بند ہوا تو سرجی خوشی سے مجھے گلے ملنے کی بجائے نسرین کی جانب حملہ آور ہوئے مگر شہباز نے راستے ہی میں انہیں دبوچ لیا۔ نسرین نے سکھ کا سانس لیا۔ اشوک یہ سب دیکھ کر ہنس پڑا۔ نسرین خاموش تھی۔

آج ہم میں سے کسی کی کوئی جاب نہ تھی۔ سرجی کا اصرار تھا کہ آج کافی پینے چلتے ہیں اور پھر میری خوشامد کرتے ہوئے بولے۔ ''بھابی سے بولو کہ کسی طرح ین کو بھی ساتھ لے لیں۔''

میں بوکھلا گیا۔ ''کون سی بھابی؟''

شرما کر نسرین کی جانب اشارہ کیا تو میرا دل چاہا کہ ان کی گردن دبوچ لوں۔ شکر ہے کہ نسرین کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا۔

''سرجی تو مجھے مفت میں مجھے مروائے گا۔'' میں مصنوعی غصے میں چیخا۔

فیصلہ تو نسرین نے میری جانب دیکھتے ہوئے سنایا۔ ''یہ تو اب یہاں نظر نہیں آئے گا اور آپ لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں۔ اسی لیے صرف ہم دونوں ہی کافی پینے جائیں گے۔''

شہباز بولا۔ ''یہ ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

مگر سرجی نے ہلکی سی ضد کی تبھی شہباز نے مداخلت کی۔ اس کی ایک ڈپٹ پر ہی وہ ہلکے پڑ گئے۔ جب جا رہے تھے تو بار بار مڑ کر پیچھے دیکھ رہے تھے جیسے بہت رنجیدہ ہوں۔ پھر بھی وہ یہ کہہ گئے کہ آتے ہوئے جلیبیاں لے آنا اور شکر قندی اگر ملے تو وہ بھی ایک کلو لے آنا۔ شکر قندی کا سن کر شہباز برفانی ہواؤں میں زرد ہوتا چلا گیا جس کا مطلب تھا کہ اب وہ غصے میں ہے۔ کہنے لگا۔ ''سرجی! اب یہ شکر قندی کا سیاپا کہاں سے آگیا؟'' پھر ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ''تجھے تیرے اپنوں کا واسطہ۔ خود بھی جاب کر اور ہمیں بھی کرنے دے۔''

وہ دور تک بحث کرتے چلے گئے اور سرجی ہمیں مڑ مڑ کر دیکھتے رہے۔ میں شہباز کی بے بسی اور سرجی کی بے پروائی پر ہنستا رہا۔

وہ گئے تو نسرین ہنستے ہوئے بولی۔ ''تمہارے اپارٹمنٹ میں بہت شغل رہتا ہوگا؟'' اور اپنی بات کو خود ہی آگے بڑھایا۔ ''اور تم تینوں ایک دوسرے کے لیے مخلص بھی بہت ہو اور بہت خیال رکھتے ہو ایک دوسرے کا۔''

بات وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں اسے ان دونوں کی باتیں بتا رہا تھا کہ ہم کافی شاپ پہنچ گئے۔ اب پڑھنے والوں کو بار بار یہ بتانا عجیب لگتا ہے کہ برف کے ڈھیر لگے تھے۔ سرد ہواؤں سے فضاء منجمد تھی۔ زمین نے برف کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ سردی رگوں میں اتر رہی تھی، وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ یہاں وہ سب چیزیں تھیں مگر سردی رگوں میں نہیں اترتی تھی کیونکہ ایران کے شہر مشہد کی نسرین ساتھ تھی۔ گو ہمارے درمیان پیار کا کوئی رشتہ نہ تھا، صرف دوستی کا تعلق تھا۔ آج سوچ رہا ہوں کہ کیا دوستی میں پیار نہیں ہوتا؟ اور جو آج یہ سوچ رہا ہوں، اس دن محسوس ہو رہا تھا۔ نسرین کے ارد گرد حرارت کا ایک ہالہ تھا جہاں سے حدت پھوٹتی تھی۔ میں نے اپنے گلے کا مفلر بھی اتار دیا تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ جب بھی جاب کی آفر ہوئی، میں اسی دن دس دن کے لیے امریکا چلا جاؤں گا۔ نسرین کہنے لگی۔ ''پھر تو تم کین سینٹر بھی نہیں آؤ گے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ''جاب کے لیے آیا تھا اور جب جاب مل گئی تو پھر آنا مشکل ہوگا۔''

ہم کچھ دیر خاموشی سے کافی پیتے رہے۔ پھر وہ پوچھنے لگی۔ ''کل آؤ گے؟''

''ہاں! جب تک جاب کی آفر نہیں ہوتی، تب تک تو......''

Downloaded From http://paksociety.com

وہ کہنے لگی۔ ”اس کے بعد تو ہم کبھی نہیں ملیں گے؟“

”تم نے ہائی پارک دکھانے کا وعدہ کیا تھا کیا بھول گئیں؟“ میں نے کافی کا گھونٹ بھرا۔

وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”جب فرصت ملے تو فون کرنا۔ اپنا یہ وعدہ ضرور پورا کروں گی۔“ میرا کپ ابھی خالی نہ ہوا تھا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دس ڈالر کا نوٹ میز پر رکھا اور کافی شاپ کا دروازہ کھول کر نکل گئی۔

وہ چلی گئی۔ میں تادیر اسے جاتے دیکھتا رہا۔ دور جا کر ایک بار اس نے مڑ کر دیکھا۔ مجھے وہیں کھڑا پایا تو دور سے ہاتھ ہلایا اور بس میں بیٹھ کر کہیں کھو گئی۔

میں واپس اپارٹمنٹ پہنچا تو جلیبیاں اور شکر قندی لینا نہ بھولا تھا۔ سرجی نے ان کے بیگ پہلے میرے ہاتھ سے وصول کیے۔ جلیبیاں فریج میں رکھیں حالانکہ دو لفافے ان کے پہلے ہی سے فریج میں رکھے تھے۔ شکر قندی کو کپڑوں کی الماری میں کہیں چھپا دیا۔ پھر خوشی سے اپنے دونوں ہاتھ رگڑتے ہوئے میرے ہمراہ کارپٹ پر بیٹھ کر مجھے کن انکھیوں سے دیکھ کر مسکرانے لگے اور ساتھ شرماتے بھی چلے جاتے تھے۔ پھر بولے۔ ”سردیوں میں شکر قندی ابالنے کے بعد اس پر نیموں نچوڑ کر کھائیں تو بڑی طاقت ملتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”جو جلیبیاں کھانے سے طاقت آئی تھی، وہ تو ین کے گرد گھومنے میں ہی خرچ ہو گئی اور اب اس نئی طاقت کا کیا کرو گے؟“

سرجی نے کچھ دیر غور سے سوچا اور پھر زیر لب مسکرا کر بولے۔ ”ایک دن آئے گا جب ین بھی میرے ہمراہ کافی پینے چلے گی۔“ پھر چونک کر بولے۔ ”جلیبیاں تو لے آئے ہو مگر نسرین بھابی کو ساتھ نہیں لائے؟“

میں اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ اب یہ کچھ دیر میں آؤٹ آف کنٹرول ہونے والے تھے۔

میں جا کر کمرے میں اپنے میٹرس پر لیٹا تو کچھ ہی دیر میں نیند نے دبوچ لیا جب کہ ساتھ والے میٹرس سے بھیانک قسم کے خراٹے ابھر رہے تھے کیونکہ شہباز بھی وہاں سویا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد سو کر اٹھا تو لیونگ روم میں دیکھا کہ سرجی ڈور وال کے پردے ہٹائے، باہر جھاڑیوں پر پڑی برف کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ اسی نظروں سے ین کو بھی دیکھتے ہوئے کئی بار پائے گئے تھے۔ ان کی نظر میں منجمد برف اور چینی ین کی تاثیر میں کوئی فرق نہ تھا۔ کچن میں شہباز تر آنکھوں سے پیاز اور ٹماٹر کاٹ رہا تھا۔ وہ، سرجی سے مخاطب تھا۔ ”چاول بھی بھگو دیے ہیں اور گوشت بھی نکال رکھا ہے۔ اب کچھ اور کرنا ہے۔“

سرجی نے کسی عیاش تماش بین کی طرح تکیے سے ٹیک لگایا اور شہباز کو نادر شاہی حکم دیا۔ ”اب چولہے پر کڑھائی چڑھا دو اور ایک کپ آئل ڈال دو۔ باقی میں دیکھ لوں گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”سرجی کیا بنا رہے ہیں؟“

کہنے لگے۔ ”ڈیرہ کا مشہور پلاؤ بنا رہا ہوں۔“

مجھے یہ تو اچھی طرح معلوم تھا کہ ڈیرہ اسماعیل خان میں جو پلاؤ تیار ہوتا ہے وہ دنیا بھر میں کہیں اور بن ہی نہیں سکتا مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ اچھے اچھے ایسا پلاؤ نہیں بنا سکتے تو سرجی نے دو چار سال ڈیرہ میں رہ کر کیسے سیکھ لیا۔ میں نے بہر حال ان کی ہمت افزائی کے لیے کہا۔ ”لگتا ہے کوئی خاص ترکیب ہاتھ لگی ہے؟“

میری تعریف پر ذرا سے مغرور ہوئے، باہر برف کو ایک بار پھر بھوکی نظروں سے دیکھا اور بولے۔ ”سوچ رہا ہوں کہ پلاؤ میں تھوڑی سی چینی بھی ڈال لوں تاکہ زردے کا مزا بھی آ جائے۔“ یہ کہہ کر اپنے ہونٹوں پر زبان بھی پھیری۔

میں یہ سن کر ہی طیش میں آ گیا اور کہا۔ ”سرجی اگر ایسی حرکت کی تو اسی ڈور وال کے شیشے پر اٹھا کر ایسا ماروں گا کہ آپ شیشہ توڑتے ہوئے باہر برف میں پڑے ہوں گے۔“

اب کے وہ سہمے نہیں، طنزیہ لہجے میں بولے۔ ”مجھے اٹھاؤ گے کیسے؟“

شہباز نے کچن سے آواز دی۔ ”میں مدد کروں گا۔“

یہ سن کر سرجی کا رنگ فق ہو گیا اور پھر مجھ سے بولے۔ ”آپ نسرین کے ساتھ گھومیں تو ہم کچھ نہیں کہتے اور ہم ذرا سا مذاق بھی کر لیں تو سب لوگوں کو غصہ آ جاتا ہے۔“ یہ کہہ کر ناراض ہونے کی اداکاری کرتے کچن میں گھس گئے۔

رات میں مفتی آیا تو اسے ریفرنس کے فون آنے کا بتایا تو اس نے بھی یہ اطلاع دی کہ چند اور لوگ بھی جاب پر رکھے جا رہے ہیں۔ کہنے لگا کہ سپروائزر تمہاری بہت تعریف کر رہے تھے۔

میں نے مفتی سے کہا۔ ”اگر جاب آفر ہوتی ہے تو میں پہلے نیویارک طارق سے ملنے جاؤں گا۔“

سرجی نے سنا تو کہنے لگے۔ ”میں بھی ساتھ جا رہا ہوں اور شہباز بھی تیار ہے مگر میں نے ابھی اسے ساتھ لے جانے کا فیصلہ نہیں کیا۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

شہباز بولا۔ ''کیا مجھے نیویارک جانے کے لیے تمہاری اجازت کی ضرورت ہے؟''

سر جی بولے۔ ''میری طرف سے تم دوزخ میں جاؤ..... مگر اکیلے اکیلے۔ اپنے ساتھ میں کس کو لے جاتا ہوں اور کس کو نہیں؟ یہ فیصلہ میں ہی کروں گا۔''

یہ سن کر شہباز نے اپنی بنیان میں ہاتھ ڈال کر اپنے آپ کو کسی ریچھ کی طرح کھرچا اور بے بسی سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں بولا۔ ''سر جی ہم سے بڑے ہیں اور بزرگ ہیں میں نے تو ہمیشہ بڑوں کا کہا مانا ہے۔''

سر جی سے بزرگی کا طعنہ برداشت نہ ہوا۔ وہ بولے۔ ''آپ لوگوں سے بڑا لگتا ہوں پر ہوں نہیں۔'' پھر شہباز پر احسان کرتے ہوئے بولے۔ ''تمہارے بارے میں کچھ سوچتا ہوں۔''

یہ سن کر میں اور شہباز مسکرانے لگے۔

اب ہم مکمل فیصلہ کر بیٹھے تھے کہ اگر میں نیویارک جاتا ہوں تو وہ بھی جائیں گے۔ مفتی نے سمجھایا کہ تم وہاں کیا کرو گے تو کہنے لگے کہ فیض صاحب سے مل لوں گا اور پھر حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے بچپن سے نیویارک دیکھنے کا شوق ہے اور وہ بھی ندیم بھائی کے ساتھ۔''

ان کی رہائش کا مسئلہ نہ تھا کیونکہ فیض صاحب کا گھر نیو جرسی میں تھا اور انہیں وہاں رہنے میں کوئی دشواری بھی نہ تھی۔ شہباز کا بھائی بھی لانگ آئی لینڈ میں تھا جہاں طارق رہتا تھا۔ نیو جرسی اور نیویارک ایک طرح کے جڑواں شہر ہیں جیسے ہمارے ہاں پنڈی اور اسلام آباد۔ میں نے سوچا کہ اب سر جی سے زیادہ بحث کرنے سے بہتر ہے کہ جب جانا ہوگا تو دیکھ لیں گے۔ دوسرا مجھے ان دونوں کو ہمراہ لے جانے پر کوئی اعتراض بھی نہ تھا بلکہ خوشی تھی کہ سفر اچھا کٹے گا۔

دوسرے دن کین سینٹر پہنچے تو دیکھا کہ آج نسرین نہیں آئی تھی۔ سر جی اور شہباز بہت خوش ہوئے کہ میں خالی خالی رہوں گا۔ کلاس شروع ہونے سے پہلے سر جی ین کے پاس جا پہنچے۔ میری جانب ایک کامیاب شکاری کی طرح دیکھ کر اس سے بولے۔ ''کیا آپ مجھے چینی زبان سکھلا سکتی ہیں؟''

اس نے اپنے سیاہ چشمے کے پیچھے سے اپنی کالی پلکیں حیرت سے جھپکائیں اور پوچھا۔ ''یہ زبان سیکھ کر آپ کینیڈا میں اس کا کیا کریں گے؟''

وہ بولے۔ ''جب کبھی میں چین جاؤں گا تو کام آئے گی۔''

اسی وقت شہباز آ پہنچا اور ان سے بولا۔ ''اوہ چینی سوداگر! چل کلاس شروع ہو رہی ہے۔''

شہباز نے انہیں پکڑا۔ اسی دوران ین کھسک گئی۔ سر جی مجھے کھڑے دیکھ کر بولے۔ ''کیا ہوا اگر چلی گئی ہے۔ آپ کی بھی تو آج ناغہ کر گئی ہے۔''

شہباز بولا۔ ''مایا تو صبح سے بیٹھی شاید میرا انتظار کر رہی ہے۔''

سر جی کلاس روم کی جانب بڑھتے ہوئے بولے۔ ''ابھی اس سے پوچھ لیتے ہیں کہ کیا وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے یا تم سے چھپتی پھر رہی ہے؟''

شہباز بولا۔ ''اگر تم نے اس سے کوئی بھی بات کی تو میں ین کو بتا دوں گا کہ آپ کے تین بچے بھی ہیں۔''

سر جی بولے۔ ''تین ہوں یا چھ، ان چینیوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دل آ جائے تو کون پرواہ کرتا ہے۔''

اسی دوران ہم کلاس روم میں آ بیٹھے۔ الزبتھ نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہارے دونوں انٹرویوز میں جو بھی سوال پوچھے گئے تھے وہ لکھ کر لاؤں۔ میں آج وہ لایا تھا اور سب اسٹوڈنٹس کو وہ یہ سوالات لکھوا رہی تھی اور ساتھ ہی ان کے مناسب جوابات بھی بتا رہی تھی۔ یہاں ہر انٹرویو میں چند گنے چنے سوالات ہی پوچھے جاتے ہیں۔ آج کا لیکچر بہت معلوماتی تھا۔ یہ جوابات میں بھی نوٹ کر رہا تھا اور یہ بعد میں کینیڈا آنے والے پاکستانیوں کے بہت کام آئے تھے۔

☆......☆

آج میری جاب ہولڈنگ سینٹر میں تھی۔ یہاں سے سیدھا مجھے وہیں جانا تھا۔ نسرین کے ساتھ انسیت ہوگئی تھی۔ اسی لیے ایسا لگ رہا تھا کہ کچھ کمی ہے۔ کچھ یہیں رکھا تھا اور دل نہیں رہا۔ نسرین کے ساتھ دوستی میں کوئی ہوس نہ تھی اور نہ کوئی جھوٹ تھا۔ نہ کوئی وعدہ تھا جس کو نبھانا تھا اور نہ کوئی امید جس کو بر آنا تھا۔ صرف دوستی تھی مگر اس دوستی کو کوئی معنی بھی نہ دے سکتا تھا۔ دوست تو سر جی بھی تھے اور شہباز بھی تھا۔ وہ کبھی نہ آتے تو میں نے کبھی ان کے نہ ہونے کی کمی محسوس نہ کی تھی۔ شاید جنس مخالف کی دوستی میں کوئی اور کشش ہوتی ہے جو مجھے اس دن ارد گرد دیکھنے پر مجبور کرتی رہی۔ اگر میری یہ دوستی سب کے ساتھ ایک طرح کی ہوتی تو میں آج اس کے نہ آنے پر ویران سا نہ ہوتا۔ اگر وہ کسی سے محبت کرتی ہوتی تو بھی میں بے چین نہ ہوتا۔ سر جی کے ساتھ دوستی تھی مگر وہ تو ین کو پٹانے پر لگے تھے۔

Downloaded From http://paksociety.com

شہباز بھی دوست تھا مگر اپنے طور پر مایا کو اپنی محبت کے ہمالیہ تلے زیر کر چکا تھا مگر نسرین تو ہر وقت تنہا اور اداس رہتی تھی۔ ایک صدمے اور رنج کی کیفیت میں۔ اس کا یہی دکھ اس کی کشش بن گیا تھا۔ آج نسرین نہ تھی اور میں اسی صدمے، رنج اور دکھ کی کیفیت میں تھا۔

سرجی میری یہ حالت دیکھ کر بہت خوش تھے۔ میرے قریب سے جب بھی گزرتے تو یہ گانا زور زور سے گنگنانے لگتے۔ ”جانے کیوں ہے آج کل کھوئی کھوئی زندگی۔ لگتا ہے یہ جہاں جانے کیوں اجنبی......“

آج گارڈ کی یونیفارم اپنے بیگ میں لے آیا تھا۔ واش روم میں وردی تبدیل کی اور اوپر جیکٹ چڑھالی۔ دو ابلے آلو اور دو عدد چاکلیٹ میرا من وسلوا تھے، جو میرے بیگ میں بند تھے۔ انہیں اٹھائے میں ہولڈنگ سینٹر آپہنچا۔

باجوہ ہیڈ گارڈ بنا بیٹھا تھا۔ وہ مجھے اپنا مرشد سمجھتا تھا کیونکہ میرے لائے گئے لاٹری کے ٹکٹس پر وہ ہر بار جیتتا رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو مرشد کے رتبے پر رکھے اس کے ساتھ پڑی کرسی پر جا بیٹھا۔ اپنی ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھی اور بائیں ہاتھ سے اس کی میز بجانے لگا۔ سب ڈائننگ ہال میں بیٹھے تھے۔ گرنام بھی اخبار لیے میرے ساتھ آ بیٹھا۔ باجوہ نے تو میری طرف دیکھا بھی نہ تھا اور میں حیران تھا کہ مرید اپنے مرشد کے کرتوت جان تو نہیں گیا؟ گرنام نے میرے کان میں سرگوشی کی کہ تیسری بار ہے کہ جب بھی لاٹری جیتتا ہے تو ٹریفک کی ٹکٹ اسے لگ جاتی ہے اور اب اس کا مجھ پر سے ایمان ڈھیلا پڑتا جارہا ہے اور یہ کہتا پایا گیا ہے کہ ”اقبال کے لائے گئے ٹکٹوں میں جیت تو تھی مگر نصیب نہ تھا۔ اب میں اس کی بے غرضی کا سبب جان پایا کہ وہ کیوں اتنا بے اعتنا بنا بیٹھا ہے۔“

بٹ صاحب قریب سے گزرے تو میں نے انہیں روک کر پوچھا۔ ”آج کوئی نیا اسکیچ نہیں لائے؟“

خوشی سے آنکھیں چمک اٹھیں کہ ان کے فن کو پذیرائی مل رہی ہے۔ وہ بولے۔ ”ہاں! ہاں لایا ہوں۔“

میں نے فوراً کہا۔ ”مگر تو آج مجھے نہ دکھانا کیونکہ میں ان فن پاروں کی تاب نہیں لاسکتا۔“

وہ غصے اور شک بھری نظروں سے مجھے گھورنے لگے کہ کہیں میں مذاق تو نہیں اڑا رہا۔ دراصل میں ان کا دل رکھنے کے لیے یہ دیکھ بھی لیتا مگر ایک تو وہ بہت بے ہودہ اور فحش ہوتے اور اس کے اوپر وہ اسکیچ فحاشی کی شان میں گستاخی بھی ہوتے۔

باجوہ، بٹ کی اس درگت پر بہت ہنسا اور پذیرائی میں میز پر رکھے تھرماس سے ایک گتے کے ڈبے میں مصالحے دار گرم چائے انڈیلی اور میری خدمت میں پیش کردی۔ یہ چائے وہ ہر بار مجھے پلاتا تھا جو ذائقے میں بہت اچھی ہوتی۔ میں نے باجوہ کا دل رکھنے کے لیے کہا۔ ”آپ کی بنائی ہوئی چائے کی کیا بات ہے۔ یہ گرنام بھی مصالحے والی چائے بناتا ہے مگر بالکل بدذائقہ ہوتی ہے۔“

باجوہ بولا۔ ”پتر اقبال! تین بار لاٹری نکلی اور تین بار اسی دن ٹریفک کا ٹکٹ ملا اور اب یہ کھسن نہ لگا کیونکہ آج چائے میرے لیے بھی گرنام بنا کر لایا ہے۔“ یہ سن کر میں شرمندہ ہوا اور گرنام قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

جب کافی کا بریک ختم ہوا تو سب قیدیوں کو کمروں میں لے آئے اور پھر نیم تاریک ماحول میں اپنی اپنی پوسٹوں پر بیٹھے اونگھنے لگے۔ میں ایک دو بار حاضری لگانے گیا تو دیکھا کہ ایک کمرے میں دو سیاہ فام شدید مایوسی اور صدمے کی حالت میں اپنے بستروں پر پڑے ہیں۔ جیسے کہ کوئی ڈاکٹر ابھی انہیں کسی موذی مرض کی خبر دے گیا ہو۔ میں نے انہیں چھیڑنا مناسب نہ جانا اور حاضری لگا کر دوبارہ اپنی پوسٹ پر آبیٹھا۔

ڈنر کا ٹائم ہوا تو میں ہر کمرے میں جا کر منادی کرنے لگا۔ ”ڈنر ٹائم......ڈنر ٹائم......“ مگر جب ان کے کمرے میں جا کر بھوکوں کو کھانے کی دعوت دی تو دونوں پھٹ پڑے۔ کراہ کر ایک بولا۔ ”ہمیں کھانا نہیں چاہیے۔ ہمیں ہمارے گھر بھیج دو۔“ یہ کہہ کر وہ سسکیاں بھرنے لگا۔ میں حیرت سے انہیں تک رہا تھا کہ ابھی تو انہیں آئے ہوئے وقت ہی کتنا ہوا ہے۔ ابھی تو ان کا کیس لگے گا اور معلوم نہیں کب فیصلہ ہوتا ہے۔ یہ ابھی سے ٹوٹ گئے۔ اگر انہیں یہاں نکلنے کی اجازت مل بھی جاتی ہے تو اصل رگڑا تو کینیڈا خود لگائے گا جب یہ کوئی جاب ڈھونڈنے جائیں گے۔

لوگ اپنی زندگی گزارنے کے لیے کتنے مشکل راستے چنتے ہیں، جن پر چلنا بھی دشوار ہوجاتا ہے۔ اگر خود یہ راہ نہیں چنتے تو کیا کوئی اور انہیں ان رہ گزر پر چھوڑ جاتا؟ کوئی اور تو کوئی بھی ہوسکتا ہے، جیسے حالات، غربت، لالچ، شوق آوارگی یا پھر شوق دل لگی۔ جو بھی انہیں ان راہوں پر چھوڑ گیا تھا، وہ ان پر کاری ضرب لگا گیا تھا۔ میں ان کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا، اسی لیے رنجیدہ ہوکر نکل آیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

ہولڈنگ سینٹر کی وہ وین جو غیر قانونی امیگرینٹس کو ایئر پورٹ سے لاتی تھی یا عدالت لے جاتی تھی، اس کا ڈرائیور حسن نام کا عراقی باشندہ تھا۔ بیدی اور باجوہ کی اس سے اَن بن رہتی تھی۔ آج وہ مجید کو عدالت سے لے کر آیا تو ان کی کسی بات پر تکرار ہوئی اور لنچ روم میں آتے آتے وہ لڑ پڑے۔ وجہ معلوم نہ ہوئی کہ یہ سب کیسے ہوا۔ حسن ایک دم غصے میں آگیا اور مجید کو دھکا دے کر ایک لگا بھی دی۔ میں نے چھڑوایا مگر دونوں ایک دوسرے کو خوب برا بھلا کہے جا رہے تھے۔ حسن غصے میں کرسی پر دوسرے گارڈ کے ساتھ بیٹھا بڑبڑا رہا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ جب امیگریشن حکام کو اس واقعے کی خبر ہوگی تو سب سے پہلے حسن کی چھٹی ہو جائے گی۔ مجھے اندازہ تھا کہ آج باجوہ کو اپنی چال چلنے کا موقع مل گیا ہے اور یہ کہ وہ حسن کی چھٹی کروا کر ہی دم لے گا۔ میرے خیال میں وہ امیگریشن آفیسر، جس کا دفتر سیڑھیوں کے نیچے تھا، اسے ساری خبر پہنچا دے گا۔

میں نے اسی سوچ کو لے کر حسن سے کہا۔ ''تمہاری جاب آج ہی ختم ہو جائے گی اگر مجید سے ایک بار صلح کرلو تو میں باقی کے معاملات سنبھال لوں گا۔''

مجھے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ باجوہ اب مجید سے حسن کے خلاف ایک زوردار لیٹر لکھوانا چاہتا ہے اور مجھے یہ امید تھی کہ مجید میرے کہنے پر حسن کے خلاف کوئی لیٹر امیگریشن کو نہیں لکھے گا مگر حسن غصے میں لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ''میں کسی طرح سے اس خبیث سے صلح نہیں کروں گا۔''

میں اسے سمجھاتا رہا۔ ''تم کو کسی قیدی پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا اور وہ بھی جب بہت سے گواہ موجود تھے۔''

وہ نہ مانا۔ باجوہ نے مجید سے اپنی مرضی کا ایک لیٹر لکھوایا اور امیگریشن آفیسر کے حوالے کر دیا۔ نوکری سے تو حسن گیا ہی مگر اس پر قانونی داؤ بھی چل گیا، پولیس آئی اور ہتھکڑیاں لگا کر اسے اپنے ساتھ لے گئی۔

باجوہ کے لیے میرے دل میں کدورت پیدا ہو گئی تھی مگر میں اسے غلط بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ گرنام پورے واقعے میں خاموش بیٹھا اخبار پڑھتا رہا۔

گرنام مجھ سے بولا۔ ''تمہاری فیملی چند ماہ میں آجائے گی تو کیا کرائے پر رہو گے؟''

میں نے اسے بتایا۔ ''ظاہر ہے، اپارٹمنٹ خریدنے کے پیسے میرے پاس کہاں ہیں؟''

اس نے مجھے یہاں اپارٹمنٹ یا گھر خریدنے کا سارا نظام سمجھایا۔ اگر دو لاکھ کا گھر ہے اور آپ یہاں کے رہائشی ہیں تو رہنے کے لیے بینک دس ہزار ڈالر ڈاؤن پر صرف تین فیصد کے انٹرسٹ پر باقی رقم ادا کر دیتا ہے۔ یہ رقم آپ نے تیس سالوں میں واپس کرنی ہوتی ہے۔ ایک لاکھ اسی ہزار پر کوئی تیرہ یا چودہ سو ڈالر ماہانہ قسط تھی۔ دو سو ڈالر کا شاید ماہانہ ٹیکس تھا اور باقی دو سو ڈالر بجلی اور گیس کے ملا کر سترہ سو کا خرچ تھا۔ دو کمروں کا اپارٹمنٹ آٹھ سے نو سو ڈالر ماہانہ کرائے پر مل جاتا تھا۔ مجھے اگر ہیمو سال میں جاب مل بھی جاتی تو ماہانہ تنخواہ ٹیکس کاٹ کر دو ہزار ہوتی۔

وہ دراصل اپنا گھر بیچنا چاہتا تھا۔ کہنے لگا۔ ''اگر بروکر کے ذریعے بیچوں تو اس کا کمیشن بھی دینا ہوگا۔ ایک لاکھ نوّے ہزار ڈالر کا گھر ہے اور میں تمہیں ایک اسّی میں دے دوں گا۔'' مزید بتانے لگا۔ ''اوپر چار کمرے ہیں اور بیسمنٹ کا الگ راستہ ہے اور وہ آسانی سے سات سو ماہوار پر اٹھ جائے گا اور تم ایک ہزار ڈالر ماہانہ کی ادائیگی پر گھر کے مالک بن جاؤ گے۔''

دوسرے دن ہولڈنگ سینٹر سے چھٹی تھی۔ اس نے کہا۔ ''میرا بیٹا تمہیں اپارٹمنٹ سے لے آئے گا۔ تم آکر گھر دیکھ جاؤ اور پھر فیصلہ کر لینا۔'' واپسی پر بھی اس نے اپارٹمنٹ ڈراپ کرنے کا وعدہ کر لیا۔

میں خاکوانی صاحب کا گھر دیکھ چکا تھا اور اپارٹمنٹ میں خود رہتا تھا۔ دونوں کی رہائش کا فرق میں بہت بہتر طور پر جانتا تھا۔ گھر میں اپنی زمین ہوتی ہے۔ زیادہ کمرے اور ٹی وی لاؤنج بھی بہت بڑا ہوتا ہے۔ دوسرے دن تین بجے کا وقت مقرر رہوا۔ گرنام کا بیٹا جو پیشے کے لحاظ سے ٹرک ڈرائیور تھا۔ مجھے لینے پہنچ گیا۔ اس کے پاس نوّے ماڈل کی ٹیوٹا کرولا تھی اور دیکھنے میں اچھی حالت میں تھی۔ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ یہی کار میری کینیڈا میں پہلی کار ہوگی۔

بریمپٹن یہاں کا مشہور علاقہ ہے۔ زیادہ تر سکھ رہتے ہیں۔ یہاں مسلمان بھی اچھی تعداد میں ..... بستے ہیں۔ یہاں کا ممبر پارلیمنٹ کوئی دیسی ہی ہوتا ہے۔ ہولڈنگ سینٹر ایئر پورٹ روڈ پر ہے اور جہاں ایئر پورٹ روڈ ڈیری روڈ سے ملتی ہے، اس کے پار بریمپٹن کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ ہم ڈیری روڈ پر آئے اور پھر دائیں جانب ایک لمبی سڑک پر مڑے۔ دونوں جانب خوب صورت چھوٹے چھوٹے گھر ایک ترتیب سے بنے تھے۔ ہر گھر کے آگے ایک درخت تھا۔ گھروں کے آگے برآمدے بنے تھے جو اس وقت برف باری اور ٹھنڈ کی وجہ سے ویران پڑے تھے۔ درخت پتوں سے خالی تھے اور اب

Downloaded From http://paksociety.com

ان کی صرف سوکھی ٹہنیاں ہی بچ گئی تھیں۔ نہ کوئی بس آرہی تھی اور نہ ہی جا رہی تھی۔ ٹریفک بھی زیادہ نہ تھی۔ مجھے یہ جگہ ویران سی لگی۔ پھر دور جا کر بائیں جانب مڑے تو الٹے ہاتھ پر ایک صاف ستھرے اور برف سے لدے گھر کے سامنے گرنام کے بیٹے سنگدل سنگھ نے گاڑی روک لی۔ ہر جانب برف تھی مگر گھر کی ڈرائیو وے صاف تھی۔

اندر داخل ہوا تو گرنام شلوار کرتے میں ملا۔ اس کی بیوی گرنام سے خاصی کم عمر تھی۔ گھر میں تین افراد تھے۔ ہم نیچے تہ خانے میں جا بیٹھے۔ سنگدل کہیں چلا گیا تھا۔ گرنام کی بیوی پکوڑے اور سموسے لے آئی۔ یہ گھر تو خاکوانی صاحب کے گھر سے بہت بڑا اور کشادہ تھا۔ بیسمنٹ تو پورا ایک علیحدہ گھر سا تھا۔ جہاں دو کمرے، لیونگ، کچن اور دو باتھ روم تھے۔ گھما پھرا کر گھر دکھایا اور ہم دوبارہ سے نیچے آرام دہ صوفوں پر آبیٹھے۔ گرنام کہنے لگا۔ ”اگر تم لینا چاہو تو ایک پھٹر پر تمہیں دے دوں گا۔“

میں کشمکش میں تھا۔ اتنے بڑے سودے میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ تھی۔ اگر بیسمنٹ کرائے پر نہیں لگی تو لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔

بعد میں مفتی نے مجھے بہت ڈرایا کہ گرمیوں میں لان کی گھاس ہر ہفتے خود ہی کاٹنی پڑتی ہے۔ سردیوں میں برف بھی اپنے گھر کی ڈرائیو وے اور سامنے فٹ پاتھ سے آپ ہی کو کنارے لگانی ہوتی ہے۔ اپارٹمنٹ میں تو بجلی اور گیس کا بل کرائے میں شامل ہوتا ہے مگر اپنے گھر میں خود اپنے پلے سے دینا پڑتا ہے اور یہاں تو بس بھی نہیں جاتی اور گاڑی لینا تو آسان ہے مگر چلانے کے لیے لائسنس بہت ہی مشکل ہے۔ مفتی کے ان ”نایاب مشوروں“ نے گھر خریدنے کے میرے ڈگمگاتے فیصلے کو زمین بوس کردیا تھا۔ ہر چیز اللہ، بندے کو نصیب سے دیتا ہے اور آج... جب میں یہ لکھ رہا ہوں تو اس گھر کی قیمت آٹھ لاکھ ڈالر سے زیادہ ہے اور ایسے گھروں کے تین پورشن بنا کر سکھوں نے کرائے پر اٹھا دیئے ہیں اور ماہانہ قسط نکال کر ہر مہینے ایک ہزار اپنی جیب میں ڈال لیتے ہیں۔

خیر میں گرنام کے گھر صوفے پر بیٹھا چائے کے آخری گھونٹ پی رہا تھا کہ گرنام آرام سے اٹھا اور وائن کی بوتل فریج سے نکالی۔ کہنے لگا۔ ”اپنی تو رات کو ہی ختم ہو گئی تھی، یہ کاکے سنگدل کی ہے۔“

میں حیران بیٹھا دیکھ رہا تھا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ باپ بیٹے کی شراب اٹھا کر خوش ہو رہا ہو۔ اتنے میں کاکا بھی آگیا۔ میں نے پینے سے انکار کردیا اور پھر دونوں باپ بیٹا مل کر جام لنڈھانے لگے اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں، ایک ایک لیٹر کی دو بوتلیں خالی کر کے پھر فریج میں جھانک رہے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سکھوں میں تو دادا، بیٹا اور پوتا مل بیٹھ کر چڑھاتے ہیں اور بعد میں ایک دوسرے کو ماں بہن کی ننگی گالیاں بھی دیتے ہیں۔

نشہ چڑھا تو گرنام سنگھ کے بارہ بج گئے۔ اپنے آپ کو ذرا ڈھیلا کیا اور صوفے پر ٹیک لگا کر اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے مونچھوں پر لگی شراب صاف کرنے لگا۔ ”اقبال پتر! یہ گھر خرید لے۔ مجھے تو بیچنا اس لیے ہے کہ سنگدل شادی کر کے کہیں اور رہنا چاہتا ہے اور میں اور میری بڑی (بیوی) کسی اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جائیں گے۔ تیرا ہی بھلا ہے۔ تو تو بس مفت میں رہے گا۔“

پھر وہ بولتا چلا گیا۔ ”اس گھر کے تین پورشن بنا لے۔ دو کرائے پر اٹھا لے سامنے کے پورشن میں خود فری میں رہے۔“

میں اس کی کسی بات کو نہیں سمجھ رہا تھا۔ وہ اب بہکنے لگا تھا۔ لڑکھڑاتی زبان سے کہے جا رہا تھا۔ ”فری میں رہنے کا مطلب ہے کہ ہر ماہ ہزار ڈالر بچا لے گا۔ یہ بڑی رقم ہے۔ عیش کرے گا۔ بندے کے پاس پیسا ہے تو سب کچھ ہے اور پیسا نہیں تو دنیا اس کے لیے خاک ہی خاک ہے۔“

بات اس کی سو فیصد صحیح تھی مگر میرا ذہن کہیں اور چلا گیا تھا۔ مجھے ایپل کمپنی کے بانی اور مالک اسٹیو جاب کے مرنے سے پہلے کہے ہوئے آخری الفاظ یاد آرہے تھے۔ جس میں وہ کہتے پایا گیا ہے کہ انسان کی زندگی میں پیسے سے بڑھ کر اور چیزوں کی اہمیت یاد ہے۔ اس کے الفاظوں نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔

اسٹیو جاب دنیا کا کامیاب ترین اور نہایت ہی امیر انسان تھا۔ امریکا کی گرتی معیشت کو اس کی ایپل کمپنی نے اب سہارا دیا ہوا ہے۔ چھپن سال کی عمر میں وہ ایک خطرناک بیماری کے ہاتھوں چل بسا تھا۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے:

”میں اپنی زندگی میں کامیابیوں کی بلندیوں تک پہنچا ہوں۔ دوسروں کی نظر میں میری زندگی ایک شاندار کامیابی کی علامت ہے۔ بہرحال میری زندگی میں کام کے علاوہ کوئی زیادہ سحر انگیزی بھی نہیں رہی۔ میرے لیے میری دولت کی صرف اتنی حقیقت ہے کہ یہ میری ایک عام سی عادت بن کر رہ گئی تھی۔ آج جب میں اسپتال کے بستر پر پڑا موت کو سامنے

Downloaded From http://paksociety.com

کھڑا دیکھ رہا ہوں تو میں اس حقیقت تک آپہنچا ہوں کہ میرے سارے اعزازات اور کامیابیاں جو مجھے آج تک حاصل ہوئیں اور جن پر میں فخر کرتا تھا، یہ سب میرے مرنے کے ساتھ ہی اپنی حیثیت کھودیں گی۔ آج جب اسپتال کے بیڈ پر میں رات کو اکیلا ہوتا ہوں تو اندھیرے میں ان سبز روشنیوں کو دیکھتا ہوں جو ان آلات سے آرہی ہوتی ہیں جہاں سے مجھے مصنوعی سانس مہیا کی جارہی ہے تو میں موت کو اپنی طرف بڑھتا محسوس کرتا ہوں۔ میں آج آپ لوگوں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آج ایک حقیقت آپ کو بتادوں کہ زندگی میں ایک بار جب آپ اتنی دولت اکٹھی کرلیں جو آپ کی باقی ماندہ زندگی کے لیے کافی ہو تو آپ یہ حرص چھوڑ کر کسی نئی دنیا کو تلاش کریں، جس کا دولت سے دور دور تک واسطہ نہ ہو۔''

اس کی یہ بات تو اسلامی احکام کی کاپی ہے۔ جس بات کی تلقین اسلام میں ہے۔ وہی بات وہ کہہ رہا ہے۔ ایسا حکم چودہ سو سال قبل ہمیں دیا گیا وہ اس نے تجربات کی بھٹی میں جل کر حاصل کیا۔ کاش ہم بھی اسے اپنالیں۔ یہی سوچ کر کہ یہ حکم دین ہے۔ اسٹیو جاب کے الفاظ پر غور کریں تو وہ دنیا میں خوشیاں کسی دوسرے ذرائع سے تلاش کرنے کا کہہ رہا ہے۔ یعنی کہ عبادت و ریاضت، انسانوں سے محبت جس کا اسلام نے سختی سے حکم دیتا ہے۔

وہ مزید کہتا ہے۔ ''موت کے وقت سب سے اہم دولت آپ کی محبتیں، یادیں، بچپن کے حسین خواب اور آپ کے وہ لمحات ہوتے ہیں جن میں آپ نے کسی کو کوئی مسکراہٹ دی ہوتی ہے۔ دولت کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دیں کیونکہ یہ آپ کی زندگی سے وہ سلوک کرے گی جو اس نے مجھ سے کیا ہے۔ خدا نے تمام انسانوں میں ایک ہی طرح کی جبلت رکھی ہے۔ وہ محبت ہے۔ ہم اس سے ایک دوسرے کے دلوں کو جیت سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کی محبت میں زیادہ خوش رہ سکتے ہیں اور یہ خوشی دولت کے انباروں سے نہیں ملتی جو میں نے آج تک بنائی ہے۔ میں اس دولت کو اپنے ساتھ لے جا نہیں سکتا ماسوائے ان یادوں کے جو محبت کی صورت مجھے ملی تھیں۔ یہ محبتیں ہی اصل سرمایہ ہیں جو آپ کے ساتھ رہیں گی، جو آپ کو طاقت بخشیں گی۔ اس زندگی میں محبت ہی واحد چیز ہے جو پائیدار ہے۔ محبت انسانوں سے ملتی ہے اور انسان بھی آپ سے محبت کرتا ہے۔ جب اسے یقین ہو جائے کہ آپ بھی اس کا خیال کرتے ہیں اور اس یقین تک پہنچنے کے لیے آپ انتھک جدوجہد کریں جو آپ کے دل میں اور وہ جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ دل میں سچ اور عظیم مقاصد رکھیں اور پھر ان مقاصد کو پانے کے لیے جدوجہد کریں۔ آپ پیسے سے سب چیزیں شاید خرید سکتے ہیں مگر کسی کے ہاتھ اپنی وہ بیماری نہیں بیچ سکتے جس نے مجھ کو موت کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا ہے۔'' اسٹیو جاب کے اس جملے پر غور کریں، کیا یہ باتیں ہمارے مذہب کا نکتہ کامل نہیں ہے۔ یہی تو حکم ہے لیکن ہم غور نہیں کرتے۔ وہ مزید کہتا ہے۔ ''دنیاوی چیزیں ایک بار کھو جائیں تو دوبارہ ڈھونڈھی جاسکتی ہیں مگر ایک چیز جو ایک بار کھو جائے واپس نہیں مل سکتی وہ زندگی ہے۔ آپ اس وقت زندگی کے کسی بھی حصے میں بھی ہیں ایک بات ذہن نشین کرلیں کہ وہ وقت آرہا ہے جب آپ موت کے روبرو کھڑے ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ پچھتاوے واپس نہ لوٹائے جاسکیں، پلیز...... پلیز محبت صرف بیوی اور بچوں سے نہیں بلکہ اپنے آس پاس کے لوگوں سے بھی کریں جو آپ کی طرف کی ایک مسکراہٹ کے منتظر ہیں اور یہی اصل دولت ہوگی جو مرتے وقت آپ اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ اسٹیو جاب۔ عمر چھپن سال۔''

میں نے بھی اسٹیو جاب کی اس آخری تحریر کو اپنی زندگی کا حصہ بنا رکھا ہے۔ آج یہ تحریر لکھتے ہوئے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ایک غیر مسلم نے زندگی کے تجربات سے جو علم حاصل کیا وہ میں نے اسلامی اصولوں سے حاصل کر رکھا ہے اور یہی چاہتا ہوں کہ میرے احباب بھی انہی اصولوں پر کاربند رہیں۔ میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ مجھے اپنے کرداروں کی تعریف کروانے کی کوئی عادت نہیں ہے۔ بلکہ اپنے تجربے اور مشاہدے سے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اصل خوشی تب حاصل ہوتی ہے جب کوئی ہاتھ آپ کی خاطر دعا کے لیے اٹھے تو کچھ نہیں کرنا بلکہ صرف مسکراہٹ اور کسی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر صرف یہی کہنا ہے۔ ''پریشان نہ ہو۔ میں ہوں ناں۔''

گرنام سنگھ پر نشہ سوار ہوتے دیکھ کر میں نے جانے کی اجازت مانگی۔

واپسی پر کاکا سنگدل گاڑی چلا رہا تھا اور میں اندر سے کانپ رہا تھا کہ کہیں نشے میں وہ ایکسیڈنٹ نہ کردے مگر خمار تو اس پر ابھی چڑھا ہی نہ تھا۔ وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''باپو یہاں آکر بھی ذرا نہیں بدلا۔ وہ آج بھی خود کو پنجاب میں بیٹھا ہوا سمجھتا ہے۔ یہ کینیڈا ہے۔ یہاں خود کو بدلنا پڑتا ہے۔''

اس کی زبان متواتر چل رہی تھی کہ وہ کچھ ہوگیا جس کا مجھے ڈر تھا۔

(جاری ہے)

Downloaded From http://paksociety.com

کھڑکی

کاشف زبیر

بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہم بھول نہیں سکتے۔ گویا وہ سب دل پر نقش ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی واقعات اس معصوم سے بچے کی زندگی میں آئے تھے جسے وہ زندگی کا حاصل سمجھتا ہے۔

امریکا سے درآمد پر اثر واقعات میں سے ایک دلچسپ کتھا

نینا بہت چالاک تھی۔ وہ میری بڑی بہن ہے اور مجھ سے تین سال بڑی ہے۔ ان دنوں وہ دس سال کی تھی اور میں صرف سات سال کا۔ مام کے مرنے کے بعد میری دیکھ بھال بھی اسی نے کی تھی اور تب صحیح معنوں میں پتا چلا کہ وہ کس قدر تیز ہے، اپنی عمر سے کہیں زیادہ تیز ذہن رکھتی ہے۔ مام کا ایک سال پہلے انتقال ہوا تھا۔ وہ نشے کی عادی تھی اور نشہ کیے بغیر اسے سکون نہیں ملتا تھا۔ ڈیڈی اس وقت مام سے الگ ہو گئے تھے جب اس نے نشہ شروع کیا تھا۔ مام کا کہنا تھا کہ اس نے

Downloaded From http://paksociety.com

نشہ ڈیڈی کی وجہ سے شروع کیا تھا کیونکہ وہ اس پر اور گھر پر توجہ نہیں دیتے تھے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ڈیڈی جب اسے اور ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تب بھی مام نے نشہ ترک نہیں کیا تھا حالانکہ اب تو نشہ کرنے کی وجہ بھی نہیں تھی۔

مام کو ہم سے محبت تھی لیکن وہ ہماری زیادہ پرواہ نہیں کرتی تھی۔ اسے صرف اپنے نشے سے مطلب تھا۔ ہاں اس نے کبھی ہمیں کھانے پینے کے حوالے سے تکلیف نہیں دی۔ اس طرح وہ ہماری سہولتوں کا خیال بھی رکھتی تھی۔ ہم اسکول جاتے تھے اور ہمارے پاس کچھ اچھے کپڑے بھی تھے۔ مام کو ان کے باپ کی طرف سے کچھ شیئرز ملے تھے جس کی آمدنی سے ہمارا گزارا ہوتا تھا۔ مام نے یہ شیئرز کبھی نہیں بیچے کیونکہ یہ شیئرز بیچنے کی صورت میں اس کے پاس کوئی ذریعہ آمدنی نہیں رہتا اور اس کے نتیجے میں حکومت ہمیں اس سے لے لیتی۔ مام کسی صورت ہم سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھی۔ اسی لیے اس نے ڈیڈی کو اپنے پاس موجود شیئرز میں ایک تہائی دے دیئے تھے کیونکہ ڈیڈی نے دوسری صورت میں کورٹ جانے کی دھمکی دی تھی اور وہاں وہ مام کے نشہ کرنے کی عادت کی بنا پر باآسانی ہمیں اس سے حاصل کر سکتے تھے۔ یہ ساری باتیں بعد میں نینا نے مجھے بتائیں کیونکہ میں تو صرف دو سال کا تھا جب مام اور ڈیڈی میں علیحدگی ہوئی تھی۔

نینا مام پر گئی تھی بہ ظاہر نرم لیکن اپنے معاملے میں بہت سخت تھی۔ ساتھ ہی اس میں یہ خصوصیت تھی کہ موقع سے فائدہ اٹھانے سے کبھی نہیں چوکتی تھی۔ اس معاملے میں وہ مجھے بھی نہیں بخشتی تھی۔ مام کے آخری دنوں میں جب وہ زیادہ تر نشے میں دھت پڑی رہتی تھی۔ گھر کا کام نینا ہی دیکھتی تھی اور مجھے کھانا وہی دیتی تھی۔ اس وقت وہ کھانے میں اچھی چیزیں جیسے بوٹیاں وغیرہ خود کھا جاتی تھی اور مجھے صرف شوربہ دیتی تھی۔ ایک بار مام نے مجھے بال لا کر دی تو اس نے چالاکی سے یہ بال غائب کر دی اور اگلے دن اس کے پاس ایک گڑیا تھی جو اس نے کہیں سے بال کے عوض حاصل کی تھی۔

جب مام کی حالت زیادہ خراب ہو گئی تو ایک دن پڑوسیوں کی کال پر پولیس نے آ کر اسے اسپتال منتقل کر دیا اور ہم دونوں بہن بھائی کو پہلے ایک رضاکار جوڑے کے سپرد کیا اور اس کے بعد ہمیں ایک سرکاری یتیم خانے بھیج دیا گیا۔ اس کے ایک مہینے بعد مام اسپتال میں انتقال کر گئی تھی اور ہمیں اس بات کا اس وقت پتا چلا جب ہمیں مام کی تدفین کے لیے لے جایا گیا تھا۔ ہمیں مام کے مرنے کا دکھ تھا لیکن بہت زیادہ نہیں کیونکہ ہمارے ذہنوں نے پہلے ہی ان کی موت کو قبول کر لیا تھا۔ آخری بار میں نے ان کو اسپتال کے بستر پر اس حالت میں دیکھا تھا کہ وہ بے ہوش تھیں اور ان کی ناک سے آکسیجن کی نلکی لگی ہوئی تھی۔ مام کی رنگت اتنی سفید ہو رہی تھی جیسے ان کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہ ہو۔ اس کے بعد میں نے مام کو تابوت میں لیٹے دیکھا تھا۔ اس وقت بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سو رہی ہوں۔

ہمیں جس یتیم خانے میں بھیجا گیا تھا۔ اس کا سربراہ مینارڈ نامی ایک پادری تھا۔ بہ ظاہر وہ ایک نرم اور نیک دل انسان تھا لیکن اس کا اصل روپ بہت سخت اور سفاک تھا۔ وہ بچوں کو معمولی سی غلطی پر بہت زیادہ سزا دیا کرتا تھا اور میں نے ایک بار اس کی دی ہوئی سزا بھگتی بھی تھی جب مجھ سے سوپ کا پیالہ گر گیا اور اس نے مجھے پورے دو دن تک کھانے کو کچھ نہیں دیا۔ دو دن بعد میں بھوک سے مرنے والا ہو گیا تھا تو اس نے مجھے ایک گندہ سا برگر کھانے کو دیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”امید ہے اب تم تمیز سے کھانا کھاؤ گے۔“

میں اس گندے برگر پر ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ بڑی دل چسپی سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ جب میرے حواس ٹھکانے آئے تو میرا دل چاہا کہ اس شخص کو قتل کر دوں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بڑا اور مضبوط آدمی تھا اور میں صرف چھ سات سال کا بچہ تھا۔ ہم ایک سال سے کچھ کم عرصے اس کے یتیم خانے میں رہے جو درحقیقت ہمارے لیے قید خانہ تھا۔ پھر آنٹی روزا ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئیں۔ جب مام کا انتقال ہوا تو پولیس نے ڈیڈی کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا کچھ پتا نہیں چلا پھر ہمیں یتیم خانے بھیج دیا گیا۔ پولیس نے ہمارے رشتے داروں کی تلاش جاری رکھی تھی اور اس تلاش کے نتیجے میں روزا آنٹی کا پتا چلا۔

روزا آنٹی مام کی دور کی کزن تھیں اور وہ جارجیا کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھیں۔ روزا آنٹی کے دو بچے تھے جو بڑے ہو کر گاؤں سے دور چلے گئے تھے۔ بیٹی نے شادی کے بعد نیویارک میں سکونت اختیار کی تھی اور بیٹا کینیڈا کا شہری بن گیا تھا۔ ظاہر ہے روزا آنٹی اور ان کے شوہر پائن انکل اکیلے رہ گئے تھے۔ اس لیے جب پولیس نے ان سے رابطہ کر کے ان کو ہمارے بارے میں بتایا تو وہ بہ خوشی ہماری ذمے داری اٹھانے کو تیار ہو گئے۔

روزا آنٹی مذہبی خیالات رکھنے والی عورت تھیں اور جب نینا کو یہ بات پتا چلی تو اس نے منہ بنا کر کہا۔ ”ایک

Downloaded From http://paksociety.com

پادری سے جان چھوٹی تو دوسرے پادری کے پاس جا رہے ہیں۔''

میں سہم گیا۔''کیا وہ فادر جوزف کی طرح سخت ہوں گی؟''

''مجھے کیا پتا۔'' نینا نے شانے اچکائے۔''لیکن یہ سارے مذہبی لوگ ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔''

میں ڈر گیا تھا کیونکہ فادر جوزف کا تجربہ بالکل بھی اچھا نہیں تھا۔لیکن ہمیں جانا تھا اور ہم انکار نہیں کر سکتے تھے۔ایک پولیس کار نے ہمیں روزا آنٹی کے فارم ہاؤس تک پہنچایا اور جب میں نے اس کی پہلی جھلک دیکھی تو میں خوش ہو گیا تھا۔اس سے پہلے میں نے صرف تصویروں میں اس قسم کے فارم ہاؤس دیکھے تھے، سچ مچ دیکھنے کا پہلا اتفاق تھا۔ جب پولیس کار اس طرف مڑی تو دور سے سرسبز درختوں کی قطار نظر آئی تھی۔ان درختوں کے پاس ایک خوب صورت دو منزلہ مکان تھا جس پر سفید رنگ کیا گیا تھا۔

''کتنا خوب صورت ہے۔''میں نے نینا سے کہا۔

''ہاں ..ٹھیک ہے۔'' اس نے بے دلی سے جواب دیا۔

لیکن جب پولیس کار مکان کے سامنے رکی تو نینا کار سے اتر کر ہمارے انتظار میں کھڑی روزا آنٹی سے یوں دوڑ کر لپٹ گئی جیسے ان سے نہ جانے کب سے بچھڑی ہوئی ہو حالانکہ ہم پہلی بار ان سے مل رہے تھے۔یہی نہیں نینا سسک سسک کر رونے بھی لگی تھی۔روزا آنٹی اس سے بہت متاثر ہوئی تھیں اور انہوں نے نینا کو خود سے مزید لپٹاتے ہوئے کہا۔''مت رو میری بچی....مجھے معلوم ہے تمہیں اپنی ماں سے بچھڑنے کا بہت دکھ ہے۔''

یہ سن کر نینا کی سسکیاں مزید تیز ہو گئیں۔ میں ایک طرف کھڑا ہوا نینا کی اداکاری دیکھ رہا تھا۔صرف مجھے معلوم تھا وہ اداکاری کر رہی ہے۔ ورنہ اس کا رونا دھونا ایسا تھا کہ ہمیں چھوڑنے کے لیے آنے والا پولیس افسر بھی متاثر نظر آنے لگا۔اس نے آنٹی روزا سے ایک پیپر پر سائن لیے اور واپس چلا گیا۔نینا اب نارمل تھی اور تجسس سے اس جگہ کا معائنہ کر رہی تھی۔ میں نے روزا آنٹی کو ہیلو کہا تو انہوں نے مجھے پیار کیا تھا لیکن ان کے انداز میں وہ گرم جوشی نہیں تھی جو نینا کے لیے تھی۔روزا آنٹی تقریباً پچاس برس کی لیکن صحت مند عورت تھیں۔انہوں نے لمبا اسکرٹ اور ڈھیلی سی شرٹ پہن رکھی تھی اور سر پر رومال بندھا ہوا تھا۔

روزا آنٹی کا مکان ان کے فارم کے سامنے والے حصے میں تھا۔مکان کے پیچھے بڑا سا فارم تھا اور اس میں ایک جھیل بھی تھی۔جھیل کے پیچھے بڑا سا جنگل تھا۔یہ بھی روزا آنٹی کی ملکیت تھا۔پولیس کار کے واپس جانے کے بعد آنٹی نے ہم سے کہا۔''چلو بچوں سامان اٹھاؤ اور اندر چلو۔''

ہمارے پاس چھوٹے چھوٹے دو ہینڈ بیگ تھے اور اس میں بھی سامان نہ ہونے کے برابر تھا۔ہم اندر آئے تو روزا آنٹی نے سب سے پہلے ہمیں اوپر کی منزل پر ایک کمرا دکھایا جسے انہوں نے بچوں کے لحاظ سے سیٹ کر رکھا تھا۔اس میں دو چھوٹے بیڈ اور دو عدد الماریاں تھیں۔ دو کرسیوں والی ایک رائٹنگ ٹیبل تھی۔ایک طرف کھلونوں کا ریک رکھا ہوا تھا اور اس میں روزا آنٹی نے پہلے ہی کئی کھلونے لے کر رکھے ہوئے تھے۔انہوں نے کہا۔''نینا اور جونی یہ تمہارا کمرا ہے اگر تم لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف مجھ سے کہہ سکتے ہو۔میں تمہاری آنٹی ہوں۔''

''شکریہ آنٹی۔'' میں نے کہا۔نینا اس وقت کھلونوں کے پاس موجود تھی۔آنٹی ہمیں کمرے کی چیزوں کے بارے میں بتانے لگیں کہ کون سے چیز کہاں رکھنی ہے اور الماری میں کپڑے کس طرح تہ کر کے رکھنے ہیں، انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جوتے اور چپل کہاں رکھنی ہے۔جانے سے پہلے روزا آنٹی نے گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔

''ٹھیک ایک بجے کھانا لگے گا، تم دونوں نیچے آ جانا۔ تمہاری اپنے انکل سے بھی ملاقات ہو گی۔''

''شکر ہے دفع ہوئی منحوس بڑھیا۔'' روزا آنٹی کے جانے کے بعد نینا نے آہستہ سے کہا۔میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''تم آنٹی کو ایسے کیوں کہہ رہی ہو؟''

''تم نے دیکھا اس کا انداز ایسا لگ رہا ہے جیسے ہمیں یہاں بلا کر اس نے کوئی بہت بڑا احسان کیا ہے۔''

''احسان تو ہے۔'' میں نے کہا۔''تم اتنے اچھے گھر میں آئی ہو تو آنٹی روزا کا احسان ہی ہے۔ورنہ وہ ہمیں رکھنے سے انکار بھی کر سکتی تھیں۔''

نینا نے منہ بنایا۔''تم ہمیشہ دوسروں کے پیچھے رہنا۔''

''اچھا ابھی نیچے رونے کا ڈراما کون کر رہا تھا؟'' میں نے طنز کیا۔

وہ بنا کسی شرم کے بولی۔''ہاں ڈراما ہی تو تھا۔اس بڑھیا کو متاثر کر رہی تھی۔تم نے دیکھا نہیں وہ بھی رونے کے

Downloaded From http://paksociety.com

قریب ہوگئی تھی۔"

میں باتوں میں نینا سے نہیں جیت سکتا تھا۔ اس لیے میں نے واش روم میں جا کر منہ ہاتھ دھوئے۔ وہاں ایک چھوٹا سا باتھ ٹب بھی تھا اور مجھے باتھ ٹب میں نہائے پورا ایک سال ہوگیا تھا۔ اس لیے میں خوش ہوگیا۔ مکان اور اس کی آرائش سے لگ رہا تھا کہ آنٹی روزا اور انکل پائن بہت دولت مند نہ سہی لیکن اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ مجھے اُمید ہوئی کہ اب ہمیں یتیم خانے کی طرح ترس ترس کر نہیں رہنا پڑے گا۔

ایک بجے میں اور نینا نیچے آئے تو کچن میں کھانے کی میز پر انکل پائن ہمارے منتظر تھے۔ وہ ایک لمبے چوڑے اور ہنس مکھ چہرے والے شخص تھے۔ ان کی عمر آنٹی روزا جتنی یا ان سے کچھ زیادہ تھی لیکن صحت ان کی بھی بہت اچھی تھی۔ اس کی وجہ بعد میں پتا چلی کہ وہ اپنے فارم ہاؤس پر خود کام کرتے تھے۔ صبح سے شام تک وہ بارہ سے چودہ گھنٹے کام کرتے تھے اور یہی ان کی صحت کا راز تھا۔ انکل پائن بھی ہم سے محبت سے ملے انہوں نے مجھ سے کہا۔

"برخوردار! ابھی تم ذرا یہاں کے عادی ہو جاؤ پھر میں تمہیں مچھلی اور پرندوں کا شکار کرنا سکھاؤں گا۔"

میں خوش ہوگیا۔ "شکریہ انکل۔"

روزا آنٹی نے بہت مزے کا کھانا بنایا تھا۔ یتیم خانے میں ہمیں بدمزہ اور نپا تلا کھانا ملتا تھا اس وجہ سے میں اور نینا دونوں کمزور تھے۔ لیکن یہاں آکر ایک ہفتے میں ہماری صحت نکھر آئی تھی۔ آنٹی ہمارے کھانے پینے کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ رات سونے سے پہلے وہ ہمیں اپنی نگرانی میں دودھ کا گلاس دیتی تھیں۔ میں اور نینا دونوں اسکول میں پڑھتے تھے۔ یہاں بھی روزا آنٹی نے ہمیں گاؤں کے اسکول میں داخل کرا دیا۔ زندگی میں پہلی بار ہمیں کوئی اچھا اسکول ملا تھا۔ میں یہاں آکر بہت خوش تھا لیکن نینا اتنی خوش نہیں تھی کیونکہ اسکول سے آنے کے بعد آنٹی روزا اسے کسی نہ کسی کام کے لیے بلا لیتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ نینا گھر کے کام کرنا سیکھے تاکہ مستقبل میں وہ پورا گھر چلانے کے قابل ہو سکے۔ نینا کے بارے میں ایک بات بتانا میں بھول گیا کہ وہ بلا کی کام چور اور کاہل ہے اگر اس کا بس چلے تو وہ سارا دن بستر پر لیٹ کر کامک بک پڑھتی رہے۔ روزا آنٹی کی وجہ سے اسے آرام کرنے کا موقع کم ملتا تھا اس لیے وہ ان سے اور بھی چڑنے لگی تھی۔ رات کو جب ہم اپنے کمرے میں ہوتے اور نینا کو یقین ہو جاتا کہ آنٹی روزا اور انکل پائن اپنے کمرے میں سو چکے ہیں تو وہ آنٹی کو بری بری گالیاں اور القاب دیتی تھی۔ وہ مجھ سے کہتی۔ "تم دیکھنا جیسے ہی میں اٹھارہ سال کی ہوں گی اس قید خانے سے بھاگ جاؤں گی۔"

مجھے نینا سے شدید اختلاف تھا۔ ایک تو وہ آنٹی روزا جیسی شفیق عورت کو اتنے برے الفاظ سے نوازتی تھی دوسرے وہ ان کے اتنے اچھے اور پُرسکون گھر کو قید خانہ قرار دے رہی تھی۔ حالانکہ یہ فادر جوزف کے یتیم خانے سے لاکھ درجے بہتر تھا۔ بلکہ ان دونوں کا آپس میں کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ لیکن میں یہ بات نینا سے نہیں کہہ سکتا تھا ورنہ وہ میری دشمن بن جاتی اور میں فی الحال اس کی دشمنی مول لینے کے موڈ میں نہیں تھا کیونکہ یہاں آنے کے بعد میں اپنی زندگی کے بہترین دن گزار رہا تھا۔ نینا میری خوشیوں کو ملیامیٹ کر سکتی تھی۔ پھر بھی میں نے دبی زبان میں کہا۔ "یہ جگہ فادر جوزف کے یتیم خانے سے بہت بہتر ہے۔ یہاں ہمارا کتنا خیال رکھا جاتا ہے۔"

"خیال رکھا جاتا ہے۔" نینا کا چہرہ مارے غصے کے بگڑ گیا تھا۔ "یا ہم سے یہاں بیگار لیا جاتا ہے۔ اس بڑھیا کا بس نہیں چلتا ہے کہ سارا دن مجھ سے گدھوں کی طرح کام لے۔ اس سے اچھے تو ہم یتیم خانے میں تھے۔"

ممکن ہے نینا کے خیالات اس کے ذاتی تجربات کا نتیجہ ہوں لیکن یہاں میں بہت مزے سے تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد میں انکل پائن کے پاس کھیتوں میں چلا جاتا اور ان کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا تھا۔ اگرچہ وہ مجھے منع کرتے تھے کہ ابھی میں ان کاموں کے لیے چھوٹا تھا، جب میں ذرا بڑا ہو جاؤں گا تو وہ خود مجھے یہ کام سکھائیں گے۔ پھر کھانا کھا کر میں کچھ دیر آرام کرتا تھا اور شام کو انکل پائن مجھے مچھلی کا شکار سکھانے کے لیے جھیل پر لے جاتے تھے جہاں انہوں نے اچھی نسل کی مچھلیاں پال رکھی تھیں۔ اور وہ ان کو مصنوعی غذاؤں کے بجائے جھیل میں اگنے والی قدرتی غذا پر پال رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح مچھلی بہت سستی سے بڑھتی ہے لیکن گوشت لذیذ ہو جاتا ہے۔ مسلسل ایک ہفتے کی کوشش کے بعد میں ایک چھوٹی مچھلی شکار کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس شام آنٹی نے میری کامیابی کی خوشی میں دعوت کی تھی اور انکل نے مچھلی سمیت میری تصویر لی تھی۔ سب خوش تھے سوائے نینا کے۔

نینا کا خیال تھا کہ آنٹی روزا اور انکل پائن میرے ساتھ خصوصی سلوک کرتے ہیں جب کہ اس کے ساتھ ان کا سلوک

Downloaded From http://paksociety.com

ایسا نہیں ہے۔ مجھے کتے پسند تھے اس لیے انکل پائن نے مجھے ایک چھوٹا بل ٹیریر لا دیا۔ آنٹی روزا کو کتے پسند نہیں تھے اور وہ ان کا گھر میں آنا تو بالکل پسند نہیں کرتی تھیں اس لیے میں نے اور انکل پائن نے کتے کے لیے عقبی لان میں ایک چھوٹا سا لکڑی کا گھر بنا دیا جس میں وہ رہا کرتا تھا۔ وہ اتنا سمجھدار تھا کہ نہ تو گھر میں گھستا تھا اور نہ ہی لان میں گندگی کرتا تھا۔ آنٹی روزا نے ایک سفید رنگ کی بڑے سائز کی بطخ پال رکھی تھی۔ یہ جھیل کے آس پاس رہا کرتی تھی اور مزے سے جھیل میں تیرتی تھی۔ اس وقت تک وہ فارم پر اکیلا جانور تھی لیکن کتا آیا اور گھر کے عقبی لان میں رہنے لگا تو بطخ کو لگا جیسے اس کا حریف آ گیا ہو۔

جب میں کتے کے ساتھ نکلتا تھا تو بطخ صرف گھورتی اور آوازیں نکالتی تھی لیکن اگر کتا اکیلا جھیل کی طرف جا نکلتا تو وہ اسے مارنے کو دوڑتی تھی۔ ایک بار اس نے کتے کی کمر پر ایسی زوردار چونچ ماری کہ وہاں زخم بن گیا تھا اور اس کے بعد کئی دن تک کتا ڈر کے مارے اپنے گھر سے بھی نہیں نکلا تھا۔ کیونکہ بطخ آنٹی کی چہیتی تھی اس لیے میں نے اسے کچھ کہنے سے گریز کیا لیکن مجھے اس پر غصہ بہت تھا۔

ہمیں یہاں آئے ہوئے چھ مہینے ہونے کو آئے تھے۔ میرے اور نینا کے امتحانات تھے۔ اس لیے دوسری ساری سرگرمیاں چھوڑ کر ہم پڑھنے میں لگے تھے۔ نینا خوش تھی کہ آنٹی اسے کام کے لیے نہیں کہتی تھیں۔ وہ مزے سے اپنے پیپرز کی تیاری کے بعد کامک بک پڑھتی تھی۔ ان دنوں آنٹی ہمارا خصوصی خیال رکھ رہی تھیں۔ انہوں نے انکل پائن کو مکان کے قریب مشینیں چلانے سے منع کر دیا تھا کیونکہ ان کے شور سے ہماری پڑھائی متاثر ہو سکتی تھی۔

آنٹی روزا اور انکل پائن مزاج کے لحاظ سے بہت سادہ اور سیدھے لوگ تھے ان کو جدید دور کی تفریحات سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ ان کے گھر میں نہ تو ٹی وی تھا، نہ کوئی میوزک سسٹم اور نہ ہی ان کو سینما جانے کا شوق تھا۔ دیکھا جائے تو ان کے گھر میں ایک بچے کے لیے دل چسپی کے لوازمات نہیں تھے اس کے باوجود مجھے وہاں بہت مزہ آیا تھا۔ البتہ نینا کو ٹی وی اور میوزک سسٹم کی کمی بہت کھلتی تھی۔ انکل پائن اسے جو جیب خرچ دیتے تھے اس سے رقم بچا کر اس نے ایک چھوٹا سا ایف ایم ریڈیو خرید لیا تھا اور رات کو کانوں پر ہیڈ فون چڑھا کر اس سے موسیقی سنتی تھی۔

امتحانات کے بعد ہماری چھٹیاں تھیں اور انکل پائن

سلیم بانو

سلیمہ بانو بیگم، جہانگیر کی سوتیلی ماں تھی۔

شہزادہ سلیم کو اپنے شہنشاہ باپ اکبر سے یہ شکایت تھی کہ اس نے اسے ولی عہد کے شایان شان عزت نہیں بخشی اور وہ محسوس کرتا تھا کہ اکبر اس سے زیادہ اس کے بیٹے ''خرو'' سے پیار کرتا ہے اسے خدشہ تھا کہ اکبر اس کی بجائے خرو کو ولی عہد مقرر کرے گا لہٰذا اس نے اکبر کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اس پر ابوالفضل نے اکبر کو لکھا کہ شہزادہ سلیم کا طرز عمل درست نہیں ہے اس کا کوئی بندوبست ہونا چاہیے اور یہ بھی لکھا کہ سختی کے بغیر علاج ممکن نہیں میں شہزادہ سلیم کو پابہ زنجیر شاہی میں پیش کروں گا۔ سلیم (جہانگیر) کو ابوالفضل کے عزائم معلوم ہو گئے تھے اس لیے اس نے بیر سنگھ بندھیلہ کے ذریعے راستے ہی میں ابوالفضل کو قتل کروا دیا۔ (ابوالفضل اکبر کا وفادار وزیر تھا اور اکبر نے ابوالفضل کے مشورے پر ہی حضرت سلیم چشتی کے نسبت سے ہی جہانگیر کا نام سلیم رکھا تھا۔ اکبر کو ابوالفضل کی اچانک موت کا بڑا دکھ ہوا یوں اکبر شہزادہ سلیم (جہانگیر) سے سخت ناراض ہوا اور خرو کو اپنا جانشین مقرر کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ ان حالات میں شہزادہ سلیم (جہانگیر) کی سوتیلی ماں سلیمہ بانو بیگم نے اپنی مخلصانہ کوششوں سے شہزادہ سلیم کو نہ صرف بچایا بلکہ باپ بیٹے کے درمیان صلح بھی کروائی۔ سلیمہ بانو بیگم نے مریم مکانی حمیدہ بیگم اکبر کی ماں کے ذریعے شہزادہ سلیم (جہانگیر) کی اکبر سے صلح کروائی لیکن یہ صلح عارضی ثابت ہوئی یہاں تک کہ اکبر کی وفات تک باپ بیٹے کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم نہ ہو سکے۔ جہانگیر کی اٹھارویں بیوی نور جہاں، جہانگیر کی سوتیلی ماں سلیمہ بیگم کی مقرب خاص تھی۔

مرسلہ: مرسلہ: اشفاق حسین، گجرات

Downloaded From http://paksociety.com

نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ چھٹیوں میں وہ مجھے غلیل سے پرندوں کا شکار کرنا سکھائیں گے۔ اس علاقے میں پرندے بہت تھے، وہ فصلوں اور درخت پر لگنے والے پھلوں کو نقصان پہنچاتے تھے۔ ان کے خاتمے کے لیے مقامی کونسل نے آتشیں ہتھیاروں کے استعمال پر پابندی لگا دی تھی کیونکہ رائفلوں اور ایئرگن کی مدد سے کسانوں نے پرندوں کا اتنا شکار کیا کہ ان کی نسلیں مٹ گئی تھیں۔ اس لیے پرندوں کو شکار کرنے کی اجازت تھی لیکن غلیل کی مدد سے، اس طرح پرندوں کا بے دریغ شکار ممکن نہیں تھا اور ان کی تعداد بھی ایک حد میں رہتی۔

انکل کے پاس کئی جدید غلیلیں تھیں جن کی مدد سے پتھر کی گولی بہت طاقت اور درست طریقے سے پھینکی جا سکتی تھی۔ میری گرمیوں کی چھٹیاں آئیں تو میں نے انکل پائن کو ان کا وعدہ یاد دلایا۔ انہوں نے مجھے المونیم کی بنی ایک ہلکی اور طاقت ور غلیل دی۔ اس میں بہت اعلیٰ درجے کا ربر لگا ہوا تھا۔ ایک سات سال کے بچے کے لیے اسے استعمال کرنا بھی آسان تھا۔ انکل پائن نے مجھ سے کہا۔ ”پہلے تم اسے چلانے کی مشق کرو اور نشانہ درست کرو۔“

انکل نے باغ میں نشانے کے لیے مصنوعی پرندے ڈوریوں سے باندھ کر درختوں سے لٹکا دیے۔ وہ ہوا میں جھولتے تھے اور میں غلیل کی مدد سے انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کرتا تھا۔ کئی دن کی مشق کے بعد میرا نشانہ بہتر ہو گیا تھا۔ تب میں نے انکل سے جنگل میں جا کر پرندے شکار کرنے کی اجازت مانگی۔ انکل پائن نے کہا۔ ”اصل چیز شکار نہیں ہے بلکہ یہ جاننا ہے کہ کن پرندوں کو شکار کرنا ہے اور کن کو نہیں کرنا۔“

انکل پائن کے پاس اس علاقے میں پائے جانے والے تمام پرندوں کی ایک البم تھی انہوں نے مجھے ان پرندوں کی تصویریں دکھائیں جن کے شکار کی ان دنوں اجازت تھی اور پھر ان پرندوں کے بارے میں بتایا جن کے شکار پر پابندی تھی۔ پھر انہوں نے میرا امتحان لیا اور مجھے دوبارہ البم دکھا کر پوچھا کہ کن پرندوں کا شکار کرنا ہے اور کن کا نہیں کرنا ہے۔ میں نے تقریباً سو فیصد درست جواب دیا تھا۔ انکل خوش ہو گئے اور انہوں نے مجھے جنگل میں جا کر شکار کرنے کی اجازت دے دی۔

”تم جنگل کی حد میں رہو گے اس سے آگے مت جانا کیونکہ تم اس علاقے سے واقف نہیں ہو۔ یہ سیٹی اپنے پاس رکھو۔“ انہوں نے ایک وسل میرے گلے میں ڈال دی۔ ”اگر تم کو کوئی چوٹ لگ جائے یا تمہیں کسی معاملے میں مدد کی ضرورت ہو تو یہ سیٹی بجا دینا میں آ جاؤں گا۔“

میں دوپہر کو گھر سے نکلا کیونکہ اس وقت سورج سر پر ہوتا ہے اور درختوں پر بیٹھے پرندے صاف نظر آتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ آج جب میں واپس آؤں گا میرے پاس موجود نیٹ کے تھیلے میں کئی پرندے ہوں گے۔ انکل پائن نے مجھے سلیٹی رنگ کی کانچ کی گولیاں دی تھیں۔ یہ وزنی ہونے کی وجہ سے شکار کو بہت قوت سے لگتی تھیں اور صحیح جگہ لگ جاتی تو ایک ہی گولی کافی ہوتی۔ میرے پاس ایسی کوئی دو درجن گولیاں تھیں۔ انکل نے کہا تھا کہ میں مارنے کے بعد گولی بھی واپس حاصل کروں کیونکہ یہ خاصی مہنگی ملتی ہیں۔ جنگل میں بے شمار درخت تھے اور ہر درخت پر بے شمار پرندے تھے۔

میں نے ان کو نشانہ بنانے کی کوشش شروع کی لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ میں ایک پرندے کو بھی نشانہ نہیں بنا پایا تھا۔ شاید پرندے جان گئے تھے کہ غلیل لے کر آنے والا ان کی تاک میں ہوتا ہے۔ اس لیے وہ پہلے ہی میری طرف سے ہوشیار ہو جاتے تھے اور جیسے ہی میں ان کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتا وہ اڑ جاتے تھے۔ میں کئی گھنٹے تک یہ مشق کر کے تھک گیا۔ ایک بھی پرندہ میرے نشانے پر نہیں آیا تھا۔ ساری گولیاں بنا نشانے کے جا رہی تھیں۔ اس دوران میں کوئی ایک درجن گولیاں بھی گنوا بیٹھا تھا۔ مجھے غصہ آ رہا تھا۔ شام ہونے کو تھی اور مجھے تھکن کے ساتھ بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے واپسی کا ارادہ کیا۔

میں جھیل والے راستے سے واپس آ رہا تھا کہ میری نظر آنٹی روزا کی بطخ پر پڑی جو بڑی شان سے دھوپ میں اپنے پر پھیلا کر ان کو خشک کر رہی تھی۔ مجھے غصہ آیا ہوا تھا اور پھر مجھے بطخ کا کتے پر حملہ بھی یاد آ گیا۔ میں نے غیر ارادی طور پر غلیل میں گولی رکھی اور اسے کھینچ کر بطخ کو دے مارا۔ میرا ارادہ اس کے جسم کو نشانہ بنانے کا تھا تا کہ اسے بھی ایسی تکلیف ہو جیسی کتے کو ہوئی تھی۔ مگر گولی اس کے سر پر جا لگی۔ بطخ نے ہلکی سی آواز نکالی اور گر گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اچانک حملے کی وجہ سے گری ہے اور ابھی پر ہلاتی ہوئی اٹھ جائے گی۔ اس کے بعد مجھے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑے گا، غصے میں وہ بہت خطرناک ہو جاتی تھی۔ میں اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا اور وہ ایسے ہی پڑی تھی گرنے کے بعد وہ ذرا بھی نہیں ہلی تھی۔

پہلی بار مجھے فکر ہوئی اور میں ڈرتے ڈرتے بطخ کے پاس گیا۔ وہ زمین پر بالکل ساکت پڑی تھی اور اس کی چونچ

Downloaded From http://paksociety.com

کھلی ہوئی تھی اور اس کی چونچ کے سوراخوں سے خون نکل کر جم رہا تھا۔ میں کانپ گیا۔ مجھے لگا بطخ مر چکی ہے۔ میں نے اسے پاؤں سے ہلایا لیکن وہ پھر بھی ساکت رہی۔ اب مجھے پسینے آنے لگے تھے میں نے آنٹی روزا کی چہیتی بطخ کا خاتمہ کر دیا۔ میں نے آس پاس دیکھا کہ کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا ہے۔

تب مجھے درختوں کے درمیان کھڑی نینا دکھائی دی۔ وہ نہ جانے کب سے وہاں کھڑی تھی اور یقیناً اس نے یہ سب دیکھ لیا تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ مسکرائی اور پھر مڑ کر مکان کی طرف چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی میں نے گولی تلاش کر کے اپنی جیب میں رکھی جس سے بطخ ماری گئی تھی اور پھر بطخ کا بھاری جسم جھیل میں دھکیل دیا۔ تاکہ ایسا لگے کہ اسے جھیل میں کچھ ہوا تھا اور وہ مر گئی۔

پھر میں ڈرتے ڈرتے مکان کی طرف آیا۔ مجھے خوف تھا کہ نینا نے آنٹی روزا کو بتا نہ دیا ہو۔ لیکن آنٹی روزا معمول کے مطابق کچن میں کام کر رہی تھیں۔ نینا اوپر گئی ہوئی تھی۔ میری بھوک مر گئی تھی اس لیے آنٹی روزا کی طرف سے سینڈوچز کی پیش کش مسترد کر کے اوپر آ گیا تھا۔ نینا مزے سے لیٹی کامک بک پڑھ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ پھر کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ آنٹی اور انکل پائن کو شام تک معلوم ہو گیا تھا کہ بطخ جھیل میں مردہ حالت میں تیر رہی ہے۔ انہوں نے اسے نکال کر ایک جگہ دفن کر دیا۔ آنٹی روزا کچھ افسردہ لگی تھیں لیکن انہوں نے اس بارے میں کچھ کہا نہیں تھا اور اگلے روز جیسے سب نارمل تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔

اس شام کو انکل پائن ہم سب کو لے کر ماہانہ شاپنگ پر نکلے تھے۔ گاؤں سے ذرا دور ہائی وے پر ایک بہت بڑا اسٹور تھا جہاں سے ضرورت کا تمام سامان مل جاتا تھا۔ میں اور نینا بھی اپنے جیب خرچ سے چیزیں لیتے تھے۔ نینا کامک بک خریدتی تھی اور مجھے ایروپلین لینے کا شوق تھا۔ جیسے ہی ہم اسٹور پہنچے نینا نے میرا بازو پکڑا اور بلند آواز سے بولی۔ ”جونی تم نے کامک بک لینے کو کہا تھا آج میں تمہیں کامک بک دلواتی ہوں۔“

”لیکن جونی کو تو کامک بک پسند نہیں ہے۔“ آنٹی روزا نے حیرت سے کہا۔

”پسند ہے آنٹی اس نے خود مجھ سے کہا ہے۔“ نینا نے آنٹی روزا کو جواب دیا اور آہستہ سے مجھ سے کہا۔ ”بطخ یاد رکھنا۔“

اس کے بعد میں نینا کے ساتھ کھنچا چلا گیا۔ اس نے اپنے جیب خرچ سے کامک بک خریدیں اور اس کے بعد میرے سارے جیب خرچ سے بھی اپنی پسندیدہ کامک بکس لے لیں۔ میں چوں بھی نہیں کر سکا تھا۔ لیکن اندر سے مجھے شدید غصہ آ رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی نینا نے کئی بار میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا لیکن آج اس نے حد کر دی تھی۔ پچھلی بار میں نے اسٹور میں کھلونوں کے شعبے میں ایک طیارہ دیکھا اور اسے لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ خاصا مہنگا تھا اور اس کے لیے میں نے سارے مہینے بچت کی تھی اور جب میں طیارہ لینے آیا تو نینا نے بلیک میل کر کے میری ساری بچت ہتھیا لی تھی۔ واپسی میں وہ خوشی سے گنگنا رہی تھی اور میں دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا۔

اس روز میں نے نینا سے بات نہیں کی اور نہ ہی اسے گڈ نائٹ کہا لیکن اسے پرواہ بھی نہیں تھی۔ وہ اپنی کامک بکس میں کھوئی رہی تھی۔ وہ کامک بھی اپنی شخصیت کی طرح پسند کرتی تھی۔ یہ ایک برا کردار کاپر مین تھا جو جس چیز کو چھوتا اسے کاپر زنگ سے بھر دیتا تھا اگرچہ وہ بہت سارے کارنامے بھی انجام دیتا تھا۔ لیکن وہ منفی کریکٹر تھا اور اس وجہ سے نینا کو پسند تھا۔

چھٹیوں میں آنٹی روزا نینا کو کوئی نہ کوئی ذمے داری سونپ دیتی تھیں جسے اس کو انجام دینا پڑتا تھا۔ آج کل اسے روز دوپہر کے کھانے کے بعد برتن دھونا اور کچن صاف کرنا پڑتا تھا جب کہ اس کی شدید خواہش ہوتی تھی کہ وہ فوراً کمرے میں جائے اور کھڑکی سے آتی دھوپ میں لیٹ کر کامک بک پڑھے۔ اسے آدھے پون گھنٹے کی ذمے داری بھی کھلتی تھی حالانکہ اسے سوائے چند معمولی سے کاموں کے اور کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا جب کہ یتیم خانے میں اپنے برتن سے لے کر کپڑے تک اسے خود دھونے پڑتے تھے۔ وہاں وہ چوں چرا کیے بغیر سارے کام کرتی تھی اور یہاں اسے اتنی آسائشیں تھیں اس کے باوجود وہ معمولی کام کرنے کو تیار نہیں تھی۔

اس روز میں صبح شکار پر گیا اور میں نے دو پرندے بھی مارے تھے۔ میں ان کو لے کر آنٹی روزا کے پاس آیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ انہیں رات کے کھانے میں استعمال کریں گی۔ ان کا سوپ بہت لذیذ بنتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ آنٹی روزا نے میز پر کھانا لگا دیا اور سب آ گئے۔ ہم نے کھانا کھایا اور کھانے کے بعد آنٹی روزا نے اپنا ایپرن اتارتے ہوئے کہا۔ ”نینا چلو برتن دھو کر کچن صاف کرو۔“

”آنٹی آج جونی نے مجھ سے کہا ہے کہ یہ برتن دھو کر کچن صاف کرے گا۔“

Downloaded From http://paksociety.com

آنٹی روزا نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”کیا واقعی جونی؟“

”بالکل آنٹی۔“ نینا نے خاص انداز میں میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دھمکی نمایاں تھی کہ میں نے اس کی بات سے انکار کیا تو وہ آنٹی روزا کو بتادے گی کہ ان کی چہیتی بطخ کو کس نے ہلاک کیا تھا۔ اس نے بنا بولے صرف ہونٹوں سے بطخ بھی کہا تھا۔ میں انکار نہیں کرسکتا تھا مجبوراً میں نے کہا۔ ”جی آنٹی آج میں برتن دھو کر کچن صاف کروں گا۔“

نینا مسکراتی ہوئی اوپر چلی گئی اور میں اس کی جگہ برتن دھونے لگا۔ مجھے کام کرنے میں کوئی عار نہ تھا بلکہ مجھے کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن نینا مجھ سے جو سلوک کررہی تھی اس نے مجھے مشتعل کردیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں پرانے زمانے کا غلام ہو جس سے اس کا آقا اپنی مرضی سے مشقت لے رہا تھا۔ میں نے برتن دھو کر کچن بھی صاف کیا۔ میں اوپر آیا تو نینا کو مزے کرتے دیکھ کر سلگ اٹھا اور میں نے اس سے کہا۔ ”تم میرے ساتھ اچھا نہیں کررہی ہو۔“

اس نے شرارت سے میری طرف دیکھا۔ ”تم نے بڑا اچھا کیا تھا ایک معصوم بطخ کو بلاوجہ ہلاک کرکے۔“

اس کی آواز خاصی بلند تھی۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ ”پلیز آہستہ بولو آنٹی روزا نے سن لیا تو...“

”یہی تو میں تمہیں کہہ رہی ہوں کہ اگر ان کو پتا چل گیا تو تم سوچ سکتے ہو ان کا کیا ردِعمل ہوگا۔ شاید وہ تمہیں واپس یتیم خانے بھیج دیں۔“

یہ خیال بڑا ہی لرزہ خیز تھا۔ میں کسی صورت اس گھر کو چھوڑ کر یتیم خانے میں نہیں جانا چاہتا تھا جہاں سے میری ایک بھی اچھی یاد وابستہ نہیں تھی۔ نینا غور سے مجھے دیکھ رہی تھی اس نے سر ہلایا۔ ”میں آنٹی سے نہیں کہوں گی اگر تم میری یہ چھوٹی موٹی باتیں مانتے رہو۔“

”مجھے تمہاری بات ماننے میں کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن اس طرح بلیک میل کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔“

نینا ہنسی۔ ”اوکے میں تمہیں بلیک میل نہیں کروں گی لیکن جب میں تم سے کچھ کرنے کو کہوں تو شرافت سے مان جایا کرو تاکہ مجھے دھمکی دینا ہی نہ پڑے۔“

میں نے بے دلی سے سر ہلایا۔ میں اسے جانتا تھا اگر میں نے اس کی کوئی بات ماننے سے انکار کیا تو وہ بلاتکلف آنٹی روزا کو بطخ کی ہلاکت کے واقعے سے آگاہ کردے گی اور اسے ذرا بھی پروا نہیں ہوگی کہ اس شکایت کے نتیجے میں اس کے چھوٹے بھائی کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ نینا مجھے کبھی پسند نہیں رہی تھی لیکن اس واقعے کے بعد تو مجھے اس سے نفرت ہوگئی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ میں بہت کمزور تھا اور اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ میں ڈرتا تھا کہ آنٹی کو اصل حقیقت کا پتا چل گیا تو مجھے واپس یتیم خانے میں بھیج دیا جائے گا۔

پھر اسکول کھل گئے اور اس دوران میں کئی بار نینا نے اسی طرح مجھے بلیک میل کرکے اپنا مطلب پورا کیا۔ ہم بڑی کلاس میں آگئے تھے اس لیے اب ہمیں زیادہ دیر اسکول میں رکنا پڑتا تھا اور گھر میں بھی اسکول کا خاصا کام کرنا پڑتا تھا اس لیے پرندوں اور مچھلی کے شکار کی تفریح صرف اتوار کے دن تک محدود رہ گئی تھی۔ دوپہر کے بعد میں اور انکل پائن شکار پر جاتے تھے جب کہ نینا آنٹی روزا کا ہاتھ بٹاتی تھی کیونکہ اتوار کی رات وہ ذرا خصوصی اہتمام کرتی تھیں اور اس سلسلے میں انہیں نینا کی مدد درکار ہوتی تھی۔ نینا اس پر بہت چڑتی تھی۔

”بڑھیا میرے آنے سے پہلے بھی تو اتوار کا ڈنر بناتی تھی۔“

”اس وقت وہ دو افراد تھے۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”اب ہم چار افراد ہیں، آنٹی کو یقیناً مدد کی ضرورت ہے۔“

اس نے مجھے گھورا اور زہریلے لہجے میں بولی۔ ”تو صرف میری شامت کیوں آتی ہے تم مزے کرتے ہو۔“

”میں ناشتے کے بعد زمین کی صفائی میں انکل پائن کا ہاتھ بٹاتا ہوں۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

مگر نینا قائل ہونے والی لڑکیوں میں سے نہیں تھی اس کا خیال تھا اس کے ساتھ زیادتی ہورہی تھی۔ آنے والے اتوار کو دوپہر کے بعد میں اور انکل پائن تیار ہوکر شکار پر جانے لگے تو نینا نے کہا۔ ”جونی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آج یہ آنٹی کا ہاتھ بٹائے گا اور اس کی جگہ میں شکار پر جاؤں گی کیوں جونی کیا تھا نا وعدہ؟“

میرے اندر غصہ ابھرنے لگا تھا اور شاید میں انکار کردیتا لیکن جب میں نے نینا کی طرف دیکھا تو اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ میرے انکار کی منتظر ہے اور فوراً آنٹی روزا کو میری شکایت لگادے گی۔ میرا غصہ سرد پڑگیا اور میں نے سر ہلادیا۔ ”ہاں میں نے وعدہ کیا تھا۔“

”ٹھیک ہے آج نینا جائے گی۔“ انکل پائن نے خوش دلی سے کہا۔

”اور جونی میرے ساتھ کام کرے گا۔“ آنٹی بولیں۔

”جونی آج میں ٹرکی میں چاول اور سبزی بھر کر بنانے جارہی

Downloaded From http://paksociety.com

ہوں۔ تم نے اتنی مزے کی چیز آج تک نہیں کھائی ہوگی۔"

نینا اور انکل پائن چلے گئے۔ میں آنٹی روزا کا ہاتھ بٹانے لگا۔ کام کے دوران وہ مجھے بائبل کے اکتساب سنانے لگیں۔ فارغ اوقات میں ان کا مشغلہ بائبل پڑھنا تھا اور وہ جب موقع ملتا ہمیں اس کا کوئی نہ کوئی حصہ سناتی تھیں۔ فادر جوزف کے یتیم خانے میں رہنے کی وجہ سے ہمیں مذہب سے کوئی دل چسپی نہیں رہی تھیں لیکن یہاں آنے کے بعد آنٹی نے ہمیں مجبور کیا تھا کہ ہم مذہب کی طرف توجہ دیں۔ وہ ہمیں ہر اتوار کو چرچ لے جاتی تھیں اور رات کے کھانے سے پہلے ہمیں بائبل کا کچھ حصہ ضرور سناتی تھیں۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ہمیں مذہبی اخلاقیات کے بارے میں بتائیں۔ اس شام انہوں نے مجھے کچھ آیات سنائیں جو جھوٹ بولنے اور اپنی خطاؤں سے توبہ کرنے کے بارے میں تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ خاص طور سے سنا رہی تھیں اور میں ڈر گیا کہ کہیں ان کو معلوم تو نہیں ہو گیا کہ ان کی بطخ کو میں نے ہی مارا تھا۔

لیکن انہوں نے سوائے آیات سنانے کے اور کوئی ایسی بات نہیں کی بلکہ مجھے کھانا بنانا سکھانے لگیں۔ "جونی سیکھ لو زندگی میں کبھی ایسا موقع آیا کہ جب اپنا بنایا ہوا کھانا پڑے تو تمہیں پچھتاوا نہیں ہوگا۔"

"تو آپ مجھے سکھا دیں۔"

"میں سکھاؤں گی۔" انہوں نے کہا اور مجھے سبزی کاٹنے کو دی اور اس کا طریقہ بھی سکھایا کہ کس طرح کاٹنی ہوگی۔ میں نے ان کو سبزی کاٹ کر دی تو وہ خوش ہو گئیں۔ "واہ تم نے تو اتنی باریک اور اچھے طریقے سے کاٹی ہے، ایسی تو کبھی نینا نے بھی نہیں کاٹی ہے۔"

میں جانتا تھا نینا کوئی کام بھی دل لگا کر نہیں کرتی ہے بلکہ وہ جان چھڑاتی تھی۔ آنٹی روزا نے چاول اور سبزیاں ابالیں اور ان کو ٹرکی کے خالی پیٹ میں بھر کر اسے اوون میں رکھ دیا۔ اب اسے کوئی پون گھنٹے پکنا تھا۔ اس دوران میں آنٹی ساسز تیار کرنے لگیں۔ وہ کھانے پینے کی ساری چیزیں خود بناتی تھیں۔ اچار چٹنیاں اور مربے بھی خود تیار کرتی تھیں جو اسٹور سے آرام سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ اس روز انہوں نے مجھے کئی چیزیں تیار کرنا سکھائیں اور ان کی سکھائی ڈشز بعد میں میرے بہت کام آئی تھیں۔ شام گئے انکل پائن اور نینا آئے۔ نینا خوش نہیں تھی کیونکہ اسے کوشش کے باوجود کوئی مچھلی نہیں ملی تھی لیکن میں خوش تھا میری شام آنٹی روزا کے ساتھ اچھی گزری تھی۔

وہ دونوں نہانے دھونے چلے گئے۔ انکل دو بڑی مچھلیاں لائے تھے جنہیں آنٹی نے اگلے روز کے کھانے کے لیے فریج میں رکھ دیا تھا۔ میں اوپر آیا تو نینا نہانے کے بعد بال خشک کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میرا خوش گوار موڈ غارت ہو گیا تھا اور مجھے پھر سے غصہ آنے لگا۔ میں نے اس سے کہا۔ "اب میں تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا۔"

"تب میں آنٹی کو بتا دوں گی کہ ان کی بطخ کیسے مری تھی۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"بے شک تم بتا دو۔"

اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ "تمہیں خوف نہیں ہے آنٹی تمہیں واپس فادر جوزف کے یتیم خانے بھیج دیں گی۔"

"بے شک وہ واپس بھیج دیں۔" میں نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

نینا مسکرائی۔ "ابھی تم غصے میں ہو اس لیے ایسا کہہ رہے ہو۔ ویسے میں آج بور ہوئی۔ مچھلی کا شکار بہت بور کام ہے آئندہ میں کبھی مچھلی کے شکار پر نہیں جاؤں گی۔"

میں اس سے کہنا چاہ رہا تھا کہ وہ جہنم میں جائے۔ لیکن میں نہیں کہہ سکا بس اتنا کہا۔ "میں اب ہرگز ہرگز تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا۔"

رات کا کھانا اتنا اچھا تھا کہ انکل پائن نے بھی تعریف کی۔ آنٹی روزا نے کہا۔ "میرا خیال ہے اس کا کریڈٹ جونی کو بھی جاتا ہے اس نے بہت دل لگا کر کام کیا تھا۔"

"جونی جو کام کرتا ہے بہت محنت سے اور دل لگا کر کرتا ہے۔" انکل پائن نے آنٹی کی تائید کی۔

نینا یہ سب سن سن کر جل رہی تھی جب اس سے برداشت نہیں ہو سکا تو وہ بول اٹھی۔ "ہاں بہت اچھا کام کرتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو ایسے کام کر جاتا ہے کہ آپ دونوں کو پتا چلے تو حیران رہ جائیں۔"

میرا نوالہ حلق میں اٹک گیا تھا۔ انکل اور آنٹی نے بیک وقت نینا کی طرف دیکھا۔

"کیا مطلب؟" آنٹی روزا نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔

"جونی کوئی کام چھپا کر نہیں کرتا ہے۔" انکل بھی بولے۔

"کرتا ہے۔" نینا تیز لہجے میں بولی۔ ایک لمحے کو مجھے ایسا لگا جیسے وہ ابھی میرا بھانڈا پھوڑ دے گی۔ لیکن اس کے

Downloaded From http://paksociety.com

بجائے وہ کرسی سے اٹھی اور پاؤں پٹختی اوپر کی طرف چلی گئی۔ کھانے کی میز پر چند لمحے پہلے جو خوش گوار ماحول تھا وہ ختم ہوگیا اور پھر سب نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد نینا آنٹی کے ساتھ برتن دھلواتی تھی لیکن اس رات وہ نہیں تھی اس لیے میں نے آنٹی کے ساتھ برتن دھلوائے حالانکہ انہوں نے منع کیا تھا لیکن میں نہیں مانا۔ میں ایک طرح سے نینا کے رویے کی تلافی کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ انکل پائن سارا دن کام کرنے کے بعد گھر میں بنائی بیئر سے شغل کرتے تھے۔ یہ ان کی واحد تفریح تھی۔ آنٹی ان کے پاس بیٹھ کر ستاروں بھرا آسمان دیکھتی تھیں۔

ہمارے لیے اصول تھا کہ ہمیں رات نو بجے تک لازمی سونے کے لیے بستر پر چلے جانا ہے۔ اس لیے میں اور نینا بستر پر چلے جاتے تھے۔ میں سو جاتا لیکن نینا رات گئے تک کامک پڑھتی یا ریڈیو سنتی تھی۔ میری آنکھ کھلتی تو وہ مجھے جاگتی نظر آتی اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ دیر تک سوتی تھی اور اکثر ناشتے پر سب سے آخر میں آتی تھی۔ کبھی کبھی وہ نہیں آتی تو آنٹی روزا اس کا ناشتا نکال کر رکھ دیا کرتی تھیں۔ وہ دیر سے آتی اس کا دل کرتا تو ناشتا کرلیتی اور دل نہیں کرتا تو یہ ناشتا ڈسٹ بن کی نذر کر دیتی تھی۔ آنٹی روزا کو خوراک اس طرح ضائع کرنا سخت ناپسند تھا لیکن وہ نینا کو کچھ نہیں کہتی تھیں۔ ایک بار انہوں نے صرف اتنا کہا تھا۔ ”اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ دنیا میں کتنے لوگوں کو پورے دن کھانے کو کچھ نہیں ملتا ہے تو تم کبھی خوراک کو اس طرح ضائع نہ کرو۔“

اس پر نینا سارا دن آنٹی روزا کو برا بھلا کہتی رہی تھی۔ اس رات میں اوپر گیا تو نینا کا موڈ انتہائی خراب تھا اس نے مجھے دیکھا اور پھٹ پڑی۔ ”ان بڈھے بڑھیا کو ساری خوبیاں بس تم میں نظر آتی ہیں۔“

میں سہم گیا۔ ”لیکن میں تو نہیں کہتا تھا کہ وہ میری تعریف کریں۔“

وہ کچھ دیر زہریلی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔ ”تم کسی غلط فہمی میں مت رہنا انہوں نے تمہیں عارضی طور پر رکھا ہے اور جب تم ان کے پاس بیگار کر کر کے پریشان ہوجاؤ گے تو یہاں سے بھاگ جاؤ گے۔“

”نینا یہ بہت اچھے لوگ ہیں پلیز ان کے بارے میں ایسی باتیں مت کرو۔“ میں نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

”کیوں نہ کروں۔“ اس نے برہمی سے کہا۔ ”انہوں نے میرے لیے کیا کیا ہے؟“

”انہوں نے ہمیں اپنے گھر میں رکھا ہے۔ ہمیں اچھی خوراک اور لباس دیتے ہیں۔ اسکول میں داخل کرایا ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے یہ لوگ دیتے ہیں۔“

”مجھے اس سے زیادہ چاہیے۔“ وہ چلا کر بولی۔

”پلیز آہستہ بولو۔“ میں نے سہم کر کہا۔ ”انہوں نے سن لیا تو ہمیں واپس فادر جوزف کے یتیم خانے بھیج دیں گے۔“

”بھیج دیں۔“ اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ”یہاں صرف تم مزے نہیں کر سکتے اگر میرے ساتھ ایسا سلوک ہوا تو میں فادر جوزف کے پاس واپس چلی جاؤں گی اور تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گی۔“

”میں نہیں جاؤں گا۔“ میں رونے لگا تھا۔ ”میں وہاں اب نہیں جاؤں گا میں مرجاؤں گا۔“

مجھے روتے دیکھ کر نینا کھل کھلا کر ہنس دی تھی۔ ”تم جاؤ گے میرے ساتھ۔“

”نہیں جاؤں گا آنٹی روزا اور انکل پائن مجھے کبھی یہاں سے نہیں نکالیں گے۔“

”نکالیں گے۔“ وہ چڑانے کے انداز میں میرے منہ کے آگے انگلی نچاتے ہوئے بولی۔ ”جب میں ان کو بتاؤں گی کہ آنٹی روزا کی پیاری بطخ کو تم نے مارا تھا۔“

میرا دم رک گیا تھا۔ ”تم ایسا نہیں کروگی۔“

”میں ایسا ہی کروں گی۔“ وہ اچھل کر بستر پر بیٹھ گئی۔ ”بس انتظار کرو کچھ دن بعد ہم واپس وہیں ہوں گے۔“

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ نینا اس طرح کیوں کر رہی تھی اسے اس جگہ کیا تکلیف تھی۔ انکل پائن اور آنٹی روزا ہمارا ہر ممکن خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے کبھی ہمیں جھڑکا بھی نہیں تھا۔ ہماری ہر ضرورت اس طرح پوری کرتے تھے جیسے ہم ان کے اپنے بچے ہوں۔ اگر نینا کو اپنی بعض بری عادتوں کی وجہ سے ان سے تکلیف تھی تو اس میں ان کا قصور تو نہیں تھا۔ وہ اگر نینا پر کوئی ذمے داری ڈالتے تھے تو اس کا مقصد بھی اس کی بہتری تھا۔ مجھے وہ جو کام کہتے تھے میں دل و جان سے کرتا تھا اس لیے وہ میری تعریف بھی کرتے تھے۔ اگر نینا ایسا کرتی تو وہ اس کی تعریف بھی کرتے۔ میں نے نینا کی طرف دیکھا۔ مجھے پریشان کر کے وہ مزے سے ریڈیو سنتے ہوئے کامک بک پڑھ رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ اس چڑیل کو قتل کردوں جو مجھے پھر سے اس جہنم میں جھونکنا چاہتی تھی۔

میں سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور پھر میری سمجھ

Downloaded From http://paksociety.com

میں ایک ہی بات آئی کہ میں خود آنٹی روزا کو سب بتا کر ان سے معافی طلب کرلوں ممکن ہے وہ مجھے معاف کردیں۔ اس کا امکان بھی تھا کہ وہ مجھے معاف نہ کریں اور اس بات پر مجھے اور نینا کو واپس فادر جوزف کے یتیم خانے جانا پڑے لیکن اس طرح میرے دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جاتا۔ میں روز روز نینا کے ہاتھوں بلیک میل ہوتا تھا اور ذہنی کرب سے گزرتا تھا اس سے تو نجات مل جاتی۔ میں اٹھ کر نیچے آیا۔ آنٹی روزا اور انکل پائن حسب معمول برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انکل نے مجھے دیکھ کر فکر مندی سے کہا۔ ''کیا بات ہے بیٹے تم سوئے نہیں تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا؟''

ان کے محبت بھرے لہجے پر میرا دل بھر آیا تھا اور میں نے سر ہلایا۔ ''جی انکل میں ٹھیک ہوں..... مجھے آنٹی سے کچھ بات کرنی ہے۔''

آنٹی روزا نے میری طرف دیکھا اور کرسی سے اٹھ گئیں۔ ''جونی میرے ساتھ آؤ ہم ذرا چہل قدمی کر کے آتے ہیں۔''

وہ مجھے الگ میں بات کرنے کے لیے لے جا رہی تھیں۔ ہم ٹہلتے ہوئے سامنے والے لان کی باڑھ تک چلے آئے۔ انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولیں۔ ''کہو جونی تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

میں نے اٹک اٹک کر آنٹی روزا کو ساری بات بتا دی کہ کس طرح میں شکار سے واپس آرہا تھا اور میں نے بلیچ کو غلیل سے گولی ماری تھی اور وہ مرگئی۔ ''میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا اس نے کتے کو زخم دیا تھا تو میں اسے زخم دینا چاہتا تھا لیکن گولی اس کے سر پر لگی اور وہ مرگئی۔ میں نے اس بات کو چھپانے کے لیے اسے جھیل میں ڈال دیا۔''

یہ سب بتانے کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے ان کی طرف دیکھا لیکن وہ بالکل پُر سکون تھیں پھر انہوں نے کہا۔ ''میں جانتی ہوں میرے بچے میں نے اوپر کھڑکی سے سب اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔''

میں حیران ہوا تھا۔ ''آپ نے دیکھا تھا اور آپ نے مجھے کچھ کہا نہیں؟''

''ہاں کیونکہ میں تم سے محبت کرتی ہوں اس سے کہیں زیادہ محبت کرتی ہوں جتنا میں بلیچ سے کرتی تھی۔ اس لیے میں نے تمہیں معاف کردیا اگرچہ تم نے مجھ سے معافی نہیں مانگی تھی۔''

''نینا مجھے بلیک میل کرتی رہی ہے۔''

''میں یہ بھی جانتی ہوں۔''

میں پھر حیران ہوا تھا۔ ''آنٹی آپ سب جانتی تھیں تو آپ نے مجھے کچھ کہا کیوں نہیں .... اور نینا کو منع کیوں نہیں کیا؟''

''کیونکہ میں دیکھنا چاہتی تھی تم اس کی غلامی کہاں تک برداشت کرتے ہو۔ وہ تمہاری ایک غلطی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تمہارا استحصال کر رہی تھی۔ میں نے جب کھڑکی سے تمہیں دیکھا تھا تب سے میں منتظر تھی کہ تم مجھ سے معافی چاہو گے۔ حالانکہ میں تمہیں پہلے ہی معاف کرچکی تھی۔ تم نادانستگی میں نینا کے اشاروں پر چل رہے تھے۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ تم نے خود پر بلاوجہ کا بوجھ لاد لیا تھا۔ تم ایک بار میرے پاس آجاتے تو میں تمہیں اس بوجھ سے پہلے ہی آزاد کردیتی۔''

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا اور جب یقین آیا تو تو میں آنٹی سے لپٹ گیا۔ انہوں نے شفقت سے کہا۔ ''میرے بچے ٹھیک اسی طرح شیطان انسان کو استعمال کرتا ہے وہ اس کی کمزوری اور کوتاہیوں سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنا غلام بنالیتا ہے۔ حالانکہ خدا منتظر ہے کہ اس کا بندہ اس کی طرف آئے اور وہ اسے بتائے کہ اس نے جو خطا کی تھی وہ خدا پہلے ہی معاف کرچکا ہے کیونکہ وہ انسان سے محبت کرتا ہے اس کی خطا سے نہیں۔''

اس بات کو تیس سال گزر چکے ہیں۔ میں آج ایک کامیاب انسان ہوں اور اعلیٰ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک اچھی جاب پر کام کررہا ہوں۔ میری بیوی اور تین بچے ہیں۔ میں نے ایک بیٹے کا نام انکل پائن کے نام پر اور ایک بیٹی کا نام آنٹی روزا کے نام پر رکھا ہے۔ میری ایک بیٹی اور بھی ہے اور میں نے اس کا نام نینا کے نام پر رکھا ہے۔ نینا جو صرف سولہ سال کی عمر میں گھر سے بھاگ گئی تھی۔ اس کے بعد دوبارا سے پولیس نے گھر پہنچایا۔ آخری بار میں نے اسے بیس سال پہلے دیکھا تھا اس نے بھی ماں کی طرح نشہ شروع کردیا تھا۔

جب آنٹی روزا نے مجھے بتایا کہ انہوں نے مجھے معاف کردیا تھا کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہیں بالکل اسی طرح خدا بھی انسانوں کو بہت زیادہ معاف کرتا ہے۔ تو میں نے نینا کو دل سے معاف کردیا اور آج بھی اس کا منتظر ہوں کہ وہ واپس آئے تو میں اسے بتاؤں کہ میں اس کی خامیوں اور کوتاہیوں سے نہیں بلکہ اس سے محبت کرتا ہوں۔ وہ ایک بار آئے تو سہی۔

www.paksociety.com

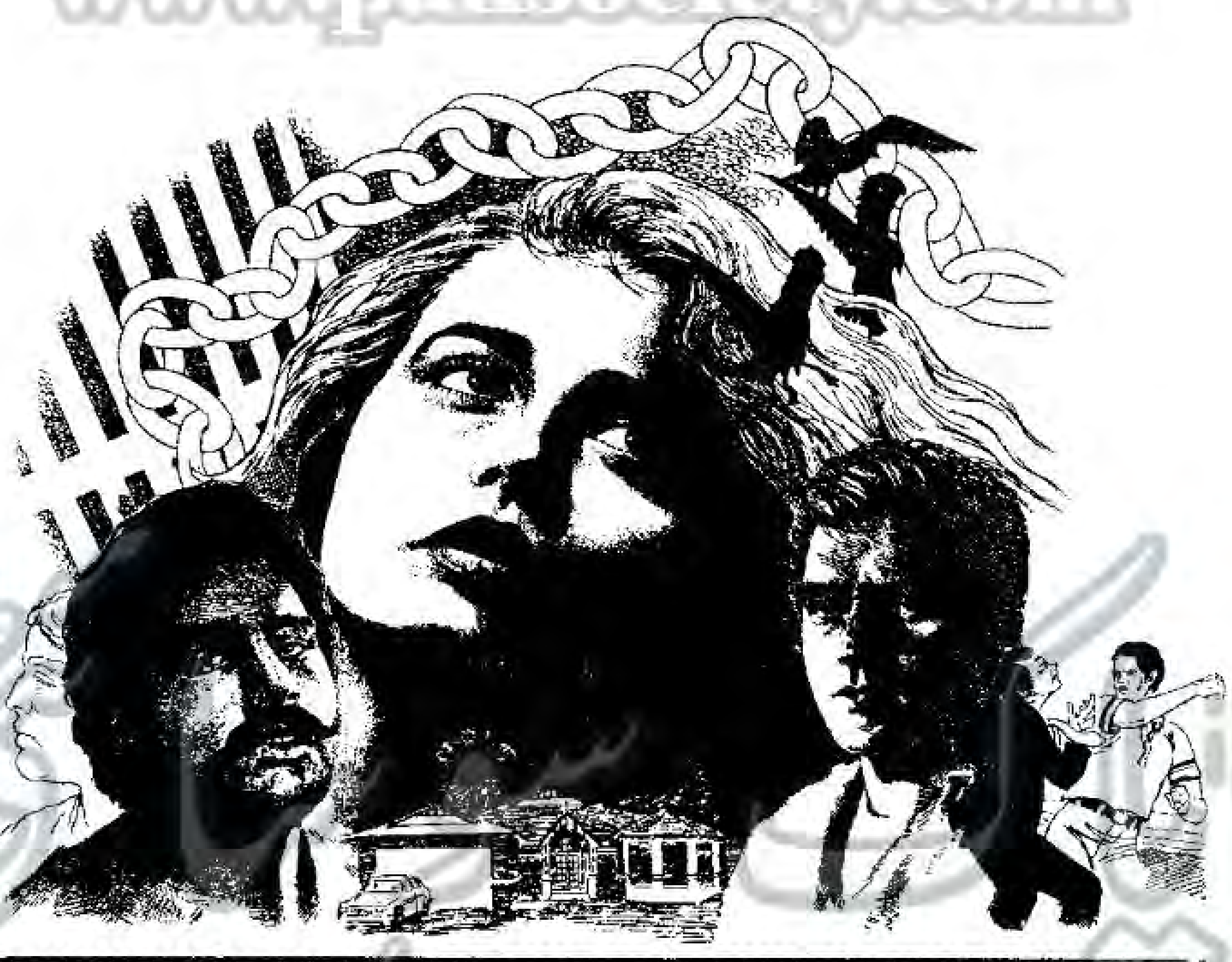

قسط 2

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

رانا بشیر کا میرے دروازے پر آنا، میرے لیے ناممکن حد تک غیر یقینی تھا اور اسی سبب، میں اسے اپنے دروازے پر دیکھ کر اپنی جگہ کئی ثانیوں تک جم کر رہ گیا تھا اور پلک جھپکتے میں ہی میری دم بہ خود آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا، جب میرے باپ کو پھانسی لگنے والی تھی اور ہم سب، میں، میری بہن، بھائی اور ماں اسی سنگ دل و بے رحم شخص کی محل نما کوٹھی کے دروازے پر فریاد لے کر پہنچے تھے۔

مجھے وہ منظر آج بھی یاد تھا۔ بھول بھی کیسے سکتا تھا میں؟ جب اسے دیکھتے ہی میری ماں نے اپنے سر کی چادر اتار کر رانا بشیر کے سامنے پھیلا دی تھی۔

''بھائی صاحب! میرا اپنے شوہر کے ساتھ برسوں پرانا تعلق ہے اور میں اس کے ہر مزاج و عادات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میری بات کا یقین کریں بھائی صاحب! آپ محلے والوں سے بھی پوچھ لیں، ہر کوئی ان کی شرافت کی قسمیں کھا کر آپ کو بتائے گا کہ احمد حسین کتنا شریف اور سیدھا سادہ آدمی ہے۔ وہ قتل جیسا اتنا بڑا اور بھیانک جرم۔''

''او۔ مائی! اپنی بڑبڑ بند کر اور کہیں اور جا کر اپنے خونی شوہر کی شرافت کا راگ الاپ، ان حالات میں ہر کسی کو اپنا شوہر اچھا اور شریف نظر آنے لگتا ہے۔'' رانا بشیر نفرت خیز لہجے میں اپنے ہونٹ سکیڑ کر بولا تو میری بہن عاصمہ نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''انکل! میرے ابو واقعی بے گناہ ہیں، آپ انہیں معاف کر دیں۔ میرے سر سے باپ کا سایہ مت چھینیں، میں بھی آپ کی بیٹیوں جیسی ہوں...... پلیز۔'' فرطِ جذبات سے بے حال روپڑی تھی تو فہیم اور میں رانا بشیر کے پیروں پر گر پڑے۔

''جناب رانا بشیر صاحب! خدارا ہماری باتوں کا یقین کریں، ہم اپنے ابو کو اچھی طرح جانتے ہیں، وہ اتنا بڑا جرم کبھی نہیں کر سکتے۔'' میں نے اس سنگدل اور بے حس انسان کی منتیں کرتے ہوئے روہانسے لہجے میں کہا۔

''وہ بے گناہ ہیں، ہم قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں، اگر انہوں نے واقعی ایسا کوئی جرم کیا بھی ہوتا تو وہ ایسے انسان ہیں، اس سے انکار نہیں کرتے۔''

مگر ہماری داد فریاد پر اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ بڑی حقارت آمیز اور رعونت سے ہمیں دھتکارتے ہوئے بولا۔ ''جاؤ دفع ہو جاؤ یہاں سے تم سب۔ تمہارے باپ نے میرا گھر اجاڑا ہے۔ اب میں اس کا بھی گھر اجڑتے دیکھنا چاہتا ہوں گا....'' پھر اس نے اپنے نوکروں سے ہمیں دھکے دے کر وہاں سے نکال دیا۔

بے عزتی اور کم مائیگی کی یہ ذلت آمیز ٹھوکر میں کبھی بھی نہیں بھلا سکتا تھا جو میرے گھر والوں کو اس بے رحم اور بے حس شخص نے پہنچائی تھی۔

آج اس آدمی کو یوں غیر متوقع ایک ناقابلِ یقین منظر سے میں اسے اپنے دروازے پر دیکھ کر پہلے تو مجھے ایک غیر یقینی سی کیفیت نے آلیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے میرا چہرہ سرخ ہو گیا اور دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہونے لگی۔

''یہ اب یہاں کیا لینے آیا ہے؟'' میرے سوچتے ذہن میں ابھرا۔ ''ہمیں برباد کرنے کے بعد کیا یہ پھر کوئی رہی سہی کسر پوری کرنے آیا تھا؟ کیا اب بھی اس سنگ دل و بے مہر انسان کا کوئی قرض ہم پر باقی رہ گیا ہے؟''

وہ اپنی لمبی چوڑی کار سے اتر چکا تھا اور اب دروازے پر دستک دینے کے لیے آگے قدم بڑھا رہا تھا، جبکہ میں اس ڈر سے کہ کہیں فہیم باہر نہ نکل آئے اور رانا بشیر کو اپنے دروازے پر دیکھ کر بھڑک نہ اٹھے، میں یک دم آگے بڑھا اور بہ مشکل خود پر قابو پاتے ہوئے اس سے قدرے بلند آواز میں بول پڑا۔ ''جی فرمایئے! کس سے ملنا ہے آپ کو؟''

وہ میری آواز سن کر اس طرف متوجہ ہوا، جدھر سے میں ایک دم ہی نیم تاریکی کو چیر کر اس کے سامنے ابھرا تھا۔

وہ ایک پچپن، ساٹھ سالہ، اچھی صحت کا حامل شخص تھا۔ رنگ سانولا تھا، سر گنجا، البتہ کنپٹیوں کی طرف سے کچھ بال جھالر کی شکل میں نظر آتے تھے، جو مہندی رنگے تھے، اگرچہ ان میں بھی سفیدی جھلک رہی تھی۔ آنکھوں میں سفید عدسوں والے سیاہ نفیس فریم کی عینک تھی جسم پر سفاری سوٹ تھا۔

شام کی مدھم سی تاریکی میں، وہ مجھے اور میں اسے بہ غور دیکھنے کی کوشش کرتے رہے، اس قلیل سے وقفے میں وہ مجھے پہچان گیا تھا، جبکہ میں تو پہلے ہی اسے پہچان چکا تھا۔

اس نے مجھے سلام کیا اور نیم بازسی مسکراہٹ کے ساتھ مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بھی میری طرف بڑھا دیا۔ بادل نخواستہ میں نے بھی اس سے ہاتھ ملا لیا۔

میری ہنوز کھنڈی ہوئی نظریں اس کے بشرے کا ہی جائزہ لینے میں محو تھیں، تب پہلی بار ہی مجھے اس کے چہرے کے تاثرات میں شرمندگی پشیمانی کی کیفیت محسوس ہوئی تھی

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

اور میرے اندر دور کہیں ایک کھٹک جاگی۔

"شاید تم مجھے پہچان رہے ہو؟" میری طرف دیکھ کر استفساریہ بولا۔ اس کی بات سن کر میری پیشانی پہ انتہائی ناگواری کی سلوٹ ابھری تھی اور پھر اسی لہجے میں اس سے مخاطب ہو کے بولا۔ "میں ہی نہیں، بلکہ میرے گھر والے بھی آپ کو کبھی نہیں بھول سکتے رانا بشیر صاحب!"

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اسی دوران کسی کھٹکے پر میری نگاہ چونکی اور میں نے اسی کی کار سے ایک اور فرد کو اترتے دیکھا تو معلوم ہوا کہ رانا بشیر اکیلا یہاں نہیں آیا تھا۔

وہ ایک اٹھارہ انیس سالہ بہ ظاہر شوخ سی نظر آنے والی لڑکی تھی، اس نے ایک فیشن ایبل سفید رنگ کا اسکن ٹائیٹ پاجامہ اور اوپر کیسری رنگ کی چست سلیولیس شرٹ پہن رکھی تھی، جس کا چاک غیر معمولی حد تک کھلا ہوا تھا، رنگ اس کا گورا ہی نظر آرہا تھا، چہرہ بیضوی اور آنکھیں گہری تھیں، بال پونی ٹیل کیے ہوئے تھے، البتہ اس پر دوپٹا اس نے فیشن اسٹائل کی بجائے سلیقے سے رکھا ہوا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک متناسب الاعضاء اسمارٹ سی لڑکی تھی اور مجھے اس پر یہی گمان ہوا تھا کہ وہ رانا بشیر ہی کی بیٹی تھی۔

میں نے بس ایک ہی چونکتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی تھی اور دوبارہ تلخ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

اثنائے راہ۔ وہ لڑکی بھی قریب آگئی تھی اور اس نے مجھے شستہ لہجے میں سلام کیا، میں نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دے کر اس کے سلام کا جواب دیا تھا اور اس کی طرف سے یکسر بے خبر سا ہو گیا۔

رانا بشر نے ایک تھکی تھکی سی سانس خارج کر کے میرے کاندھے پر اپنا ایک ہاتھ رکھنا چاہا تھا، مگر میں نے فوراً اپنا کاندھا موڑ کر اس کی دسترس سے پرے کر لیا۔ ہاتھ خالی جاتے پر اس نے برا منائے بغیر واپس کھینچ لیا، تو میں نے انتہائی سرد مہری سے کہا۔ "تم اسی وقت واپس لوٹ جاؤ۔ رانا بشیر! میرے چھوٹے بھائی فہیم میں برداشت کا مادہ مجھ سے کم ہے اور میں نہیں چاہتا کہ محلے میں کوئی بدمزگی ہو۔"

"وہاٹس سوسیڈ، مسٹر نعمان! وی آر ایکسٹریملی سوری۔ پپا آپ لوگوں سے سوری کرنے آئے تھے اور۔" وہ لڑکی جو اس کی بیٹی ہی تھی، براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کر بولی تو میں نے سخت نظروں سے اس کی طرف گھورتے ہوئے، اس کی بات کاٹ کر پوچھا: "آپ کی تعریف؟" حالانکہ اس نے پپا کہا تھا مگر میں نے اس کے ساتھ بھی اکھڑے رویے سے پیش آنا ضروری سمجھا تھا۔

"یہ میری بیٹی ہے، فرحانہ، میں اسے پیار سے فری......"

"آپ دونوں جا سکتے ہیں یہاں سے......" میں نے رانا بشیر کی بات کاٹ دی۔

"تم حق بجانب ہو ہمارے ساتھ یہ سلوک کرنے پر، اور ہم اس کا بالکل برا نہیں منائیں گے۔" رانا بشیر بولا۔ مجھے اس کا لہجہ ٹوٹا ٹوٹا اور بوجھل سا لگا۔

"اچھا!" میں نے زہریلے طنز سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کون سے سلوک کی بات کر رہے ہیں آپ رانا صاحب؟ اس سلوک کی کہ میں اب تک آپ سے شرافت اور تمیز کے ساتھ بات کر رہا ہوں یا آپ اپنے اس سلوک کی بات کر رہے ہیں، جب ہم سب آپ کے در پہ منت سماجتیں کرنے آئے تھے اور ہمارے ساتھ آپ نے کیا سلوک کیا تھا؟"

میری اس بات پر دونوں ہی باپ بیٹی حد سے زیادہ شرمسار سے نظر آنے لگے، میرا زہریلا طنز انہیں اندر سے بری طرح گھائل کر گیا تھا۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتے تھے کہ میں نے انہیں دوبارہ سخت لہجے میں چلے جانے کا کہہ دیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

ابھی میں نے دروازے پر دانستہ دستک نہیں دی تھی۔ وہ دونوں باپ بیٹی خاموشی سے اپنا سر جھکائے اپنی کار میں بیٹھ کر واپس چلے گئے اور میں اندر آ گیا۔

میں نے عاصمہ اور فہیم سے ابھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں انہیں کوئی بھی ایسی ویسی بات نہیں بتاتا تھا جس سے میرے دونوں بہن بھائی پریشان ہوتے۔

تاہم کھانا وغیرہ کھا کر میں اپنے کمرے میں چارپائی پہ آکر لیٹ گیا اور کافی دیر تک میرا ذہن سوچ و بچار کا شکار رہا۔ میں نے غصے اور نفرت کے جوش تلے، رانا بشیر اور اس کی جواں سال بیٹی کی کوئی بات سنے بغیر چلتا تو کر دیا تھا مگر اب میرے اندر ایک عجیب سی کھٹک جاگنے لگی تھی اور بار بار ایک سوالیہ نشان سا ذہن میں ابھرتا تھا کہ آخر ایسی کیا بات تھی جس نے رانا بشیر کو میرے در پہ آنے پر مجبور کر دیا تھا؟ وہ اب کیا کہنے آیا تھا؟ کہاں تو وہ ہماری کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہوتا تھا مگر اب جبکہ میرے باپ کو پھانسی لگے کئی روز بیت چکے تھے اور رانا بشیر کا بھی ایک طرح سے ہم سے حساب بے باق ہو چکا تھا تو پھر ایسا کیا ہوا تھا کہ...... اس

Downloaded From http://paksociety.com

نے یہاں کا رخ کیا تھا۔ کہاں تو وہ ہماری صورتیں دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔ پھر وہ کچھ شرمسار اور پشیمان بھی نظر آتا تھا۔ کیوں؟ کیا اب اسے کسی حقیقت کا ادراک ہو چلا تھا؟ مگر کون سی حقیقت؟ اور پھر باپ کو پھانسی لگنے کے بعد؟ اب کیا فائدہ تھا مگر نہیں۔ مجھے اپنے باپ سے کی ہوئی آخری ملاقات کے دوران اس کے آخری الفاظ ابھی تک ازبر تھے کہ میں نے دنیا کے سامنے اس کی بے گناہی ثابت کرنا تھی اور اپنے خاندان کی پیشانی سے یہ داغ دھونا تھا اور میں اس کے لیے کوشاں بھی تھا تو ایسے میں مجھے اس کی بات تو کم از کم سن لینی چاہیے تھی۔

ساتھ ہی میرے دل و دماغ میں اس سیاہ رنگ کی ٹویوٹا کرولا کار سوار بھی گردش کرنے لگے اور مجھے دھمکی دینے والے اس گھنی مونچھوں اور وحشت ناک چہرے والے شخص کے وہ الفاظ بھی جس سے میں واقعی پریشان ہو گیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ کسی خطرناک مافیائی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ دیکھا جاتا تو ان لوگوں کے مقابلے میں میری کیا حیثیت تھی؟ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ میں بے حوصلہ ہو رہا تھا۔ نہیں، میں جن حالات سے دوچار تھا، اسے میں نے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کر رکھا تھا اور پھر اللہ تعالیٰ کی ذات پر مجھے پورا بھروسا تھا۔ بے شک میں ایک آزمائش سے دوچار تھا اور میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اس آزمائش سے سرخرو ہو کے نکلوں گا۔ کیوں کہ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے مجھے اس بات پر پختہ یقین تھا کہ حق و باطل کی اس جنگ میں فتح ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے۔

میں اللہ سے خیر و برکت کی دعائیں مانگ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

صبح حسبِ معمول جاگا، ناشتا کیا اور لاری اڈے کی طرف نکل گیا۔ میری بائیک آج کل فہیم کے استعمال میں تھی۔ پرانی ہونے کے باعث وہ خراب بھی رہنے لگی تھی۔

یوں بھی لاری اڈا گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ وہاں تک ایک ہی بس جاتی تھی اور بہ مشکل پندرہ بیس منٹ میں پہنچ جاتا تھا۔ اکثر کوئی جاننے والا ٹرک ڈرائیور اور بس والا مل جاتا تھا۔ میں اس میں بیٹھ کر چلا جاتا تھا۔

لاری اڈے پہنچ کر ابھی میں اپنی میز پر بیٹھا ہی تھا کہ مجھے زنیرہ کی کال موصول ہوئی۔

''یہ کیا بے وقوفی کی ہے تم نے۔ نومی؟'' وہ چھوٹتے ہی مجھ سے بولی۔

میں اس کا اشارہ سمجھ نہیں پایا اور الجھ سا گیا۔ وہ آگے بولی۔

''آسانیاں خود چل کر تمہارے در پہ آرہی ہیں اور تم اسے ٹھوکر مار رہے ہو۔ کل رات رانا بشیر اور اس کی بیٹی تم سے ملنے آئے تھے اور تم نے ان کی بات تک سننا گوارا نہ کی اور چلتا کر دیا۔ کیوں؟''

''وہ اسی قابل ہی تھا اور میں نے وہی کیا، جو اس نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں نومی؟'' وہ جیسے ایک رسانیت آمیز لہجے میں بولی۔

''تم تو کہتے تھے کہ میں اپنے باپ کے وعدے کا پاس رکھوں گا اور یہی میری زندگی کا مقصد بھی ہوگا۔ پھر یہ سب کیا ہوا؟ تم تو بڑے سمجھدار اور بردبار انسان تھے اور اب تک سمجھداری کا ہی مظاہرہ کر رہے تھے، یہ ایک دم بدل کیوں گئے؟''

مجھے اس کی بات سے اتفاق تھا، لہٰذا ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔ ''شاید آپ صحیح کہہ رہی ہیں مگر یہ سب میرے لیے اچانک تھا اور میں باوجود کوشش کے خود پر قابو نہ پا سکا تھا۔''

''او کے! ہو جاتا ہے ایسا، لیو اٹ، اب یہ بتاؤ، کیا چاہتے ہو؟ وہ اب بھی تم سے ملنا چاہتے ہیں۔'' وہ بولی۔

''ویسے میں نے انہیں تمہارے مشن سے متعلق بتا دیا تھا کہ تم آئندہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو، کچھ اسی لیے بھی وہ تم سے ملنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

''آپ سے کب بات ہوئی تھی ان کی؟'' میں نے الٹا سوال کر دیا۔

''آج صبح، پہلے اس کی بیٹی فرحانہ نے مجھ سے بات کی تھی، اس کے ساتھ میری ہائے ہیلو رہتی تھی۔'' زنیرہ جواباً بولی۔ ''اس نے اپنے باپ کے ایماء پر ہی مجھے فون کیا تھا، پھر رانا بشیر نے بات کی۔ یقین کرو نومی! مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی اور یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ......''

''کاش! یہ سب ابو کی پھانسی سے پہلے ہو جاتا۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''تم ابھی تک تلخ ہو رہے ہو۔ کیا تم اصل مجرم کو بے نقاب نہیں کرنا چاہتے؟'' میں خاموش رہا تو وہ آگے بولی۔ ''ٹیک اٹ ایزی نومی! میں تمہاری دلی کیفیات کو اس وقت سمجھ رہی ہوں لیکن کیا یہ کافی نہیں ہے کہ تمہیں اس طرح

Downloaded From http://paksociety.com

ایک طرف اپنے خاندان کی پیشانی سے ایک داغ دھونے کا موقع مل رہا ہے اور دوسری طرف اپنے باپ کے قاتلوں کو بے نقاب کرنے کا بھی۔''

''رانا بشیر مجھ سے کیا چاہ رہا ہے اب؟'' بالآخر میں نے اصل بات کی طرف آتے ہوئے پوچھ لیا۔

''وہ پشیمان ہے اور اس قدر پشیمان ہے کہ اس کی بھی سمجھ نہیں آرہا ہے کہ وہ تم سے کیسے معافی مانگے لیکن نومی! وہ بھی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ تمہاری مدد کی صورت میں۔''

''اچھا۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''نومی! تقدیر نے ہمیں ایک موقع دیا ہے اور یہ بہت اچھا وقت ہے ہمارے لیے اور رانا بشیر خود بھی چاہتا ہے کہ اس کی بیوی رفعت خانم کے اصل قاتل بے نقاب ہوں۔''

''اچھا! تو اصل وجہ یہ ہے اس کی مجھ سے معافی مانگنے کی۔ پھر پشیمانی کا ڈھونگ کیوں رچا رہا ہے میرے ساتھ؟'' میرے لہجے میں ایک بار پھر زہر اتر آیا۔

''چلو یہی سہی۔'' وہ بولی۔

''کیا یہ ہمارے لیے کم نہیں کہ اس کیس کا ایک اہم کردار رانا بشیر کی صورت میں نہ صرف ہمارے سامنے ہے بلکہ ہماری مدد پر آمادہ بھی ہے، ہماری مہم کا اہم آغاز بھی سب سے پہلے اسی سے تعلق رکھتا ہے۔''

''تو پھر کیا پروگرام ہے؟'' میں نے ایک گہری سانس لے کر پوچھا۔

''ایک میٹنگ کر لیتے ہیں۔ میں بھی ساتھ ہونا چاہتی ہوں۔ اسی کے گھر پر رکھ لیتے ہیں نشست۔'' زنیرہ کی بات پر ایک بار پھر میرے حلق میں کڑواہٹ سی گھلنے لگی۔ جس گھر سے مجھے اور میری ماں اور بھائی بہن کو بے عزت کر کے رانا بشیر نے نکالا تھا، میں اب وہاں ایک قدم بھی رکھنا تو کجا، دیکھنا بھی گوارا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے سوچتا پا کر زنیرہ شاید میری خاموشی کا مطلب سمجھ گئی، مجھے ایک بار پھر سمجھاتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو، نومی! اپنا نیک مقصد حاصل کرنے کے لیے تمہیں ایسے کئی تلخ گھونٹ بھرنے پڑیں گے ...... یہ میٹنگ اس کے گھر کی بجائے کسی اور جگہ بھی رکھوائی جاسکتی ہے مگر ایسا زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔ اس طرح ہمیں اس کے خاندان کے دیگر افراد یا عزیز رشتے داروں تک جان کاری لینے میں مشکل پیش آسکتی ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو میں خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ یہ میٹنگ اس کے گھر پر ہی ہو۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟''

''سمجھ رہا ہوں۔ آپ میٹنگ طے کر کے مجھے بتا دیں۔''

''گڈ! تمہاری یہ عادت مجھے اچھی لگتی ہے کہ تم بات کی گہرائی فوراً سمجھ لیتے ہو۔ آج شام کا وقت صحیح رہے گا؟ تم ڈیوٹی سے سیدھے رانا بشیر کے ہاں چلے آنا۔''

میں نے کچھ سوچ کر اثبات میں اپنا سر ہلا دیا اور پھر رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

اس روز میں چاچا انور شاہ کو اس موچھیل آدمی کی دھمکی کے بارے میں نہیں بتا سکا تھا، وجہ یہی تھی کہ کل میری ان سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی، ٹول پلازہ کی طرف کوئی ٹرک الٹ گیا تھا اور وہ اسی سلسلے میں بڑے منشی دادن خان کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔ پولیس کیس وغیرہ بھی نمٹانا تھا اسی لیے ان کا کل کا سارا دن وہیں گزرا تھا مگر آج میری ان سے ملاقات ہوگئی اور میرے پاس بھی اب انہیں بتانے کے لیے بہت سی باتیں تھیں۔

جب میں دونوں اہم باتیں ان کے گوش گزار کر چکا تو وہ کئی ثانیوں تک دم بہ خود سے رہ گئے۔ شاید ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ پہلے کون سے موضوع پر بات کریں؟ دونوں ہی اہم نوعیت کے موضوعات تھے۔

بالآخر سب سے پہلے انہوں نے لینڈ مافیا کے اس موچھیل ڈان کی دھمکی کے سلسلے میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے قدرے فکرمندی سے کہا۔ ''نومی بیٹے! اس کا مطلب ہے چھپے ہوئے دشمن ظاہر ہونے لگے ہیں مگر ہمیں ان کا مقابلہ بہادری سے کرنا ہوگا۔ ورنہ اپنی بقا یا جنگ ہم ہار جائیں گے اور ہماری ہار کا مطلب ہوگا کہ ہم سب سمیت کئی غریب لوگوں کی بیروزگاری۔''

میں نے پورے حوصلے اور مستحکم لہجے میں چاچا انور شاہ سے کہا۔ ''چاچا! میں نے جب اس جنگ کا آغاز کیا تھا تو بہت پہلے سے ہی میرے ذہن میں یہ خدشات تھے، اسی لیے آپ کو میری طرف سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے آپ انشاء اللہ ہر محاذ پر تیار اور ثابت قدم پائیں گے۔''

انور چاچا میری بات سن کر بہت متاثر ہوئے اور توصیفی لہجے میں بولے۔ ''بیٹا! میں تجھے جانتا ہوں تو ایک جی دار لڑکا ہے۔ اس لیے کہ تیرے بابا نے بھی ظلم اور ناانصافی کے آگے اپنا سر کبھی نہیں جھکایا تھا تو بھی میرے جی دار یار کا

Downloaded From http://paksociety.com

دلیر اور بہادر بیٹا ہے مگر نومی بیٹا! ہمیں بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس بارے میں ہمیں شاید عطا محمد صاحب سے بھی بات کرنا پڑے گی۔ خیر۔'' وہ اتنا کہہ کر ذرا رک کے، پھر دوسرے اہم موضوع کی طرف آتے ہوئے بولے۔

''رانا بشیر والی بات نے تو یار! مجھے ایک عجیب سے ذہنی کرب میں مبتلا کر دیا۔ کیا اسے میرے یار کو پھانسی دلوانے سے پہلے خیال نہیں آیا تھا؟ اس وقت اس نے حقائق جاننے کی کوشش نہیں کی تھی؟ جواب......'' ان کے حلق میں شاید ایک غم زدہ سی رقت اتر آئی تھی اور وہ اپنا جملہ پورا نہیں کر سکے۔ ان کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

میں جانتا تھا۔ ابو اور چاچا انور کی آپس میں کس قدر گہری دوستی تھی۔ وہ بچپن کے دوست تھے۔ بلکہ لنگوٹیے یار تھے دونوں۔ سگے بھائیوں سے بڑھ کر بھائی جیسے اور ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے دوست۔ انہیں غم زدہ دیکھ کر میں بھی آزردہ ہونے لگا۔

''میرا یار احمد حسین بھی بے چارہ کیسی قسمت لے کر دنیا میں آیا تھا۔'' وہ گلوگیر سے لہجے میں دوبارہ گویا ہوئے۔

''اس بے چارے کے تو وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا کہ تقدیر اس کے ساتھ ایسا مذاق بھی کر سکتی ہے۔ حادثاتی موت ہو یا طبعی موت۔ انسان کو صبر آ ہی جاتا ہے۔ مگر ایک بے گناہ اور جھوٹے الزام تلے تختہ دار پر چڑھ جانا۔ اس سے بڑھ کر کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے، بس! بیٹا نومی! یہ سوچ کر صبر کر لیتے ہیں کہ اس میں بھی اللہ کی کوئی حکمت ہوگی اور میرے یار احمد حسین کی اسی میں ہی بخشش کا سامان رکھا ہوگا قدرت نے کہ وہ ایک بہرحال ایک مجرم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک فریادی کی حیثیت سے ہی اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوا ہوگا۔ اللہ میرے یار کی مغفرت فرمائے۔''

''آمین!'' میں نے زیرلب کہا۔

''پر یار بھتیجے! بات تو سوچنے کی ہے یہ۔ آخر ایسا ہوا کیا ہے کہ اچانک رانا بشیر جو اس وقت تو ہماری بات سننے کو تیار ہوتا تھا نہ ہی ہماری شکل دیکھنا بھی گوارا کرتا، کیا پہلے اسے عقل نہیں آئی، یا ابھی اگر اسے کسی حقیقت کا علم ہوا ہے تو کیسے اور کیوں کر؟''

''یہی بات مجھے بھی الجھن میں ڈالے ہوئے ہے چاچا! اسی لیے میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے ملنے کا ارادہ کر ہی ڈالا ہے، زنیرہ بھی ساتھ ہوگی۔'' کہتے ہوئے میں نے انہیں زنیرہ سے متعلق بھی بتا دیا کہ وہ بھی اس میٹنگ میں شامل ہوگی۔

''یہ تم نے اچھا فیصلہ کیا ہے نومی بیٹا! رانا بشیر کی بے حسی اور سرد مہری اپنی جگہ لیکن اگر اسے حقیقت کا علم ہو ہی گیا ہے، بھلے دیر سے سہی لیکن اس سے ہمیں اصل سازشیوں کا تو کھوج لگانے میں مدد مل سکتی ہے ناں!''

''ہاں، چاچا! یہی سوچ کر ہی تو میں نے بالآخر اس سے ملنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' میں نے ہولے سے کہا تو وہ بولے۔

''بس! ٹھیک ہے، تم ایسا کرنا، آج ذرا جلدی چلے جانا۔ میں پیچھے سنبھال لوں گا۔'' پھر جیسے اچانک انہیں کچھ یاد آیا۔ بولے۔ ''عطا صاحب سے بھی تو ملنا ضروری تھا۔ ان سے پھر کب ملا جائے؟'' ان کی بات پر اچانک فوزیہ کا دلکش چہرہ آپوں آپ میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا اور جیسے دل مچل سا اٹھا۔ حالانکہ ہم ایک گمبھیر مسئلے کے سلسلے میں ان سے ملنے کے خواہشمند تھے لیکن مجھے تو وہاں جا کر کوئی اور ہی ''مسئلہ'' درپیش ہو جاتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''وہ بھی دیکھ لیں گے چاچا! کم از کم آج تو نہیں۔ کل سہی۔''

چاچا انور شاہ نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور پھر ہم اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے۔

میں بے چینی سے وقت گزرنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میرا دل ودماغ ابھی تک رانا بشیر سے ملاقات پر اٹکا ہوا تھا اور ایک عجیب سا تجسس بے قرار کیے دے رہا تھا کہ آخر وہ کیا وجہ تھی؟ جس نے اتنی بڑی اور اہم حقیقت کو رانا بشیر کے سامنے آشکارا کیا تھا اور انہیں بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ سب آخر ابو کو پھانسی ملنے سے پہلے کیوں نہیں ہوا تھا؟ اور پھر اب اچانک۔ یہ سب؟ کیا اس میں بھی کوئی چال تھی، چھپے ہوئے بازی گروں کی؟

بہرطور۔ میں اپنے کام میں مگن رہا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ کسی نے مجھے آکر پیغام دیا کہ بڑا منشی دادن خان مجھے بلا رہا ہے۔ میں نے پیغام لانے کی طرف دیکھ کر اثبات میں اپنا سر ہلا دیا اور پھر اپنی کرسی سے اٹھ کر کوٹھڑی سے نکلا۔

میرے کمرے سے باہر سیدھے ہاتھ پر ہی بڑے منشی کا کمرا تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ میں نے اندر داخل ہو کر اسے سلام کیا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا، میرا ہی انتظار کر رہا تھا، میری بہ ظاہر خاموش مگر بھانپتی ہوئی نظروں نے پل کے پل اس کے چہرے کا جائزہ لیا تھا، جہاں مجھے ایک الجھن آمیز سی پریشانی تیرتی ہوئی نظر آئی تھی، جو مجھے سامنے دیکھتے ہی ایک

Downloaded From http://paksociety.com

ناگواری میں بدل گئی تھی۔ میں اس کی وجہ اچھی طرح جانتا تھا، جب سے ضلعی صدر عطا محمد نے اس لاری اڈے کے اہم مسئلے کی ''باگ'' میرے ہاتھوں میں دی تھی، تب سے یہ بڑا منشی دادن خان مجھ سے زیادہ ہی خار کھانے لگا تھا۔ کیوں؟ اس کا مجھے پتا لگانا تھا اور یہ کام اتنا مشکل بھی نہ تھا۔

''بیٹھو۔'' اس نے مجھے اپنی چوبی میز کے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر میرے براجمان ہوتے ہی بولا۔ ''تمہارے اس لمبے چوڑے کھڑتیل کا کوئی نتیجہ برآمد ہوتا نظر نہیں آرہا۔ آخر ہم کب تک انتظامیہ کو اس طرح چکر دیتے رہیں گے؟''

مجھے اس کی بات عجیب ہی لگی۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر گہری سنجیدگی سے کہا۔

''تو پھر آپ کا کیا مطلب ہے منشی صاحب! ہم ہار مان لیں؟''

''مم۔ میرا یہ تو مطلب نہیں تھا۔'' وہ اچانک گڑبڑا گیا۔ پھر فوراً ہی سنبھل کر بولا۔ ''میرا مطلب تھا کہ تمہارا اتنا لمبا چوڑا کھڑاگ پیدا کرنے کے باوجود کوئی مثبت نتیجہ سامنے نہیں آیا ہے ابھی تک اور مجھے ڈر ہے کہ اس بار انتظامیہ کوئی اچانک بڑا فیصلہ نہ کر ڈالے اور ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں۔''

''منشی صاحب! میرا تو خیال ہے کہ مثبت نتیجہ ہمارے سامنے آچکا ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم ابھی تک آرام سے یہاں بیٹھے ہیں۔ ورنہ تو مقامی انتظامیہ، پچھلے دنوں ہی ہم سب کا بستر گول کرنے کا مکمل اور پکا بندوبست کرچکی تھی۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ کچھ بے چین سا نظر آتے ہوئے اور ذرا کسمسا کر بولا۔

''دیکھو، یہ سب محض ایک خوش فہمی کے سوائے کچھ نہیں ہے، مقامی انتظامیہ نے عارضی خاموشی ضرور اختیار کرلی ہے لیکن ہار انہوں نے بھی نہیں مانی ہے اور نہ ہی اس طرح مانیں گے بھی، وہ بہت جلد اور اچانک ایک بڑے فیصلے کے ساتھ ہم پر دوبارہ حملہ آور ہوں گے اور دیکھنا ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔''

مجھے اس کی بات عجیب لگی، نہ صرف اس وقت اس کا لب ولہجہ بھی منافقت اور مفاد پرستی کی چغلی کھاتا محسوس ہورہا تھا مجھے۔ میں بہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''تو منشی صاحب! آپ کیا چاہتے ہو پھر؟ کیا کیا جائے؟''

میں نے محض اس کی اصلیت جاننے کے لیے گیند اس کی کورٹ میں پھینک دی تھی کہ آخر پتا تو چلے یہ خود کو کتنا عقل

ماہم بیگم

ماہم بیگم ہمایوں کے والد ظہیر الدین بابر کی سب سے چہیتی بیوی تھی۔ ماہم بیگم مسلک کے لحاظ سے شیعہ تھی۔ اس کی وفات ہمایوں کی تخت نشینی کے تقریباً پانچ سال بعد ہوئی۔ لہٰذا وہ اپنے بیٹے کی زندگی کی خزاں کے بعد اس کی بہاریں نہ دیکھ سکی۔ ہمایوں نامہ از گلبدن بیگم کے صفحہ 21 پر تحریر ہے کہ ماہم بیگم جب تک زندہ رہی مریم بن کر ہمایوں کو عیسیٰ بنائے رہی۔ ہمایوں نامہ کے صفحہ 22 پر تحریر ہے کہ ہمایوں کی علالت کی خبر سنتی تو اس طرح بے چین ہوجاتی جس طرح ایک تشنہ مہجور آب ہو کر بے چین رہتا ہے۔

ماں کی حیثیت سے اسے بڑی فکر رہی کہ ہمایوں کے اولاد نرینہ ہوتا کہ وہ اس کے بعد سلطنت کا وارث بنے۔ اس لیے جب اس کی نظر کسی تندرست حسین وجمیل لڑکی پر پڑتی تو وہ اسے ہمایوں کے عقد میں لانے کی کوشش کرتی۔ ہمایوں نامہ میں تحریر ہے کہ شہزادی گلبدن بیگم کی خدمت میں ایک لڑکی میوہ جان تھی جو ایک یساول کی لڑکی تھی۔ ہمایوں کی ماں کو پسند آگئی۔ ماہم بیگم نے ہمایوں سے اس کی سفارش کی تو اس نے ماں کی مرضی کو آمین کہا اور میوہ جان سے شادی کرلی۔ شادی کے تیسرے روز ہمایوں کی چہیتی بیوی بیگہ بیگم کابل سے آئی۔ بیگہ بیگم حاملہ ہوئی تو میوہ جان نے بھی کہا کہ اس کے بھی حمل کے آثار ہیں۔ ماہم بیگم بے حد خوش ہوئی اور ایک قیمتی زیور (براق) بنوایا اور کہتی رہی کہ دونوں میں سے جس کے لڑکا پیدا ہوگا یہ زیور اس کو دوں گی۔ ہمایوں کی پہلی بیوی بیگہ بیگم کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی اور میوہ جان کا حمل جھوٹا ثابت ہوا یوں ماہم بیگم کی یہ آرزو مرتے دم تک پوری نہ ہوئی۔

مرسلہ: اشفاق حسین، گجرات

Downloaded From http://paksociety.com

منداور مجھے کس قدر بے وقوف سمجھے ہوئے ہے؟

''دیکھو بابا نعمان! جتنی تمہاری عمر نہیں ہے اتنا میرا تجربہ ہے۔ تم ابھی ناسمجھ اور اس میدان کے کچے کھلاڑی ہو اور جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں تمہیں اس دھندے میں آئے ہوئے۔ میری مانو تو وہی طریقہ صحیح ہے جو میں چاہتا تھا۔ اس سے مقامی انتظامیہ خوف زدہ ہو جائے گی۔''

''آپ کا خیال ہے ہمیں انتظامیہ سے براہِ راست ٹکر لینی چاہیے؟'' میں نے بھنوئیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''بالکل! اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ ہمارے پاس۔'' وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا اور ذرا میری طرف بھی جھک آیا تھا، یوں جیسے وہ مجھے بے وقوف بنانے میں کامیاب ہونے لگا ہو۔ پینترا بدل کر دوبارہ اسی لہجے میں ذرا رازداری سے بولا۔

''اگر تم میرا ساتھ دو تو۔ اس طرح انتظامیہ بلیک میل ہوگی اور مذاکرات کے لیے ہمیں بلائے گی تو یقیناً ہماری آواز کو دبانے کے لیے روپوں پیسوں کی بھی بات کرسکتی ہے جو ہم آپس میں بانٹ سکتے ہیں۔''

مجھے اس کی رشوت والی بات انتہائی کریہہ محسوس ہوئی۔ حرام کی ایک پائی تک کھانا میرا باپ گناہ عظیم سمجھتا تھا اور ایسے ہی میں مجھے ابو کی ایک نصیحت یاد آنے لگی۔

''بیٹا! حرام کی ایک پائی بھی کھانا ایسا ہی ہے جیسے آپ نے اپنے ہاتھوں سے اپنے اور اپنے گھر والوں کے پیٹ میں جلتا سلگتا انگارہ ڈال لیا ہو۔ تم ایک روپیا حرام کا کھاؤ گے، تمہارا کسی ایسے راستے سے اچانک ہزاروں روپے نکل جائیں گے کہ تمہیں اس کا اندازہ بھی نہ ہوگا۔ بے شک کچھ لوگوں کو یہ مال حرام ہضم بھی ہو جاتا ہو۔ لیکن وہ بہرحال جہنم میں ہی اپنی عاقبت بنا رہا ہوتا ہے۔''

اب یہ بدبخت دادن خان مجھے جہنم کی آگ کمانے کی مذموم ترغیب دے رہا تھا۔ میں اگر جوش میں آکر اسے برا بھلا کہنے لگ جاتا تو تھیلے سے نکلنے والی بلی پوری طرح باہر نہ آتی اور پھر دادن خان جیسے انسان کو میری نصیحت کا اثر بھی کیا پڑتا؟ الٹا وہ محتاط ہو جاتا، ابھی تو وہ مجھے بے وقوف سمجھنے کی جو غلطی کررہا تھا، میں اسے اسی ''غلطی'' میں پڑے رہنے دینا چاہتا تھا۔ اس طرح وہ مزید میرے سامنے ظاہر ہوتا رہتا۔

میں نئے زمانے کا پروردہ تھا۔ جہاں منافقت، جھوٹ اور دوسرے کو بے وقوف بنا کر اپنا کام نکالنا، لوگوں کا وتیرہ بن چکا تھا۔ صاف اور سچی بات کرنے اور کہنے والوں کو پاگل دیوانہ کہا جاتا تھا۔ اسی لیے میں اسے سرزنش کرنے کی بجائے ہلکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''منشی صاحب! مجھے تو واقعی ان باتوں کا کوئی تجربہ نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے میں جو کچھ کررہا ہوں۔ اس میں چھوٹے منشی (چاچا انور شاہ) کے مشوروں اور راہ نمائی کا بھی دخل ہے۔'' میں اس کے سامنے دانستہ چاچا انور کہنے سے اجتناب ہی برتتا تھا۔

وہ چیں بہ چیں ہو کر بولا۔ ''اب ایسی بات بھی نہیں ہے کہ تم اتنے بچے ہو کہ انور شاہ کی انگلی پکڑنے چل رہے ہو۔''

''تو پھر آپ مجھے کیسے ناتجربے کار کہہ رہے ہو دادن صاحب؟'' میں نے فوراً اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ ایسی نظروں سے گھور کے دیکھا کہ ایک لمحے کو میں نے اسے اپنی جگہ دبکتے محسوس کیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کمرے میں آگیا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں نے دادن کو اپنے کمرے سے نکلتے دیکھا۔ پھر میرے جی میں بھی جانے کیا سمائی ...کہ میں بھی، ذہن میں ابھرنے والے کسی فوری خیال کے تحت اٹھ کر اپنے کمرے سے نکلا اور سیدھا انور شاہ کی کوٹھڑی میں داخل ہوا، اس سے بائیک کی چابی لی اور باہر آگیا۔

وسیع و عریض اڈے پر اس وقت بہت سی مسافر لاریاں کھڑی تھیں۔ ایک طرف کچھ باربردار ٹرک بھی موجود تھے۔ مسافر اور لوگ بھی کافی جمع تھے، جو دوسرے شہروں کی جانب سفر پہ گامزن ہونے والے تھے۔

میری متلاشی نظروں نے ایک طرف تیز تیز قدموں سے اپنی ویسپا اسکوٹر کی جانب بڑھتے ہوئے دادن کو دیکھ لیا ......وہ اسے اسٹینڈ سے اتارنے کے بعد اس پر سوار ہوا اور کک لگا کر اسٹارٹ کرنے تک میں بھی اس کے پیچھے لگ چکا تھا۔

وہ اڈے سے باہر نکلا اور سیدھے ہاتھ والی سڑک پر مڑ گیا۔ چند ہی منٹوں بعد میں بھی اس کے تعاقب میں رواں دواں، ایک مین شاہراہ پر آگیا۔

یہ ڈبل روڈ تھی۔ یہاں بیس منٹ تک کا سفر رہا اس کے بعد دادن نے اپنی ویسپا ملیر پندرہ نمبر کی طرف موڑ لی۔ میں بھی بدستور اس کے تعاقب میں لگا رہا۔

یہ علاقہ، ظاہر ہے میرا دیکھا بھالا تھا۔ آگے ایک چوراہا آگیا اور یہاں سے وہ نظر علی ٹاؤن کی طرف مڑ گیا اور پھر سیدھا ہی چلتا چلا گیا۔ یہاں کا سفر بھی پندرہ سے بیس

Downloaded From http://paksociety.com

منٹ کی مسافت پر محیط رہا اس کے بعد وہ ملیر کے کسی دور افتادہ گوٹھ میں داخل ہو چکا تھا، جہاں زیادہ تر سندھی اور بلوچ رہتے تھے۔ یہاں جابجا پالک اور چاولوں کے کھیت بکھرے ہوئے تھے اور بھینسوں کے طویل و عریض باڑوں کی تو بہتات نظر آتی تھی۔ مجھے یاد پڑتا تھا، یہاں میرا ایک کالج کے زمانے کا سندھی دوست رہتا تھا، جو بہت مہمان نواز اور اچھا لڑکا تھا۔ اس کا نام سائیں داد تھا اور میرا بڑا اچھا دوست رہ چکا تھا، ایک بار میں اس کے ساتھ یہاں آ بھی چکا تھا۔ اس کا بھینسوں کا باڑا تھا۔ اس نے بس انٹر تک ہی پڑھا تھا، اس کے بعد چھوڑ دیا۔ یہ تین چار سال پرانی بات تھی۔ پھر میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ آج جب دادن کے تعاقب میں یہاں آیا تو مجھے وہ یاد آ گیا تھا۔

اسی کی زبانی مجھے تھوڑا بہت یاد آتا تھا کہ یہاں ایک حاجی مہران خان کے نام سے ایک زمیندار بھی رہتا تھا جو اس پورے علاقے میں اچھا خاصا اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ اس وقت وہ ایم پی اے تھا۔ آج کل نجانے کیا تھا، یہ مجھے نہیں معلوم۔ میں نے اسے براہِ راست تو نہیں دیکھا تھا، البتہ یہاں جابجا لگے انتخابی پوسٹروں اور بینروں میں لگی اس کی تصویریں ضرور دیکھ چکا تھا۔

بہر طور موٹر سائیکلوں کا یہ تعاقب نما سفر، کھیتوں، پگڈنڈی نما کچے بل کھاتے راستوں اور اپلے تھپی، گارے مٹی کی دیواروں والے کچے گھروں کے درمیان سے ہوتا ہوا، بالآخر ایک وسیع و عریض قطعۂ اراضی پر پھیلے ہوئے حویلی نما ایک مکان پر منتج ہوا۔

میں نے ذرا پرے ہی اپنی بائیک روک لی تھی۔ یہاں آتے ہی مجھے وہاں لگے الیکشن کے زمانے کے کچھ پرانے بینرز اور پوسٹرز میں لگی حاجی مہران خان کی تصویریں دیکھ کر ایک جھٹکا سا لگا۔

یہ ایک پورا دیہاتی ماحول معلوم ہوتا تھا اور یہاں آ کر کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کراچی جیسے ایک جدید شہر میں ایسے پسماندہ دیہات بھی دیکھنے کو مل سکتے ہیں۔

بہر طور میں نے دیکھا، وہاں کچھ لوگ موجود تھے، ان میں گن بردار محافظ بھی تھے۔ حویلی نما اس مکان کے وسیع احاطے میں دو گاڑیاں مجھے کھڑی دکھائی دیں ایک ٹویوٹا کراس روڈ جیپ اور دوسری کار تھی۔ ایک اوطاق کا سامنے پھیلا ہوا چھپر نما سائبان نظر آتا تھا۔

میں نے دیکھا کہ وہاں موجود لوگ دادن خان کو اچھی طرح جانتے تھے اور دو آدمی اسے اوطاق نما کمرے کی طرف لے جا رہے تھے۔

یہاں میرا زیادہ دیر کھڑے رہنا مناسب نہیں تھا، میں ایک سیاسی شخصیت کی رہائش گاہ کے قریب موجود تھا، جہاں پرائیوٹ سیکیورٹی کا عمل دخل نظر آتا تھا مگر میں ابھی تک اسی میں الجھا ہوا تھا کہ آخر دادن خان یہاں کرنے کیا آیا تھا؟ اتنی بات تو طے تھی کہ وہ یقیناً حاجی مہران خان سے ہی ملنے آیا تھا مگر کیوں اور کس سلسلے میں؟

''کون بابا تم؟ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اچانک ایک پاٹ دار آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میں نے چونک کر آواز کی طرف دیکھا تو کچھ گھبرا سا گیا۔ وہ دو افراد جنہوں نے کھلی ڈلی شلوار قمیص اور بھاری کاندھوں پر اجرکیں ڈال رکھی تھیں، جن میں ایک کے بغلی ہولسٹر سے پستول کا دستہ اور دوسرے کی پشت سے بندوق کی نال جھلک رہی تھی مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے گھورنے کے انداز میں دیکھ رہے تھے۔

''وہ......! میں اپنے دوست سائیں داد سے ملنے آیا تھا، مجھے اس کا گھر نہیں مل رہا ہے؟''

بالآخر میں نے فوراً سنبھلتے ہوئے کہا تو دوسرا بولا۔

''بابا تم خود کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ یہاں کے تو نہیں دکھتے؟''

''نعمان نام ہے میرا، میں شہر سے آیا ہوں۔ سائیں داد اور میں ایک کالج میں پڑھتے ہیں، اسی سے ملنے آیا تھا، اس کے باپ کا یہاں ایک باڑا بھی ہے، شاید خالق داد نام ہے اس کا۔'' میں نے فوراً ہی اپنے زیادہ لمبے چوڑے تعارف سے انہیں ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے گفتگو کا رخ دوسری طرف موڑ دیا اور میرا یہ تیر نشانے پر لگا کیوں کہ اگلے ہی لمحے پہلے والا کچھ ہموار لہجے میں بولا۔

''اچھا۔ اچھا۔ تم خالقو کی بات کر رہے ہو۔ اس کا گھر اس طرف ہے، جدھر ہمت شاہ کی چکی ہے۔ وہاں مسجد کے سیدھے ہاتھ پر تمہیں، اس کا باڑا نظر آ جائے گا، وہیں اس کا گھر بھی ہے۔''

اس کا دوسرا ساتھی کچھ مطمئن نہ تھا، وہ اپنے ساتھی کی طرف تکنے لگا تو پہلے نے مقامی زبان میں اس سے کہا۔

''اڑے بابا وہی خالقو۔ جس کو سائیں بھوتار کا آڈر جاتا ہے دودھ کا، سائیں داد اسی کا تو بیٹا ہے۔'' دوسرے نے تفہیمی انداز میں اپنے سر کو جنبش دی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

لاری اڈے میں میرا ہر قسم کے اور ہر قومیت کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا، اسی لیے مجھے تھوڑی بہت مختلف علاقائی زبانوں کا سمجھنے کی حد تک تو تجربہ تھا ہی۔

میں نے فوراً ان کا شکریہ ادا کیا تو دوسرا آدمی جو مجھ سے مطمئن نظر نہیں آتا تھا، میرے ساتھ بائیک پر پیچھے بیٹھ گیا اور بولا۔

''چلو میں چاچا خالقو تک تمہاری راہ نمائی کردیتا ہوں۔ مجھے بھی وہیں جانا تھا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور بائیک کو کک لگا کر اسٹارٹ کیا اور آگے بڑھ گیا۔

میں اس کی چالا کی سمجھ گیا تھا، یہ تسلی کرنا چاہتا تھا کہ میں واقعی اپنے دوست سائیں داد ہی سے ملنے آیا تھا یا نہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ دونوں حاجی مہران خان کے ہی آدمی تھے اور ان کے اس قدر محتاط رہنے کی وجہ بھی سمجھ میں آتی تھی کہ ان لوگوں کی مٹھی چاپی کرنے والے جتنے آدمی ہوتے تھے اتنے ہی دشمن بھی جبکہ میں تو دل ہی دل میں خدا کا شکر کرنے لگا تھا کہ میرے پاس انہیں اپنی طرف سے بھٹکانے کا پہلے سے ہی ایک ''تیار شدہ'' آپشن موجود تھا، میں نے اسے ہی استعمال کیا تھا۔

خوش قسمتی سے مجھے سائیں داد، ہمت شاہ کی چکی کے پاس ہی مل گیا۔ وہ ایک ڈاٹسن ٹرک پر دودھ کے بڑے بڑے کین رکھوا رہا تھا اور دو مزدور ٹائپ آدمی اندر چکی سے اٹھا کر ٹرک پر لادرہے تھے۔

شکر تھا کہ اتنے عرصے بعد ملنے کے، سائیں داد مجھے پہچان گیا تھا اور تیزی سے میری طرف لپکا تھا۔ میرے ساتھ بیٹھے آدمی کو بھی تسلی ہوگئی اور وہ چلا گیا۔

سائیں داد کہاں تو ایک دبلا پتلا سا ہوتا تھا مگر اب کچھ موٹا دکھائی دے رہا تھا، رنگ سانولا تھا اور قد درمیانہ۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ یہی اس کا پسندیدہ لباس تھا حالانکہ وہ کالج میں کبھی کبھی پینٹ شرٹ بھی پہن آتا تھا، اس وقت اسمارٹ سا تھا۔

''ارے میرے یار! اتنے دنوں بعد۔ کیسے میری یاد آگئی؟'' وہ بے چارہ یہی سمجھا کہ میں واقعی اسی سے ہی ملنے آیا تھا اگرچہ یہ ایک حادثاتی ملاقات سہی لیکن اب لگتا تھا کہ اس سے آگے بھی ملاقاتیں متوقع تھیں۔

''بھئی، تم تو ہمیں بھول گئے تھے، دیکھو ہم نے تمہیں یاد رکھا اور تمہارا کھایا ہوا نمک بھی، سو چلے آئے تم سے ملنے۔'' میں دوستانہ انداز میں مسکرایا۔ وہ خوش ہوگیا اور مجھے لیے اپنے ڈاٹسن ٹرک کے ڈرائیونگ کیبن میں سوار ہوگیا۔

دودھ کے کین شاید پورے لادے جاچکے تھے۔ لادنے والے دونوں مزدور بھی پیچھے ڈالے پر چڑھ گئے تو سائیں داد نے ایک کو میری بائیک ساتھ لانے کا کہا اور ٹرک آگے بڑھا دیا۔

اس دوران ہمارے درمیان رسمی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کا گھر زیادہ دور نہ تھا، وہاں پہنچے تو مجھے باڑے کا وسیع احاطہ دکھائی دیا۔ ٹرک رک گیا۔ ہم سب نیچے اتر آئے۔ میری بائیک بھی ایک طرف اسٹینڈ سے لگادی گئی۔ میری سائیں داد کے باپ خالق داد المعروف خالقو سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ بھی اچھا انسان تھا۔ باڑے میں ہی ایک اوطاق بنائی گئی تھی۔ ہم دونوں وہیں جا کر بیٹھ گئے۔

''یار نومی! اتنے عرصے بعد تم سے دوبارہ مل کر بہت خوشی ہورہی ہے۔ کیسے ہو؟ سب خیریت ہے؟ یہاں ایک دم میری کیسے یاد آگئی تمہیں؟'' وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ اس کے لہجے میں مسرت آمیز حیرت تھی۔ اسے واقعی میرے بارے میں اب تک کوئی تازہ خبر معلوم نہ تھی اور ہوتی بھی کیسے؟ اتنے عرصے بعد تو ہم ملے تھے۔

''یار سائیں داد! سچ پوچھو تو مجھے بھی تجھ سے اتنے عرصے بعد مل کے بے حد خوشی ہورہی ہے۔ تجھے تو پتا ہی ہوگا کہ پورے کالج میں ہم دونوں کی ہی زیادہ بنتی تھی۔ پھر تم نے آگے پڑھائی چھوڑ دی، ورنہ یہ یارانہ یونیورسٹی تک تو ضرور چلتا۔''

میں نے دیکھا میری بات پر اس کے چہرے سے دکھ کی ایک رمق سی ابھری، پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔ ''دوست! میں تو آگے پڑھنا چاہتا تھا لیکن ان دنوں اچانک میرے بڑے بھائی کا انتقال ہوگیا تھا۔ اسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ ایک ہی بھائی تھا میرا، بابا کے ساتھ وہی کام میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ پھر مجھے پڑھائی چھوڑنا پڑی۔ میں پڑھ کر بھی کیا کر لیتا یار نومی! بس، اب اپنا کاروبار ہے، سو عزت و آرام سے زندگی بیت رہی ہے۔'' وہ اتنا بتا کر خاموش ہوا تو میں نے اس سے افسوس کا اظہار کیا۔

''اچھا یہ بتاؤ کیا پیو گے؟ کیا کھاؤ گے؟''

''بس! یار چائے پلا دو اچھی سی۔ دودھ پتی۔'' میں مسکرا کے بولا۔ ''دودھ کی تو تمہارے پاس کمی نہیں۔'' وہ بھی ہنس دیا۔ میرا خیال تھا وہ وہاں موجود کسی نوکر کو آواز دے گا

Downloaded From http://paksociety.com

مگر وہ خود اٹھ کر چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی واپسی ہوگئی۔ میں یہی سمجھا تھا کہ چائے وہ خود ہی لینے کے لیے گیا ہوگا مگر ایسا نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ میں چائے نہیں تھی بلکہ ایک بڑی سی پلیٹ میں جوش دیا ہوا خالص کھویا تھا جو ہلکا براؤن سا ہو رہا تھا۔ میرے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ ''لو دوست! یہ کھاؤ ہمارے باڑے کے دودھ کا خالص کھویا۔''

کھوئے سے خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس پر چاندی کا ورق چڑھایا ہوا تھا اور خشک میوے کتر کر ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے تھوڑا سا ہاتھ میں لے کر کھایا، بڑا خوش ذائقہ تھا اور لذیذ بھی، میں تعریف کیے بنا نہ رہ سکا۔

''واہ یار سائیں داد! مزہ آگیا۔ بہت زبردست ہے۔ سچی بات ہے ایسا لذیذ اور مزیدار خالص کھویا آج پہلی ہی بار کھا رہا ہوں۔''

میری توصیف پر وہ مسکرانے لگا۔ پھر بولا۔ ''میں نے دو کلو ڈبے میں بندھوانے کا بھی کہہ دیا ہے۔ گھر بھی لے جانا۔''

''ارے نہیں یار! یہ زحمت نہ کر۔'' میں نے کہا تو وہ سر جھٹک کر دوستانہ انداز میں بولا۔

''زحمت کیسی یار! تیرے گھر والے خالص کھویا کھائیں گے تو خوش ہو جائیں گے اور مجھے دعا تو ضرور دیں گے۔ پتا ہے میرا بابا سائیں کہتا ہے کہ ہمارے پرانے وقتوں میں یہ دودھ اور اس جیسی چیزوں کو فروخت کرنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا، یہ تو ایک دوسرے کو تحفے کے طور پر دی جاتی تھیں، اس سے خیر و برکت اور بھائی چارے کی فضاء پیدا ہوتی تھی اور لوگ بھی خوشحال تھے مگر اب تو بھینس کا گوبر بھی بکنے لگا ہے۔ کیا کیا جائے۔''

''ہاں دوست! سچ کہتے ہو، نیرنگ زمانہ ہی یہ سب۔'' میں نے کہا۔

اسی دوران چائے آگئی، نوعمر چھوکرا ٹائپ ایک پیالے میں چائے لے آیا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں گتے کا ڈبہ تھا۔ اس میں میرے گھر والوں کے لیے کھویا تھا۔

چائے وغیرہ پینے کے بعد میں نے سائیں داد سے اجازت چاہی اور اسے بھی اپنے ہاں آنے کی دعوت دے ڈالی... وہ مجھے رات کے کھانے پر روکنے کے لیے اصرار کرنے لگا مگر میں نے شکریے کے ساتھ معذرت کرلی۔ پھر جب وہ مجھے باہر میری بائیک تک چھوڑنے کے لیے آیا تو میں نے بہ ظاہر روا روی میں حاجی مہران خان کے بارے میں پوچھ لیا۔

''یار! یہ آج کل تمہارا ایم پی اے مہران خان اسمبلی میں ہے یا سیاست کو خدا حافظ کہہ چکا ہے؟''

میری بات پر وہ ایک عجیب ہنسی کے ساتھ جواباً بولا۔

''سیاست کیسی یار! بس۔ اپنے اپنے مفادات کو پروان چڑھانے والی بات ہے۔ آج کل تو یہ لینڈ مافیا بنا ہوا ہے۔ حالانکہ اپنا آبائی گھر اس کا ٹھٹھہ میں ہے، وہاں گھوڑا باڑی کے علاقے میں اس کا عالیشان محل نما گھر ہے مگر زیادہ تر ادھر ہی وقت گزارتا ہے۔''

''اوہ اچھا!'' میرے منہ سے نکلا تو وہ بولا۔ ''ارے یار! میں تو تم سے یہ پوچھنا ہی بھول گیا کہ تم کیا کرتے ہو؟ پڑھتے ہو یا میری طرح کام پر لگ گئے ہو؟''

میں تب تک اپنی بائیک کو اسٹینڈ سے اتار کر اس پر سوار ہو چکا تھا۔ اس کے سوال پر ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔ ''ہاں یار! میری کہانی بھی تم سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ یونیورسٹی تک تو میں نے بھی تعلیم حاصل کی مگر پھر باپ کے انتقال کے بعد بڑے بھائی کی حیثیت سے مجھے ہی گھر سنبھالنا تھا سو اب ایک لاری اڈے میں پرچی کلرک ہوں۔''

میں نے ابھی دانستہ اسے ابو کی پھانسی سے متعلق نہیں بتایا تھا۔ وہ جیسے چونک کر بولا۔ ''اوہو۔ بہت افسوس ہوا یار! اچھا جیسے اللہ کا حکم، اچھا یہ بتاؤ، یہ تم نے اچانک حاجی مہران خان کے بارے میں کیوں پوچھ لیا؟ خیریت تو ہے ناں؟''

اس کی بات پر میں نے کہا۔

''تم ایسا کرو کل اتوار ہے، مجھے بھی چھٹی ہے، دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ گھر آ کے، پھر تم سے مزید تفصیلی باتیں ہوں گی۔''

میری بات پر وہ کچھ سوچتا بن گیا تو میں نے فوراً اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''دیکھو! اب انکار مت کرنا۔ ہماری دوستی ایسی نہیں تھی کہ کالج چھوٹ گیا تو دوستی بھی چھوٹ گئی۔ سمجھے؟'' میری بات پر وہ بے اختیار دوستانہ انداز میں مسکرایا اور آنے کا وعدہ کرلیا۔

جس وقت میں لوٹنے لگا تو شام اترنے لگی تھی۔ میں نے بائیک کی ہیڈ لائٹس روشن کردیں۔ گوٹھ ٹائپ علاقہ تھا، شام پڑتے ہی رات کا گماں ہونے لگا تھا۔ میں کچے بل کھاتے پگڈنڈی نما راستے پر بائیک دوڑائے جا رہا تھا۔ سائیں داد کا دیا ہوا تحفہ، یعنی کھوئے کا ڈبہ میں نے شاپر میں

Downloaded From http://paksociety.com

ڈال کر بائیک کے کیریئر پر پھنسا دیا تھا۔

مجھے یاد تھا کہ میں نے آج زنیرہ کے پُرزور ایماء پر رانا بشیر کے ہاں بھی جانا تھا۔

میں جلدی میں اس گوٹھ کی حدود سے نکل کر نظر علی ٹاؤن کی طرف نکل آیا اور یہاں سے میں نے جناح اسکوائر کا رخ کیا۔

یہاں کے حالات خراب رہتے تھے، اسی لیے میری کوشش تھی کہ جلد از جلد اس علاقے سے نکل جاؤں۔ ابھی میں ملیر پندرہ نمبر کی روڈ پر تھا۔ سڑک تنگ تھی اور شام کا وقت ہونے کے باعث ٹریفک بھی جام تھا، یہاں سے ایک شارٹ کٹ راستہ گلیوں سے گزرتا تھا، ایسی ہی ایک گلی میں، میں نے بھی اپنی بائیک موڑ دی۔ گلی کچھ سنسان تھی کہ اچانک گلی کے سرے پر موڑ کاٹتے ہی مجھے ایک دوسری بائیک کی غوں غوں کرتی آواز سنائی دی مگر تب تک میں اسی جانب مڑ چکا تھا اور وہ تیزی میں تھا، مجھ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا اور قریب کی دیوار سے اس کی بائیک خاصی زور سے ٹکرائی، وہ گر پڑا، ٹھیک ایسے ہی وقت میں مجھے اسی کے عقب سے ایک سے زائد موٹر سائیکلوں کی گھر گھراتی ہوئی آوازیں سنائی دیں، گرنے والا وہ نوجوان، بدحواس سا تھا، اس کے پاس اب اپنی بائیک سنبھالنے کا وقت نہ تھا، یوں بھی اس کی بائیک دیوار سے ٹکرانے کے باعث، ناکارہ ہوگئی تھی اور خود بھی وہ خاصا زخمی تھا مگر سخت جان تھا یا موت اس کے سر پہ سوار تھی، فوراً ہی سنبھل کر مجھ سے بولا۔ ''یار! میری جان خطرے میں ہے۔ مجھے جلدی سے لے چلو اور یہاں سے بائیک واپس موڑ لو۔''

میں نے اس لڑکے کو دیکھا اور مجھے ایک جھٹکا لگا، یہ میرا ہم عمر تھا اور میں اسے پہچان بھی گیا تھا۔ اس سلسلے میں میری یادداشت بہت تیز تھی۔ پھراتنی جلدی پہچان لینے کی وجہ بھی میرے پاس بڑی معقول تھی کہ اسی لڑکے کی وجہ سے میں نے ارشاد مٹن جیسے ایک بڑے شرپسند کو فاش شکست دی تھی اگر اس روز میں اس کے منہ سے وہ الفاظ نہ سن لیتا اور میرے ذہن میں، ارشاد مٹن کو شکست دینے کا وہ اہم نقطہ نہ آتا۔

ہاں! یہ وہی نوجوان تھا، جسے میں نے اس روز اپنے ایک ساتھی کے ساتھ ارشاد مٹن کے ڈھابا نما ہوٹل میں آتے اور اس کے بیٹے کو بے نقط سناتے ہوئے دیکھا تھا، اس کی اس شکایت پر ہی میں چونکا تھا کہ اسے جو گوشت دیا گیا تھا وہ مشکوک تھا، یہی وہ نقطہ تھا جو اس نوجوان نے مجھے ''حادثاتی'' طور پر سجھایا تھا اور مجھے ارشاد مٹن جیسے شرپسند کے خلاف ایک مضبوط کلیو ملا تھا۔

''پیچھے بیٹھ جاؤ۔'' میں نے کہا اور اسی وقت جب وہ میرے پیچھے بائیک پر بیٹھ چکا تھا۔ تین موٹر سائیکل سوار نوجوان جو چہرے سے ہی لوفر اور آوارہ لگتے تھے (اگرچہ اس شناسا لڑکے کا بھی یہی حلیہ تھا) نمودار ہوئے، اب میرے پاس اس شناسا لڑکے کی ہدایت پر عمل کرنے کا وقت نہ تھا، یعنی میں اب بیک نہیں ہوسکتا تھا۔ ایسی صورت میں ایک طرف دھر لیے جانے کا امکان تھا اور اس جانب پھر وہی سڑک آجاتی، جہاں ٹریفک بری طرح بلاک تھی۔ پھر ان لوفروں کی تعداد بھی چھ تھی اور دو کے ہاتھوں میں، میں نے ٹی ٹی پستول بھی دبی ہوئی دیکھی تھیں۔ خود میری اپنی جان بھی اب داؤ پر لگ چکی تھی۔ شاید اس خطرناک صورتِ حال کا میرے ساتھ سوار اس نوجوان کو بھی ہوگیا تھا، یہی سبب تھا کہ مجھے پیچھے سے اپنے کانوں میں اس کی مردنی سی آواز سنائی دی۔ ''ابے لے۔ آج گیا کالیا.....''

دوسرے ہی لمحے میں نے اپنی بائیک کا ایکسیلیٹر پوری طرح گھما دیا، میری بائیک کا انجن غرایا اور پھر جب تک وہ تینوں بائیک سوار کچھ سمجھ پاتے، میں ان کے بالکل درمیان سے اپنی بائیک گولی کی طرح آگے نکال لے گیا۔ کیوں کہ ان کے ذہنوں میں صرف اپنے دشمن کی شبیہہ تھی اور اس کی کاواسا کی ون ٹو فائیو کی، اس لیے مجھ پر ان کا دھیان تھوڑا دیر سے پڑا اور جب تک پڑا، میں ان کے درمیان سے نکل چکا تھا، یہ الگ بات تھی کہ مجھے اپنے عقب سے ان کی چیختی آواز ضرور سنائی دی تھی۔ انہوں نے اب میرے پیچھے سوار اپنے دشمن اور گری ہوئی اس کی بائیک کو دیکھا تھا اور پیچھے سے للکار ماری تھی جبکہ میں سیدھے ہاتھ والی ایک گلی میں مڑ چکا تھا۔ مجھے اندازہ تھا انہیں اس تنگ سی رہائشی گلی میں اپنی موٹر سائیکلیں موڑنے اور رفتار پکڑنے میں دیر لگے گی، اسی لیے میں تب تک ان کی پہنچ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔

''ڈز۔ ڈز۔''

مجھے اپنے پیچھے دو گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ جانتا تھا میں یہ محض ہمیں ڈراوا دیا گیا تھا، ورنہ ہم ابھی ان کی فائرنگ رینج میں آئے تھے مگر زیادہ دیر ایسے نہیں چل سکتا تھا۔ پھر بھی میں نے اپنے پیچھے سوار اس لڑکے سے

Downloaded From http://paksociety.com

پوچھ لیا۔ ''تم ٹھیک تو ہوناں......؟''

''میں ٹھیک ہوں دوست!'' وہ بولا۔ ''تم نے بروقت استادی سے کام لیا، ورنہ تو آج گیا تھا کالیا!'' اس کے لہجے میں میرے لیے توصیف تھی۔

اس نے دوسری بار ''کالیا'' پکارا تھا جس سے مجھے یہ سمجھنے میں متعلق دیر نہیں لگی تھی کہ یہ اسی کا نام تھا۔

بھل بھلیوں کی مانند یہ گلیاں ایسے وقت میں سودمند ثابت ہوئیں، پھر بائیک کو ''رف'' انداز میں چلانے کا مجھے بھی بچپن کا تجربہ تھا، میں اسے انہی بھل بھلیوں میں دوڑاتا چلا گیا اور جلد ہی مین روڈ پر آ کر میں نے اس کی رفتار طوفانی کر دی۔

اسی وقت میرے سیل فون کی بیل بجی اور اس کی تھرتھراہٹ بھی میں نے محسوس کی، میں جب بھی بائیک پر ہوتا، سیل کو وائبریشن پر کر لیتا تھا کیوں کہ اکثر ٹریفک کے شور میں مجھے بیل کی آواز کم ہی آتی تھی۔

''بس دوست! مجھے ادھر ہی اتار دو۔'' اسی وقت ممکنہ طور پر کالیا نام کے اس لڑکے نے پیچھے سے میرا ہلکے سے کندھا تھپتھپا کے کہا اور میں نے بائیک روکنے کی بجائے اس کی رفتار کم کر دی اور کسی خیال کے تحت اس سے پوچھا۔

''تم کہاں اترنا چاہتے ہو؟''

''آگے بلوچ کالونی کے پل پر۔'' وہ بولا۔

مجھے بھی اسی طرف ہی جانا تھا۔ اس سے تھوڑا آگے ایک پوش علاقے میں رانا بشیر کی کوٹھی تھی جو طارق روڈ سے متصل تھی۔ کیوں کہ میرے سیل کی بیل بجنے کی آواز پر میں سمجھ گیا تھا کہ کال کس کی ہو سکتی تھی۔

''میں نے بھی اسی طرف جانا ہے۔'' کہتے ہوئے میں نے اپنی چیسٹ پاکٹ سے سیل نکالا اور کان سے لگا دیا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے ہینڈل تھامے رکھا تھا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ کال زنیرہ کی ہی تھی اور میں نے اسے بتا دیا کہ میں پہنچنے ہی والا ہوں، سڑک پر ٹریفک کے رش کے باعث ذرا دیر ہو گئی، وغیرہ۔

سیل جیب میں دوبارہ رکھنے کے بعد میں نے بائیک کی رفتار بڑھا دی اور جلد ہی بلوچ کالونی کے پل پر اسے اتار دیا۔

''تم نے آج مجھ پر جو احسان کیا ہے، میں شاید اس کا کبھی بھی بدلا نہ چکا سکوں۔'' وہ بائیک سے اترنے کے بعد بولا۔ ساتھ ہی وہ محتاط نظروں سے اطراف میں بھی تکے جا رہا تھا۔

''اس کی ضرورت بھی نہیں، کیوں کہ تم ایک احسان پہلے بھی مجھ پر کر چکے ہو۔'' میں نے بھی دوستانہ مسکراہٹ سے کہا تو وہ میری بات پر چونکے بنا نہ رہ سکا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا۔ میں نے کہہ ڈالا۔ ''تم ٹھیک تو ہوناں؟ کہو تو تمہیں کسی اسپتال لے چلوں؟''

''ابے لے۔ اس کی ضرورت نہیں، میں اپنے ٹھکانے پہنچ گیا، یہی بہت ہے۔'' وہ بولا۔ ''باہر کی دنیا مجھے شیراز کے نام سے جانتی ہے جبکہ اندر کی دنیا میں مجھے کالیا کہا جاتا ہے۔''

''اور مجھے اندر اور باہر دونوں ہی دنیا میں صرف نعمان احمد کہا جاتا ہے۔'' میں مسکرایا۔

''اس لیے کہ تم شریف ہو۔ مگر میں...... خیر۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا اور کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر آخر میں بولا۔ ''دوست! یہ دنیا بہت زہریلی ہے، یہاں شریف انسان کو سر اٹھا کے جینے نہیں دیا جاتا اور اسی پر بھی بس نہیں کرتے بلکہ اس بے چارے کا تو جھکا ہوا سر بھی کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جی تو بہت چاہتا ہے کہ میں تمہیں اپنے ٹھکانے پر لے جاؤں مگر تم پتا نہیں کیا سمجھو۔ ویسے تم نے مجھے اپنی جان پر کھیل کر جس طرح میری زندگی بچائی ہے۔ لگتا تو ایسا ہی ہے کہ جیسے تم بھی کسی ایسی ہی جنگ میں مصروف ہو۔''

اس کے لفظ لفظ اور لہجے کی ایک ایک دھمک سے برسوں کا تجربہ مترشح ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے میرے بارے میں جتنا بھی اندازہ لگایا تھا وہ غلط نہیں تھا۔

میں نے اس وقت اسے زیادہ غور اور قریب سے نہیں دیکھا تھا، اب ذرا موقع ملا تو ایک نگاہ ڈالی۔ میری ہی عمر کا تھا۔ ہم قد بھی مگر ڈیل ڈول میں وہ ذرا بھاری تھا اور جسم بھی اس کا ورزشی معلوم ہوتا تھا۔ ناک نقشہ بھی مناسب تھا مگر حلیہ کے اعتبار سے وہ جس قماش کا نظر آتا تھا، وہ اس پر چڑھا ایک خول ہی معلوم ہوتا تھا۔ ورنہ اس کا لہجہ اس کے اندر کے دبے ہوئے کسی اچھے انسان کا پتا دیتا تھا۔

بہرطور اس نے میرا سیل نمبر لے لیا اور اپنا دیتے ہوئے ایک بار پھر ذومعنی لہجے میں بولا۔

''مجھے نہیں پتا کہ میں تمہارے کب، کیسے اور کہاں کام آ چکا ہوں؟ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر ایسا واقعی ہوا ہے تو مجھے خوشی ہوئی۔ بس! اتنا یاد رکھنا دوست! صرف

Downloaded From http://paksociety.com

شرافت سے ہی یہاں زندگی بسر نہیں ہوتی، اس کے لیے ایک کڑوی گولی جیب میں رکھنا پڑتی ہے۔کیا ہم آج سے دوست ہیں؟''

وہ ذومعنی لہجے میں گفتگو کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے کہا۔

''ابے لے۔'' وہ مسکرایا۔''ابے لے'' شاید اس کا تکیہ کلام تھا۔آگے بولا۔

''زندگی کے ستائے ہوئے لگتے ہو۔تمہارے ساتھ تو میری دوستی کب کی ہو چکی، جی چاہتا ہے، تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارا جائے۔ بیٹھا جائے تمہارے ساتھ مگر افسوس اس وقت میں خود ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے، جمائیں گے محفل کسی دن۔''

وہ مجھ سے بڑی گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے بولا اور میں نے بائیک آگے بڑھالی۔

تھوڑی دیر بعد ہی میں ایسے علاقے میں تھا، جہاں نہ ٹریفک کا شور تھا نہ ہی گنجلک سی آبادی کی طرح زیادہ لوگوں کی آوک جاوک۔ ہر سو خاموشی تھی اور سکون۔

دورویہ بنگلوں اور کوٹھیوں کی قطاریں تھیں۔

رانا بشیر کی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے میں نے اپنی بائیک روکی تو گیٹ پر موجود ایک مسلح چوکیدار نے مجھے اشارے سے بائیک سمیت اندر داخل ہونے کا کہا۔ مجھے حیرت ہوئی۔

میں بائیک میں سوار ہی تھا اور وہ اسٹارٹ بھی تھی۔

اس نے گیٹ کھول دیا۔ میں اندر داخل ہونے لگا تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

''آپ ہی نعمان صاحب ہیں نا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور سمجھ گیا کہ اسے میرے سلسلے میں پہلے ہی سے آگاہ کر رکھا گیا تھا۔

اندر ایک پختہ روش تھی۔ جس کے دائیں بائیں وسیع و عریض لان پھیلا ہوا تھا اور وہاں آہنی پائپوں پر سفید دودھیا گلوب روشن تھے، کچھ فولڈنگ چیئرز اور لان کی گھاس میں گڑھی، خوب صورت فینسی چھتریاں بھی نظر آرہی تھیں۔

ماربل چپس کی یہ دلآویز روش آگے جا کر قوس کی صورت میں مرکزی دروازے پر ختم ہوتی تھی اور وہیں کار پورٹیکو میں دو کاریں کھڑی تھیں۔ایک تیسری کار مجھے بالکونی کے نیچے کھڑی نظر آئی، جسے میں پہچان گیا تھا۔ یہ زنیرہ کی کار تھی، گویا وہ بھی اندر موجود تھی۔ میں نے بائیک روک دی۔ کیوں کہ ایک عمر رسیدہ ملازم کے ساتھ مجھے رانا بشیر کی بیٹی فرحانہ نظر آگئی تھی۔ اس نے کاسنی رنگ کا بیش قیمت سوٹ زیب تن کر رکھا تھا اور اس پر جالی دار راسلک کا دلکش دوپٹا تھا۔اس میں وہ خاصی پُرکشش اور حسین دکھائی دے رہی تھی مگر میرے لیے اس میں کوئی رعنائی نہ تھی۔ میں اس کی طرف سے نظریں ہٹا کر اپنی بائیک کو اسٹینڈ کرنے لگا۔

اس نے مجھے سلام کیا اور کھنکتے لہجے میں بولی۔

''نعمان صاحب! آپ چھوڑ دیں یہ قمرو آپ کی بائیک سنبھال لے گا۔''

ساتھ آنے والا ملازم فوراً میری طرف بڑھا اور مجھ سے بائیک لے لی۔

''آیئے، پلیز! تشریف لائیں۔'' وہ میری طرف ایک دلآویز مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے بولی۔ میں اس سے ذرا فاصلہ کیے ساتھ چل پڑا اور ایک پُرتزئین نشست گاہ میں آگیا، جہاں ایک صوفے پر زنیرہ بیٹھی تھی۔اس کے سامنے کھانے پینے کے لوازمات سے سجی ہوئی ایک نفیس سی ٹرالی دھری پڑی تھی۔ زنیرہ کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا جبکہ مجھے اس کے قریب ہی ایک زنانہ پرس کے پاس ایک نیلی جلد والی ڈائری بھی نظر آئی تھی۔

''ارے بھئی نومی! بہت دیر لگا دی تم نے۔'' وہ مجھے دیکھتے ہی بولی اور کپ ٹرالی کی اوپری سطح پر رکھ دیا۔

''ہاں ! سوری، کچھ ٹریفک جام تھا۔آپ کب آئیں؟'' میں نے جواب دیتے ہوئے پوچھ بھی لیا۔

''مجھے تو آئے کافی دیر ہو چکی ہے۔ رانا صاحب بھی ادھر ہی ہیں، کسی کا فون آگیا تھا، وہ سننے گئے ہیں دوسرے کمرے میں۔''

''آپ بیٹھیں پلیز نعمان صاحب!'' اسی اثناء میں قریب کھڑی فرحانہ نے مجھ سے کہا اور میں زنیرہ کے سامنے والے صوفے پر دھنس گیا۔

''میں ابھی پاپا کو بتا کر آتی ہوں۔'' فرحانہ نے کہا۔ پھر ذرا رک کر میری طرف دیکھتے ہوئے ٹرالی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔''نعمان صاحب! آپ کچھ لیں ناں پلیز!''

''جی میں لے لوں گا۔آپ رانا صاحب کو ذرا جلدی بلالیں۔'' میں نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ فوراً آگے بڑھ گئی۔

''میں تو پہلی بار آج آئی ہوں یہاں مگر بہت سی

Downloaded From http://paksociety.com

باتیں معلوم ہو چکی ہیں مجھے۔'' فرحانہ کے کمرے سے نکلتے ہی زنیرہ نے مجھ سے کہا۔

''مثلاً؟'' میں اس کی طرف دیکھ کر مستفسر ہوا۔

''بھئی یہی کہ یہاں ان دونوں باپ بیٹی کے علاوہ اور کون کون رہتا ہے۔''

''کون کون رہتا ہے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا تو اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

''کیا تم اس سے پہلے بھی یہاں آچکے ہو؟'' اس کے سوال پر میرے حلق میں کڑواہٹ سی گھل گئی، تاہم جواباً بولا۔ ''ہاں آچکا ہوں مگر اندر نہیں باہر تک۔ اس وقت میں اپنے تمام گھر والوں کے ساتھ آیا تھا، رانا بشیر کی منتیں سماجتیں کرنے کے لیے مگر اس بے حس انسان نے ہمیں اندر بلانا بھی گوارا نہیں کیا تھا اور باہر سے ہی ہم سب کو بری طرح دھتکار دیا تھا۔''

''اوہو۔ سو سیڈ۔ سوری، میں نے تمہارا زخم پھر ہرا کر دیا۔ لوی!''

''اٹس او کے۔'' میں نے بھی ہولے سے کہا۔

اثنائے راہ۔ وہ دونوں باپ بیٹی اندر داخل ہوئے۔ چار ونا چار میں اٹھنے لگا، رانا بشیر مجھے دیکھتے، اپنے دونوں بازو وا کیے، تیر کی طرح سیدھا میری طرف بڑھا اور مجھے اس طرح اپنے گلے سے لگا لیا جیسے میں اس کا برسوں بچھڑا ہوا کوئی عزیز رشتہ دار ہوں۔

''مجھے بہت خوشی ہوئی تمہیں یہاں دیکھ کر۔'' وہ بولا۔

''مگر میں شرمندہ بھی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی تمہارا تہہ دل سے مشکور بھی کہ تم نے بالآخر ہماری بات مانی بھی اور یہاں آگئے۔ بیٹھو۔ بیٹھو۔ بیٹا!''

میں کچھ نہیں بولا اور خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور اس کی بیٹی دائیں جانب کے دو صوفوں پر براجمان ہو گئی۔

فرحانہ مسلسل میری جانب بڑے غور اور گہری نگاہوں سے تکے جا رہی تھی۔

جبکہ رانا بشیر نے ایک نگاہ زنیرہ پر ڈالی جو اس کا اشارہ بھانپ کر بولی۔

''میرا خیال ہے اصل بات پر گفتگو شروع کر دینی چاہیے۔''

میں رانا بشیر کے چہرے کی طرف کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے تکنے لگا۔ وہ ہولے کھنکار کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہاری ہی نہیں بلکہ تمہارے گھر والوں کی ذہنی اذیتوں کا شاید اندازہ بھی نہ کر پاؤں مگر انہیں محسوس کر سکتا ہوں اور جتنا محسوس کرتا ہوں اتنا ہی خود کو زمین میں گڑتا ہوا پاتا ہوں، اب جب کہ تھوڑی دیر پہلے ہی مجھے زنیرہ صاحبہ نے یہ بھی بتایا کہ اس صدمہ جانکاہ کو تمہاری ماں بھی نہ سہارتے ہوئے جاں بر نہ ہو سکیں تو۔ یقین کرو میرے ضمیر کی چبھن مزید بڑھ گئی ہے اور، اور میں خود کو تمہارا مجرم سمجھنے لگا ہوں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سے کہاں سے اور کیسے بات شروع کروں۔'' وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔ میں نے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا تھا کہ اس میں کتنی ریا، جھوٹ اور سچ شامل تھا؟

بہ ظاہر تو اس کا چہرہ بالکل ایسی ہی کیفیت کا عکاس دکھائی دیتا تھا، جیسے انسان کسی اندرونی دباؤ اور خلش کا شکار ہو جبکہ اس کی بیٹی فرحانہ کی بھی یہی کچھ کیفیات سمجھ میں آتی تھیں مگر مجھے ان دونوں باپ بیٹی کے اس ڈرامے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے فوراً اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے اس سے کہا۔

''میرا خیال ہے اب اصل بات شروع کر لی جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔''

وہ فوراً بولا۔ ''چاہتا تو میں یہی تھا کہ میں خود تمہارے گھر آ کر تم سے اور تمہارے گھر والوں سے معافی مانگتا اور میں نے ایسا کرنا بھی چاہا تھا مگر تم نے......'' اس نے اتنا کہہ کر دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور پھر جیسے سینے میں اٹکی ہوئی ایک گہری خلش زدہ اور پھنسی پھنسی سانس خارج کرتے ہوئے اصل بات کی طرف گفتگو کا رخ موڑا۔

''افسوس تو اسی بات کا ہے کہ کاش یہ سب پہلے ہو جاتا تو احمد حسین جیسے بے گناہ کو پھانسی نہ لگتی مگر......!''

''آخر اب اچانک آپ کو ایسی کون سی حقیقت کا علم ہوا ہے، پتا تو چلے؟'' میں نے قدرے بے چینی سے پوچھا۔

''فی الحال تو یہی پتا چل سکا ہے کہ میری بیوی رفعت خانم کا قاتل کوئی اور ہے، تمہارا باپ احمد حسین نہیں۔''

''کیا یہ بات پولیس سے کنفرم ہوئی ہے یا کسی تفتیش وغیرہ سے پتا چلا ہے؟'' میں نے بہ غور اپنی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے سوال کیا۔ زنیرہ ابھی خاموش تھی۔ شاید یہاں تک اسے بھی بہت کچھ بتا دیا گیا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''نہیں، پولیس نے تو اپنا جو کام کرنا تھا وہ کر چکی تھی۔'' اس نے جواباً کہا اور ایک نگاہ اپنے قریب بیٹھی، فرحانہ ... پر ڈالتے ہوئے آگے بولا۔ ''ابھی تھوڑے دنوں پہلے ہی۔ میری بیٹی فرحانہ کو اس کی ماں کی ڈائری ملی تھی۔ میری بیوی باقاعدگی سے ڈائری لکھنے کی عادی تھی۔ اسے لکھنے لکھانے کا بھی شوق تھا، کسی زمانے میں وہ ہلکے پھلکے افسانے کہانیاں لکھتی رہی تھی، پھر یہ سب چھوٹ گیا مگر اس کی کمی وہ ہر روز ڈائری لکھ کر پوری کرتی تھی۔''

''یہ ہے وہ ڈائری۔'' اچانک زنیرہ نے پہلی بار مداخلت کرتے ہوئے، اپنے پرس کے ساتھ رکھی ہوئی، وہی نیلی جلد والی ڈائری اٹھا کر میری طرف بڑھا دی، جسے میں اس کی ملکیت سمجھے ہوئے تھا۔

''میں نے اس میں وہ صفحہ بک مارک کر دیا ہے، اس سے آگے تم خود پڑھ لو تا کہ تمہیں باقی کی باتیں بھی آسانی سے سمجھ آ جائیں۔''

میں نے بہ ظاہر وہ ڈائری غیر دلچسپ انداز میں، زنیرہ کے ہاتھ سے لی اور بک مارک والا صفحہ دیکھ کر اسے کھول کر پڑھنے لگا۔

تحریر شستہ انداز میں اور بڑے سلیقے سے لکھی ہوئی تھی۔

''بہ روز بدھ، مورخہ 7، وقت رات گیارہ بجے۔

آج صبح سے ہی موسم خاصا خوشگوار تھا، آسمان پر گہرے بادل چھائے رہے تھے مگر بوندا باندی کا آغاز سہ پہر کے بعد سے ہوا جو وقفے وقفے سے ابھی تک جاری ہے۔ رانو (رانا بشیر)، ایک اہم بزنس میٹنگ کے سلسلے میں آج بعد دوپہر کی فلائٹ سے لاہور جا چکے تھے، ان کا یہ بزنس ٹور دو دن کا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں اور فرحانہ رات کے کھانے کے بعد اپنی پسند کا ٹی وی ڈراما دیکھنے کے بعد سونے کے لیے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔''

یہاں تک ڈائری پڑھنے کے بعد میں رکا تھا اور یہیں پیراگراف بھی ختم ہوا تھا جبکہ نیا پیراگراف ایک مختصر سی ہیڈ لائن دے کر شروع کیا گیا تھا۔ میں نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

''آج کا نیا واقعہ:

وہی پُراسرار واقعہ دو دنوں بعد آج بھی میرے ساتھ پیش آیا۔

یہ دوسری بار ہوا تھا، اسی لیے میں اب اسے کسی صورت بھی اپنا وہم نہیں قرار دے سکتی تھی۔

تفصیل:

اکثر رانو کو ہمارا ڈرائیور، خدا بخش سی آف کرتا تھا مگر کبھی کبھار میں بھی چھوڑ آتی تھی اور فرحانہ بھی تیار ہو جاتی، آج بھی ایسا ہی ہوا۔

ائرپورٹ سے واپسی پر فرحانہ نے اپنی ایک سہیلی کے ہاں اترنا تھا، میں نے اسے وہاں ڈراپ کیا اور کہہ بھی دیا کہ ڈرائیور اسے آ کر لے جائے گا، لہٰذا زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے۔

میں اکیلی گھر لوٹی۔ کچھ تھکن کا احساس ہوا ملازمہ چاندی، چھٹی پر تھی آج، میں خود ہی چائے بنانے کچن میں آ گئی۔

گھر پر ہر انسان کی اپنی رونق ہوتی ہے، رانو کے چلے جانے کے بعد مجھے یہ گھر بہت سونا سونا لگتا تھا، پھر بیٹی فرحانہ بھی نہیں تھی۔ اس پر سوا، چاندی نے بھی آج ہی کے دن اچانک چھٹی کر لی تھی۔ اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔

میرا ارادہ چائے بنانے کے بعد لاؤنج میں آ کر ٹی وی دیکھنے کا تھا۔ ابھی میں کچن میں ہی تھی کہ اچانک مجھے ہلکے کھٹکے کی آواز سنائی دی۔ پہلے تو میں نے اسے کوئی اہمیت نہ دی مگر پھر اس وقت تو میں دہل ہی گئی جب مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

باہر گیٹ پر متعین چوکیدار کو بھی بغیر اطلاع دیئے اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ آنے سے پہلے وہ انٹرکام پر بتاتا تھا یا دروازے پر دستک دیتا تھا جبکہ چاندی تو موجود ہی نہیں تھی۔

آواز بہت واضح تھی اور بالکل ایسا ہی لگا تھا کہ کوئی کچن کی طرف بڑھ رہا ہو۔

''کون؟'' میرے منہ سے بے اختیار یہ نکلا اور میں کچن سے باہر نکلی مگر کوئی دکھائی نہ دیا۔ میں پھر اسے اپنے وہم پر محمول کرنے لگی لیکن دل میں بے چینی سی گھر کر گئی تھی۔

چائے بنا کر میں جلدی سے لاؤنج میں آ گئی اور مگ سینٹرل ٹیبل پر رکھ کے میں نے انٹرکام پر باہر چوکیدار عجب گل سے رابطہ کیا، وہ وہیں موجود تھا اور پوچھنے پر بتایا کہ اس نے کسی کو اندر آتے جاتے نہیں دیکھا۔ اس کے جواب پر مجھے کچھ تسلی ہوئی اور میں صوفے پر آ کے، چائے کا مگ تھام کر ٹی وی دیکھنے میں محو ہو گئی۔ تب ہی اچانک مجھے ایسا لگا جیسے میرے پیچھے کوئی کھڑا ہو، میں نے پلٹ کر دیکھا اور بے

Downloaded From http://paksociety.com

اختیار میرے حلق سے ایک گہری سانس خارج ہوگئی۔ وہ صفدر تھا، میرا چھوٹا دیور اور گھر بھر کا لاڈلا۔

''یو۔اسکیئرڈ می۔'' میں نے بوکھلا کر کہا اور وہ ہنس پڑا۔

''سوئیٹ بھابی! دراصل جب میں آیا تو پورا بھائیں بھائیں کرتا گھر ہی مجھے ہنٹڈ ہاؤس محسوس ہوا تھا۔خیر!'' وہ یہ کہتا ہوا، صوفے کی پشت کے عقب سے ہی چھلانگتا ہوا، آن بیٹھا۔

میں نے اسے چائے کا پوچھا اور اس نے اثبات میں سر ہلایا، میں کچن میں چلی گئی، اس کے لیے چائے بنالائی۔

''ویسے تمہیں اتنے چھپ چھپاتے ہوئے آنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟'' میں نے پوچھ ہی لیا۔ ''کہ چوکیدار تک نے تمہیں نہیں دیکھا۔'' میں نے بات مکمل کی تو وہ قدرے چونک کر بولا۔

''چھپ چھپاتے تو نہیں آیا، گیٹ سے ہی آیا ہوں، یہ الگ بات تھی کہ گیٹ پر آج عجب گل کو میں نے کہیں اور ہی کھسکتے دیکھا تھا۔ پھر اندر چلا آیا۔''

''مگر دروازہ؟''

''وہ کھلا ہوا تھا۔''

''اچھا! لیکن۔خیر اور سناؤ۔گھر میں سب ٹھیک تو ہیں ناں؟ فرحت بھائی اور بھابی طاہرہ کیسی ہیں؟ دونوں چھوٹے شرارتی کاکے۔تمہارا حکم بجالا رہے ہیں کہ نہیں؟ اور اماں جی کی طبیعت کیسی ہے اب؟''

''ارے۔رے۔اتنے ڈھیر سارے سوالات، کچھ تو خدا کا خوف کریں بھابی!'' وہ مصنوعی انداز میں گھبرا کے بولا۔ ''چلیں، پھر ایک ہی جواب میں آپ کو سارے سوالات کے جواب دیے دیتا ہوں کہ گھر میں سب خیریت سے ہیں اور آپ کی خیریت بہ فضل خدا کے نیک مطلوب ہے۔''

یہ میرا شوخ سا پیارا سا دیور ہے، مزاجاً شریف مگر کھلنڈری طبیعت کا، عمر اس کی اٹھارہ سال ہے۔ خیر۔ تھوڑی دیر بعد بیٹھ کر وہ چلا گیا۔ پوچھنے پر اس نے یہی بتایا تھا کہ وہ یہاں قریب ہی طارق روڈ شاپنگ کرنے آیا تھا، سوچا ملتا جاؤں۔

وہ چلا گیا۔ مگر میں اب بھی مخمصے کا شکار رہی تھی، پھر ایک خیال کے تحت صوفے کے سیدھے ہاتھ پر دھری تپائی پر سے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور باہر چوکیدار عجب گل سے بات کی، اسے ڈانٹ بھی دیا تھوڑا سا کہ چلو یہ تو اپنا آدمی تھا، اس طرح اس کی ذرا سی بے پروائی سے کوئی غیر بھی گھسا چلا آسکتا ہے، وہ شرمندہ ہوا، میں نے ریسیور رکھ دیا۔

مجھے جانے کیوں ماحول میں عجیب سی خاموشی اور سناٹا طاری محسوس ہوتا تھا یا شاید یہ خالی گھر کی وجہ سے زیادہ محسوس ہوتا تھا۔ جی آپوں آپ گھبرانے سا لگا۔

میں نے اس کا حل یہ نکالا کہ ٹی وی کی آواز اونچی کردی۔

اسی وقت مجھے ایک زبردست کھٹکے کی آواز سنائی دی، میں ڈر گئی، یہ آواز اوپری منزل سے آئی تھی۔ ہمارے بیڈ رومز نیچے ہی تھے مگر ایک ماسٹر بیڈروم اوپر بھی تھا، جہاں رانو نے ایک چھوٹا سا دفتر بنا رکھا تھا، یعنی ان کی دفتری معاملات سے متعلق کچھ ضروری چیزیں اور ایک چیئر ٹیبل وہاں بھی موجود ہوتی تھیں۔ وہ اکثر کام کرتے کرتے وہیں سوجایا کرتے تھے۔ یہ ایک طرح سے ان کا اسٹڈی روم بھی تھا۔

میں نے سوچا، خالی گھر میں اس طرح کی آوازیں آتی ہی رہتی ہیں مگر ایک کھٹک دل میں آچکی تھی، سوچا، پہلے عجب گل کو اندر بلالوں، بعد میں ہی اوپر جاؤں مگر پھر مجھے یہ مناسب نہ لگا، ناچار میں اللہ کا نام لے کر زینے کی طرف بڑھی، احتیاطاً میں نے کچن سے ایک ڈنڈا اٹھالیا تھا۔

ایسے وقت میں انسان خوف زدہ تو ہو ہی جاتا ہے مگر ساتھ ہی ایک عجیب سی ہمت بھی اپنے اندر پانے لگتا ہے، اسی کے بل بوتے پر میں دبے پاؤں اوپر پہنچی اور ماسٹر بیڈ روم کی طرف بڑھی تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے ہلکی روشنی کی کرن نظر آرہی تھی ...... جس کا مطلب تھا، کوئی اندر موجود ہے، میرے پورے وجود میں خوف کی ایک لہر سی ابھری تھی، کیوں کہ رانو ہمیشہ اپنا یہ والا کمرا بند، بلکہ لاکڈ رکھتے تھے اور اس کی چابی بھی اپنے پاس ہی رکھتے تھے، البتہ احتیاطاً ایک ڈپلی کیٹ چابی انہوں نے مجھے بھی دے رکھی تھی کہ اگر ان کے پاس سے چابی کہیں کھو جائے تو وہ میرے پاس موجود چابی کو استعمال میں لاسکیں۔

اچانک ایک خیال میرے ذہن میں اور ابھرا تھا کہ کیا خبر رانو خود ہی یہ دروازہ اور لائٹ کھلی چھوڑ گئے ہوں؟

میں نے ڈنڈا مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں پکڑا اور دھیرے قدموں سے آگے بڑھنے لگی، یہاں تک کہ میں

Downloaded From http://paksociety.com

ادھ کھلے دروازے کے بالکل قریب پہنچ کر رک گئی اور اندر جھانکا تو کمرے کو خالی پایا۔ میں دھڑکتے دل سے اندر داخل ہوئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ کمرے کی ہر شے الٹ پلٹ پڑی ہوئی تھی، رانو کی چھوٹی سی آفس کیبنٹ اور ٹیبل کی درازیں کھلی پڑیں تھیں، اس طرح جیسے کسی نے جلدی جلدی اس کی تلاشی لی ہو۔ کاغذ، فائلیں اور دیگر اشیاء اِدھر اُدھر پھیلی ہوئی تھیں۔

اسی دوران مجھے فرش پر ایک چیز گری ہوئی نظر آئی، یہ ایک بڑی نفیس قسم کی خوب صورت ٹائی پن تھی جو مگر مچھ کے منہ کی "شیپ" میں تھی اس پر ننھے منے نگینے جڑے ہوئے تھے، مجھے نہیں یاد پڑتا تھا کہ میں نے ایسی کوئی ٹائی پن رانو کے پاس دیکھی تھی، کچھ سوچ کر میں نے وہ ٹائی پن اپنے پاس رکھ سنبھال لی کہ رانو جب لوٹیں گے تو انہیں یہ دکھا کر اس کے بارے میں پوچھوں گی، ایک خیال ذہن میں یہ بھی ابھرتا تھا کہ اگر تو واقعی کوئی اور شخص یہاں کمرے کی تلاشی لینے آیا تھا تو کہیں یہ اسی کا نہ ہو۔ کیوں کہ مجھے پورا یقین تھا کہ کوئی یہاں چوری چھپے آیا ضرور تھا، اس لیے کہ رانو کو اس طرح کی بے ترتیبی بالکل پسند نہیں تھی اور وہ ہر شے کو سلیقے اور ترتیب سے رکھنے کے عادی تھے، اس طرح الٹ پلٹ نہیں کرتے تھے۔ تب ہی اچانک میں نے کسی کے تیز قدموں سے زینے اترنے کی دھمک سنی اور باہر کو لپکی۔

میں نے دانستہ کمرے کی کسی شے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور دروازہ بھی اسی طرح کھلا چھوڑے رکھے تھا (جیسا کہ وہ پہلے تھا)۔

میں بھی زینے سے نیچے اتر آئی اور فوراً انٹر کام پر چوکیدار سے رابطہ کیا کہ وہ گیٹ پر محتاط رہے۔ وغیرہ۔

کافی دیر گزر گئی، کچھ نہیں ہوا، اس دوران فرحانہ بھی آ گئی۔ میں نے اسے یہ بات بتائی تو اس نے کوئی خاص توجہ نہ دی اور میری طرح وہ بھی یہی سمجھی تھی کہ پاپا ہی جلدی میں اپنا یہ کمرا کھلا چھوڑ گئے ہوں گے۔

یہ بھی اسی رات کا ذکر ہے، میں خود دروازے وغیرہ بند کر کے اور سیکیورٹی الارم آن کرنے کے بعد اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔

نیچے یہ نوٹ لکھا ہوا تھا۔

"ڈائری بھر گئی ہے، باقی اگلی ڈائری میں۔"

یہاں ڈائری ختم ہو گئی تھی۔ میں نے اسے بند کر کے دوبارہ زنیرہ کی طرف بڑھا دی اور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اس کے بعد کسی دوسری ڈائری کا ذکر کیا گیا ہے اس میں۔"

"دوسری ڈائری نہیں مل رہی ہے۔" اس کی بجائے رانا بشیر نے جواب دیا اور میری جانب تکنے لگا۔ میں نے صاف گوئی سے کہا۔

"بہ ظاہر تو مجھے اس ادھوری ڈائری میں کوئی ایسی خاص بات معلوم نہیں ہوتی، تاہم ایک سوال میں آپ سے ضرور کروں گا کہ کیا پھر آپ کی واپسی پر آپ کی بیگم نے یہ ساری باتیں آپ کو بتائی تھیں؟"

"مجھے دو روز بعد لوٹنا تھا مگر میں تیسرے دن لوٹا، تو یہ سانحہ ہو چکا تھا، یعنی ان کا مرڈر ہو چکا تھا۔" رانا بشیر نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ مغموم سا ہو گیا۔

"یہ ڈائری کب اور کیسے ملی؟" میں نے پوچھا۔

"ویسے مجھے ایک تکلیف دہ حیرت ہی ہوئی کہ یہ ڈائری میرے ابو کی پھانسی کے بعد ملی اور وہ بھی اتنے سال بیت جانے کے بعد؟ اگرچہ مجھے پھر بھی اس میں ابھی تک ایسی کوئی خاص بات محسوس نہیں ہو سکی ہے کہ جس سے کسی ایسی بات کا پتا چلتا ہو یہ قتل کیا کس نے ہے؟"

"یہی ایک اہم پوائنٹ ہے۔ جو میرے ذہن میں بھی آیا تھا۔" زنیرہ نے بے اختیار کہا، تو میں نے ایک بار پھر رانا بشیر کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا سوال دہرایا تو اس کی بجائے اس کی بیٹی فرحانہ نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ ڈائری مجھے ملی تھی، درحقیقت مما کے مرڈر کے بعد میرا اب جانے کیوں اس گھر میں جی نہیں لگتا، ہر وقت مما کی باتیں اور یادیں، ہمارا پیچھا کرتی محسوس ہوتی ہیں کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے وہ ابھی کسی کمرے سے اچانک نمودار ہوں گی اور ہمارے ساتھ کھلکھلا کر باتیں کرنے لگیں گی۔ پپا کے ایک دوست ہیں، وہ سائیکاٹرسٹ ہیں، انہوں نے ہی ہمیں ہر وقت مغموم اور آزردہ دیکھ کر یہ مشورہ دیا تھا اور اب بالآخر ہم نے بھی یہی فیصلہ کیا، بولی لگ چکی ہے ہم نے کلفٹن میں ایسا ہی دوسرا گھر دیکھ لیا ہے۔ اب شفٹنگ کی تیاری میں مصروف تھے کہ سامان... کی اکھاڑ پچھاڑ اور پیکنگ کے دوران مما کے ایک پرانے لباس کی جیب سے یہ ڈائری برآمد ہوئی۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مما ہر وقت اپنے ساتھ یہ ڈائری رکھتی تھیں اور جب جو جی چاہتا اس میں کچھ نہ کچھ لکھ ڈالتی تھیں اور ان کی اس عادت سے ہم بھی واقف!

Downloaded From http://paksociety.com

تھے۔''

یہ بتاتے ہوئے وہ بھی افسردہ اور رقت زدہ سی ہونے لگی تھی۔ مجھے اس کی بات میں کچھ وزن محسوس ہوا تھا۔ تاہم میں ابھی تک الجھا ہوا تھا، ابھی بھی مجھے کوئی واضح راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ آخر اس ادھوری ڈائری کو کیا معنی دوں؟ جو مجھے کسی سنسنی خیز کہانی کا پہلا باب محسوس ہوا تھا۔ ہاں البتہ دوسری ڈائری مل جاتی تو اسے پڑھ کر کوئی حتمی رائے قائم کی جاسکتی تھی محض اس ڈائری سے ابھی یہ ثابت ہی نہیں ہوتا تھا کہ اصل قاتل کون تھا؟ یا میرا باپ بے گناہ تھا، مجھے جس سنسنی خیز موڑ کی توقع ہورہی تھی کہ یہاں آکر رانا بشیر کوئی اہم انکشاف کرے گا، وہ پوری نہ ہوسکی تھی۔

''میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔'' میں نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے کہا تو، فرحانہ مجھ سے بولی۔''ارے نعمان صاحب! آپ نے تو کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔''

''جی شکریہ! ویسے آپ کوشش کیجیے گا کہ دوسری ڈائری بھی مل جائے تو اچھا ہوگا۔'' اور پھر ذہن میں ابھرے خیال کے تحت میں نے کہا۔

''جس ٹائی پن کا اس ڈائری میں ذکر کیا گیا ہے، کیا اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی تھی؟''

میرا خیال تھا کہ اب تک کسی نے اس اہم نقطے پر توجہ ہی نہیں دی تھی مگر فرحانہ کی بجائے رانا بشیر نے فوراً اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے مجھ سے انگلی کے اشارے سے کہا۔''ایک منٹ، وہ میں ابھی لاتا ہوں، اس ڈائری کا سب سے سنسنی خیز کلیو، میرا خیال ہے وہی ٹائی پن ہی ہے، آپ بیٹھیں، پلیز نعمان صاحب!''

میں دوبارہ صوفے پر براجمان ہوگیا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ فرحانہ کچھ عجیب عجیب نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ تھوڑی ہی دیر میں رانا بشیر نمودار ہوا اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی تھیلی نظر آرہی تھی جو اس نے مجھے تھمادی وہ لے کر میں نے اسے بغور دیکھا، پھر اندر دو انگلیوں کی مدد سے وہ ٹائی پن نکال لی۔ اس کا سائز صرف دو سے ڈھائی انچ تھا اور صرف مگرمچھ کا منہ تھا، یعنی اس کے لمبوترے جبڑے کو، جس میں ننھے منھے دانت جھانک رہے تھے اور وہی اس کی ''گرپ'' تھی۔

''ایک بات بتائیں آپ، کیا بزنس ٹور سے واپسی پر آپ نے اپنا کمرا چیک کیا تھا، جیسا کہ اس ڈائری میں ذکر کیا گیا تھا کہ وہاں کوئی آیا تھا؟'' میں نے کسی خیال کے تحت سوال کیا تو جواباً وہ اثبات میں اپنا سر ہلا کر بولا۔

''ہاں! مگر فوراً تو نہیں، کیوں کہ تب تک یہ سانحہ پیش آچکا تھا اور میں کئی روز تک تو خود بھی اس جانکاہ حادثے کے باعث اپنے ہی ہوش میں نہ رہا تھا۔ تاہم کئی دن گزر چکنے کے بعد جب معمولات زندگی ایک ڈگر پہ آنے لگے تو میں اوپر اپنی اسٹڈی روم میں گیا تھا اور جیسا کہ اس ڈائری کے مندراج میں کمرے کی ابتر حالی کا ذکر کیا گیا تھا مجھے وہ ویسا ہی ملا تھا۔ حیرت تو مجھے کمرے کی ایسی حالت دیکھ کر ہوئی تھی مگر میں کس سے پوچھتا؟ گھر کی مالکن تو رہی نہیں تھی اب وہی بتاسکتی تھی، تاہم مجھے اچنبھا ضرور ہوا تھا کہ آخر میرے اسٹڈی روم کی ایسی حالت کون بناسکتا ہے بھلا؟ دیکھنے میں یہی آرہا تھا کہ کسی کو اس کمرے سے کچھ ڈھونڈنا ہی مقصود تھا مگر کیا؟ اس کا مجھے اندازہ اس وقت تو نہیں ہوسکا تھا اگرچہ وہاں میرے ضروری کاغذات اور بینکنگ سے متعلق واؤچرز اور ڈرافٹس وغیرہ موجود ہوتے تھے مگر بعد میں جب میں نے کمرے کی بکھری ہوئی اشیاء کو سمیٹنا اور ترتیب دینا شروع کیا تو میرے ہاتھ یہ ٹائی پن لگی تھی۔'' وہ اتنا کہہ کر تھوڑا سانس لینے کو رکا۔

میری یہ غور سی نظریں اس کے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ توقف کے بعد بتانے لگا۔

''میں اس ٹائی پن کو دیکھ کر حیران سا ہوا تھا کیوں کہ کم از کم میرے پاس ایسی کوئی ٹائی پن نہیں تھی۔ میں نے اسے غیر ضروری سمجھ کر یونہی میز کی دراز میں رکھ دی تھی۔ اب جبکہ یہ ڈائری ملی تو اس میں اس کا ذکر سن کر میں نے اسے سنبھال لیا تھا۔''

ایکا ایکی اس گمبھیر معاملے کی سنسنی خیزی، کچھ کچھ واضح ہونے لگی تھی۔ میں نے اس ٹائی پن کو اپنی انگلیوں کی مدد سے سب کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے ایک عجیب سے جوش تلے کہا۔

''کیا اب بھی آپ لوگوں کو یہ بات بتانے کی ضرورت ہے کہ یہ ٹائی پن ضرور اسی پُراسرار شخص کی ہی ہو سکتی ہے، جو اس روز چوری چھپے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ گویا وہ سوٹ بوٹ میں آیا ہوگا وہاں۔''

اس دوران میری اور رانا بشیر کی دیکھا دیکھی، زنیرہ اور فرحانہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

Downloaded From http://paksociety.com

''ایگزیکٹلی! میرا بھی یہی خیال ہے۔'' زنیرہ نے فوراً کہا۔

''یہی وہ اہم کلیو ہے جو ہمیں اصل مجرم تک پہنچا سکتا ہے۔''

رانا بشیر اور اس کی بیٹی دھیرے دھیرے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دینے لگے مگر میرے حلق میں جو بات اٹکی ہوئی تھی وہ میں صرف زنیرہ سے ہی کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ میں نے رانا بشیر کو بھی اس کا تھوڑا بہت اشارہ دیا تھا۔ اب سوال سے سوال بنتے چلے گئے اور برخاست ہونے والی یہ نشست تھوڑی طویل ہونے لگی۔ میں نے رانا بشیر کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

''کیا آپ کے علم میں، ایسا کوئی شخص ہو، جسے آپ نے ایسی ٹائی پن استعمال کرتے ہوئے دیکھا ہو؟''

''میں سب سے پہلے اسی پر مغز ماری کر چکا ہوں مگر میرے بزنس پارٹنر اور دیگر ساتھیوں، حتیٰ کہ میرے دفتری ایمپلائیز سے لے کر قریبی رشتے داروں تک، کسی کو کبھی بھی میں نے ایسی ٹائی پن لگاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔''

''اب ایک آخری سوال کر کے میں یہاں سے جانا چاہوں گا۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں گفتگو کو لپیٹنے کی غرض سے کہا اور رانا بشیر اور فرحانہ میری طرف یک ٹک، مستفسرانہ سی نگاہوں سے تکنے لگے۔

''رانا صاحب! پھر آپ کے اس یقین کی بنیادی وجہ کیا ہے کہ آپ کی بیگم کا قاتل کوئی اور تھا؟''

''یہ ڈائری اور یہ ٹائی پن۔'' وہ بولا۔

''مگر میرا نہیں خیال کہ اس سے کچھ ایسا ثابت ہوتا ہو کہ قاتل یہی پُراسرار آدمی ہو سکتا ہے، جس کی موجودگی کو اس روز آپ کی مرحومہ بیگم نے گھر میں محسوس کیا تھا۔'' میں نے کسی خیال کے تحت محتاط لہجے میں کہا۔

''قاتل کوئی اور بھی ہو سکتا ہے جبکہ جس شخص کی موجودگی کو آپ کی بیگم رفعت خانم نے محسوس کیا تھا، اسے آپ کی اسٹڈی روم سے کسی اور شے کی تلاش ہو؟''

''ہاں! یہ ایک اہم پوائنٹ ہے۔'' زنیرہ نے میرے خیال کی تائید کی اور میرے اشارے کو سمجھتے ہوئے رانا بشیر کی طرف دیکھ کر آگے بولی۔ ''آپ ذرا اپنے ذہن کو ری فریش کرتے ہوئے یہ سوچنے کی کوشش کریں کہ آخر آپ کے پاس ان دنوں ایسی کون سی اہم شے تھی جو کسی کے لیے فائدے مند ثابت ہو سکتی تھی؟ نیز یہ بھی کہ ایسا کون ہو سکتا تھا جسے آپ کی بیگم کو قتل کرنے سے کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا تھا؟''

رانا بشیر سے میرا اگلا سوال یہی تھا۔ جو زنیرہ نے اس سے پوچھ لیا تھا۔

وہ بولا۔ ''ہاں! مجھے اس پر واقعی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ میں آرام سے اور پوری ذہنی یکسوئی کے ساتھ، ان دونوں باتوں کے پس پردہ سوچنے کی کوشش کروں گا۔''

اس کے بعد میں اور زنیرہ ایک ساتھ ہی وہاں سے رخصت ہوئے تھے۔

اس وقت تو میں نے زنیرہ سے وہ بات نہیں کہی، جو میں صرف اسی سے ہی کرنا چاہتا تھا، البتہ میں بعد میں اس سے اس بات پر تبادلہ خیال کرنے کا ارادہ ضرور رکھتا تھا۔

رات بھی زیادہ ہونے لگی تھی۔ وہ اپنی کار میں جا چکی تھی اور میں نے اپنی بائیک سنبھال لی تھی۔

رات کافی ہو چکی تھی، میں نے بائیک میں سوار ہوتے وقت اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا تھا۔ بارہ سے کچھ اوپر کا وقت ہو چلا تھا۔ یقیناً عاصمہ اور فہیم میرے لیے فکرمند ہو رہے ہوں گے، میں نے انہیں فون کر کے اپنی جلد متوقع آمد کے بارے میں بتایا اور بائیک کو کک مار کے اسٹارٹ کر دی۔

گیٹ سے نکلا اور مین روڈ پر آ گیا۔ کراچی جیسے گنجان آباد شہر میں اگرچہ رات بارہ کا وقت کوئی ایسا زیادہ وقت تو نہ تھا مگر آج کل اس شہر نگاراں کے حالات کچھ ٹھیک نہ تھے۔

اسنیچنگ سے لے کر اغوا اور لوٹ مار، بعدۂ قتل کی وارداتیں عام سی بات ہونے لگی تھیں۔

سڑک پر بھی برائے نام ٹریفک تھا، میں اپنی بائیک اڑائے جا رہا تھا۔

آگے ایک اوور ہیڈ برج تھا، سیدھے ہاتھ پر ایک سڑک نکل کر قوس کی شکل میں گھوم کر اوپر اس اوور ہیڈ برج کی روڈ سے جا ملتی تھی، میں نے اسی سڑک پر مڑنے کے لیے ذرا گردن گھما کے پیچھے دیکھا کہ کوئی اور گاڑی تو نہیں آ رہی تو مجھے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں، وہ ابھی دور تھی میں نے اپنی بائیک سیدھے ہاتھ کی سڑک پر موڑ لی اور قوس کی شکل میں گھومتی اس سڑک پر بائیک دوڑانے لگا، رفتار ہلکی

Downloaded From http://paksociety.com

تھی یہی وہ وقت تھا جب عقب سے آتی ہوئی اسی کار نے یک دم رفتار پکڑ لی تھی یہاں تک کہ اس کے انجن کے زور سے غرانے کی آواز بھی مجھے صاف سنائی دی تھی۔

میں نے اپنی بائیک کنارے پر ہی رکھی ہوئی تھی جو ''سلسلے وار'' موڑ کاٹ رہی تھی کہ اچانک اسی کار نے میری بائیک کو ٹکر مار دی۔ بائیک لہرائی اور قوسی سڑک کی منڈیر سے ٹکرا گئی۔ میں نے سنبھالنے کی پوری کوشش کی مگر بائیک بے قابو ہو کر گر پڑی۔ میں بھی گرا تھا اور سڑک پر آ رہا، اسی دوران مجھے ٹکر مارنے والی کار کے ٹائروں کی زوردار چرچرانے کی آواز سنائی دی اور جب میں سڑک پر گرا تھا تو کار کے اگلے دونوں ٹائر میری گردن کو چھو رہے تھے اور بونٹ تقریباً میرے سر کے اوپر تھا۔

مجھے ٹھیک ٹھاک خراشیں آئی تھیں اور کسی ہڈی میں بھی چوٹ لگی تھی، میں ابھی سنبھل کر اٹھنے کی کوشش میں ہی تھا کہ کار کے دروازے کھلنے کی آواز ابھری اور ساتھ ہی بھاری بوٹوں کی دھمک بھی۔

میں اتنا سخت جان واقع نہیں ہوا تھا اور چوٹوں کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ وہ دو افراد تھے، خاصے لحیم شحیم، جو جھک کر مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھا رہے تھے، میں یہی سمجھا تھا کہ شاید یہ مجھے سنبھال رہے ہیں مگر جلد ہی مجھے ان کی ''گرفت'' سے اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا چاہتے تھے؟

بڑی بے دردی سے انہوں نے مجھے دبوچا ہوا تھا اور کار کے عقبی کھلے دروازے سے مجھے اندر ڈالنے کو کوشاں تھے۔

''اغوا!'' دفعتاً ہی میرے ذہن میں یہ لفظ ابھرا تھا اور ساتھ ہی یکبارگی زور سے میرا دل بھی دھڑکا۔ ٹھیک اسی وقت ایک عجیب سا جھنجھناتا ہوا شور مجھے سنائی دیا، یہ ایک سے زائد موٹر سائیکلوں کی بے سائیلنسرز آوازیں تھیں، جو سامنے سے اچانک ہی نمودار ہوئی تھیں اور ان کی روشنی ٹھیک میرے چہرے پر پڑی اور گویا نہلا گئی۔ تب پھر میری آنکھیں چندھیانے کے دوران ہی، مجھے ایک پُرجوش سی شناسا آواز سنائی دی۔

''ابے لے۔ یہ تو اپنے ہی جگری کو اغوا کیا جا رہا ہے۔'' یہ شیراز عرف کالیا کی آواز تھی۔

مجھے اغوا کی نیت سے کار کی پچھلی سیٹ میں ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہوئے، دونوں اغوا کاروں کو کالیا کی اس ہائے، نعرہ مستانہ نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا جبکہ تب تک میں اس کار اور ان دونوں اغوا کاروں کو بھی پہچان چکا تھا، یہ اسی لینڈ مافیا کی کار اور آدمی تھے جبکہ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص میرے لیے اجنبی ہی تھا اور اس کے برابر والی سیٹ خالی تھی۔

اچانک ایک اغوا کار نے پستول نکال لیا اور میرا بازو چھوڑ کر سیدھا ہوا ہی تھا کہ اچانک میں نے فضاء میں ''شپ شپاک'' کی عجیب سی ایک مرحلہ وار آواز سنی اور دوسرے ہی لمحے میں نے اس اغوا کار کے حلق سے ایک کریہہ انگیز چیخ سنی وہ پیچھے کو الٹ گیا۔

دوسرے نے مجھے چھوڑا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا مگر پستول نکالنے سے پہلے ہی کوئی شکرے کی طرح اس پر جھپٹا اور ساتھ دو نوجوان سے لڑکوں نے مجھے سنبھال کر تھام لیا۔

میں نے دیکھا، سامنے تین موٹر بائیکس سائیڈ اسٹینڈ سے لگی کھڑی تھیں اور اسٹارٹ تھیں، نوجوان پانچ تھے۔ دو نے مجھے تھاما ہوا تھا ایک ڈرائیور والی کھڑکی کی طرف الجھا ہوا تھا، چوتھا پہلے والے اغوا کار کے ساتھ مارا ماری میں مصروف تھا جبکہ پانچواں کالیا تھا جو دوسرے اغوا کار کو ادھ موا کیے ڈال رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ''نن چکو'' (nunchaku) تھا۔

تینوں کا بھرکس نکال چکنے کے بعد، انہوں نے وہاں سے فرار چاہی اور مجھے کالیا نے اپنے ساتھ بائیک پر بٹھا لیا جبکہ میری بائیک اس کے ایک ساتھی نے سنبھال لی۔

''تم ٹھیک ہوناں دوست؟''

''ٹھیک ہوں میں۔'' میں نے ہولے سے جواب دیا تھا۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھ گئے۔

''کون تھے یہ لوگ؟ اور تمہیں کیوں اغوا کرنا چاہتے تھے؟'' بائیک کو ریس دینے کے دوران اس نے مجھ سے پوچھا۔ تو میں نے مختصر جواب دیا۔

''دشمن تھے میرے۔''

''ابے لے۔ جگری! تیرے جیسے شریف آدمی کے بھی دشمن ہو سکتے ہیں؟'' وہ ہنسا۔

''شریفوں کے ہی تو لوگ زیادہ دشمن ہوتے ہیں دوست!''

''بات تو تیری بھی ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ پھر پوچھا۔ ''تجھے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟''

''نہیں، بس! اب تم مجھے ادھر ہی اتار دو۔ تمہارا/

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایڈ فری لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety
پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1
پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

شکریہ، مجھے گھر جانا ہے، بھائی اور بہن پریشان ہورہے ہوں گے۔''

''ارادہ تو میرا تمہیں اپنے اڈے پر لے جانے کا تھا، پر خیر۔ گھر کا پتا بتادو ہم چھوڑ دیتے ہیں۔'' وہ بولا۔ میں نے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں، چلا جاؤں گا خود اپنی بائیک پر تمہارا شکریہ۔ مجھے یہیں اتار دو یار!''

اس نے اپنی بائیک روک دی۔ اس کے ساتھی بھی رک گئے۔ سڑک سنسان تھی، کوئی اکا دکا گاڑی ''زناٹے'' سے گزرتی تو ایک لمحے کے لیے سناٹے کی چادر پھڑ پھڑا جاتی۔

اس کے ساتھی نے بائیک میرے حوالے کی اور قریب کھڑے کالیا سے نیچی آواز میں کہا۔ ''استاد! یہ آدمی تو شریف لگتا ہے، تیری اس سے کیسے دوستی ہوگئی؟''

''ابے چپ۔ بائیک اسٹارٹ کر کے دے اسے، اسٹارٹ ہوتی بھی ہے یا نہیں۔''

کالیا نے اسے گھر کا۔ اس نے دو تین بار میری بائیک کو کک ماری اور وہ اسٹارٹ ہوگئی۔ میں نے ایک بار پھر ان کا شکریہ ادا کیا اور اپنی بائیک میں روانہ ہوگیا۔ میں نے کار کا نمبر نوٹ کرلیا تھا۔ معاملہ پولیس کو دیا جاسکتا تھا مگر کالیا نے مجھے آنکھ ماری تھی، میں اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ وہ لوگ بھی اسی قبیل کے تھے، اسی لیے کترا گئے تھے۔ میں نے بھی یہی مناسب سمجھا، البتہ کار کا نمبر میں نے نوٹ کرلیا۔

گھر پہنچا تو بہنا عاصمہ اور بھائی فہیم کو متفکر پایا، وہ دونوں میرے ہی انتظار میں جاگ رہے تھے، پھر میرے چہرے اور جسم پر خراشیں دیکھیں تو متوحش سے ہوگئے، میں انہیں اصل بات بتا کر بلاوجہ پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہی بتایا کہ بائیک سلپ ہوگئی تھی۔

عاصمہ نے ڈیٹول وغیرہ سے میرے زخموں کو صاف کرکے مرہم پٹی کردی اور گرم گرم دودھ میں ہلدی ملا کر پینے کو دی۔

''بھائی جان! بائیک خطرناک سواری ہے، ذرا احتیاط سے ہی چلایا کریں اور ہاں، کل صبح ضرور ٹٹنس کا ٹیکہ لگوا لیجیے گا۔'' فہیم نے کہا تو میں مسکرا کر اس سے بولا۔

''اچھا ڈاکٹر صاحب! ضرور لگوالوں گا اور حکم؟'' میری بات پر وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا اور بولا۔

''بھائی جان! اپنا خیال رکھا کیجیے۔ اب ہمارا آپ کے سوا اور کوئی نہیں ہے اس دنیا میں۔ آپ ہی ہمارے لیے سب کچھ ہیں۔''

عاصمہ بھی میرے سرہانے آبیٹھی اور ہولے ہولے محبت سے میرے بالوں کو سہلانے لگی۔ میں نے ان دونوں کے سروں پہ ہاتھ رکھ کر ہولے سے تھپتھپادیا اور بولا۔ ''جس بھائی کے تم دونوں جیسے محبت کرنے اور دعائیں دینے والے بھائی بہن ہوں، بھلا اسے کیا ہوسکتا ہے؟''

اگلے دن صبح فہیم نے میرے ساتھ جا کر کسی قریبی کلینک سے ٹیٹنس کا ٹیکہ لگوادیا اور ڈیوٹی پر چلا گیا۔ آج اس کا اوورٹائم ڈیوٹی ڈے تھا۔ میں نے بھی اڈے کی راہ لی۔

آج اتوار تھا مگر مجھے جانا پڑ گیا تھا، تھوڑا بہت ضروری کام نمٹانا تھا اور جلدی لوٹنا تھا۔ کیوں کہ آج دوپہر کے کھانے پر میرا دوست سائیں داد آنے والا تھا، میں نے اس سے بہت سی اہم باتیں پوچھنا اور کرنا تھیں۔ پھر رات والے واقعے کے علاوہ، چاچا انور شاہ کو بھی آگاہی دینا مقصود تھی اور تبادلہ خیال بھی۔

وہاں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ میری حکمت عملی سے سب خوش اور مطمئن تھے اور بڑے منشی دادن خان سے زیادہ مجھ پر اعتماد کرنے لگے تھے اور اسی بات پر وہ مجھ سے چڑنے لگا تھا۔ میں نے اس کی کل والی بات بھی تو ماننے سے انکار کردیا تھا مگر مجھے اب پورا یقین ہو چلا تھا کہ اڈے کی غیر منصفانہ اور جانبدارانہ منتقلی کو قابل مذموم کوششوں میں، جہاں اور لوگ ملوث تھے وہاں درپردہ دادن خان بھی شامل تھا۔

کل کی ساری روئیداد میں نے چاچا انور شاہ سے گوش گزار کردی۔ وہ میری طرف سے تشویش اور پریشانی میں مبتلا ہوگئے۔

میں نے کہا۔ ''چاچا! اب اس میں، شک کی ذرا بھی گنجائش نہیں رہی کہ اپنا یہ بڑا منشی بھی لینڈ مافیا سے ملا ہوا ہے کیوں کہ اس نے کل پھر میرا ذہن بدلنے اور مجھے اس روش پر چلنے سے روکنے کی کوشش کی تھی مگر میرے انکار کے بعد اس نے فوراً ملیر کے گوٹھ کا رخ کیا تھا اور وہاں کے ایک زمیندار حاجی مہران خان سے بھی ملا تھا۔''

''حاجی مہران خان!'' اس نام پر چاچا انور شاہ چونکا تھا۔ پھر جیسے اندر ہی اندر کچھ اخذ کرتے ہوئے پُرسوچ انداز میں خود کلامیہ بولا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''اس کا مطلب ہے، یہ مہران خان کی شرارت ہے۔''

''لیکن چاچا! اس میں وہ لینڈ مافیا کا سرغنہ کہاں فٹ ہوگا؟ جس نے اس روز مجھے دھمکی دی تھی اور کل اس کے آدمیوں نے مجھے اغوا کرنے کی بھی کوشش کی تھی؟''

تب پھر پل کے پل میرے پُرسوچ ذہن میں ایک خیال اچانک ہی کلک ہوا اور گویا اپنے ہی سوال کا جواب دیتے ہوئے دوبارہ بولا۔ ''ضرور پھر اس لینڈ مافیا کی پشت پر اسی زمیندار حاجی مہران خان کا ہاتھ ہوگا۔''

''تیرا خیال غلط نہیں ہے نومی بیٹا! کیوں کہ ان لینڈ مافیاز کا طریقہ کار ہی یہی ہوتا ہے، یہ لوگ کسی سرکاری و غیر سرکاری زمینوں پر قبضے اور چائنا کٹنگ میں ان کے ساتھ کسی سربرآوردہ سیاسی شخصیت کی ''مدد'' اور پشت پناہی کو ضرور شامل رکھتے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے چاچا کہ میں اپنے ہدف تک پہنچنے والا ہوں!'' میں نے ایک خفتہ جوشِ مسرت سے کہا۔ ''ایک بار میں اس لینڈ مافیا کے چیف اور حاجی مہران خان کو بے نقاب کرلوں تو سمجھو یہ معاملہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا۔''

''بالکل اور انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' چاچا انور شاہ بولا۔ ''لیکن بیٹا! اس سلسلے میں تمہیں بے حد محتاط رہنے کی بھی ضرورت ہوگی۔ یہ کوئی ایک دو لوگ نہیں ہوتے بلکہ ان کا پورا گینگ ہوتا ہے انہیں سب سے زیادہ اپنا ذاتی مفاد عزیز ہوتا ہے، جس کے حصول کے لیے یہ لوگ انسانی جانوں سے بھی کھیل جانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔''

''ہاں چاچا! یہ ساری باتیں میرے ذہن میں ہیں مگر میں نے ان لوگوں کو قانون کی گرفت میں لینے کا پورا بندوبست کررکھا ہے۔'' میں نے پُرعزم ہو کے کہا۔

''آج کا دور میڈیا کا دور ہے اور ایک بار جس کا کچا چٹھا ان کی لپیٹ میں آجائے تو۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی حکومت وقت کو ان کے خلاف قانونی کارروائی لانی ہی پڑتی ہے پھر یہ لوگ نہیں بچ سکتے۔''

''اللہ تمہاری زبان مبارک رکھے بیٹا! لیکن اب اس میں کوئی شک نہیں رہا ہے کہ تم ان خطرناک لوگوں کی زد میں آچکے ہو جو تمہارے گھر اور گھریلوں حالات سے بھی بہ خوبی واقف ہیں۔''

''مجھے بھی اس خطرے کا احساس ہے چاچا!'' میں نے کہا۔ ''اسی لیے میں جلد سے جلد ان کے گرد گھیرا تنگ کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

میری بات پر انور شاہ نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولا۔

''یہ رانا بشیر کا آخر کیا معاملہ ہوا؟ مجھے تو یہ ڈائری والا معاملہ ہی کچھ اور لگتا ہے؟ جیسا کہ تم نے بتایا تھا۔''

''ابتداء میں میرے حلق سے بھی یہ بات نہیں اتری تھی چاچا!'' میں نے ایک گہری اور پُرسوچ ہنکاری خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن پھر اس کے مندرجات اور اس کا اتنے عرصے بعد ملنے کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔ کیوں کہ وہ اب اپنی طارق روڈ والی کوٹھی فروخت کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ سامان وغیرہ کی اٹھاک پٹاخ میں یہ ڈائری ان کے ہاتھ لگی ہو۔''

''کیا بتا رہے تھے تم؟ میں بھول گیا، وہ ڈائری باپ بیٹی میں، سب سے پہلے کس کے ہاتھ لگی تھی؟''

''رانا بشیر کی بیٹی، فرحانہ کو ملی تھی وہ ڈائری......'' میں نے بتایا۔

''ہوں۔'' چاچا انور شاہ کے حلق سے ایک ہنکارہ برآمد ہوا تھا۔

انہوں نے مجھ سے ان اغوا کاروں کی گاڑی کا نمبر لے لیا اور کہا کہ وہ شام تک اس گاڑی کے ''اونر'' کا پتا معلوم کرکے بتائیں گے۔ میں نے نمبر انہیں لکھوا دیا۔ ازیں علاوہ ہم نے متعلقہ تھانے جاکر اس کار کے نمبر پر ان نامعلوم اغوا کاروں کے خلاف ایف آئی آر بھی کٹوا دی۔

میں نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا، ایک بجنے والا تھا۔ گھر سے نکلتے وقت میں عاصمہ کو بتا چکا تھا کہ آج ذرا اچھا سا کھانا تیار کرلے، میرا ایک دوست آنے والا ہے۔ لہٰذا میں نے چاچا انور شاہ سے آج جلد گھر جانے کی اجازت مانگ لی جو انہوں نے بہ خوشی دے دی۔ میں لاری اڈے سے نکلنے کی تیاری کرنے لگا۔ کچھ رسید بکس تھیں، جو میں جاتے وقت چاچا انور شاہ کے سپرد کردیا کرتا تھا۔

اسی وقت میرے سیل فون کی بیل گنگنائی، نمبر دیکھا تو اجنبی تھا، آج کل میں ایسے حالات سے گزر رہا تھا کہ ہر اجنبی کال پر میرا دل انجانے خدشے تلے یکبارگی زور سے دھڑک اٹھتا تھا کہ نجانے کس کی دھمکی مل جائے۔

بہرطور۔ میں نے فون کان سے لگایا اور ہیلو کہا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''جی۔ السلام علیکم۔ آپ۔ نعمان صاحب؟''
دوسری جانب سے شناسائی کا شائبہ دیتی ہوئی ایک نسوانی اور نہایت شائستہ سی آواز ابھری۔
''جی۔ وعلیکم اسلام۔ معافی چاہوں گا، میں شاید آپ کو پہچان نہیں پار ہا ہوں۔''
''آپ کا قصور بھی نہیں اس میں، اس لیے کہ ہماری کچھ زیادہ بات چیت نہیں ہو سکی اور نہ ہی سامنا ہوا اور فون پر تو ویسے بھی کافی حد تک آواز بدلی بدلی بھی محسوس ہوتی ہے جب تک کہ پوری طرح سے آشنائی نہ ہو پائے۔''
اس کی اس لمبی ''تفسیر'' پر میں چونکا اور بے اختیار میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔
وہی تھی۔ بالکل وہی تھی۔ صاعقہ بار۔ جھلک والی اپسرا۔ مگر۔ میں اسے پہلے کیوں نہیں پہچانا؟ شاید پھر اس کی یہ تاویل درست تھی۔ میں نے فوراً کہا۔
''او۔ سوری۔ ٹرولی سوری۔ میں واقعی آپ کو نہیں پہچان پایا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ آپ کی یہ کال میرے لیے بالکل غیر متوقع تھی اور پھر میرا نمبر بھی آپ کے پاس نہیں تھا۔''
''بابا جان کے پاس تو تھا نا۔ انہی کے سیل فون سے میں نے لیا تھا۔ کیسے ہیں آپ؟ میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟'' فوزیہ کی نرم اور ملائمت آمیز سی آواز ابھری۔
اسی دوران ایک اور ہلکی بپ کی آواز مجھے اپنے فون پر سنائی دی۔ شاید کوئی اور کال بھی آرہی تھی۔ مگر میں نے اسے صرف نظر کیے رکھا اور فوزیہ کے ساتھ بات جاری رہنے دی۔ بولا۔
''نن۔ نہیں۔ بالکل بھی نہیں، میں اس وقت یوں بھی ذرا جلدی آف کر کے گھر ہی جا رہا تھا۔ ویسے آپ نے بالکل صحیح کہا فوزیہ صاحبہ! کہ فون پر پہلی بار کوئی شناسا بھی بولے تو اس کی آواز دیر سے ہی پہچانی جاتی ہے۔ ویسے سچی بات ہے کہ میرے دل میں ہلکا سا شائبہ آپ کی طرف سے ابھرا تھا۔ مگر اس کا اظہار نہ کر سکا۔'' میں رکا۔ پھر بولا۔ ''خیریت! آپ نے کیسے فون کیا؟''
''بس یوں ہی آپ سے کچھ باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا مگر آپ گھر جا رہے تھے۔'' وہ بولی تو میں نے بے یک ترنت کہا۔
''نن۔ نہیں۔ ایسی بھی کوئی جلدی نہیں، گھر ہی تو جا رہا تھا، تھوڑا دیر سے ہی سہی، آپ بات کریں۔ کوئی خاص بات؟ میرا مطلب ہے عطا صاحب تو ٹھیک ہیں ناں؟''
''جی ہاں! بابا جان بالکل ٹھیک ہیں اور بہت خوش بھی، آپ نے ان کی ایک بہت بڑی پریشانی جو دور کر دی ہے۔'' اس کی کھنکتی آواز کی سنجیدگی میں بھی ایک محبت کا سا تاثر، کسی شفاف جھیل کے کنارے کھلتے کنول کی طرح تیرتا محسوس ہوتا تھا۔
''شکریہ، کہ آپ ایسا سمجھتی ہیں مجھے ورنہ تو دیکھا جائے اس میں میرا بھی تو مفاد تھا۔ آخر کو میرا روزگار بھی تو اسی مسئلے سے وابستہ تھا۔''
''اب آپ کسر نفسی سے کام نہ لیں، یہ آپ کی قابلیت اور بابا جان سے وفاداری کا ثبوت ہے، ورنہ تو اتنے سارے اور لوگ بھی تو تھے، وہ یہ کارنامہ کیوں نہیں انجام دے سکے تھے؟'' وہ بولی۔ ''اینی وے۔'' اگر آپ سے میں ایک بات پوچھوں تو کیا آپ اس کا مجھے صحیح جواب دیں گے؟''
''کیا آپ کو اس کی توقع ہے کہ میں آپ سے جھوٹ بولوں گا؟'' میں نے الٹا اسی پر سوال داغ دیا۔
''نہیں'' وہ فوراً بولی تھی۔
''تو بس بے فکر ہو کر پوچھیے، کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ؟''
دوسری جانب خاموشی چھائی رہی یوں لگا جیسے فوزیہ کسی تذبذب کا شکار ہو۔ مزید چند ثانیے اسی طرح بیت گئے تو میں نے ''ہیلو'' کہہ کر گویا اسے بولنے پر اکسایا تو وہ اس بار جلدی سے بولی۔
''اوکے تھینکس! میں پھر آپ سے بات کروں گی۔ خدا حافظ!'' کہہ کر اس نے خود ہی رابطہ منقطع کر دیا۔
میں الجھ سا گیا۔ سوچنے لگا۔ اس نے وہ سوال کیوں نہیں پوچھا؟ کیا ایسا ہی پرسنل سوال تھا یا پھر کوئی اس کے کمرے میں آ گیا تھا اور وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ بیٹھی؟
تاہم فوزیہ نے مجھے ایک عجیب سی الجھن میں ڈال دیا تھا اور میں یہی سوچتا رہ گیا کہ نجانے وہ مجھ سے ایسی کون سی بات کہنا چاہتی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس نے اسی بات کے لیے ہی مجھے فون کیا تھا۔
بہر طور۔ میں نے اس کا نمبر اسی کے نام سے اسی وقت سیو کر لیا اور اسکرین پر دیکھا تو سائیں داد کی مس کال آئی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً اس سے رابطہ کیا اور معذرت بھی چاہی کہ میں اس کا فون اٹینڈ نہ کر سکا۔

Downloaded From http://paksociety.com

"کوئی بات نہیں دوست! میں سمجھ گیا تھا۔" وہ دوستانہ لہجے میں بولا۔ "دراصل میں تمہاری طرف ہی نکل رہا تھا، سوچا پہلے فون کرلوں، جانے تم کہاں ہو؟"

"اچھا کیا، میں ابھی گھر ہی جارہا تھا، بس تم بھی پہنچ جاؤ۔ پھر آرام سے باتیں کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ اس نے اثبات میں جواب دیا اور پھر میں نے رابطہ منقطع کرلیا۔ بائیک پر سوار ہوا اور گھر کی راہ لی۔

گھر پہنچا تو بہنا عاصمہ نے کھانا تیار کررکھا تھا۔ اس نے چکن کڑھائی اور بیف بریانی بنائی تھی۔ میٹھا بھی بنایا تھا۔ میں نے اس سے شرارتاً کہا۔ "میری پیاری بہنا! میرے بے چارے سے دوست کو کوس تو رہی ہوگی، جس نے تمہیں اتنی محنت میں جھونک دیا۔"

"نہیں بھائی جان! مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں اور مہمان کے آنے سے پہلے اللہ میزبان کے گھر کا رزق کشادہ کرچکے ہوتے ہیں۔"

"سبحان اللہ! میری بہن! بہت اچھی بات کہی تم نے، ویسے میں تو تمہیں یونہی چھیڑ رہا تھا۔"

"مجھے پتا ہے بھائی جان!" وہ مسکرائی۔ "ویسے لگتا ہے کوئی خاص دوست ہے یہ آپ کا۔"

"ہاں، بہنا! میرے کالج کے زمانے کا دوست ہے اور بہت اچھا نیک اور شریف انسان ہے۔ مجھے بھی ایک بار اپنے ہاں لے گیا تھا۔ بہت مہمان نواز ہے، میری بڑی خاطر مدارت کی تھی اس نے۔" میں نے کہا۔

تھوڑی دیر گزری، سائیں داد آگیا۔ میں نے اس کا پُرتپاک استقبال کیا اور اندر بیٹھک میں لے آیا۔

ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر کھانے کا دور چلا۔ کافی دیر تک ہم کالج کے دور کی باتیں کرتے رہے، اس کے بعد جو اہم بات میں اس سے کرنا چاہتا تھا وہ اس نے خود ہی چھیڑ دی۔

"یار! تم اس روز اچانک میرے گوٹھ آئے تھے، تمہارے جانے کے بعد مجھے کچھ ایسا لگا تھا کہ تم کسی خاص وجہ سے ہی آئے تھے۔ کیا واقعی میرا خیال ٹھیک ہے یا محض وہم؟"

میں مسکرایا، پھر بولا۔ "تم نے کیسے اندازہ لگالیا؟"

"بس! مجھے کچھ ایسا ہی لگا تھا، ویسے اس کی وجہ یہی تھی کہ میں نے تمہیں، حاجی مہران خان کے ایک آدمی کے ساتھ آتے جو دیکھا تھا، پھر اس کے بعد تمہارا بار بار حاجی مہران خان کے بارے میں پوچھنا۔ یہی وہ وجوہات تھیں، جس سے میں نے یہ اندازہ۔"

"تمہاری بات ٹھیک ہے دوست!" میں نے فوراً اس کی بات کاٹتے ہوئے بالآخر سنجیدگی سے اس کا اعتراف کیا۔

"درحقیقت میں اس روز ایک شخص کے تعاقب میں ہی تمہارے گوٹھ پہنچا تھا مگر وہاں میں اس کے دو آدمیوں کی نظروں میں آگیا تھا۔ تو میں نے تمہارا بہانہ کرکے اپنی جان چھڑائی تو تھی لیکن وہ بھی ایک کائیاں تھا، میری بات کی تصدیق کی خاطر وہ میری بائیک پر ہمت شاہ کی چکی پر پہنچا تھا، جدھر اتفاق سے تم بھی موجود تھے۔"

میری بات سن کر وہ بھی کچھ سنجیدہ سا نظر آنے لگا۔ پھر بولا۔ "نعمان! تم میرے اچھے دوست ہو، اسی لیے میں تمہیں بھی دوستانہ مشورہ دوں گا کہ حاجی مہران خان سے دور ہی رہنا۔"

"کیوں؟ کیا وہ ایسا ہی خطرناک آدمی ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر پھیکی سی مسکراہٹ سے پوچھا تو وہ اثبات میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔

"ہاں! کچھ ایسا ہی ہے۔"

"تو پھر تم لوگ اتنے خطرناک آدمی کو ووٹ دے کر اسمبلی کیوں بھیجتے ہو؟ کیا ایسا آدمی تم لوگوں کے مسائل حل کرتا ہوگا، جس کا اپنا تو عالیشان محل ہے اور اس کی رعایا کن حالوں میں وہاں سسکتی بلکتی زندگی گزار رہی ہے، یہ سب میں اپنی آنکھوں سے وہاں دیکھ چکا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میرا لہجہ کچھ تلخ سا بھی ہوگیا تھا۔ میں نے دیکھا سائیں داد کے بشرے پہ، میری بات کا کچھ خاص ہی اثر پڑا تھا۔ وہ جیسے تھوڑی دیر کے لیے کہیں کھو سا گیا تھا۔ میں بھی دانستہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ ایک گہری سانس خارج کرکے بولا۔

"نعمان! یہ بات تلخ سہی مگر اپنی جگہ ایک حقیقت ہی ہے کہ ہم لوگ بھی ایسے مگرمچھوں کے سامنے مجبور ہی رہتے ہیں، جن کے سمندر ہمارے ساحلوں کے ساتھ نتھی ہوتے ہیں۔ بھلا ان سے ہم کس طرح بیر لے سکتے ہیں؟ بس! ایک زندگی ہے، چاروناچار گزر رہی ہے۔ اس زندگی سے کون کتنا خوش ہے، اس سے کسی کو کوئی سروکار نہیں اور یہی ہماری سب سے بڑی کمزوری ہے جو ہمیں ایسے مگرمچھوں کے خلاف متحد ہونے سے مانع رکھتی ہے۔ پھر یہ مگرمچھ ہمیں زخمی بھی کرتے

Downloaded From http://paksociety.com

ہیں اور چیرتے پھاڑتے بھی ہیں، بدقسمتی تو یہ ہے کہ ہم اف تک نہیں کرسکتے۔ اگر کریں، تو وہی اف، ہائے بن جاتی ہے، اسی طرح ہم ہر ظلم پر اپنے ہونٹ سی لیا کرتے ہیں۔''

وہ اتنا بتا کر خاموش ہوگیا اور ساتھ ہی اس نے اپنا سر بھی جھکا دیا۔ میں حیرت سے اسے تکنے لگا۔ ایکا ایکی اس کے مغموم ہوتے لہجے نے مجھے چونکا کر رکھ دیا تھا۔ ہر انسان کا اپنا دکھ اپنا غم تھا۔ مجھے آج اندازہ ہو رہا تھا کہ اس ناپائیدار دنیا میں ہر کوئی اپنے پیٹ کے جہنم کے ساتھ غموں کی پوٹلی بھی اسی پیٹ کے جہنم میں چھپائے ہوئے تھا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ صرف میرا ہی غم ایسا ہے جس نے مجھے اندر سے توڑ کے رکھ چھوڑا ہے اور اس سے بڑھ کر اور بھلا کسی کا کیا غم ہوسکتا ہے؟ مگر کالیا کا تلخ اشارہ اور اب یہ سائیں داد۔ کا مغموم پڑتا لہجہ۔

ایسے میں مجھے ایک فلمی گانے کے بول یاد آنے لگے۔

دنیا میں کتنا غم ہے
میرا غم کتنا کم ہے
لوگوں کا غم دیکھا تو
میں اپنا غم بھول گیا
کوئی ایک ہزاروں میں شاید ہی خوش ہوتا ہے
کوئی کسی کو روتا ہے، کوئی کسی کو روتا ہے
ہر گھر میں یہ ماتم ہے
میرا غم کتنا کم ہے
کبھی ہنسی آجاتی ہے
کبھی یہ آنسو بہتے ہیں
دکھ سکھ کا یہ سنگم ہے
تیرا غم کتنا کم ہے
لوگوں کا غم، دیکھا تو
میں اپنا غم بھول گیا

بیٹھک میں ایک ساتھ کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں آمنے سامنے چارپائیوں پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ اس نے ابھی تک اپنا سر جھکایا ہوا تھا، میں نے آگے سرک کر اس کا سر دھیرے سے اوپر اٹھایا تو چونک ہی پڑا اور۔ ایک بار پھر گانے کے بول میری سماعتوں میں گونجنے لگے۔

سائیں داد کا چہرہ آنسوؤں سے لبریز۔ مگر۔ سرخ ہو رہا تھا۔ پل کے پل مجھے یہ احساس ہوا کہ میں نے انجانے میں شاید اس کی کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''ارے۔ تت۔ تم رو رہے ہو دوست؟'' بے اختیار میرے ہونٹوں سے برآمد ہوا تھا۔ ''یار سائیں داد! مجھے معاف کر دینا یار......! میں شاید انجانے میں تمہارا دکھ۔''

''نہیں، تم نے ایسا کچھ نہیں کیا نومی!'' وہ ہولے سے بولا۔ اس کی آواز میں رقت آمیز لرزش تھی۔ ''میں نہیں چاہتا کہ تم بھی اسی دکھ سے گزرو۔ جس میں، میں گزر چکا ہوں۔ اس لیے دوست! کہ ہم لوگ بہت کم مایہ اور بے حیثیت لوگ ہیں۔ کمزور ہیں۔ اس معاشرے میں کمزوروں اور زبردست لوگوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ہم لوگ چھوٹی مچھلیاں ہیں، جنہیں بڑی مچھلیوں کی خوراک بننا ہوتا ہے۔ اسی لیے کہتا ہوں۔ ادھر ہی بس کر دو۔'' وہ کہتا چلا گیا اور میں ہک بک سا اس کا چہرہ تکتا چلا گیا۔

اس مختصر سے کمرے میں ایکا ایکی مغموم سی خاموشی چھا گئی تھی، وقت جیسے تھم گیا ہو۔ بیٹھک کی فضاء اچانک ہی عجیب سے رنگ میں ڈھل گئی تھی، ایسے میں، میں نے کہا۔

''سائیں داد! تم شاید نہیں جانتے کہ اس ظالم سماج کی بڑی مچھلیوں کا میں بھی شکار ہو چکا ہوں۔ لیکن میں نے کبھی ایسے حالات پر سمجھوتا نہیں کیا، بلکہ اس کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی ہے، چاہے کم مایہ اور بے حیثیت سہی، لیکن میری اصل دولت اور طاقت وہ سچائی ہے جو ہمیشہ باطل کو سر جھکانے پر مجبور کرتی ہے۔ مانا کہ ایک طویل امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔ مگر فتح آخر حق کی ہی ہوتی ہے اور یہ صرف اسے ہی حاصل ہوتی ہے جو اللہ پر کامل بھروسا کر کے اس راہ کٹھن کی جانب قدم بڑھا چکے ہوتے ہیں۔ مگر دوست! اس طرح چپکے چپکے ظلم سہنا تو ظلم کرنے سے بھی بڑھ کر ہے۔''

میں نے دیکھا، وہ بہ غور میرا چہرہ تکنے لگا پھر بڑے ہی عجیب لہجے میں مجھ سے بولا۔

''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں نے ہار مان لی ہے؟'' میں اس کی بات پر چونکا تھا۔ تاہم بولا۔

''تو پھر یہ آنسو؟''

''کیا تمہاری آنکھوں سے کبھی آنسو نہیں نکلے؟ کیا تم پتھر کے ہو؟ یا میں پتھر ہوں؟'' میں لاجواب سا ہو گیا اور مسکرا کر بولا۔

''نہیں دوست! تمہاری بات درست ہے۔ تمہارے ساتھ ایسا کیا ہوا۔ بتانا چاہو گے؟ مگر ایک شرط پر کہ مجھے واقعی اپنا سچا دوست اور غم خوار سمجھنا۔ ایسا دوست، جو مشکل گھڑی میں دوستوں کے کام آنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔''

Downloaded From http://paksociety.com

زار بم

''زار بم'' دراصل اس ہائیڈروجن بم کا نام تھا جو سوویت یونین نے 1961ء میں نہ صرف تیار کیا بلکہ آزمائشی طور پر چلا کر بھی دکھایا۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا اور خطرناک ترین بم تھا جو بنی نوع انسان نے اپنی ہی نسل کو اسی صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے بنایا۔ آٹھ میٹر لمبا، دو میٹر چوڑا اور ستائیس ٹن وزنی یہ بم روس کے شمال مغرب میں واقع کولہ پینینسولہ کے بے آباد علاقے میں ٹیسٹ کیا گیا یہ ایک تھری اسٹیج بم تھا جس کی طاقت جان بوجھ کر آدھی یعنی پچاس میگاٹن رکھی گئی تھی۔ اس کے باوجود اس بم کی طاقت ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے جانے والے ایٹم بموں کی مجموعی طاقت سے 1570 گنا زیادہ تھی۔

مرسلہ: ناصر غنی، پشاور

مترنم کلامی، دل بے اختیار موہ لیتی تھی، حسن کی ایک پوری تعریف تھی وہ، جس میں ہر لفظ نگینے کی طرح فٹ محسوس ہوتا تھا۔

میں کوئی بے غیرت محبوب نہیں ہوں کہ اپنی محبوبہ کے بے مثل حسن کی تعریفیں، ہر ایک سے کرتا پھروں، مثل مقصود ہے کہ یہی حسن اس کے لیے مصیبت اور میرے لیے نا ختم ہونے والے دکھ کا پیش خیمہ بنا تھا۔

ہمارے ہاں زبانی کلامی بھی بات اگر طے ہو جائے تو وہ ایک طرح سے منگنی ہی کہلاتی ہے، اس رعایت سے وہ میری منگیتر بھی کہلانے لگی کہ اچانک کسی ظالم اور بے درد نے ہماری معصوم محبت پر شب خون مار دیا۔

وہ ایک خوبصورت اور سنہری پروں والی پیاری سی چڑیا ایک گدھ کو پسند آ گئی ایسا گدھ جو بھوکا تھا اور شکرا بن چکا تھا۔ شہزادی کے حسن و جمال کی خوشبو بھی مشک بن کر اس تک جا پہنچی اور بڑی بلندی سے اس گدھ نما شکرے نے اس پیاری چڑیا کو جھپٹ لیا اور اپنے او نچے، بلند و بالا مسکن میں لے گیا۔ تب سے وہ بے چاری ایک زندہ لاش کی مثل وہیں پڑی میری راہ تکتی رہتی ہے اور میں۔ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنی جیبیں جھاڑ چکا ہوں۔'' وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔ میری نظریں اس کے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں، جہاں شکست خوردگی اور حسرت و یاس کا کفن لپٹا ہوا

''میں جانتا ہوں، تم ایسے ہی ہو اور مجھے بھی ایسا ہی پاؤ گے۔ مگر یار! مسئلہ ہمارا بھی نہیں ہوتا۔ وہ زنجیر ہوتی ہے جو جذباتی رشتوں کی صورت ہمارے پیروں سے بندھی ہوتی ہے۔ ہم باوجود کوشش کے خود کو ان زنجیروں سے نہیں چھڑا سکتے۔ ماں، باپ، بہن بھائی، بچے۔ یہ سب ہماری جذباتی کمزوری بن کر ہمارے عزم کے سامنے ایک دیوار کھڑی کر دیتے ہیں۔ جنہیں ہم پھلانگنا بھی چاہیں تو نہیں پھلانگ سکتے۔''

''میرے پیروں میں بھی تو ایسی ہی زنجیر ہے دوست! میری جوان بہن ہے، بھائی ہے، یہ مجھ سے چھوٹے ہیں اور گھر کا بڑا میں ہی ہوں۔ لیکن۔ میں نے کبھی۔''

''اسی لیے تو کہتا ہوں کہ سمندر میں رہے رہتے ہو تو مگرمچھوں سے بیر مت لو۔ یہ بزدل لوگ سب سے پہلے ہماری اسی جذباتی کمزوری کو ہی نشانہ بناتے ہیں۔'' وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ تو میں نے کہا۔

''دیکھو سائیں داد! اگر تمہارا اللہ پر یقین کامل ہے اور تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم سب کی بہتر حفاظت اللہ کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا اور تم اپنا سب کچھ اسی کی حفاظت میں چھوڑ دیتے ہو تو۔ سمجھو۔ وہی اللہ تمہارے لیے کافی ہے۔ رہی بات امتحان اور کڑی آزمائش کی تو وہ پھر بھی آتے ہی رہتے ہیں۔ پھر کیوں نا باعزم ہو کے حالات کا مقابلہ کیا جائے۔''

پہلی بار وہ میری بات پر مسکرایا اور بولا۔

''واہ۔ دوست! تم نے تو مجھے بھی لاجواب کر کے رکھ دیا۔'' پھر وہ اپنی روئیداد بتانے لگا۔

''بہت زیادہ طویل نہیں ہے میری کہانی، مگر جتنی مختصر ہے اتنا ہی اس نے میری زندگی کو متاثر کیا ہے۔ میری خالہ کی ایک ہی بیٹی تھی، نام تو اس کا شہزادی تھا مگر زندگی اس کی ایسی نہ تھی۔ وہ غریب لوگ تھے۔ ہمارے ہی گوٹھ میں رہتے تھے۔ مگر شاید اب یہ اس کے نام کا اثر تھا کہ وہ واقعی ایک غریب ہاری کی بیٹی سے یک دم محل کی شہزادی کہلانے لگی۔

وہ میری بچپن کی پسند تھی۔ وہ تھی بھی پسند کیے جانے کے قابل، بہت حسین اور خوب صورت تھی وہ، بڑی نازک اندام اور اس کی شرم و حیا کا انداز ہی مارے ڈالے دیتا تھا کہ بس اس سے کچھ بھی نہ کہا جائے، یک ٹک دیکھا کیے جائے، وہ چلتی تو اس کے سنگ بادِ صبا کی ہمرکابی محسوس ہو، ہنستی تو جیسے چہار اطراف شگوفے کھلکھلا اٹھے ہوں اور دور کہیں بہتے آبشاروں کی مدھر باں آواز سے ہم رنگ اس کی

Downloaded From http://paksociety.com

تھا۔ میں نے کہا۔

''تو کیا تم نے اتنی آسانی سے اپنی ہار مان لی؟''

جانے کیوں یہ جملہ بے اختیار ہی میرے منہ سے نکلا تھا اور اچانک بھی، بعد میں مجھے ذرا احساس ہوا کہ یہ جملہ قبل از وقت تھا۔ کیونکہ میں نے دیکھا تھا کہ یکبارگی اس کے چہرے پہ سرخ آندھی جیسی رمق ابھری تھی۔ پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو، میں یوں ہی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہا تھا؟ نہیں، میں چاہتا تو اس بلند و بالا محل کے در و بام ہلا کر رکھ دیتا، اور میں نے اس کا پورا بندوبست بھی کر رکھا تھا، لیکن عین اس وقت جب میں نے اس راہ پُرخار میں ایک قدم ہی بڑھایا تھا کہ اچانک میرے پیروں میں زنجیریں آپڑیں اور اس میں مجھے کئی چہرے رسن بستہ دکھائی دیئے۔ ان میں میری بہن، اس کے شوہر اور دو بچوں کے چہروں کے علاوہ، میرے بوڑھے ماں باپ کے چہرے بھی شامل تھے۔ میرے یار نومی! اب تم ہی بتاؤ۔ میں کیا کرتا؟ میرا دشمن طاقت ور سہی لیکن مجھے اس کی بھی پروا نہ تھی، مگر وہ بزدل بھی تھا، کیسی عجیب بات ہے یار نومی! کہ میں نے اس بزدل آدمی سے بالآخر ہار مان لی۔''

میں پُرغور انداز کی خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا، اس کی ''بزدل دشمن'' والی بات پر مجھے وہ لینڈ مافیا چیف یاد آ گیا اور اس کی دھمکی بھی، جو اس نے مجھے میرے گھر والوں کے حوالے سے دے رکھی تھی۔ میں اس سے خوف زدہ نہیں تھا لیکن سائیں داد کی طرح میرے پاؤں بھی انہی جذباتی رشتوں سے جڑے ہوئے تھے، ہاں! یہ ضرور تھا کہ میں نے پھر بھی سپر نہیں ڈالی تھی اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی امان میں اپنے گھر والوں کو دے دیا تھا اور سچ کی علم برداری کے لیے پورے تن من دھن سے کوشاں تھا۔

میں نے کہا۔ ''سائیں داد! پوچھ سکتا ہوں، وہ کون تھا جس نے تم سے تمہاری محبت کو چھین لیا؟''

''ابھی تو تم نے اس کا ذکر کیا تھا۔'' وہ میری طرف دیکھ کر پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

''حاجی مہران خان؟''

''ہاں، یہی وہ بوڑھا گدھ ہے، جس نے شکرا بن کر میری شہزادی کو مجھ سے چھین لیا اور اسے اپنی آبائی حویلی تھٹھے لے جا کر سونے کے قفس میں بند کر دیا۔''

''مجھے بہت دکھ ہوا یار، سائیں داد!'' میں نے از راہ تاسف اس سے کہا تو وہ بولا۔

''اصل دکھ کی بات تو میرے لیے یہ ہے کہ میں کتنا کمزور اور کم مایہ آدمی ہوں کہ اپنی محبت کو اپنے ہاتھوں سے ہار کے ایک ایسا انسان پیش کر دیا، جس کے ساتھ شہزادی بھی خوش نہیں رہ سکتی، خوشی تو ایک طرف، وہ وہاں اس سونے کے پنجرے میں زیادہ عرصہ شاید جی بھی نہ سکے، بس! یہی بات بھی کبھی مجھے اندر سے توڑ اور بچھاڑ کے رکھ ڈالتی ہے نومی!''

وہ غمگین سا ہو گیا۔ میں نے ایک گہری ہمکاری خارج کی اور اس سے بولا۔ ''سائیں داد! کیا تم مجھ پر بھروسا رکھتے ہو؟''

''میں سمجھا نہیں؟'' وہ الجھی ہوئی، سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ حاجی مہران خان سے میرا عنقریب ٹکراؤ ہونے والا ہے اور میں اس کی بیخ کنی کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا اور موقع ملا تو تمہاری شہزادی کو بھی اس کے چنگل سے چھڑا لوں گا۔ مگر اس کے لیے تمہارا ساتھ لازمی ہوگا میرے لیے۔''

میری اس بات پر ایک لمحے کو اس کے ستے ہوئے چہرے پر خوش امیدی کی رمق سی ابھری تھی اور وہ بھی تاثرات .... اپنی آنکھوں میں لیے مجھ سے فوراً مستفسر ہوا۔ ''کیسی مدد؟ میں تو تمہاری ہر مدد کرنے کو تیار ہوں نومی!''

''میری کوشش ہوگی کہ تم سے کوئی زیادہ خطرناک کام نہ لوں، بس! اس حد تک کہ میرے ساتھ تمہارا مقصد بھی پورا ہوتا رہے۔ کیوں کہ تم اس کے اریب قریب میں ہی رہتے ہو۔''

''مجھے قبول ہے'' وہ جیسے بہ یک ترنت بولا۔

''بس! پھر یاد رکھنا اور تیار رہنا، سیل نمبرز ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ وقت آنے پر میں تم سے رابطہ کر لوں گا۔''

رخصت ہوتے وقت میں نے اس کے کاندھے پر اپنا ایک ہاتھ رکھتے ہوئے مزید کہا۔

''دیکھو دوست! میری ایک نصیحت یاد رکھنا، ظلم کے آگے کبھی سر نہیں جھکانا، کیوں کہ یہ ظلم سہنے سے بھی بڑھ کر ظلم ہوتا ہے۔ رہی بات انسانی رشتوں کی پابہ زنجیروں کی تو۔ اس کے لیے میرا اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ بے شک ایک متوازن مصلحت اندیشی بھی ہونی چاہیے، مگر ایک سچا مسلمان وہی ہوتا ہے جو صرف اللہ جل شانہ سے ہی ڈرتا ہے۔''

Downloaded From http://paksociety.com

وہ چند ثانیے، بڑے پُرغور انداز میں میری طرف دیکھتا رہا،اس کے بعد مجھ سے گلے مل کر رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

اگلے دن لاری اڈے پہنچا تو چاچا انور شاہ نے ایک سنسنی خیز انکشاف کرتے ہوئے مجھے اس کار کے اونر کے بارے میں بتایا، وہ کار ایک خاتون کے نام سے تھی، گلشن بیگم نام تھا اس کا اور ایک بڑے بلڈر سیٹھ ستار کی منکوحہ تھی۔

''تو اس نمبر والی کار میں مجھے اس روز دھمکی دینے والا وہ شخص سیٹھ ستار تھا۔'' میں نے زیرلب، خودکلامیہ انداز میں کہا اور پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

''سیٹھ ستار کا بھی میں نے پتا چلا لیا ہے'' ۔چاچا انور شاہ نے بتایا۔''اس کا دفتر بوٹ بیسن میں ہے۔ میں تمہیں اس کا پتا دیتا ہوں، تم ابھی اسی وقت وہاں جاکر اس کی نظروں میں آئے بغیر اس کا چہرہ پہچان لو کہ آیا یہ وہی شخص تھا جس نے اس روز تمہیں دھمکی دی تھی۔ یا یہ کوئی اور تھا۔'' میں بھی جلد سے جلد اس حقیقت سے پردہ ہٹانا چاہتا تھا۔

بولا۔''ٹھیک ہے چاچا! میں ابھی نکلتا ہوں''۔

''تمہیں دھمکی دینے والے کا چہرہ تو یاد ہے ناں اچھی طرح؟''

''بالکل، میں بھلا اس بزدل شخص کا چہرہ کیسے بھول سکتا ہوں چاچا!'' میں نے جواب دیا اور پھر اسی وقت ان سے پتا لے کر اچھی طرح ذہن نشین کیا اور اپنی بائیک میں بوٹ بیسن کی طرف روانہ ہوگیا۔

ملیر سے بوٹ بیسن خاصے فاصلے پر تھا۔ مجھے کم وبیش وہاں تک پہنچنے میں ایک گھنٹا لگ گیا۔

سیٹھ ستار کی بلڈر کمپنی ''بلیو مون ہائٹس'' کے نام سے تھی۔ جو بوٹ بیسن کے ایک بڑے گنجان آباد کمرشل علاقے میں تھی۔ یہاں کئی لگژری اور سپر لگژری اپارٹمنٹ اور ''ڈپلیکس'' بنے ہوئے تھے اور کلفٹن کا یہ ایک خاصا متمول علاقہ کہلاتا تھا۔

مذکورہ دفتر تلاشنے میں مجھے مطلق دیر نہیں لگی تھی۔ پلازا کی شکل کی اس عمارت میں کئی فلور تھے، انہی میں ایک فلور پر بلیو مون ہائٹس کا بھی دفتر تھا۔ میں لفٹ کے ذریعے اس فلور پر پہنچا۔

اگرچہ مجھے اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ سیٹھ ستار بشرطیکہ وہی دھمکی دینے والا ہی لینڈ مافیا ہوتا، سامنا... ہونے کی صورت میں وہ مجھے اور میں اسے فوراً پہچان سکتے تھے۔ باوصف اس کے میں نے اپنا حلیہ یا بھیس وغیرہ بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یہ بھی ایک طرح سے دشمن پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کا باعث بنتا۔ لہٰذا میں پُراعتماد چال چلتا ہوا استقبالیہ کی طرف بڑھنے لگا۔

دفتر نہایت شاندار تھا۔ وال ٹو وال ڈیزائننگ کارپٹ کے علاوہ۔ چھت پر کہیں کہیں فانوس لگائے ہوئے تھے۔ دفتر کی فضا سینٹرلی ائرکنڈیشنڈ تھی۔ ایک جگہ ایکوریم اور مختلف رہائشی پلازا، فلیٹس، کمرشل بلڈنگ اور پلاٹس کے خوبصورت ماڈل اور نقشے بھی دکھائے گئے تھے۔ جو بھی کام کرنے والے نظر آرہے تھے، خواہ، مرد یا عورت، سبھی ویل ڈریسڈ دکھائی دیتے تھے اور تو اور لوئر اسٹاف بھی مخصوص وردی میں تھے اور سیکیورٹی والے تو ڈارک بلیو وردی میں تھے۔

یہ ساری شان وشوکت دیکھنے سے بجا طور پر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں عام نوعیت کی بجائے بڑی بڑی ڈیلینگ ہوتی تھیں اور بہت بھاری پارٹیاں یہاں آتی ہوں گی۔

استقبالیہ، یا ایسی ہی کسی ٹیبل پر پہنچنے سے پہلے ہی مجھے ایک باوردی سیکیورٹی والے آدمی نے روک کر پوچھ لیا کہ میں یہاں کیا کرنے آیا ہوں؟ وہ میرا نیچے سے اوپر تک ایسی نظروں سے جائزہ لے رہا تھا، جیسے میں غلطی سے اندر آگیا تھا اور اب بدھوؤں کی طرح یہاں حیران وپریشان ہونے والا تھا۔ استہزاء کی ایک لہر بھی میں نے اس کے تیور میں مچلتے محسوس کی تھی۔

''کیا یہاں کوئی استقبالیہ یا ریسپشن جیسی کوئی شے نہیں ہے؟'' میں نے اسے جواب دینے کی بجائے الٹا اسی پر سوال داغ دیا۔

درحقیقت میں عام سے لباس میں تھا، جو یہاں اس ماحول میں آکر تو اور بھی زیادہ پھٹیچر دکھنے لگا تھا۔ یعنی ایک پرانی سی پتلون اور عام سی شرٹ، پاؤں میں بوٹ تو تھے مگر ان کی حالت غور سے دیکھنے پر خستہ ہی نظر آتی تھی۔

میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو وہ بے چارہ احساس کمتری کے باعث زمین میں گڑ جاتا، مگر میری فطرت اور تھی۔ احساس کمتری جیسے جذبات، انسان کے خود پیدا کردہ ہوتے ہیں، دوسرا کبھی اسے اس میں مبتلا نہیں کرتا، یہ محض اپنی سوچ ہوتی ہے۔ یہی سبب تھا کہ میرے اعتماد اور چال ڈھال میں چنداں فرق نہیں آیا تھا اور میں نے ایسے کسی دباؤ میں آنے کی بجائے نہایت پُراعتماد انداز میں اسی پر ہی الٹا

Downloaded From http://paksociety.com

سوال کھینچ مارا تھا۔

''آپ کو ملنا کس سے ہے جناب اعلیٰ!'' وہ جیسے لفظ چبا کر بولا۔

''مجھے سیٹھ ستار صاحب سے ملنا ہے۔'' میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔

''ملاقات طے ہے آپ کی صاحب سے؟''

''نہیں۔''

''پھر تو آپ ان سے نہیں مل سکتے۔''

''یہ مسئلہ میں ریسپشن میں پہنچ کر حل کرلوں گا، تم فقط میری اتنی راہنمائی کردو وہاں تک۔''

وہ مجھے سیٹھ ستار سے ملوانے کے بالکل بھی موڈ میں نہیں نظر آرہا تھا۔ اس بار اکھڑے سے لہجے میں بولا۔

''ریسپشن پہ جاکے آپ کیا کریں گے بھائی؟ جب میں نے کہہ دیا کہ آپ صاحب سے مل ہی نہیں سکتے اس طرح۔''

میں نے ایک گہری سانس خارج کرکے اپنی چبھتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پہ گاڑ دیں اور گمبھیر سے لہجے میں اس سے بولا۔

''کچھ ملاقاتیں اچانک اور بغیر مطلع کیے بھی کرلی جاتی ہیں اور یہی سب سے اہم اور سودمند ثابت ہوتی ہیں بعد میں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، تمہارے انکار پر میں واپس لوٹ جاؤں گا مگر یاد رکھنا اگر کل کلاں تمہارے ہی صاحب کا کوئی بڑا نقصان ہوگیا تو اس کی ذمے داری میں تم پر ڈال دوں گا۔ آگے تمہاری مرضی۔''

میں جانتا تھا کہ بعض اوقات ملاقات سے قبل مطلع کرنا اتنا ضروری بھی نہیں ہوتا، یہ سیکیورٹی گارڈ اپنی اکڑ دکھا رہا تھا، تاہم میری اس بات پر اس کے چہرے پہ مخمصے کے تاثرات ابھرے تھے، پھر وہ کچھ سوچ کر مجھے اشارے سے اپنے ساتھ آنے کا کہتے ہوئے بولا۔

''آپ ذرا آئیں میرے ساتھ ایک منٹ۔'' وہ آگے بڑھا۔ میں نے اس کی تقلید کی، وہ مجھے سیدھے ہاتھ کی طرف بنے ایک کاؤنٹر پہ لے گیا۔ یہی استقبالیہ تھا، وہاں ایک خوبصورت سی جوان لڑکی موجود تھی، جو ایک فون اٹینڈ کرنے میں محو تھی، جبکہ دوسرا ایک ایجڈ سا مرد تھا۔ سیکیورٹی والے نے اس کے قریب جاکر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے نیچی آواز میں کچھ کہا، اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی، ہولے سے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ میں اس کا اشارہ بھانپ کر فوراً آگے بڑھا اور قریب پہنچا تو اس نے مجھ سے نام پوچھا۔ ''نعمان احمد۔''

''کس سلسلے میں آپ باس سے ملنا چاہتے ہیں؟''

''یہ میں ان کو ہی بتاؤں گا۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے متانت سے کہا۔

''اگر انہوں نے آپ سے ملنے سے انکار کردیا تو آپ کو فوراً واپس لوٹ جانا ہوگا۔''

''آف کورس'' میں نے ہولے سے سر کو جنبش دی۔

اسی دوران میری نگاہ بائیں جانب ایک کمرے کے دروازے پر پڑی۔ جہاں ایک براس پلیٹ پر بڑے بڑے الفاظ میں اسی کا نام درج تھا۔

وہ سیٹھ ستار سے رابطہ کرنے لگا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

ابھی کچھ کنفرم نہ تھا کہ آیا یہ وہی میرا مطلوبہ آدمی تھا یا کوئی اور۔ تاہم اگر تو وہی تھا تو اسے میرا نام یاد ہونا چاہیے، بشرطیکہ وہ اس مغالطے میں نہ پڑے کہ میں ''وہی'' نعمان تھا۔

میں نے دیکھا اس نے جلدی سے فون رکھ دیا اور بے اختیار اس کی نظریں مذکورہ کمرے کے دروازے کی طرف اٹھ گئیں، میں نے بھی پُرسوچ انداز میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بھنویں سکیڑ لیں، وہ بولا۔

''باس، باہر ہی آرہے ہیں۔ انہوں نے انٹرکام آف کردیا ہے۔''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک اسی کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک ٹھگنا سا گنجا آدمی نمودار ہوا جس نے اپنے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کا سوٹ کیس تھامے رکھا تھا، مجھے اس کا انداز کچھ مودبانہ سا لگا۔ کیوں کہ اس نے کسی کے لیے دروازہ کھولا تھا اور تب ہی ایک اور شخص بھی اندر سے برآمد ہوا۔ اس سوٹ کوٹ میں ملفوف شخص کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ کیوں کہ یہی میرا مطلوبہ آدمی تھا۔

اس نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اور اس گنجے آدمی کے ساتھ ایک طرف کو بڑھا، وہ گنجا آدمی شاید اس کا پی اے تھا، ادھر سیکیورٹی والا آدمی بھی تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ میں نے بھی قدم آگے بڑھائے اور فوراً ہی پہلے سے جاکر اس جگہ جا کھڑا ہوا، جہاں میرا اور اس کا سامنا یقینی تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ رک گیا۔ سیکیورٹی والے کے چہرے

Downloaded From http://paksociety.com

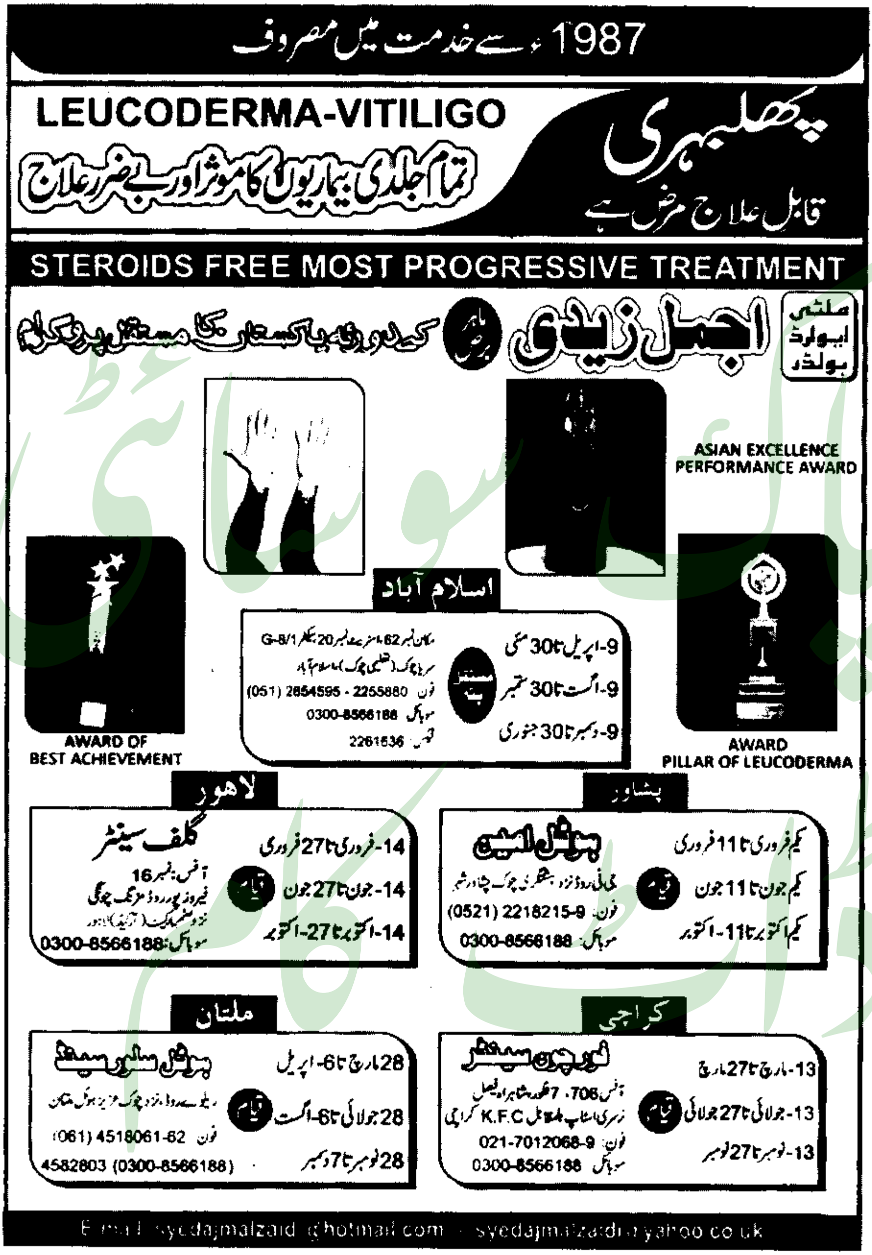

Downloaded From http://paksociety.com

پہ ناگواری کے تاثرات ابھرے تھے۔ مگر بولا کچھ نہیں۔ جبکہ سیٹھ ستار تو مجھے یوں اچانک اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گیا تھا۔ شاید اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اس طرح یہاں اس کے سامنے آجاؤں گا۔

''تم!'' اس کے حلق سے بس اتنا ہی برآمد ہوا تھا اور تب میں نے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

''ہاں، یہ میں ہی ہوں سیٹھ ستار! میں تو تم سے اندر ہی ملنا چاہتا تھا تاکہ بات اندر ہی رہتی لیکن تمہارے اس نامعقول سے سیکیورٹی گارڈ نے مجھے فضول سی باتوں میں الجھا کر وقت برباد کردیا۔'' کہتے ہوئے میں نے بھانپتی ہوئی نظروں سے سیٹھ ستار کے چہرے کا بھی جائزہ لیا تھا، جہاں اب تلخی سے زیادہ ایک پریشان کن الجھن کے تاثرات بھی ہویدا ہونے لگے تھے۔ اسے شاید مجھ سے اتنی جرأت کی توقع نہ تھی کہ میں اس طرح اس کے دفتر دوڑا چلا آؤں گا۔ بولا۔ ''آجاؤ، پھر اندر بات کرتے ہیں۔''

وہ میرے دباؤ میں آگیا تھا۔ مگر میں نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ ''اب میرے پاس اندر آنے کا وقت نہیں رہا۔ میں صرف یہ کہنے آیا تھا کہ تمہاری گیدڑ بھبکیوں سے میں ڈرنے والا آدمی نہیں ہوں، سیٹھ ستار! اور تم نے جو کل رات اپنے تین آدمیوں کے ذریعے مجھے اغوا کروانے کا ناپاک منصوبہ بنایا تھا وہ بھی میرے آدمیوں نے بری طرح ناکام بنادیا ہے، جو تمہاری بیوی گلشن بیگم کے نام رجسٹرڈ کار میں سوار تھے۔''

وہاں کام کرنے والے بہ شمول بھی لوگ اسی طرف دیکھنے میں محو تھے، جبکہ سیکیورٹی گارڈ نے اپنا نمک حلال کرنا چاہا تھا اور میری طرف خاصے جارحانہ انداز میں بڑھا بھی تھا۔ مگر سیٹھ ستار نے اسے اشارے سے روک دیا۔

''تم نے جو بکواس کرنا تھی کرلی، اب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' اس نے بہ دستور مجھے غصیلی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا تو مجھے آج اس کے لہجے میں وہ پہلے والی گھن گرج کا احساس بالکل محسوس نہیں ہوا تھا، جو اس نے مجھے اس روز دھمکی دیتے وقت، طاقت کے زعم میں دی تھی، آج یہی زعم میں نے اس کا یہاں بہ نفس نفیس خود آکر چکنا چور کرکے رکھ دیا۔

''بکواس یہ نہیں ہے، سیٹھ ستار! جو میں نے کی ہے، بکواس وہ تھی جو تم نے کچھ روز پہلے گیدڑ بھبکی دے کر میرے ساتھ کی تھی۔ اب دھیان رکھنا ذرا۔ چار موٹے موٹے ستونوں جیسی ٹانگوں پہ کھڑے ایک ہاتھی کی سونڈ میں جب چیونٹی گھستی ہے تو اسے بھی زمین بوس کردیتی ہے۔ سرکاری زمینوں پر قبضے، چائنا کٹنگ، یہ سارا کچا چٹھا تمہارا پل بھر میں میڈیا کے ذریعے عوام الناس کے سامنے آسکتا ہے۔ اسی لیے بھی کسی کو کمزور سمجھنے کی غلطی نہ کرنا۔''

میں نے آخر میں طنزیہ کہا اور پلٹ گیا۔

☆☆☆

سیٹھ ستار جیسے مافیائی چیف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی دھمکی کا جواب دینا اور اس کے کرتوتوں کا برملا اظہار کرنا میرے لیے اس لیے بھی ضروری تھا کہ گزشتہ شب اس نے اپنی دھمکی کو جس طرح عملی جامہ پہنانے کی مذموم کوشش کی تھی اور عین اسی وقت محض اتفاقاً شیراز عرف کالیا نے وہاں پہنچ کر اپنے ساتھیوں سمیت سیٹھ ستار کے گماشتوں کی جو درگت بنائی تھی۔ یوں سیٹھ ستار کو بھی معلوم ہو جانا چاہیے کہ مجھے بھی اس کی اس حرکت کا اسی ہتھیار سے جواب دینا آتا ہے۔

دولت اور طاقت کے گھمنڈ میں اپنی تیس مار خانی قائم کرنے والے سیٹھ ستار جیسے لوگوں کے لیے اسی کی ''زبان'' میں بات کرنا کتنا اہم یا ضروری ہوتا ہے، یہ مجھے کالیا کے انداز بے جگری نے سمجھایا تھا۔

کیسی عجیب ہی بات ہے کہ ہمارے معاشرے میں ایک شریف آدمی کی عزت نہیں، بلکہ اسے ڈرپوک، بزدل اور بے وقوف سمجھا اور کہا جاتا ہے۔ یہ المیہ ہی تو ہے کہ جو دھن دولت والا ہے یا جس کے پاس ''چار کتے'' ہیں، وہی شریف، عزت دار اور طاقت ور کہلاتا ہے۔

اب چاہے نعمان احمد ہو یا پھر ملیر گوٹھ کا سائیں داد۔ یہ دونوں بے چارے بھلا اس دوہرے معیار والے سماج میں کیا حیثیت رکھتے ہیں؟

ایک نے اپنی کم مائیگی اور مجبوری کے باعث حاجی مہران خان جیسے جاگیردار آدمی کے سامنے اپنا سب کچھ ہار دیا اور اب اپنی ناکام محبت کی قبر پر یاس زدہ یادوں کا مقبرہ بنائے مجاوری کرنے پر مجبور ہو رہا تو دوسری طرف میں، یعنی نعمان احمد۔ اپنے بے گناہ باپ کو پھانسی کی سزا سے نہ بچا سکا اور رتح بالآخر رانا بشیر جیسے سرمایہ دار آدمی کے حصے میں آئی۔

ایک چوٹ کیا لگی کہ ارشاد مٹن جیسے مردار خوروں نے ہمارا اجڑا اجڑا گھر دیکھ لیا اور بھوکے بھیڑیوں کی طرح دانت نکوس کر سامنے آگئے۔

Downloaded From http://paksociety.com

حاجی مہران خان، رانا بشیر اور سیٹھ ستار...... یہ تینوں معاشرے کے ذومی تھے، جن کا ضمیر مردہ ہو چکا تھا اور وہ اپنی ازلی بھوک، جو قیامت تک ختم ہونے والی نہیں (دیکھا جائے تو یہ بھی قدرت کا ان پر ایک طرح سے عذاب ہی ہے)، غریبوں، مسکینوں اور کمزوروں کے حقوق ہڑپ کر کے مٹاتے ہیں اور کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ پاتا کہ جان تو گٹر میں آغشتہ رہنے والے ایک معمولی کیڑے کو بھی پیاری ہوتی ہے۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہے، یہ محاورے اور تمثیلیں ایسے ہی وجود میں نہیں آگئیں! ان کے پیچھے پوری ایک داستان دلستاں ہوتی ہے۔ جس میں، شیراز عرف کالیا جیسے لوگ بھی ہوتے ہیں اور سائیں داد جیسے بھی ہارے ہوئے جواری۔ جبکہ نعمان احمد کی یہاں شاید کوئی نئی کہانی رقم ہونے والی تھی۔ شاید اس کی کہانی کے اختتام میں بھی کوئی نئی تمثیل، کوئی اچھوتا محاورہ ایجاد ہونے والا تھا، کیوں کہ میں نے ابھی ہار نہیں مانی تھی اور نہ ہی کالیا کی طرح اپنی زندگی کا ''ٹریک'' بدلا تھا۔ شرافت اور انسانیت کے مروجہ اصولوں کو ابھی نعمان احمد نے اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا تھا۔

سیٹھ ستار کے شاہانہ دفتر سے لوٹتے وقت مجھے احساس ہونے لگا کہ میرے حوصلوں کے بادبان کچھ مزید بلند ہوئے ہیں۔ ایسا ہی احساس مجھے دوبار پہلے بھی ہوا تھا۔ ایک بار اس وقت جب میں نے ارشاد مٹن جیسے بلیک میلر اور غاصب کو شکست دی تھی اور دوسری بار تب، جب میں نے رانا بشیر کو اپنے دروازے پر دیکھا تھا۔

بہر طور۔ میں نے لاری اڈے پہنچ کر چاچا انور شاہ کو ساری بات بتا دی یہ بھی کہ سیٹھ ستار ہی وہ آدمی ہے جس نے مجھے دھمکی دے رکھی تھی اور اپنے دو ساتھیوں کے ذریعے اغوا کروانے کی کوشش چاہی تھی۔

چاچا انور شاہ یکدم جوش میں آگیا تھا، اس نے متعلقہ تھانے جانے کا ارادہ کیا تو میں نے منع کر دیا میں یہ کام زنیرہ کے ذریعے اور اس کے مشورے سے کروانا چاہتا تھا۔

ایسے ہی وقت میں بڑے منشی دادن خان نے ہمیں بتایا کہ انتظامیہ کا تین رکنی وفد ہم سے مذاکرات کے سلسلے میں ملنا چاہتا ہے۔ انہوں نے وقت مانگا تھا اور دادن نے انہیں آج شام کا وقت دے دیا تھا۔

مجھے اس کی بات پر سخت غصہ آیا، جسے برداشت کرتے ہوئے میں نے قدرے تخی سے کہا۔

''منشی صاحب! آپ نے ہم سے مشورہ بھی نہیں کیا اور انتظامیہ کے وفد سے مذاکرات کا فیصلہ بھی کر لیا؟''

میری بات پر اس نے پہلے تو ناک بھوں چڑھا کر میری طرف دیکھا، اس کے بعد اکھڑے لہجے میں بولا۔

''مشورہ! کیسا مشورہ؟ میں بڑا منشی ہوں اور مجھے اختیار ہے کہ میں یہاں کے مفاد کی خاطر بغیر کسی کے ساتھ مشورے کے کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہوں۔''

مجھے اس کی ہٹ دھرمی اور اس ڈھٹائی پر غصہ تو بہت آیا مگر ضبط سے کام لیتے ہوئے بولا۔

''بڑے منشی صاحب! آپ شاید بھول رہے ہیں کہ عطا محمد صاحب نے یہ معاملہ ہمارے بلکہ خالصتاً میرے سپرد کر رکھا ہے۔ اس لیے آپ کو ایسے کسی بھی معاملے میں مجھ سے مشورہ کیے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا ہے۔'' میری بات پر اس کے چہرے پہ درشتی کے آثار نمودار ہوئے اور آنکھوں میں مخاصمت کی تندی سی ابھری تھی۔ بولا۔ ''تو میں نے کیا غلط کیا ہے؟ کیا مذاکرات نہیں ہونے چاہیے تھے؟ آخر تو یہ مسئلہ حل کرنا ہی ہے ناں۔''

''یہ مسئلہ حل ہونے جا رہا ہے منشی صاحب! مگر آپ کی حرکتوں کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہونے لگا ہے کہ یہ مسئلہ کسی اور کے مفاد میں حل ہونے کی کوشش کی جا رہی ہے۔''

بالآخر میں نے دادن خان سے صاف کہہ ڈالا اور اس کی سمجھ کے لیے یہ اشارہ کافی تھا کہ وہ در پردہ کیا کرنا چاہ رہا تھا۔ میری بات پر وہ گڑبڑا سا گیا اور مجھے سخت نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا میں معاملہ بگاڑنے کی کوشش کر رہا ہوں؟ تم مجھ پہ الزام لگا رہے ہو۔ میں ابھی صدر صاحب سے تمہاری شکایت کروں گا، بہت سر چڑھ گئے ہو تم۔'' وہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ چاچا انور شاہ نے اس سے بھاری لہجے میں کہا۔

''دادن خان! زیادہ گرمی کھانے کی ضرورت نہیں ہے، سب اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ ہی رہے ہیں کہ ہم نے اس معاملے کو کس کامیابی کے ساتھ ہاتھ میں رکھا ہوا ہے ورنہ تو تمہاری اپنی منصوبہ بندی بالکل فیل ہو چکی تھی۔ اسی لیے تو صدر عطا صاحب نے نعمان پر پورا بھروسا کرتے ہوئے یہ معاملہ اسی کے ہاتھ میں دے رکھا ہے، باقی تم عطا صاحب سے ہمارے بارے میں کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔ ہمیں اس کی پروا نہیں لیکن آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔''

Downloaded From http://paksociety.com

چاچا انور شاہ کی بات پر دادن خان کی آنکھوں میں معاندانہ چمک ابھری تھی اور پاؤں پٹخ کر کوٹھڑی نما کمرے سے نکل گیا۔

ہمیں اس کی شکایت کرنے کی کوئی پروا نہ تھی کیوں کہ یہ ایسا پہلے بھی کر چکا تھا اور ہماری توقع کے عین مطابق، عطا صاحب نے اس کی شکایت کا کوئی نوٹس نہ لیا تھا۔

میرا ارادہ ابھی انتظامیہ سے بات کرنے کا تھا ہی نہیں۔ کیوں کہ مجھے یہ خوبی اندازہ تھا کہ اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ یہ محض باتوں میں سرکھپائی اور انتظامیہ کو ڈھیل دینے اور اپنے اصولی موقف کو لچک دینے والی بات ہوگی اور انتظامیہ یہی چاہتی تھی۔

''تمہاری بات نے شاید اسے بھی یہ باور کرا دیا ہے کہ ہم اس کی چالاکی سمجھ چکے ہیں، اسی لیے یہ مزید کمین پنے پر اتر سکتا ہے، اسی لیے نومی بیٹا! اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔'' دادن خان کے دفع ہونے کے بعد چاچا انور شاہ نے مجھ سے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''آپ اس کی فکر نہ کریں چاچا! میں اسے نظروں میں رکھے ہوئے ہوں۔ آپ ایک کام کر سکتے ہیں؟'' میں نے آخر میں پوچھا۔

''ہاں۔ ہاں۔ بولو بیٹا!''

''کیا آپ کے پاس یہاں کوئی ایسا آدمی نہیں ہے چاچا! جس پر بھروسا کیا جا سکے؟''

وہ میری بات پر غور کرنے کے انداز میں کچھ سمجھتے ہوئے بولے۔

''ہاں! ہے تو سہی ایک ایسا آدمی مگر وہ یہاں کا نہیں ہے، میرا مطلب اس کا تعلق یہاں لاری اڈے سے نہیں ہے، وہ باہر کا ہے۔''

''ٹھیک ہے چلے گا چاچا!'' میں نے فوراً کہا۔ ''لیکن آدمی پکا ہونا چاہیے، ہوشیار بھی اور چالاک بھی، اس سے زیادہ بھروسے کا۔۔۔ بے شک اسے پلے سے کچھ دینا بھی پڑ جائے تو کوئی پروا نہیں، ابھی عطا صاحب کے دیئے پیسوں میں سے کافی روپے ہیں میرے پاس جو میں نے اپنے ہی اکاؤنٹ میں رکھے ہوئے ہیں۔''

''پھر تو سمجھو بیٹے کام ہوگیا۔ باقی تم اس کی فکر نہ کرو، وہ آدمی ہرفن مولا ہے۔ مخلص بھی اور وفادار بھی ہے، اس بے چارہ آج کل بے روزگار ہے لیکن ہے زند دا ... صدرالدین نام ... وہ بھائی کے نام سے ...

ہے۔ ہے کام کا آدمی۔''

''ٹھیک ہے چاچا! آپ اسے کسی وقت یہاں لے آئیں۔ باقی باتیں میں خود ہی اس سے کرلوں گا۔'' میں نے کہا تو وہ بولا۔

''میں کل ہی لے آؤں گا۔''

دادن خان نے انتظامیہ کو وقت دے ڈالا تھا، ورنہ میرا ایسا کوئی ارادہ ابھی ان سے مذاکرات کرنے کا نہیں تھا مگر اب مجبوری تھی، یوں میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ اپنے اصولی موقف میں ایک ذرا بھی لچک نہ آنے دوں گا۔

القصہ کوتاہ۔ مذاکرات عمل میں لائے گئے، وہی ہوا، جس کی مجھے پہلے ہی سے توقع تھی، یعنی انتظامیہ کے وفد کی طرف سے آئیں بائیں شائیں کے سوا ان مذاکرات کا کوئی کھڑ تیل نہیں نکلا۔ انہوں نے ''دوسرے دور'' کے لیے وقت مانگنا چاہا، میں نے ابھی صاف جواب نہ دینے کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے انہیں ابھی کوئی وقت نہ دیا، تاہم اتنا ضرور ان سے کہہ دیا کہ آئندہ وہ مجھ سے یا چاچا انور شاہ سے ہی بات کریں گے، دادن شاہ کا اس میں کوئی کردار نہیں ہے اور ہم دونوں ہی بذاتِ خود ضلعی ٹرانسپورٹ کے صدر عطا محمد سے براہِ راست رابطے میں رہتے ہیں۔ وغیرہ۔

☆☆☆

وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ یعنی لینڈ مافیا نے ان ڈمی مذاکرات کے پیچھے جو چال چلی تھی اس کی ایک کامیاب جھلک مجھے اگلے دن کے اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ پڑھنے کو ملی تھی۔ جس کا لب لباب یہی تھا کہ انتظامیہ اور ضلعی لاری اڈا ٹرانسپورٹ کے درمیان مذاکرات کامیابی سے ہمکنار ہوئے ہیں اور مذکورہ ٹرانسپورٹ کمپنی کے کرتا دھرتا (جن میں میرا، انور شاہ اور ضلعی صدر عطا محمد کے نام شامل کیے گئے تھے) کی طرف سے نرم رویئے اور کچھ متبادل سہولیات ومراعات کے بدلے میں، نیز غریب عوام کی سفری سہولیات کو مدنگاہ رکھتے ہوئے لاری اڈے کو شہر سے باہر سپرہائی وے کی طرف منتقل کرنے کا اصولی فیصلہ کامیابی سے طے پا چکا تھا وغیرہ۔

ابھی میں اس جھوٹی خبر پر اندر ہی اندر بری طرح تلملا رہا تھا کہ سائیڈ باکس پر ایک اور نمایاں خبر پر بھی میری نگاہ پڑی۔ اس نے تو جیسے میرے ہاتھوں کے طوطے اڑا کر رکھ دیئے۔ میں آنکھیں پھاڑے یہ خبر پڑھنے لگا۔

(جاری ہے)

Downloaded From http://paksociety.com

بیت بازی

قارئین

(رفیق احمد ناز، ڈی جی خان کا جواب)

عباس شاہ..........سیالکوٹ

نہ منزلوں کو نہ ہم رہ گزر کو دیکھتے ہیں
عجب سفر ہے کہ بس ہم سفر کو دیکھتے ہیں

نزہت شیخ..........چنیوٹ

نام ہی کیا نشاں ہی کیا خواب و خیال ہو گئے
تیری مثال دے کے ہم تیری مثال ہو گئے

زریں مجید..........لاہور

ناز کو جس نے اپنا حق سمجھا
کیا تمہیں یاد ہے وہ بے چارہ

(عبدالحکیم ثمر کراچی کا جواب)

ندیم احسان..........چیچہ وطنی

دیکھی نہیں جاتی ہے اب انسان کی تذلیل
ٹپکا ہے لہو آج میرے دیدۂ تر سے

عاشق حسین..........ملتان

دل نے اکثر یہ تمنا کی ہے
تیری آواز کو چھو کر دیکھوں

(سیف اللہ ملک وال کا جواب)

انیس حیدر..........سکھر

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پہ گرے اور زخم آئے مجھے

نوازش حسن..........سیالکوٹ

یوں ہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

عباس قائم خانی..........حیدرآباد

یہ جہاں فانی ہے زندگی گزر جانی ہے
غموں کی اس دنیا میں ہم نے ہر ایک بات مانی ہے

نازش ممتاز..........کراچی

یہی ہے شان تمہاری زمیں پہ رہ کر بھی
فلک کے چاند ستاروں سے رابطہ کرنا

(رضا احمد اعوان بھکر کا جواب)

سید احمد چاند..........کراچی

کون سی خوشیاں لایا ہے جنوری
تم جو کہتے تھے برا ہے یہ دسمبر

(نعیم شاہ مظفر گڑھ کا جواب)

عبدالستار..........ساہیوال

دم آنکھوں میں ہے اور در پہ نظر ہے
وہ آجائیں تو قصہ مختصر ہے

نیلوفر شاہین..........اسلام آباد

دل گرچہ صورت پروانہ جلتا ہی رہا
زندگی میں ہم نے پائی پھر بھی رعنائی بہت

اقبال مجید..........اسلام آباد

دل کے آنگن میں تیری یادوں کے
کیسے تازہ گلاب اترے ہیں

(عینی گجرات کا جواب)

رفیق احمد ناز..........ڈیرہ غازی خان

اُدھر شب وصال یاراں اللہ اللہ
اِدھر ہجر اشکِ رواں اللہ اللہ

(ندیم زاہد سکھر کا جواب)

عبدالجبار رومی انصاری..........لاہور

ابھی تھی عقل و ہوش میں ساغر رہ حیات
میں لے کے تیرا نام فنا سے گزر گیا

(عبدالجبار رومی انصاری لاہور کا جواب)

اشفاق شاہین..........سیالکوٹ

یہ حلقۂ یاراں بھی ہے مجنوں ہمارا
ملنے کے لیے اب تو چلے آؤ ہمیں بھی

فرزانہ توحید..........فیصل آباد

یہ عشق چاٹ گیا ہے مرا بدن لیکن
کہ میری سوچ کے پنچھی کو آگہی تو ملی

Downloaded From http://paksociety.com

عنایت مسیح..........کراچی

یہ اشک یہ آہیں یہ حسرت یہ آٹھ پہر کی بے چینی
بس ایک نہیں دو چار نہیں احسان تمہارے اور بھی ہیں

(ہادیہ ایمان ماہا ایمان ڈاہرانوالہ کا جواب)

نور تبسم..........ہالہ نیو

یوں تو لکھنے کے لیے کیا نہیں لکھا میں نے
پھر بھی جتنا تجھے چاہا نہیں لکھا میں نے

عارف شیخ..........چنیوٹ

یہ کیسی دھند میں ہم تم سفر کا آغاز کر بیٹھے
تمہیں آنکھیں نہیں ملتیں ہمیں چہرہ نہیں ملتا

شبینہ جبران..........کوئٹہ

یوں ہی ہوتا رہا ہمیشہ سے
عدل روتا رہا زمانے میں

(حکیم سید محمد رضا شاہ نقوی میانوالی)

امتیاز حسن..........میانوالی

یہ کیسی سوچ ہے کیسا عمل ہے
خطا کر کے سزا سے لڑ رہا ہوں

منال اصغر..........سرگودھا

یہ جسم و روح بہت بعد میں بنے پہلے
میں ایک اسم کے اندر تھا اور دھمال میں تھا

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

یوسف حسن بخاری..........لاہور

دل چاہتا ہے غم میں ابھی مبتلا رہے
اس بے وفا کے ساتھ کوئی رابطہ رہے

(حریم بنت کاشف حیدر آباد کا جواب)

عباس علی ملک..........فیصل آباد

یہ کیسی محبت ہے اب تک نہ سمجھ پائے
غیروں کو منا لینا اپنوں کو خفا رکھنا

(زوہیب علی جہلم کا جواب)

نیلوفر شاہین..........اسلام آباد

حسرت وصل و کلفتِ فرقت کیا کچھ اپنے پاس نہیں
آس میں ڈوبا ایک ایک دن اوس میں ڈوبی اک اک رات

نوشین کنول..........جھنگ

اے خدا میری دعاؤں میں اثر بھی ہو گا
میرے آنگن میں کبھی سکھ کا گزر بھی ہو گا

ندرت علی..........لاہور

انہیں دیکھا ہے سر نوکِ سناں
سر جو سجدے میں اتر جاتے ہیں

نعمان اختر..........چنیوٹ

اس توقع پہ سہی دھوپ سفر کی افضل
رہگزاروں میں کہیں پر تو شجر بھی ہو گا

اقبال حسن..........لاہور

اک طرف آزاد خوشیاں اک طرف رنج و غم
زیست کے طوفان کے دو دھارے میرے دامن میں ہیں

(ہما اختر مظفر گڑھ کا جواب)

سید محمد حسین شاہ..........کراچی

لوحِ مزار دیکھ کے جی دنگ رہ گیا
ہر ایک سر کے ساتھ فقط سنگ رہ گیا

نسرین مجتبیٰ..........لاہور

حال کا لمحہ ماضی کی ایک ایک صدی پر بھاری ہے
کیا جانے کس آنے والے دور کی یہ تیاری ہے

(فہیم الدین ملک وال کا جواب)

عبدالحکیم ثمر..........کراچی

ایک نگاہِ ناز سے جانے کتنے دل غمناک ہوئے
ایک پریشاں زلف کے ہاتھوں کیا کیا دامن چاک ہوئے

(محمد ثاقب ملتان کا جواب)

سید محمد حسین شاہ..........کراچی

آج کی سوہنیوں پہ قہر
ٹھاٹھیں لیتے چناب اترے ہیں

ارشد حسن..........میانوالی

ان کی آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت میری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

ظہیر احمد تبسم..........کراچی

یہ عشق نے کیا سزا سونپ دی ہم کو
آگے بڑھیں تو سب خفا پیچھے ہٹیں تو بے وفا

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

Downloaded From http://paksociety.com

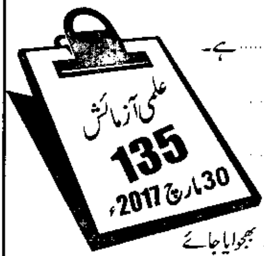

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے

کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 مارچ 2017ء تک علمی آزمائش 135 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ
بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ''بیت بازی'' شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کررہا ہوں اسے شامل اشاعت کرلیں

(شعر الگ کاغذ پر ہے) 96

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ'
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ'
ماہنامہ پاکیزہ' ماہنامہ سرگزشت'

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں
ثمر عباس 0301-2454188
سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200
فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

Downloaded From http://paksociety.com

علمی آزمائش۔ 135

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماھنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماھنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 مارچ 2017ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

سندھ کے معروف اور اہم شہر میں پیدا ہوئے۔ لندن سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ بمبئی میں وکالت کرنے لگے پھر سیاست میں آکر برصغیر کی ایک بڑی سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کی لیکن جلد احساس ہو گیا کہ ہندو مسلمانوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ اس لیے احتجاجاً پارٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ برصغیر کے مسلمانوں میں بیداری پھیل رہی تھی سو انہوں نے مسلمانوں کی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ ان کے آنے سے مسلمانوں کی پارٹی میں جان پڑ گئی اور وہ پارٹی تیزی سے مقبولیت پا گئی۔ اسی شہر کراچی میں ان کا مدفن ہے۔

علمی آزمائش 133 کا جواب

بانو قدسیہ فیروز پور مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئیں۔ لاہور سے ریاضی اور معاشیات میں بی اے پھر اردو میں ایم اے کیا۔ ریڈیو ٹی وی کے لیے بے شمار ڈرامے تحریر کیے۔ حکومت نے تمغہ امتیاز سے نوازا۔

انعام یافتگان

1- نصیر علی، مظفر گڑھ 2- شجاع زیدی، حیدر آباد 3- نوشین ملک، سکھر
4- پروین اختر قزلباش، اسلام آباد 5- احمد توحید، فیصل آباد

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

سرگودھا سے فرختندہ یاسمین، عبادت حسین زیدی، نعمان ملک۔ تلہ گنگ سے وصی الحق، احمد الدین ملک۔ چنیوٹ سے خورشید رضوی، عباس احمد، انعام اللہ۔ شجاع آباد سے خالہ یاسر، امتیاز زیدی، اقرار الحسن۔ جھنگ سے ناصر قاضی، علیم الدین، التماس عباس، شاہ فخر عالم۔ ڈی جی خان سے یوسف شاہ، توحید اللہ، نیاز احمد، شیخ پیار علی۔ ڈی آئی خان سے مغنی ایاز، خالد یوسف۔ گجرات سے انیس طاہر، احمد جاوید، ملک فیروز۔ خانیوال سے ناہید عباسی، نصیر بٹ، فرزانہ کاشف۔

Downloaded From http://paksociety.com

شادی پور سے لطیف الرحمن۔ میر پور آزاد کشمیر سے یوسف خان، نیتا بٹ۔ خیر پور سے احمد علی زیدی، نعمان حسن۔ میر پور ماتھیلو سے فہد سومرو۔ میر پور خاص سے سلطان جوکھیو، فیض مصطفی عطاری، امتیاز کامل، ذیشان۔ جیکب آباد سے ذوالفقار خان، راحت علی۔ کراچی سے رضیہ مسعود، نوید سراج، عنایت گجر، خاقان احمد، نبیل اختر، فرحت عباس نقوی، عنایت مسیح، الیاس محمد عطاری، غلام حسن، نذر حسین، صباحت مرزا، طفیل احمد، باسط فاروقی، نعمان خان، سید غلام حسن رضوی، محمد احمد، یاسین خان، منظر حسن، وردہ بتول، اکبر علی، عنبرین اختر، مولیٰ بخش بٹ، ارشد علی، اسرار احمد، تنویر حسین، ہارون محمد، فتح یاب خان، انیس بھٹو، سعید الدین مروت، خواجہ خیر محمد، مہوش علی خان، صوفی محمد فیضان، نواز سلیم کھوکھر، فرحین بشیر، غلام پنجتن نقوی، فیروز رحمانی، احمد علی، سلطان محمد، رضا خان رضوی، نثار حسن نثار، سید محمد رضی رضوی، نوازش خان، سلمان اختر، تاثیر حسن، رحیم اللہ، ثمینہ گل حسن، عباس علی خان، کائنات بتول، نیر علی خان، احسن انصاری، کلیم اللہ گجراتی، عنایت عباس۔ سکھر سے نجم الدین ثاقب، ذیشان ملک، افسر علی، سلیمان بھٹو، کریم الدین۔ اوکاڑہ سے وجیہہ الدین خان، سلیم اللہ، محمد فیروز، کاوش انصاری۔ لاہور سے کائنات مرزا، عباس رضا سید، احمد علی بٹ، نیاز احمد، اصغر حسین، کبیر الحسن، دبیر الحسن، یاسمین مرزا، سید فہد حسن اجمال، انصار حسن، نزہت الیاس، محمد صدر الدین، حسن قزلباش، ابرار بٹ، سلیم اللہ چوہان، ارباز خان، مرزا ارسلان بیگ، نوازش بٹ، ارباب جان، نکہت افروز، زاہد بٹ، نعمان اسلم، قدوس علی، برکت اللہ نیازی، زاہد تسلیم، شاہد فاروقی، نصرت اللہ، فیضان خان، اطہر قزلباش وحید بٹ، انعام الحسن ادیب، جاوید ماہی، ناصر علی خان۔ نوشہرہ کے پی کے سے غلام سبحانی، نعمت خان۔ ملتان سے عنبرین چشتی، محمد یحییٰ معین، محمد فضل اللہ، ایاز رضویہ نوید اصغر۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ، فیصل سلمان، سعید احمد، نوید الٰہی، بشریٰ افضل۔ ساہیوال سے کاظم علی، فتح محمد، رخسانہ الیاس، زیب علی، سلطان شاہ۔ ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی۔ ساہیوال سے: نصرت فتح خان، اسد خان، چوہدری اشفاق اللہ، عباس سید۔ میر پور خاص سے: مرزا طاہر الدین بیگ، ضوریز اختر، محمد طلحہ جان سرہندی، شہلا انیس، شازیہ انیس، ملکہ نوشین۔ میر پور، آزاد کشمیر سے: طلحہ جان، نصیر بٹ۔ گلگت سے: محمود الحسن شاہ، جان شاہ، حب علی، دلدار حسن۔ حیدر آباد سے: آصف کریم، نسرین یاسین، ملک نوروز، فتح محمد، نعمان قریشی، مرزا اسد بیگ، ابرار شیخ، رفیع اللہ انصاری، صالح لدین، نعیم انصاری، نصرت جہاں۔ بہاولنگر سے: سلیم کامریڈ (کھاٹاں) ضیغم علی۔ ڈگری سے: نعیم شاہ، فرحال ٹھوکر، شازیہ حسن۔ بہاولپور سے: آمنہ ملک، زرولی خان، اشرف حسین۔ چنیوٹ سے: مصطفی حسن زیدی۔ بٹگرام سے: آصف خان اچکزئی۔ دیپال پور سے: امیر الدین نظامی۔ ہارون آباد سے: غزالہ فرحت۔ گجرات سے: سید اظہار الحسنین جعفری۔ حویلی لکھا سے: دلنواز خان حسن زئی۔ ڈی جی خان سے: محبوب حسین نادر۔ پاک پتن سے: کاشان حسین۔ جہلم سے: محمد خلیل چودھری (دینہ) شیر محمد، شبیر وائین، نوشین اطہر۔ نوشہرہ سے: فضل محمد، نعمت اللہ۔ سیالکوٹ سے: نوید شہزاد خواجہ، عباس لائلی۔ سرگودھا سے: طارق سلطان قریشی، عارف شاہ، نوید اظہر۔ واہ کینٹ سے: نور افضل خان خٹک، ماریہ عرفان، فیض جوکھیو۔ گوجرانوالہ سے: ندیم شوکت، نعمان اشرف۔ پشاور سے: فائزہ شہزاد، جویریہ شیر نواز، شمشیر سنگھ خالصہ۔ جام شورو سے: منصور احمد، ابرار بھٹو، نواز علی لاشاری، محمد شاہد خان۔ حافظ آباد سے: محمد ابراہیم، محمد صدیق مستری۔ کوہاٹ سے فدا حسین طوری، مدحت، اکبر علی، قاسم جان۔ شیخوپورہ سے ثریا فاطمہ، مومن علی، نازش جمیل، عباس علی خان۔ مظفر گڑھ سے نعمان ملک، فیض احسن، ساجد علی، ریاض حسن۔ حیدر آباد سے محمد محی الدین، سحرش بتول، یونس انصاری، اطہر علی، لطیف الحسن، ناصر شیرازی، طارق حسن، نصیر فردوس۔ بہاولنگر سے افضال محمد، سلیم خان، جاوید علی، سیف خانزادہ۔ جہلم سے ناصر کوکب خان، ضیاء الدین، فیاض بٹ، ملک ایاز احمد۔ پشاور سے نجم شاہ، اصغر علی، قیوم حسن، احمد خان، بی گل۔ راولپنڈی سے عباس بٹ، عارفہ شاہین، زوہیب گل، نثار اختر، فیضان علی، سید بقا اللہ، ادیب اختر ادیب، ممتاز عادل، نکہت مرتضیٰ، محمد شاہین۔ اسلام آباد سے افسر خان، گل زیب، فیاض ہاشمی، پرویز اختر، نوشاد حسن، نیلوفر شاہین، فیروز حسن ایڈووکیٹ، ناظم حسن، سعید پیرزادہ، ضیاء اسلام، ممتاز الدین انصاری، فصیح خان، جاوید سید، فیضان چشتی۔ واہ کینٹ سے عباس علی بٹ، ذوالفقار حسن نقوی، نثار احمد خان، انیس احمد، کائنات فاطمہ، ذیشان ملک، زبیر رانا، عاشق علی ترمذی، اختر علی اختر چارچوی۔ بہاولپور سے اشفاق الدین، ناصر حسین ناصری۔

ممالک غیر سے الیاس حسن، ایم ایس سلمان (دبئی)۔ سعید حسن (جرمنی)۔

Downloaded From http://paksociety.com

شطرنج کی چال

محترم مدیر
السلام علیکم
کسی نے سچ کہا ہے کہ یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب اداکار۔ اپنا اپنا کھیل دکھا رہے ہیں۔ میری سرگزشت میں دو کردار ایسے ہیں جن کی وجہ سے میری زندگی بدلی۔ ایک میری بہن اور دوسرے راشد صاحب۔ ان دونوں کا کردار آپ بھی ملاحظہ کریں۔

مسز راشد
(لاہور)

آج میری پھر بے عزتی ہوئی تھی۔ راشد نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر اتنا ڈانٹا کہ میرے آنسو نکل آئے۔ حالانکہ بات بہت معمولی تھی۔ ایک خط وقت پر ڈسپیچ ہونے سے رہ گیا۔ جس کی میری نظروں میں اتنی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ وہ ایک عام سا تعارفی خط تھا جو کسی متوقع کلائنٹ کو بھیجنا تھا اور اگر وہ ایک دن بعد بھی چلا جاتا تو کوئی قیامت نہیں آتی لیکن راشد کو تو بہانہ چاہیے تھا جب تک وہ دن میں دو چار ملازمین کی بے عزتی نہ کر لیتا۔ اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔ مجھ پر تو وہ کچھ زیادہ ہی مہربان تھا۔ میری چھوٹی سی چھوٹی غلطی فوراً پکڑ لیتا اور پھر اس کی بکواس شروع ہو جاتی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ وہ میرے کمزور بیک گراؤنڈ سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ میں انتہائی مجبوری کے عالم میں نوکری کر رہی ہوں اور مجھ پر دو بوڑھے والدین کے علاوہ ایک بیوہ بہن کی بھی ذمے داری ہے اگر میں مجبوریوں کے جال میں جکڑی ہوئی نہ ہوتی تو کھڑے کھڑے یہ نوکری چھوڑ دیتی۔

میرا بچپن بڑے ناز و نعم میں گزرا۔ پاپا ایک کالج میں لیکچرار تھے۔ اس زمانے میں تنخواہ اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن ہمارا گزارہ اچھے طریقے سے ہو رہا تھا۔ میرے والدین سادگی پسند تھے اور ان کی ضروریات بڑی محدود تھیں۔ پاپا کو سگریٹ پان وغیرہ کی لت نہیں تھی اور نہ ہی ان کا کوئی اور خرچ تھا۔ سال میں دو جوڑے کپڑے بناتے اور اسی میں گزارہ کرتے۔ یہی حال امی کا تھا۔ دوسری عورتوں کی طرح انہیں اچھے کپڑے پہننے، شاپنگ کرنے یا گھومنے پھرنے کا شوق نہیں تھا۔ پاپا جو کچھ ان کے ہاتھ پر رکھتے وہ اسی میں مہینا پورا کرتیں۔ البتہ ہم دونوں بہنوں کو انہوں نے کسی قسم کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ موقع کی مناسبت سے ہمارے کپڑے بھی بنتے اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھی مہیا کی جاتیں۔

میں پڑھائی میں شروع سے ہی تیز تھی اور میں نے سوچ رکھا تھا کہ بڑے ہو کر ڈاکٹر بنوں گی لیکن شاہدہ باجی کو پڑھائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جیسے تیسے انہوں نے انٹر کیا اور گھر بیٹھ گئیں۔ البتہ گھر کے کاموں میں ان کا خوب دل لگتا تھا۔ یہ دیکھتے ہوئے امی نے انہیں ایک سلائی اسکول میں

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

داخلہ دلوا دیا اور وہ چھ مہینے میں ہی نئے نئے ڈیزائن کے کپڑے سینے لگیں۔ وہ مجھ سے اکثر کہا کرتی تھیں۔ ''اگر ہمارے پاس پیسے ہوتے تو میں اپنا بوتیک کھولتی۔''

میں دل ہی دل میں مسکرا کر رہ جاتی کیونکہ پاپا کی آمدنی اتنی نہیں تھی کہ وہ باجی کی خواہش پوری کر سکتے جو کماتے وہ گھر میں ہی خرچ ہو جاتا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ ان کے اکاؤنٹ میں چند ہزار بھی ہوں گے اس لیے میں نے باجی کو مشورہ دیا کہ اگر وہ اپنے ہنر سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہیں تو محلے والوں اور جان پہچان کے لوگوں کے کپڑے سینا شروع کر دیں۔ ان کا ہاتھ بھی صاف ہوگا اور چار پیسے بھی ملیں گے لیکن باجی نے اس تجویز کو سختی سے مسترد کر دیا اور بولیں۔ ''تم نے وہ مثل سنی ہے کہ گھر کی مرغی دال برابر۔ یہی عورتیں درزی کو ایک سوٹ کے منہ مانگے پیسے دے سکتی ہیں لیکن مجھے دو سو روپے دیتے ہوئے بھی ان کی جان جائے گی اور کام میں سو نقص نکالیں گی وہ الگ۔ اس سے تو اچھا ہے کہ میں گھر داری کے کام میں امی کا ہاتھ بٹاؤں تاکہ انہیں بھی کچھ آرام ملے۔''

وقت کا پہیا دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا۔ انہی دنوں باجی کے لیے ایک بہت اچھا رشتہ آیا۔ ندیم بھائی بینک میں آفیسر تھے۔ ان کے بڑے بھائی ملک سے باہر تھے۔ بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور گھر میں بوڑھی ماں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ بھی اکثر بیمار رہا کرتی تھیں۔ اسی لیے ان کی خواہش تھی کہ جلد از جلد بیٹے کے سر پر سہرا دیکھ لیں۔ پاپا نے مناسب تحقیق کے بعد یہ رشتہ قبول کر لیا اور چند ماہ بعد باجی بیاہ کر اپنی سسرال چلی گئیں۔

باجی کی شادی میں پاپا بہت زیر بار ہو گئے۔ ان کے اکاؤنٹ میں بہت معمولی رقم تھی۔ اس لیے پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لینا پڑا۔ امی نے دو کمیٹیاں ڈال رکھی تھیں۔ وہ پیسے مل گئے۔ انہوں نے اس طرح جیسے تیسے باجی کی شادی کر دی۔ حالانکہ امی نے برات کے کھانے اور جہیز میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور انہیں ضرورت کی ہر چیز مثلاً بیڈ روم سیٹ، ٹی وی، فریج، ڈنر سیٹ، برتن، کٹلری اور الیکٹرونکس کا سامان سمیت سب کچھ دیا۔ اس کے باوجود باجی کی سسرال والوں خصوصاً نندوں کے منہ بنے ہوئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پہنائی کے جوڑے نہ ملنے پر ناراض تھیں جب کہ امی نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ہمارے یہاں پہنائی دینے کا رواج نہیں ہے۔

اس کے بعد ہمارے گھر میں تنگی نے ڈیرا ڈال لیا۔ پاپا کی تنخواہ میں سے قرضہ کی قسط کٹ جاتی اور امی بھی کمیٹیوں کے پیسے بھر رہی تھیں۔ میں صورتِ حال کی سنگینی کو سمجھ رہی تھی لیکن میرے بس میں کچھ نہیں تھا۔ ملازمت کے بارے میں سوچا لیکن اس میں دو مسئلے تھے۔ اول تو گھر سے اجازت نہ ملتی۔ دوسرے فرسٹ ایئر کی طالبہ کو کون پوچھتا۔ بہت سوچنے سمجھنے کے بعد میں نے ایک فیصلہ کیا اور محلے کے چند بچوں کو جمع کر کے گھر پر ٹیوشن پڑھانا شروع کر دی۔ اس پر بھی امی نے بہت واویلا مچایا لیکن میں نے یہ کہہ کر انہیں خاموش کرا دیا کہ دو گھنٹے ٹیوشن پڑھانے سے میرا کچھ نہیں بگڑے گا لیکن اس طرح میں کم از کم اپنا خرچ اٹھانے کے قابل ہو جاؤں گی۔

باجی کی شادی کو ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ پے در

Downloaded From http://paksociety.com

پے دو حادثات پیش آئے۔ ندیم بھائی موٹر سائیکل پر گھر واپس آرہے تھے کہ انہیں ایک ٹرک نے ٹکر ماردی اور یوں باجی بیوہ ہوکر میکے واپس آگئیں۔ یہ صدمہ اتنا شدید تھا کہ اس کے اثرات سے گھر کا کوئی فرد بھی محفوظ نہ رہ سکا لیکن پاپا نے اس کا کچھ زیادہ ہی اثر لیا اور وہ گم صم رہنے لگے۔ چند ماہ بعد انہیں دل کا دورہ پڑا اور وہ بستر سے لگ گئے۔ ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ کسی پرائیویٹ اسپتال میں ان کا علاج ہوسکتا۔ لہٰذا ہماری دوڑ سرکاری اسپتال تک محدود رہی۔ البتہ شارق کی وجہ سے کافی سہولت ہوگئی تھی۔ وہ میرا خالہ زاد بھائی تھا اور ایم بی بی ایس کرنے کے بعد کارڈیو ویسکولر میں جاب کررہا تھا جس دن وہ ڈیوٹی پر ہوتا تو پاپا کا نمبر جلدی آجاتا ورنہ کئی کئی گھنٹے او پی ڈی میں انتظار کرنا پڑتا تھا۔

پاپا کو مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں کافی وقت لگا۔ اس کے بعد بھی ڈاکٹروں نے انہیں کام کرنے سے منع کردیا تھا کیونکہ معمولی سی تھکن یا بوجھ ان کے لیے نقصان دہ ہوسکتا تھا۔ لہٰذا انہیں بقیہ زندگی گھر پر ہی آرام کرنا تھا چنانچہ انہیں قبل از وقت ریٹائرمنٹ لینا پڑگئی۔

اس پریشانی میں ٹھیک طرح سے امتحان کی تیاری نہ کرسکی اور سیکنڈ ایئر میں اتنے نمبر نہیں آسکے کہ مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ مل سکتا۔ ویسے بھی اب ہمارے حالات ایسے نہیں تھے کہ میں مزید پانچ سال اپنی تعلیم جاری رکھ سکتی۔ پاپا کو ریٹائرمنٹ پر جو پیسا ملا۔ وہ انہوں نے میری شادی کے لیے بینک میں محفوظ کردیا تھا اور ہمارا گزارہ ان کی پنشن پر تھا جو اتنی قلیل تھی کہ اس میں ہمارے لیے ایک وقت کی روٹی کھانا مشکل ہورہا تھا۔ مجبور ہوکر میں ملازمت کی تلاش میں نکل پڑی۔

تین چار ماہ تک مختلف دفتروں کے چکر کاٹنے کے بعد بھی مجھے کوئی ملازمت نہیں ملی تو میں بری طرح مایوس ہوگئی۔ ہر جگہ گریجویٹ مانگتے تھے جب کہ میں صرف انٹر سائنس تھی اور میرے پاس ایک دن کا بھی تجربہ نہیں تھا۔ اس وقت شارق نے میری بڑی ہمت بندھائی۔ وہ پاپا کو دیکھنے ہر دوسرے چوتھے روز آیا کرتا تھا۔ اس نے بھی میرے لیے کئی لوگوں سے بات کررکھی تھی لیکن کہیں کام نہیں بن رہا تھا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے باجی نے گھر پر ہی سلائی کا کام شروع کردیا اور محلے کی عورتیں ان سے کپڑے سلوانے لگیں لیکن اس قلیل آمدنی سے بس ان کا ہی گزارہ ہورہا تھا۔ شارق نے کوشش کرکے مجھے بھی ایک ٹیوشن سینٹر میں لگوادیا تھا جہاں میں نویں اور دسویں کے طالب علموں کو سائنس کے مضامین پڑھاتی تھی۔

ایک دن میں حسب معمول ملازمت کی تلاش میں ایک بڑی عمارت کی کار پارکنگ سے گزر رہی تھی کہ مجھے ایک کار کے پاس پیکٹ پڑا ہوا نظر آیا۔ میں نے لپک کر اسے اٹھالیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی کہ شاید کار کا مالک اس پیکٹ کو ڈھونڈتا ہوا آجائے چونکہ میں وہ پیکٹ اٹھا چکی تھی۔ اس لیے مجھ پر لازم ہوگیا تھا کہ اسے اس کے مالک تک پہنچا دوں۔ چنانچہ میں وہیں کھڑے ہوکر اس کا انتظار کرنے لگی۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گاڑی کے پاس آیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا پھر پچھلی سیٹ دیکھی وہ مایوسی کے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گئی کہ یہ پیکٹ اسی شخص کا ہے اور غالباً گاڑی سے اترتے ہوئے اس کے ہاتھ سے گر گیا ہوگا۔ میں جھجکتے ہوئے آگے بڑھی اور لفافہ اس کے آگے کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ لفافہ آپ کا ہے؟''

اس نے لپک کر وہ لفافہ میرے ہاتھ سے لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں لیکن یہ تمہیں کہاں سے ملا؟''

''یہیں زمین پر۔ آپ کی گاڑی کے پاس پڑا ہوا تھا۔''

''لیکن تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ یہ میرا لفافہ ہے؟''

''ظاہر ہے کہ آپ کی گاڑی کے پاس گرا ہے تو آپ کا ہوگا۔ میں نے یہ لفافہ اسی لیے اٹھالیا تھا کہ آپ جب آئیں گے تو دے دوں گی۔''

اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''گویا تم یہ لفافہ دینے کے لیے آدھ گھنٹا سے میرا انتظار کررہی ہو؟''

''شاید، میرے پاس گھڑی نہیں ہے۔''

''میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ تم نے یہ لفافہ دے کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے اس میں انتہائی اہم کاغذات ہیں اگر یہ نہ ملتے تو میرا بڑا نقصان ہوجاتا۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے بٹوہ نکالا اور ایک ہزار کا نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ لو، تمہارا انعام۔''

''معاف کیجیے۔ میں نے انعام کے لالچ میں یہ کام نہیں کیا ہے۔ میں یہ نوٹ نہیں لے سکتی۔''

Downloaded From http://paksociety.com

''رکھ لو۔ میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں۔''
''جی نہیں میں اپنے گھر والوں کو کیا بتاؤں گی۔ پاپا بہت ناراض ہوں گے۔''
وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم کیا کرتی ہو؟''
''میرا نام نجمہ ہے۔ میں نے انٹر سائنس تک تعلیم حاصل کی ہے لیکن گھریلو حالات کی وجہ سے پڑھائی جاری نہ رکھ سکی اور اب ملازمت کی تلاش میں ہوں۔''
اس نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر مجھے دیا اور بولا۔ ''کل صبح نو بجے میرے دفتر آجاؤ۔ میں دیکھوں گا کہ تمہارا لیے کیا کر سکتا ہوں لیکن وقت پر آجانا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد میں تمہیں نہ مل سکوں۔''
میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے وہ کارڈ اپنے پرس میں رکھ لیا اور گھر آکر پاپا کو سارا واقعہ سنا دیا۔ انہوں نے پہلے تو مجھے شاباش دی کہ میں نے اخلاقی ذمے داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ پیکٹ اس کے مالک کے حوالے کیا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ''میری بڑی خواہش تھی کہ تم اپنی تعلیم جاری رکھتیں لیکن حالات نے مجھے بے بس کر دیا ہے۔''
''پاپا آپ کی خواہش ضرور پوری ہوگی۔ میں جاب کے ساتھ ساتھ ہی کام کی تیاری بھی کروں گی۔''
''خوش رہو بیٹا۔ اپنا خیال رکھنا۔''
دوسرے دن میں مقررہ وقت سے پانچ منٹ پہلے ہی اس کے دفتر پہنچ گئی جو آئی آئی چندریگر روڈ پر تھا۔ استقبالیہ پر ایک خوب صورت سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو اس نے مسکراتے ہوئے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود انٹر کام پر کسی سے باتیں کرنے لگی۔ پانچ منٹ بعد اس نے کہا۔ ''جائیے داہنے ہاتھ پر آخری کمرا ہے۔''
میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس جانب بڑھی۔ دروازے پر راشد علی خان کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور اندر چلی گئی۔ سامنے ہی اس کی سیکریٹری بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنے ساتھ لے کر برابر والے کمرا میں چلی گئی۔
میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا اور واپس چلی گئی۔ سامنے ایک بڑی سی میز پر وہی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم نے وقت کی پابندی کا خیال رکھا۔ بائی داوے تمہاری رہائش کہاں ہے؟''
''دستگیر۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔
''اوہ...... وہ تو یہاں سے کافی فاصلے پر ہے اور صبح میں ٹریفک بھی کافی ہوتا ہے۔''
''جی اسی لیے میں ایک گھنٹا پہلے گھر سے نکل پڑی تھی۔''
''اچھا کیا۔ اپنے کاغذات لائی ہو؟''
''جی۔'' میں نے لفافے میں سے اپنے کاغذات نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ وہ ان پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا ریکارڈ تو بہت اچھا ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکیں۔ خیر تمہارے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔''
''جی میں آپ کی مشکور رہوں گی۔''
''دیکھو نجمہ یہ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہے اور یہاں انہی لوگوں کو ملازمت دی جاتی ہے جن کے پاس اس فیلڈ میں مہارت اور تجربہ ہو جب کہ تم صرف انٹر پاس ہو اور تمہارے پاس کوئی تجربہ بھی نہیں ہے لیکن میں تمہاری ایمان داری اور شرافت سے بہت متاثر ہوا ہوں اور تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ تم چاہو تو کل سے ہی یہ دفتر جوائن کر سکتی ہو۔ فی الحال تمہیں ڈسپیچ کلرک کے طور پر کام کرنا ہوگا۔ تنخواہ دس ہزار اور دیگر مراعات بھی ملیں گی۔ میرا مشورہ ہے کہ تم ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیمی قابلیت میں بھی اضافہ کرو۔ اس طرح تمہارے لیے ترقی کا راستہ ہموار ہو جائے گا اگر میری پیشکش منظور ہے تو کل سے کام پر آسکتی ہو۔''
''او کے سر، مجھے منظور ہے۔''
گھر آکر میں نے یہ خبر سنائی تو پاپا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انہوں نے مجھے ڈاکٹر بنانے کا خواب دیکھا تھا مگر حالات کے جبر نے مجھے ڈسپیچ کلرک کی ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں ان کا دکھ سمجھتی تھی۔ اس لیے ان کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ''پاپا آپ دل چھوٹا مت کریں۔ یہ ایک عارضی بندوبست ہے۔ میں مزید تعلیم ضرور حاصل کروں گی اور دو سال بعد آپ مجھے کسی اچھی جگہ پر دیکھیں گے۔''
''انشاء اللہ۔'' انہوں نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔
اگلے روز سے میں نے دفتر جانا شروع کر دیا۔ میں نے ریسپشن پر اپنی آمد کی اطلاع دی تو اس نے مجھے ایک بار پھر راشد کے کمرے میں بھیج دیا لیکن اس مرتبہ اس کی سیکریٹری نے ہی مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور مجھے ایک لفافہ پکڑاتے ہوئے بولی۔ ''یہ رہا آپ کا اپائنٹمنٹ لیٹر اسے پڑھ لیں۔''
میں نے لفافہ کھول کر وہ خط پڑھا۔ اس میں سب

Downloaded From http://paksociety.com

باتیں وہی لکھی ہوئی تھیں جو راشد نے مجھے بتائی تھیں۔ میں نے وہ خط پڑھ کر اپنے پرس میں رکھ لیا تو سیکریٹری بولی۔ "آپ درانی صاحب کو رپورٹ کریں۔ برابر والا کمرا انہی کا ہے۔"

میں اس کا شکریہ ادا کرکے درانی صاحب کے کمرے میں چلی گئی۔ ان کے دروازے پر جنرل مینیجر کی تختی لگی ہوئی تھی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کے شفیق سے انسان تھے۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ کمپنی میں راشد کے بعد دوسری پوزیشن انہی کی تھی۔ انہوں نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا اور بولے۔ "یہ آپ کی پہلی ملازمت ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپ کو یہاں کے بارے میں کچھ بنیادی باتیں بتا دی جائیں۔ کسی بھی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں وقت کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ ذرا سی غفلت یا بے پروائی سے بہت بڑا نقصان ہوسکتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ کے کام کی بڑی اہمیت ہے۔ آپ کے پاس جو بھی ڈاک آئے۔ اس کا اپنے رجسٹر میں اندراج کرکے فوراً آگے بڑھا دیں۔ اس کے بعد آپ کی ذمے داری ختم ہوجائے گی۔"

"میں نے دل میں سوچا کہ یہ کون سا مشکل کام ہے۔ میرے پاس جو بھی ڈاک آئے گی اسے فوراً آگے بڑھا دوں گی۔ مجھے اپنے پاس رکھ کر اس کا اچار ڈالنا ہے۔ اچھا ہے کہ میری میز خالی ہی رہے۔"

"ایک بات اور۔" درانی صاحب بولے۔ "راشد صاحب مزاج کے بہت سخت ہیں اور کام کے معاملے میں تاخیر بالکل برداشت نہیں کرتے۔ کوشش کریں کہ انہیں شکایت کا موقع نہ ملے۔"

"جی بہت اچھا۔"

میرا خیال تھا کہ وہ مجھے ڈرانے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں لیکن جب اپنی سیٹ پر گئی تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہاں تو خطوط کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ابھی میں اپنے حواس قابو میں کرنے کی کوشش کررہی تھی کہ ایک لڑکی میرے پاس آئی اور مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی۔ "میرا نام فرزانہ ہے۔ تم سے پہلے جو لڑکی یہاں کام کرتی تھی۔ وہ دو دن پہلے ملازمت چھوڑ کر چلی گئی۔ اسی لیے اتنی ڈاک جمع ہوگئی ہے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ کیا کرنا ہے۔"

میری میز پر دو رجسٹر رکھے ہوئے تھے۔ ایک میں آنے والی ڈاک کا اندراج کرنا تھا اور دوسرے میں باہر جانے والی کا۔ اس کے علاوہ جو خطوط دفتر کے لوگوں کو دینا ہوتے تھے۔ ان کا اندراج پیون بک میں بھی کیا جاتا تھا تاکہ وہ اس میں دستخط کرکے اپنی ڈاک وصول کرلیں۔ میں نے اللہ کا نام لے کر کام شروع کیا اور لنچ تک ساری ڈاک نمٹا دی۔ میری معاونت کے لیے آفس بوائے شبیر تھا جو دفتر کے لوگوں میں ڈاک تقسیم کیا کرتا تھا۔ لنچ کا وقفہ ہوا تو فرزانہ ایک بار پھر میرے پاس آئی اور بولی۔ "لنچ لے کر آئی ہو؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ "آج تم میری مہمان ہو۔ میرے ساتھ ہی لنچ کروگی۔"

میں نے انکار کرنا چاہا لیکن وہ زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے گئی اور شبیر کو بھیج کر میرے لیے کھانا منگوایا۔

کھانے کے دوران اس نے کہا۔ "آج تو تمہیں کام کی زیادتی کی وجہ سے کچھ دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہوگا لیکن دو تین روز میں تم یہاں کے ماحول سے اچھی طرح واقف ہو جاؤ گی۔"

"کوئی خاص بات ہے کیا؟" میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

"میں وہی بتانا چاہ رہی ہوں۔" اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "دراصل باس بہت سخت مزاج ہے۔ غصہ تو اس کی ناک پر دھرا رہتا ہے اور وہ معمولی سی بات پر لوگوں کی بے عزتی کردیتا ہے۔ سارا اسٹاف اس سے تنگ ہے۔ میں خود بھی عاجز آچکی ہوں لیکن کیا کروں مجبوری ہے۔ آج کل دوسری ملازمت اتنی آسانی سے نہیں ملتی۔"

"میں کوشش کروں گی کہ انہیں شکایت کا موقع نہ دوں۔"

"تم چاہے کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرلو کام کے دوران کوئی نہ کوئی ... غلطی ہو ہی جاتی ہے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

فرزانہ کا کہا ہوا حرف بہ حرف سچ ثابت ہوا۔ مجھے کام کرتے ہوئے دو ہفتے ہی ہوئے ہوں گے کہ ایک دن میری طلبی ہوگئی۔ میں ڈرتے ڈرتے اس کے کمرے میں گئی تو وہ چلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے تم سے اس غیر ذمے داری کی توقع نہیں تھی۔"

میں حیران ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھ سے ایسی کیا خطا سرزد ہوگئی جو وہ اس طرح آگ بگولا ہوا تھا۔ بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا۔ "میں کچھ سمجھی نہیں سر۔"

"تمہیں سمجھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ نقصان تو میرا ہوا ہے نا۔ یہ دیکھو یہ ہے تمہارا کارنامہ۔" وہ ایک کاغذ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

Downloaded From http://paksociety.com

پنجاب کے زرخیز اور متمدن خطے کو آریوں نے اپنا مسکن بنایا اور اصل دراوڑی باشندے انڈیا کے مشرق اور جنوب کو بھاگتے گئے۔ ان آریوں نے ہندو مذہب کی بنیاد رکھی اور خود کو برہمن، کشتریہ اور ویش کے مرکزی طبقات یا ذاتوں میں تقسیم کیا۔ مقامی باشندوں کو خدمت گاری اور غلیظ کاموں کے لیے مختص کر کے انہیں شودر اور اچھوت بنا دیا گیا۔ سکندر کے حملے نے معاشرتی ساخت پر کوئی خاص اثرات مرتب نہ کیے۔ 712ء میں محمد بن قاسم کا حملہ پنجاب کے طبقات اور ذاتوں میں بہت زیادہ ابتری کا باعث بنا۔ بعد کے ایک ہزار برس میں مسلمانوں کے حملوں اور سلطنتوں نے ذات پات کے نظام میں نئے اضافے تو کیے لیکن اس میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ پیدا ہوئی۔ آج بھی بھارت میں یہ طبقے اور نظام موجود ہیں۔ پنجاب کے مسلمانوں نے ہزاروں سال سے چلے آرہے سلسلے کو اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ البتہ اساس وہی رہی۔ بیشتر ذاتیں آج بیسویں صدی کے اختتام تک دونوں مذاہب میں مشترک ہیں۔

اقتباس: پنجاب کی ذاتیں

مرسلہ: انیس حیدر، ملتان

گئی اور جو کام خود کر سکتی تھی۔ ان کے لیے بھی اس سے کہنے لگی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آنے لگے۔ شارق کے لیے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن میرے دل میں اس کے لیے چاہت کے جذبات سر اٹھانے لگے۔ میں نے شعوری طور پر انہیں دبانے کی کوشش کی کیونکہ میرے حالات ایسے نہیں تھے کہ اپنے دل میں کسی کو جگہ دے سکتی لیکن کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جہاں انسان کی عقل کام نہیں کرتی۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی میرے دل میں شارق کی محبت پروان چڑھنے لگی۔

اب یوں ہونے لگا کہ شارق جب ہمارے گھر آتا تو میری خواہش ہوتی کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت میرے ساتھ گزارے جو عملاً ممکن نہیں تھا۔ اوّل تو وہ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر آتا تھا اور اسے اپنے گھر جانے کی جلدی بھی ہوتی تھی۔ اس لیے اس کا زیادہ دیر رکنا ممکن نہیں تھا۔ وہ دس پندرہ منٹ پاپا کے پاس بیٹھتا پھر ہم لوگوں سے چند باتیں کر کے چلا جاتا۔ اس میں بھی زیادہ وقت باجی ہی اسے گھیرے رہتیں اور اس سے اپنے بوتیک کے پلان کے بارے میں

''اوہ میرے خدا۔'' میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ یہ لیٹر کسی کلائنٹ کو جانا تھا جو میں نے غلطی سے باس کی ڈاک میں ڈال دیا تھا۔ میں جلدی سے بولی۔ ''سوری سر۔ میں اسے ابھی ڈسپیچ کر دیتی ہوں۔''

''وہ تو تم کر ہی دو گی۔'' وہ بھناتے ہوئے بولی۔ ''لیکن جانتی ہو۔ یہ خط پورے چوبیس گھنٹے لیٹ ہو گیا۔ اس کا خمیازہ مجھے بھگتنا ہوگا۔''

میں خاموش رہی تو وہ بولا۔ ''اب میری شکل کیا دیکھ رہی ہو۔ دفع ہو جاؤ اور کام میں دل لگاؤ۔''

میں اپنی سیٹ پر واپس آگئی۔ شدید بے عزتی کے احساس سے مجھے رونا آرہا تھا۔ میں نے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ دل چاہا کہ اسی وقت استعفیٰ لکھ کر راشد کے منہ پر دے ماروں لیکن حالات کے جبر نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔ کیونکہ اس وقت یہ دس ہزار میرے لیے بہت بڑا سہارا تھے۔ دوسری نوکری ملنا اتنا آسان نہیں تھا اور میں فوری طور پر اس رقم سے محروم ہونا نہیں چاہتی تھی۔ ورنہ گھر میں فاقے ہونے لگتے۔ یہاں کی آدھی پنشن تو دواؤں میں ہی خرچ ہو جاتی تھی۔ پھر مہینے میں ایک بار انہیں چیک اپ کے لیے بھی جانا ہوتا تھا۔ ٹیکسی کے کرائے اور ڈاکٹر کی فیس میں اچھے خاصے پیسے خرچ ہو جاتے تھے حالانکہ باجی کا کام اچھا خاصا چل گیا تھا اور انہیں ٹھیک ٹھاک آمدنی ہو رہی تھی لیکن وہ گھر کے خرچ کے لیے ایک پیسا بھی نہیں دیتی تھیں اور نہ ہی کبھی کوئی چیز لاتی تھیں۔ انہوں نے باتوں باتوں میں جتا دیا تھا کہ وہ اپنے بوتیک کے لیے پیسے جمع کر رہی ہیں۔

شارق ہر دوسرے تیسرے دن پاپا کو دیکھنے آیا کرتا تھا۔ اس کی حیثیت گھر کے فرد جیسی ہو گئی تھی اور وہ ہمارے بہت سے کام بھی کر دیا کرتا تھا۔ میری اور اس کی عمر میں پانچ چھ سال کا فرق تھا جب کہ باجی اس سے صرف دو سال چھوٹی تھیں لہٰذا وہ فطری طور پر باجی سے زیادہ قریب تھا اور انہی سے باتیں کیا کرتا۔ مجھ سے اس کی گفتگو صرف پڑھائی اور ملازمت کے بارے میں ہوتی تھی۔ اس نے میرا بی کام میں پرائیویٹ رجسٹریشن کروا دیا تھا اور میں روزانہ رات کو دو تین گھنٹے بیٹھ کر پڑھا کرتی تھی۔ شارق ہمیشہ یہ کہہ کر میری ہمت بڑھاتا کہ بی کام کر لوں تو مجھے کسی بینک میں اچھی جاب مل جائے گی۔

رفتہ رفتہ میں شارق کے سہارے کی عادی ہوتی چلی

Downloaded From http://paksociety.com

گفتگو کرتی تھیں۔ شارق نے انہیں مشورہ دیا کہ اپنا کام شروع کرنے سے پہلے وہ کسی بڑے بوتیک سے وابستہ ہو جائیں اور انہیں ان کی ضرورت کے مطابق کام کر کے دیں۔ اس طرح انہیں تجربہ ہو جائے گا اور وہ جان جائیں گی کہ بوتیک میں کس طرح کام ہوتا ہے۔ باجی کو یہ مشورہ پسند آیا اور انہوں نے شارق سے کہا کہ وہ اپنے جان پہچان کے لوگوں سے بات کر کے کسی ایسے بوتیک کا پتا کرے جس کے ساتھ وہ کام کرسکیں۔

شارق تو شاید پیدا ہی اس لیے ہوا تھا کہ وہ دوسروں کے مسئلے حل کرتا رہے۔ چنانچہ اس نے چند دنوں کی بھاگ دوڑ کے بعد کلفٹن میں واقع ایک ایسے بوتیک کا پتا چلا لیا جو گھریلو خواتین سے آرڈر پر کام کرواتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ باجی کو وہاں لے کر گیا اور سب معاملات طے پا گئے۔ بوتیک والوں نے نمونہ کے طور پر ان سے کچھ جوڑے سلوائے اور کہا کہ ان کی فروخت سے جو آمدنی ہوگی۔ اس سے انہیں معاوضہ ادا کر دیا جائے گا۔ تقریباً ایک ماہ بعد باجی کو ٹھیک ٹھاک پیسے مل گئے اور یوں یہ سلسلہ چل نکلا۔ اس کے بعد باجی نے محلے والوں کے کپڑے سینا بند کر دیے اور پوری طرح بوتیک کے کام میں لگ گئیں۔

ادھر میرے حالات مسلسل بگڑتے چلے جا رہے تھے۔ حالانکہ میں پوری احتیاط اور دل جمعی سے کام کر رہی تھی لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی غلطی ہو ہی جاتی۔ جس کا خمیازہ مجھے ڈانٹ اور بے عزتی کی صورت میں بھگتنا پڑتا۔ رفتہ رفتہ میں اس کی عادی ہوتی چلی گئی۔ اب میں نے رونا چھوڑ دیا تھا اور ڈھیٹ بن گئی تھی۔ راشد کچھ بھی کہتا میں خاموشی سے سن لیتی اور واپس آ کر اپنا کام دوبارہ شروع کر دیتی۔ اب میری پوری توجہ اپنی پڑھائی پر تھی تاکہ بی کام مکمل کر کے کسی اچھی جگہ ملازمت کرسکوں البتہ مجھے باجی پر بہت افسوس اور غصہ تھا۔ وہ ٹھیک ٹھاک کما رہی تھیں لیکن اس کے باوجود گھر پر ایک پیسا خرچ نہیں کرتی تھیں۔ انہوں نے ساری ذمے داری مجھ پر ڈال دی تھی اور خود اپنا بینک بیلنس بڑھا رہی تھیں۔

فرزانہ اور میرے درمیان خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی اور ہم کبھی کبھی اپنے ذاتی معاملات پر بھی گفتگو کر لیا کرتے تھے۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ میری طرح اسے ملازمت کرنے کی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ اس کے والد ریٹائر ہو چکے تھے اور دو بڑے بھائی برسر روزگار تھے۔ اس پر گھر کی کوئی ذمے داری نہیں تھی لیکن وہ بڑی خود دار طبیعت کی مالک تھی اور اپنی ضرورتوں کے لیے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا اسے پسند نہیں تھا۔ اسی لیے وہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے ملازمت کر رہی تھی۔ اس کی اپنے کزن کے ساتھ منگنی ہو چکی تھی اور ایک سال بعد شادی کا پروگرام تھا۔

''تم نے بھی اپنے دل میں کسی کی تصویر سجا رکھی ہے یا یہ خانہ ابھی خالی ہے۔''

مجھے جھوٹ بولنا نہیں آتا تھا۔ اس لیے اسے صاف صاف بتا دیا کہ شارق مجھے اچھا لگتا ہے لیکن ابھی تک اس نے کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا جس سے اس کی چاہت کا اظہار ہوتا ہو۔

''ہو سکتا ہے کہ وہ پہل کرنے میں جھجک رہا ہو اگر تم اس کی حوصلہ افزائی کرو تو شاید وہ اپنے دل کی بات بتا دے۔''

''دراصل ہمیں بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ہر وقت تو باجی سر پر سوار رہتی ہیں۔''

''تم کسی بہانے اس کے ساتھ گھر سے باہر چلی جاؤ اور اسے ٹٹولنے کی کوشش کرو۔''

فرزانہ کی تجویز معقول تھی لیکن اس پر عمل کرنا بہت مشکل تھا۔ کیونکہ ہم دونوں ہی جاب کرتے تھے اور ہفتہ میں صرف ایک دن چھٹی کا ملتا تھا۔ میں کسی بہانے اس کے ساتھ باہر جاتی لیکن بہت جلد یہ موقع بھی ہاتھ آ گیا۔ ہوا یوں کہ مجھے اپنا ایڈمٹ کارڈ لینے یونیورسٹی جانا تھا لیکن میں اس سے پہلے کبھی وہاں نہیں گئی تھی۔ اس کے علاوہ ہمارے گھر سے یونیورسٹی جانے کے لیے تین بسیں بدلنا پڑتی تھیں۔ میں نے شارق سے بات کی تو وہ بولا۔ ''اس کے لیے تو تمہیں خود یونیورسٹی جانا ہوگا۔''

''یہی تو مسئلہ ہے۔ میں بسوں کے دھکے نہیں کھا سکتی۔ تم لے چلو نا۔''

میں نے اتنی معصومیت سے کہا کہ اس کا دل پسیج گیا۔ وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے میں دو گھنٹے کی چھٹی کر لوں گا۔ تم صبح نو بجے تیار رہنا۔''

امی اور پاپا نے تو کچھ نہیں کہا لیکن شارق کے جانے کے بعد باجی بول پڑیں۔ ''کیا ضرورت ہے کسی کا احسان لینے کی۔ ہزاروں لڑکیاں یونیورسٹی جاتی ہیں۔ وہ بھی بسوں سے ہی سفر کرتی ہوں گی۔ سب کے پاس تو اپنی گاڑیاں نہیں

Downloaded From http://paksociety.com

ہیں۔"

"جو لوگ روز جاتے ہیں انہیں بسوں میں سفر کرنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ میں پہلے کبھی یونیورسٹی نہیں گئی۔ اگر کسی غلط بس میں بیٹھ گئی تو نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاؤں گی اور اس میں حرج ہی کیا ہے۔ شارق کوئی غیر نہیں۔ ہمارا خالہ زاد ہے۔ اس کے ساتھ جانے سے کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔"

"پھر بھی اچھا نہیں لگتا۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولیں۔

میں نے ان کے اعتراض کو یکسر نظر انداز کر دیا اور شارق کے ساتھ جانے کے تصور میں گم ہو گئی۔ میں زندگی میں پہلے کبھی بائیک پر نہیں بیٹھی تھی۔ اس لیے یہ احساس ہی میرے اندر سنسنی پیدا کر رہا تھا کیسا عجیب لگے گا جب میں اس کے ساتھ لگ کر بیٹھوں گی۔ موٹر سائیکل پر جھٹکے بھی تو بہت لگتے ہیں اگر کسی جھٹکے کے دوران میرا جسم اس سے ٹکرا گیا تو کیا ہوگا۔ اس سے آگے میں نہ سوچ سکی۔ اس تصور سے ہی مجھے شرم آنے لگی۔

دوسرے دن میں صبح ہی صبح تیار ہو گئی۔ اپنا بہترین سوٹ نکالا۔ بال ایک خاص انداز میں سنوارے۔ ہلکا سا میک اپ کیا اور جسم پر پرفیوم کا چھڑکاؤ کر کے شارق کا انتظار کرنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ یونیورسٹی نہیں بلکہ ڈیٹ پر جا رہی ہوں۔ شارق آیا تو مجھے اس روپ میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس سے پہلے کبھی اس نے مجھے اس طرح بنا سنورا نہیں دیکھا تھا۔ اس نے مجھ سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ اس کی بائیک میں کیریئر نہیں تھا۔ اس لیے اس نے مجھ سے کہا کہ میں ایک ہاتھ سے سیٹ پکڑلوں۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک زور کا جھٹکا لگا اور میں نے گھبرا کر اس کا کندھا پکڑ لیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بولا۔ "سنبھل کر بیٹھو۔ اس طرح کے جھٹکے لگتے رہیں گے۔"

میں تقریباً اس سے چپک کر بیٹھی ہوئی تھی جب بھی کوئی جھٹکا لگتا تو میں اس سے ٹکرا جاتی اور پورے بدن میں ایک عجیب سی سنسنی دوڑنے لگی۔ نہ جانے میرے جسم کے لمس سے اس پر کیا گزر رہی ہوگی لیکن میں اس تجربے سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی اور دل چاہ رہا تھا کہ یہ سفر کبھی ختم نہ ہو لیکن آدھ گھنٹے سے بھی کم وقت میں ہم یونیورسٹی پہنچ گئے۔ ایڈمٹ کارڈ لینے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں نے شارق سے کہا۔ "چلو کہیں بیٹھتے ہیں۔ موٹر سائیکل کے جھٹکے لگ کر تو میرا جوڑ جوڑ ہل گیا۔"

ہم ایک کولڈ اسپاٹ پر جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں زیادہ رش نہیں تھا۔ وہ کولڈ ڈرنک لے کر آیا اور وہیں ایک کونے میں رکھی ہوئی بینچ پر بیٹھ کر کولڈ ڈرنک پینے لگے۔ میں جان بوجھ کر آہستہ آہستہ پی رہی تھی۔ تاکہ اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزار سکوں۔ میں منتظر تھی کہ شاید وہ کچھ کہے لیکن اس نے منٹوں میں بوتل ختم کر لی اور گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "چلو بھئی جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے۔ مجھے اسپتال بھی پہنچنا ہے۔"

مجھے بہت غصہ آیا۔ انتہائی غیر رومانی شخص تھا۔ میں اسے پورا موقع دے رہی تھی کہ وہ اپنے دل کی بات زبان پر لے آئے لیکن وہ اس معاملے میں بالکل ہی اناڑی تھا۔ میں نے ایک ادا سے دوپٹا شانوں پر سے ڈھلکایا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "چلتے ہیں۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو ہم نے کوئی بات بھی نہیں کی۔"

"بات کیا کرنی ہے۔ تمہارا کام ہو گیا۔ اب چلو۔"

میرا دل چاہا کہ کسی دیوار سے اپنا سر پھوڑ لوں۔ کیا وہ اتنا ہی احمق تھا کہ میرے اشارے نہ سمجھ سکے یا جان بوجھ کر پہلو بچا رہا تھا۔ فی الوقت یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا چنانچہ میں نے جلدی جلدی بوتل ختم کی اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ واپسی میں بھی یہی کچھ ہوا۔ اس بار میں نے اس کا کندھا پکڑنے کی بجائے اپنا بازو اس کی کمر میں ڈال دیا اور بالکل اس سے لگ کر بیٹھ گئی۔ میں نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی تھی تاکہ میرے لمس کی حرارت سے اس کے اندر کی برف پگھلنے لگے اور وہ بار بار میرے قرب کی خواہش کرے۔

اس روز میں نے دفتر سے چھٹی کی تھی۔ اس لیے وہ مجھے دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا۔ اندر گئی تو باجی کا منہ بری طرح سوجا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ "اتنی دیر کہاں لگا دی۔ میرا تو دم نکلا جا رہا تھا۔ طرح طرح کے ہول آرہے تھے۔ موٹر سائیکل کی سواری ویسے ہی بہت خطرناک ہوتی ہے۔"

جی میں آیا کہ انہیں کوئی سخت جواب دے کر ہمیشہ کے لیے خاموش کر دوں لیکن وہ مجھ سے بڑی تھیں اس لیے لحاظ کر گئی۔ البتہ اتنا ضرور کہا۔ "تھوڑی بہت دیر تو ہو ہی جاتی ہے پھر آنے جانے میں بھی کچھ وقت لگتا ہے۔"

Downloaded From http://paksociety.com

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہیں موٹر سائیکل پر نہیں جانا چاہیے تھا۔ اس کے مقابلے میں بس کا سفر زیادہ محفوظ ہے۔"

خدا جانے انہیں موٹر سائیکل پر اعتراض تھا یا میرے شارق کے ساتھ جانے پر، شاید دوسری بات زیادہ صحیح تھی۔ انہیں اچھا نہیں لگا اور وہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار موٹر سائیکل کی آڑ میں کر رہی تھیں جب کہ میرے ماں باپ زندہ تھے۔ جب انہوں نے کچھ نہیں کہا تو باجی کو میرے معاملے میں ٹانگ اڑانے کا کیا حق پہنچتا تھا۔ مجھے بھی ضد چڑھ گئی اور میں نے فیصلہ کرلیا کہ انہیں چڑانے کی خاطر بہانے بہانے شارق کے ساتھ جایا کروں گی۔

دوسرے دن میں نے فرزانہ کو پوری روداد سنائی تو وہ بولی۔ "پہلی ملاقات میں کوئی بھی کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا کرتا۔ تمہارا کزن شریف آدمی ہے۔ شاید کچھ کہتے ہوئے اسے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی ہو۔ دو چار مرتبہ اس کے ساتھ باہر جاؤ گی تو شاید اس کی جھجک دور ہو جائے۔"

اس کے بعد میں نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی اور اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ دفتر کا ماحول ویسا ہی تھا۔ وہی باس کی ڈانٹ ڈپٹ، وہی گھٹن، وہی سہمے ہوئے چہرے۔ میں بڑی بے چینی سے ایک ایک دن گن رہی تھی کہ کب میرا بی کام مکمل ہو اور کب مجھے دوسری جاب ملے۔ شارق نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے ایک دوست کے والد کسی بینک میں سینئر وائس پریزیڈنٹ ہیں، وہ ان سے میری ملازمت کی بات کرے گا۔

میرے امتحانات شروع ہوئے تو ایک بار پھر آنے جانے کا مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ میں کیونکہ پرائیویٹ امیدوار تھی۔ اس لیے میرا سینٹر یونیورسٹی میں پڑا تھا۔ اگر ایک آدھ دن کی بات ہوتی تو شارق سے کہہ سکتی تھی لیکن مجھے پانچ دن جانا تھا۔ شارق کو معلوم ہوا تو اس نے خود ہی اپنی خدمات پیش کردیں اور بولا۔ "میں یہ کرسکتا ہوں کہ صبح تمہیں یونیورسٹی چھوڑ کر اسپتال چلا جاؤں کیونکہ تمہارا وقت سے پہلے پہنچنا ضروری ہے۔ البتہ واپسی میں تمہیں بس سے آنا ہوگا۔"

میرے لیے یہی بہت تھا کیونکہ صبح کے وقت بسوں میں رش بہت ہوتا ہے۔ جگہ نہیں ملتی اور دیر سے بھی آتی ہیں۔ زیادہ تر بسیں پرانی ہیں اور راستے میں خراب ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے دیر ہونے کا اندیشہ ہے۔ شارق کے ساتھ جانے میں کم از کم یہ اطمینان تو ہوگا کہ وقت پر پہنچ جاؤں گی۔

اس بار پھر باجی نے اعتراض کیا لیکن امی نے انہیں جھڑک دیا اور بولیں۔ "تم اس معاملے میں مت بولو۔ اچھا ہے شارق کے ساتھ چلی جائے گی۔ کم از کم دیر سویر کا ڈر تو نہیں ہوگا۔"

باجی اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں لیکن صاف لگ رہا تھا کہ انہیں یہ بات پسند نہیں آئی اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ شارق کو صاف منع کردیتیں کہ وہ مجھے لے کر نہ جائے لیکن امی پاپا کے ہوتے ہوئے وہ ایسا نہیں کرسکتی تھیں۔ اس طرح میں شارق کے ساتھ یونیورسٹی جانے لگی۔ واپسی میں البتہ بس سے آنا پڑتا تھا۔ پہلے روز تو تھوڑی سی پریشانی ہوئی۔ اس کے بعد کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔

امتحان ختم ہوئے تو پھر زندگی اپنی پرانی ڈگر پر لوٹ آئی۔ پاپا کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ شارق انہیں باقاعدگی سے دیکھنے آیا کرتا تھا۔ پھر ایک روز اس کے مشورے پر پاپا کو اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے بائی پاس تجویز کیا جس کے لیے ایک بڑی رقم کی ضرورت تھی اور ہماری کل جمع پونجی وہ پیسے تھے جو پاپا نے میری شادی کے لیے بینک میں رکھ چھوڑے تھے۔ میں نے امی سے کہا کہ پاپا کی زندگی سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ آپ وہ پیسے نکلوالیں۔ آگے اللہ مالک ہے۔

اس کی نوبت ہی نہیں آئی اور صرف دو دن بعد ہی پاپا کو ایک اور شدید دورہ پڑا۔ وہ جانبر نہ ہوسکے اور ہمیں روتا بلکتا چھوڑ کر اس دنیا سے چلے گئے۔ ہماری تو دنیا ہی اجڑ گئی۔ یوں لگا جیسے ہمارے سر سے سائبان ہٹ گیا ہو اور ہم کھلے آسمان تلے کھڑے ہیں۔ امی کی حالت دیکھی نہیں جارہی تھی۔ وہ بار بار بے ہوش ہو رہی تھیں۔ میں خود فرطِ غم سے نڈھال تھی۔ ایسے میں امی کو سنبھالنا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ باجی نے تین دن تو پاپا کی موت کا سوگ منایا پھر وہ اپنے کام میں مصروف ہوگئیں۔ میرے لیے بھی زیادہ دن چھٹی کرنا ممکن نہ تھا چنانچہ چوتھے روز سے کام پر جانا شروع کردیا لیکن دل گھر میں ہی رہتا تھا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو نوکری چھوڑ کر امی کے پاس گھر میں بیٹھ جاتی گو کہ باجی کی آمدنی اچھی خاصی تھی لیکن ان کا اب بھی وہی حال تھا۔ وہ گھر میں ایک پیسا نہیں دیتی تھیں اور اپنے بینک بیلنس میں مسلسل اضافہ کر رہی تھیں۔

اس وقت شارق نے ہمارا بہت ساتھ دیا اور سگے

Downloaded From http://paksociety.com

بیٹوں سے بڑھ کر امی کی خبر گیری کرتا رہا۔ پہلے وہ پاپا کو دیکھنے کے لیے تیسرے چوتھے روز آیا کرتا تھا۔ اب تقریباً روزانہ آنے لگا۔ پاپا نے ایک عقل مندی یہ کی تھی کہ ریٹائرمنٹ سے ملنے والا سارا پیسا امی کے اکاؤنٹ میں جمع کروادیا تھا۔ اسی طرح جس مکان میں ہم رہتے تھے وہ بھی امی کے نام تھا۔ چنانچہ پاپا کے چالیسویں کے بعد جب دونوں چچا ایک وکیل کے ہمراہ ہمارے گھر آئے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے فوراً فون کر کے شارق کو بلالیا۔ امی عدت کی وجہ سے وکیل کے سامنے نہیں آسکتی تھیں۔ اس لیے وہ پردے کے دوسری طرف بیٹھ گئیں۔ بڑے چچا بولے۔

''بھابی! آپ کے علم میں ہے کہ بھائی صاحب نے انتقال سے پہلے کوئی وصیت تیار کی تھی؟''

''جی نہیں۔'' امی نے جواب دیا۔ ''ورنہ وہ مجھے ضرور بتاتے۔''

''پھر تو مرحوم کا ترکہ شرع کے مطابق تقسیم ہوگا۔'' وکیل بولا۔

فوراً ہی ان لوگوں کی آمد کا مقصد میری سمجھ میں آگیا۔ دراصل پاپا کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اس لیے ان کی وراثت میں دونوں چچا بھی شریک ہوگئے تھے۔ میں دل ہی دل میں ہنس رہی تھی کہ جب انہیں حقیقت معلوم ہوگی تو ان کے ارمانوں پر اوس پڑ جائے گی۔

''کیا آپ مجھے مرحوم کے اثاثوں کی تفصیل بتا سکتی ہیں تاکہ میں شرع کے مطابق تمام وارثوں کا حصہ نکال سکوں۔'' وکیل نے کہا۔

میں خاموشی سے اٹھ کر اندر گئی اور پاپا کی چیک بک لا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ ''اسے دیکھ لیجیے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ترکہ میں کچھ نہیں چھوڑا۔''

وکیل نے چیک بک الٹ پلٹ کر دیکھی اور بولا۔ ''اس اکاؤنٹ میں تو صرف چار ہزار روپے ہیں۔ کیا آپ یقین سے کہہ سکتی ہیں کہ اس کے علاوہ ان کا کوئی اور اکاؤنٹ نہیں ہے؟''

''وکیل صاحب۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''میرے والد صاحب محض ایک لیکچرار تھے اور انہیں ریٹائر ہوئے بھی کافی عرصہ ہوگیا تھا۔ ایک سے زیادہ اکاؤنٹ سرمایہ داروں اور کاروباری لوگوں کے ہوتے ہیں۔''

وکیل نے تائید میں سر ہلایا اور بولا۔ ''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ ملازم پیشہ آدمی کو دوسرا اکاؤنٹ کھولنے کی کیا ضرورت ہے۔''

چچا بولے۔ ''یہ مکان تو بھائی صاحب کی ملکیت ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''جی نہیں بہت پہلے انہوں نے یہ مکان امی کے نام کردیا تھا۔''

چھوٹے چچا سے ضبط نہ ہوسکا وہ تڑخ کر بولے۔ ''بھائی صاحب نے یہ اچھا نہیں کیا۔ ہمارا حق مار کر سب کچھ بھابی کے حوالے کردیا۔''

وکیل اٹھتے ہوئے بولا۔ ''بہتر ہوتا کہ پہلے آپ لوگ پوری معلومات کر لیتے۔ اس کے بعد مجھے بلاتے۔ بلاوجہ میرا وقت ضائع کیا۔''

اس کے جانے کے بعد دونوں چچا بھی بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔ اگر انہیں معلوم ہوجاتا کہ پاپا نے اپنی کل جمع پونجی امی کے اکاؤنٹ میں رکھوادی تھی تو اس پر بھی ہنگامہ کرتے۔ شارق حیرت سے یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا۔ ان کے جانے کے بعد بولا۔ ''یقین نہیں آتا کہ لوگ اس حد تک بھی گر سکتے ہیں۔ چچا تو باپ کی جگہ ہوتا ہے اور بھائی کے بچوں کی ذمے داری اس پر فرض ہے۔ یہاں الٹا حساب ہے کہ بھائی کے ترکہ میں حصہ بٹورنے چلے آئے۔''

''میرا تو دل چاہ رہا تھا کہ انہیں ٹھیک ٹھاک سنا دوں لیکن ان کی بزرگی کا خیال آگیا۔ زندگی میں تو کبھی بھائی کو پوچھا نہیں اور نہ ہی یہ دیکھا کہ ہم لوگ کس حال میں ہیں۔ اب آگئے بھائی کی جائیداد کا بٹوارہ کرنے۔''

''چلو جانے دو۔'' شارق بولا۔ ''تمہارا کیا بگڑا۔ خود ہی مایوس ہوکر چلے گئے۔ اب تم اس بارے میں زیادہ مت سوچو اور خالہ جان کا خیال رکھو اگر میرے لائق کوئی کام ہو تو بلاجھجک بتا دینا۔ میں ہر وقت حاضر ہوں۔''

اس کے ان الفاظ سے مجھے بہت ڈھارس ہوئی اور میں نے ایک بار پھر زندگی کے معمولات میں دلچسپی لینا شروع کردی۔ میں پوری دلجمعی کے ساتھ فائنل ایگزام کی تیاری کررہی تھی۔ باجی بہت زیادہ مصروف ہوگئی تھیں۔ اس لیے اب میں ہی شارق کو اٹینڈ کرتی۔ امی کے سارے کام وہی کیا کرتا۔ بینک جانا، پنشن نکلوانا، اکثر میں بھی اس کے ساتھ شاپنگ کے لیے چلی جاتی تھی۔ فائنل ایگزام کی ڈیٹ آئی تو اس مرتبہ بھی سینٹر یونیورسٹی میں پڑا اور پچھلے سال کی طرح اس مرتبہ بھی میں شارق کے ساتھ ہی امتحان دینے بائیک پر جانے لگی۔

Downloaded From http://paksociety.com

امتحان کا نتیجہ آنے سے پہلے ہی شارق نے میری ملازمت کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی اس نے اپنے دوست سے بھی کہا اور تھوڑی سی دوڑ دھوپ کے بعد مجھے بینک میں ملازمت مل گئی۔ جہاں کا ماحول راشد کی کمپنی سے بالکل مختلف تھا۔ میری تین ماہ کی ٹریننگ ہوئی اور اس کے بعد مجھے برانچ میں پوسٹ کر دیا گیا۔ تنخواہ معقول تھی اور اس کے علاوہ دیگر کئی مراعات بھی تھیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ راشد کی ڈانٹ ڈپٹ سے میری جان چھوٹ گئی تھی۔ یہاں کوئی باس نہیں تھا۔ میں صرف مینیجر کو جوابدہ تھی۔ وہ بھی پورے اسٹاف سے انتہائی تمیز کے ساتھ پیش آتا تھا۔

ملازمت ملنے کے چند روز بعد ہی باجی نے ایک نیا شوشا چھوڑ دیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ اپنا بوتیک کھول رہی ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے ایک جگہ بھی دیکھ لی ہے لیکن ان کی جمع پونجی اس کام کے لیے ناکافی ہے اور انہیں مزید پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ میں سمجھی کہ شاید وہ بینک سے قرض لینا چاہ رہی ہیں۔ اس لیے انہوں نے یہ بات کہی ہے۔ میں نے ان سے کہا۔ ”اگر آپ کو بینک سے قرض چاہیے تو کل میرے ساتھ چلیں۔ میں مینیجر سے آپ کی بات کروائے دیتی ہوں وہ آپ کی ہر ممکن مدد کریں گے۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو۔ مجھے بینک سے قرض نہیں لینا۔ جب گھر میں پیسے موجود ہیں تو میں قرض کیوں لوں؟“

”میں سمجھی نہیں۔ آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟“

”حیرت ہے اتنی سیدھی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی۔ بھئی میں ان پیسوں کی بات کر رہی ہوں جو امی کے اکاؤنٹ میں پڑے ہوئے ہیں۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ امی نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم جانتی نہیں ہو کہ وہ رقم کس مقصد کے لیے محفوظ کی گئی تھی۔ میں نے انتہائی شدید ضرورت کے باوجود اس میں سے کبھی ایک روپیا نہیں نکالا۔“

”جانتی ہوں کہ وہ پیسے نجمہ کی شادی کے لیے رکھے ہوئے ہیں حالانکہ اس میں میرا بھی حصہ ہے لیکن میں اپنا حق نہیں جتا رہی بلکہ ادھار مانگ رہی ہوں۔ جب میرا کام چل جائے گا تو واپس کر دوں گی۔“

میں نے سوچا کہ اس وقت باجی کی ضرورت مقدم ہے۔ شادی کے تو ابھی دور دور تک کوئی آثار نہیں ہیں اور ویسے بھی وہ ادھار مانگ رہی ہیں۔ اس لیے انہیں انکار کرنا ٹھیک نہیں۔ لہٰذا میں نے امی سے کہہ دیا کہ وہ پیسے باجی کو دے دیں جب وقت آئے تو دیکھا جائے گا۔

امی تیار نہیں ہو رہی تھیں لیکن باجی نے قسمیں کھا کھا کر انہیں یقین دلایا کہ وہ زیادہ سے زیادہ چھ مہینے یا ایک سال میں یہ پیسے واپس کر دیں گی۔ مجبوراً امی کو ان کی بات ماننا پڑی اور انہوں نے پانچ لاکھ کا چیک لکھ کر باجی کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد ان کے اکاؤنٹ میں کچھ باقی نہ بچا۔ باجی کے ہاتھ میں پیسے آئے تو انہوں نے زور و شور سے بوتیک کھولنے کی تیاری شروع کر دی۔ انہوں نے شارق کو بھی اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ وہ اسپتال سے سیدھے ہمارے گھر آجاتا اور گھنٹوں باجی کے پاس بیٹھ کر اپنے مشوروں سے نوازتا۔ اکثر وہ دونوں کسی نہ کسی کام سے باہر چلے جاتے اور ان کی واپسی رات گئے ہوتی تھی۔ اب باجی کو شارق کے ساتھ بائیک پر بیٹھتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی ڈر لگتا تھا۔ وہ بڑے مزے سے اس کی بائیک پر پورے شہر میں گھومتی تھیں۔

شارق باجی کے کاموں میں اتنا مصروف ہو گیا کہ اس نے مجھے تقریباً نظر انداز کر دیا۔ ویسے بھی ہماری ملاقات بہت کم ہوتی تھی۔ میں بینک سے چھ بجے واپس آتی جب کہ اس کی ڈیوٹی دو بجے تک تھی اور وہ ڈھائی تین بجے تک ہمارے گھر آجاتا تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں بوتیک کے کام سے نکل جاتے اور جب میں واپس آتی تو امی گھر میں تنہا ہوتی تھیں۔ اس کے بعد میں گھر کے کاموں میں لگ جاتی۔ باجی کا اگر موڈ ہوتا تو وہ دوپہر کا کھانا بنا دیتیں ورنہ نہیں۔ اسی لیے میں رات کو اتنا کھانا بنا دیتی کہ وہ اگلے دن دوپہر تک چل جائے۔ شارق باجی کو چھوڑنے آتا اور باہر سے ہی واپس چلا جاتا۔ اس طرح مجھے اسے دیکھے ہوئے کئی کئی دن گزر جاتے۔

شارق کی اس لاتعلقی نے مجھے بہت مایوس کیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ میرے دل میں اس کی محبت کا پودا تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ میں اس انتظار میں تھی کہ کب ہمیں تنہائی کے چند لمحات میسر آئیں اور وہ اپنے دل کی بات زبان پر لائے تو میں بھی سر جھکا کر اقرار وفا کر لوں لیکن باجی نے اسے اس بری طرح گھیر رکھا تھا کہ اسے میری طرف دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ چند دنوں کی بات ہے۔ ایک مرتبہ بوتیک کا افتتاح ہو جائے تو شارق کی مصروفیت کم ہو جائے گی پھر وہ مجھے بھی وقت دے سکے گا۔

Downloaded From http://paksociety.com

بوتیک کا افتتاح بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ باجی نے ازراہ مہربانی مجھے بھی شرکت کی دعوت دی تھی گو کہ اس دن بینک میں مصروفیت بہت زیادہ تھی لیکن میں پھر بھی باجی کی خاطر دو گھنٹے کی چھٹی لے کر چلی گئی۔ وہ بوتیک میری توقع سے زیادہ شاندار تھا گو کہ وہ جگہ رقبہ میں کم تھی لیکن باجی نے اسے بہت اچھے طریقے سے سجایا تھا۔ باہر شیشے کے شوکیس اور اندر کی تینوں دیواروں پر خواتین کے دیدہ زیب سوٹ آویزاں تھے جب کہ دکان کے وسط میں ایک قطار بچوں کے کپڑوں کی تھی۔ اس دن میں نے شارق کی غیر معمولی دلچسپی کو سنجیدگی سے محسوس کیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ دکان کا اصل مالک وہی ہے۔ بعد میں اس خیال کی تصدیق ہوگئی جب یہ معلوم ہوا کہ باجی نے اسے اپنا پارٹنر بنالیا ہے۔

میرے دل میں ایک پھانس سی چبھ گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے شارق دھیرے دھیرے مجھ سے دور ہوتا جارہا ہے۔ بوتیک کے افتتاح کے بعد باجی گھر سے بالکل ہی لاتعلق ہو گئیں۔ وہ صبح نو بجے گھر سے نکل جاتیں اور ان کی واپسی رات نو دس بجے تک ہی ہوتی تھی۔ شارق نے اب ہمارے گھر آنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ البتہ وہ کبھی کبھار چھٹی کے دن امی کی خیریت معلوم کرنے آجاتا۔ تب بھی وہ اور باجی زیادہ تر دکان ہی کی باتیں کیا کرتے۔ بزنس پارٹنر جو تھے۔ شارق کو خیال آجاتا تو وہ مجھ سے رسماً دو چار باتیں کرلیا کرتا لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس کی گفتگو مصنوعی سی لگتی۔

باجی اب مالکن بن گئی تھیں۔ اس لیے انہوں نے خود کام کرنا چھوڑ دیا اور دوسری عورتوں سے آرڈر پر کام کروانے لگیں۔ پہلے ان کا استحصال ہو رہا تھا۔ اب وہ دوسروں کا استحصال کررہی تھیں۔ وہ کام کرنے والی عورتوں کو انتہائی کم اجرت دیتی تھیں۔ اس کے باوجود ان کے پاس کام مانگنے والی عورتوں کی لائن لگی رہتی تھی جو کم اجرت کو بھی قدرت کا انعام سمجھتی تھیں۔

پہلے گھر میں باجی اور امی ہوتی تھیں۔ اس لیے مجھے کوئی فکر نہیں تھی لیکن جب سے انہوں نے بوتیک پر جانا شروع کیا تو میری پریشانی بھی بڑھ گئی۔ اب امی صبح سے شام تک گھر میں اکیلی ہوتی تھیں اور مجھے ان کی فکر لگی رہتی تھی۔ ماسی دو تین گھنٹے کے لیے آتی اور اوپر کے کام کر کے چلی جاتی۔ میری اتنی گنجائش نہیں تھی کہ پورے دن کے لیے کوئی ملازمہ رکھ سکوں جو گھر کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ امی کی دیکھ بھال بھی کر سکے۔

میں نے یہ مسئلہ باجی کے سامنے رکھا تو وہ بولیں۔ ”ابھی تو میں کچھ نہیں کرسکتی۔ تم جانتی ہو کہ نیا نیا کام شروع کیا ہے۔ اخراجات زیادہ اور آمدنی کم ہے۔ جب کچھ ہاتھ میں آئے گا تو دیکھوں گی۔“

وہ صریحاً جھوٹ بول رہی تھیں۔ ان کی دکان پہلے دن سے ہی چل پڑی تھی اور ان کی سیل اچھی خاصی بڑھ گئی تھی۔ گو کہ مجھے کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں لیکن جو کچھ آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اسے کیسے جھٹلاتی۔ باجی کے اپنے ٹھاٹ باٹ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک سے ایک قیمتی کپڑے پہنتیں۔ عمدہ پرفیوم استعمال کرتیں۔ شارق کے ساتھ آئے دن ڈنر پر جاتیں لیکن گھر میں دینے کے لیے ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔

ایک دن امی نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور بولیں۔ ”شاہدہ نے تو اپنے خواب کی تعبیر حاصل کرلی اور وہ اپنے کاروبار میں مگن ہوگئی ہے لیکن تم کب تک اپنے آپ کو رگڑتی رہوگی۔ کبھی اپنے بارے میں سوچا ہے؟“

”امی میں کیا سوچوں جو قسمت میں لکھا ہے وہی ہو گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ انسان اپنی قسمت سے نہیں لڑسکتا لیکن سوچ پر تو پہرے نہیں بٹھائے جاسکتے جیسے میں تمہارے بارے میں ہر وقت سوچتی رہتی ہوں کہ میرے بعد تمہارا کیا ہوگا؟“

”توبہ کریں امی، کیسی باتیں کررہی ہیں۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔“

”حقیقت سے نظریں نہیں چرائی جاسکتیں۔ ایک نہ ایک دن سب کو جانا ہے۔ اسی طرح میں بھی چلی جاؤں گی۔ اسی لیے سوچ رہی ہوں کہ اب تمہاری شادی ہوجانی چاہیے اگر تمہاری نظر میں......“

میں نے ان کی بات کاٹ دی اور بولی۔ ”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے ابھی تک اس بارے میں نہیں سوچا۔“

یہ سراسر جھوٹ تھا۔ میں شارق کو دیوانہ وار چاہتی تھی۔ وہ میری رگ رگ میں بس چکا تھا اور میں اس کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی لیکن میں امی کے سامنے شارق کا نام نہیں لے سکتی تھی کیونکہ یہ یک طرفہ محبت تھی۔ میں جس آگ میں جل رہی تھی۔ شاید ابھی تک اس کی تپش شارق نے محسوس نہیں کی تھی۔ مجھے اس کے دل کا حال

Downloaded From http://paksociety.com

معلوم نہیں تھا۔ پھر میں اس کا نام کیسے لے سکتی تھی۔

امی بولیں۔ ''ٹھیک ہے۔ یہ کام بھی مجھے ہی کرنا ہو گا۔ بس تم ذہنی طور پر تیار ہو جاؤ، جیسے ہی کوئی مناسب رشتہ آیا۔ میں تمہاری شادی کر دوں گی۔''

''لیکن آپ۔'' میں جھجکتے ہوئے بولی۔ ''آپ کا کیا ہوگا۔ آپ تو بالکل اکیلی رہ جائیں گی۔''

''اکیلی کیوں؟ شاہدہ ہے نا میرے پاس۔ اب بھی تو پورا دن اکیلی ہی رہتی ہوں۔''

اس کے بعد میں خاموش ہوگئی۔ کاش اس وقت شارق کا نام لے دیتی تو امی میری پسند جاننے کے بعد خود ہی خالہ سے بات کرلیتیں لیکن یہ میری انا اور خود داری کے خلاف تھا۔ جب تک شارق اپنی زبان سے پسندیدگی کا اظہار نہ کرتا۔ میں اس کا نام بھی نہیں لے سکتی تھی۔ شاید میرے دل میں یہ خوف بیٹھ گیا تھا کہ اگر اس نے انکار کردیا تو میری بڑی توہین ہوگی۔

اس دن کے بعد امی نے میرے رشتے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کردی۔ انہوں نے اپنی کئی ملنے جلنے والیوں سے کہہ دیا کہ ان کی نظر میں کوئی اچھا رشتہ ہو تو بتائیں۔ یقیناً خالہ تک بھی یہ بات پہنچی ہوگی لیکن ان کی طرف سے کوئی حوصلہ افزا ردِعمل سامنے نہیں آیا۔ اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ شاید شارق ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا لیکن اتنا مجھے یقین تھا کہ جس دن اس کی شادی کی بات چلی۔ وہ میرا ہی نام لے گا۔ اسی لیے میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ خالہ کے آنے سے پہلے امی کو کوئی لڑکا پسند نہ آئے۔

انہی دنوں میں نے محسوس کیا کہ بینک میں میرا ساتھی آفیسر عارف مجھ میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہا تھا۔ ویسے تو وہ بہت خوش شکل، خوش مزاج، خوش لباس، کم گو اور مہذب بندہ تھا اور ہر ایک سے تمیز وتہذیب کے دائرے میں رہ کر بات کیا کرتا تھا لیکن اچانک ہی نہ جانے اسے کیا ہوگیا کہ وہ مجھ سے خوا مخواہ ہی بے تکلف ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ کبھی میرے کپڑوں کی تعریف کرتا تھا۔ کبھی میرے ہیئر اسٹائل کی اور کبھی اسے میری مسکراہٹ اچھی لگنے لگتی۔ شروع شروع میں تو میں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی لیکن جب اس کی بے تکلفی حد سے بڑھنے لگی تو میرے کان کھڑے ہو گئے۔

ایک دن مجھے صبح گھر سے نکلنے میں دیر ہوگئی۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ اپنے لیے کھانا گرم کر کے لنچ باکس تیار کرتی۔ لہٰذا میں اس کے بغیر ہی کام پر چلی گئی۔ کھانے کے وقفے میں اپنی سیٹ پر بیٹھی انتظار کر رہی تھی کہ کوئی پیون فارغ ہو تو اس سے اپنے لیے کھانا منگواؤں۔ اسی وقت عارف میرے پاس آیا اور بولا۔ ''آج آپ لنچ نہیں کریں گی؟''

''آج میں لنچ لے کر نہیں آئی۔ انتظار کر رہی ہوں کہ کوئی آجائے تو باہر سے منگواؤں۔''

''اس وقت کوئی نہیں آئے گا۔ سب کھانا کھا رہے ہوں گے۔ اتفاق سے آج میں بھی لنچ لے کر نہیں آیا۔ کیوں نہ باہر جا کر کچھ کھالیں۔''

مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ اس لیے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''چلیے لیکن ہمیں جلدی واپس آنا ہوگا۔ ڈھائی بجے ڈیلنگ شروع ہو جاتی ہے۔''

''ہاں، ابھی ایک گھنٹا ہے۔ ہم وقت سے پہلے آجائیں گے۔''

وہ مجھے ایک قریبی ریستوران میں لے گیا۔ وہاں توقع کے خلاف زیادہ رش نہیں تھا اور ہال میں بہت کم لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے نسبتاً ایک الگ تھلگ گوشہ منتخب کیا اور میری طرف مینو بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''آپ جو کھانا چاہیں وہ منگوالیں۔''

میں نے مینو پر ایک نظر ڈالی اور اپنے لیے چکن بروسٹ کا آرڈر دے دیا۔ اس نے بھی اپنے لیے وہی منگوایا۔ کھانے کے بعد چائے پینے کے دوران اس نے میرے چہرے پر نظریں جمائیں اور آہستہ سے بولا۔ ''مس نجمہ! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک ذاتی سوال پوچھ سکتا ہوں۔''

''پوچھیں۔'' میں اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''آپ کی منگنی وغیرہ تو نہیں ہوئی؟''

''یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' میں نے ٹوہ لینے کی خاطر کہا۔

''اس لیے کہ آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ میں آپ کو پروپوز کرنا چاہتا ہوں۔''

''سوری، آپ کو دیر میں خیال آیا۔ میری منگنی ہو چکی ہے۔'' یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ''چلیں کھانے کا وقفہ ختم ہو رہا ہے۔''

اس نے بل ادا کیا اور خاموشی سے واپس چلا آیا۔ اس کے بعد ہمارے درمیان اس موضوع پر کبھی کوئی بات

Downloaded From http://paksociety.com

نہیں ہوئی۔ مجھے تھوڑا سا افسوس بھی ہوا کہ میں نے بلاوجہ ہی اس سے جھوٹ بولا۔ وہ ایک اچھا انتخاب ہو سکتا تھا لیکن اس دل کا کیا کرتی جس میں شارق نے قبضہ جمایا ہوا تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی اور کے لیے گنجائش کیسے ہو سکتی تھی۔

اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ اس دوران نہ تو میرا کوئی رشتہ آیا اور نہ ہی خالہ نے کوئی بات نکالی۔ اب میری تشویش میں اضافہ ہو رہا تھا اور میں یہ سوچ رہی تھی کہ کہیں شارق کسی اور کو تو پسند نہیں کرتا۔ شاید اسی وجہ سے خالہ بھی اب تک خاموش تھیں۔ اس دوران باجی کا کام خوب چل نکلا تھا۔ انہوں نے ایک سیکنڈ ہینڈ کار بھی خرید لی تھی اور وہ اس میں مزے سے گھومتی پھرتی تھیں لیکن اس کار میں مجھے یا امی کو کبھی بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ نہ ہی انہوں نے پیسے واپس کرنے کی کوئی بات کی۔

میں وہ دن کبھی نہیں بھولوں گی جب خالہ اچانک ہی ہمارے گھر چلی آئیں اور انہوں نے امی کے سامنے دست سوال دراز کر دیا لیکن وہ میری نہیں بلکہ باجی کی بات کرنے آئی تھیں جسے سن کر امی حیران رہ گئیں اور بولیں۔ ”میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم نجمہ کے لیے آئی ہو؟“

”میں بھی نجمہ سے ہی شارق کا رشتہ طے کرنا چاہ رہی تھی لیکن وہ تو اسے اپنی چھوٹی بہن کی طرح سمجھتا ہے اور ان دونوں کی عمروں میں بھی خاصا فرق ہے جب کہ شاہدہ سے اس کی بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ ماشاء اللہ دونوں کی جوڑی خوب بجے گی۔ ویسے بھی شاہدہ بڑی ہے اس کی شادی پہلے ہونی چاہیے۔“

امی کیا کہتیں۔ باجی بھی انہی کی بیٹی تھیں۔ ان کے مستقبل کے بارے میں بھی امی کو ہی فیصلہ کرنا تھا۔ ویسے بھی ان کے اقرار یا انکار سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ باجی اور شارق کے درمیان پہلے ہی سارے معاملات طے پا چکے تھے۔ اب صرف رسم ادا ہونا باقی تھی۔ چنانچہ امی نے ہاں کر دی اور چند ماہ بعد باجی بیاہ کر شارق کے گھر چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد اس گھر میں اب صرف میں اور امی رہ گئے۔ مجھے شارق سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے لیے جو بہتر سمجھا وہی کیا۔ غلطی میری تھی جو اس کی تصویر دل میں سجا کر بیٹھ گئی۔ یہ جانے بنا کہ اس کے دل میں بھی میرے لیے کوئی جذبہ ہے کہ نہیں۔ اب تو میری وہی حالت تھی کہ ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا۔ امی دن رات مصلے پر بیٹھی میری شادی کی دعائیں مانگا کرتی تھیں

لیکن ان کی قبولیت کا وقت نہیں آیا تھا۔ وہ ہر وقت میرے بارے میں سوچتی رہتی تھیں اور بالآخر اسی غم نے ان کی جان لے لی۔

باجی چالیسویں تک میرے ساتھ رہیں پھر انہوں نے نادر شاہی حکم صادر فرمایا۔ ”نجمہ اپنا سامان پیک کرلو۔ اب تم ہمارے ساتھ رہو گی۔“

”نہیں میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”پاگل ہو گئی ہو۔“ شارق نے کہا۔ ”ہم تمہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔ اب تم ہماری ذمے داری ہو۔“

”ویسے بھی میں نے اس مکان کو فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔“ باجی بولیں۔ ”اس مکان کو رکھنے کا کیا فائدہ۔ جب کسی کو یہاں رہنا ہی نہیں ہے۔“

میں نے اس تجویز کی شدید مخالفت کی لیکن انہوں نے میری ایک نہیں سنی اور وہی کیا جو وہ چاہتی تھیں۔ شارق بھی انہی کی زبان بول رہا تھا۔ مجبوراً مجھے خاموش ہونا پڑا۔ میں اتنے دن باجی کے ساتھ رہی جب تک مکان بیچنے کی کارروائی مکمل نہ ہوگئی۔ اس کے بعد میں نے اپنے حصے کی رقم وصول کی اور وومن ہوسٹل میں منتقل ہوگئی۔ یہ ہوسٹل شہر کے ایک پوش علاقے میں واقع تھا جہاں دوسرے شہروں سے آنے والی ملازمت پیشہ خواتین رہا کرتی تھیں۔ باجی اور شارق نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن میں ان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ اپنے محبوب کو بہنوئی کے روپ میں دیکھوں۔

پھر میری زندگی میں ایک ایسا عجیب وغریب موڑ آیا جس پر میں آج تک حیران ہوں اس روز میں حسب معمول برانچ میں بیٹھی کام کر رہی تھی کہ ایک آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے راشد کھڑا ہوا تھا۔ جی ہاں میرا سابق باس۔

”نجمہ تم یہاں؟“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم اس برانچ میں ہوتی ہو؟“

”جی ہاں۔“ میں احتراماً کھڑی ہوگئی۔ ”آپ بیٹھیے ناں۔“

وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”میرا اکاؤنٹ اسی برانچ میں ہے لیکن اس سے پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔“

”اسے اتفاق ہی کہہ سکتے ہیں۔“ میں نے اخلاقاً کہا۔

”یقین جانو، مجھے تمہارے جانے کا بہت دکھ ہوا تھا

Downloaded From http://paksociety.com

لیکن یہاں دیکھ کر خوشی بھی ہو رہی ہے اور ستاؤ گھر کے کیا حالات ہیں؟''

میں نے اسے بتایا کہ امی پاپا کا انتقال ہو چکا ہے۔ باجی نے شادی کر لی اور میں ہوسٹل میں رہ رہی ہوں۔'' یہ سب جان کر اسے بہت افسوس ہوا۔ اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر مجھے دیا اور بولا۔ ''اگر تم مناسب سمجھو تو آج رات میرے ساتھ ڈنر کرو۔ مجھے فون کر دینا۔ میں تمہیں ہوسٹل سے لے لوں گا۔''

وہ چلا گیا تو میں اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ یہ اس راشد سے بالکل مختلف تھا جو کبھی میرا باس ہوا کرتا تھا اور جس کی ڈانٹ ڈپٹ سے میں تنگ آ چکی تھی۔ اس وقت وہ ایک شائستہ اور مہذب انسان لگ رہا تھا۔ مجھے تجسس ہونے لگا کہ اس نے مجھے ڈنر کی دعوت کیوں دی ہے چنانچہ چھٹی ہونے سے پہلے میں نے اسے فون کر دیا کہ آٹھ بجے اس کا انتظار کروں گی۔

''اس نے پہلی ہی ملاقات میں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ دوسری شادی کے لیے کسی مناسب لڑکی کی تلاش میں تھا۔ اس نے کسی لگی لپٹی کے بغیر کہہ دیا کہ وہ مجھ جیسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے جو ایمان دار، محنتی اور باصلاحیت ہو۔''

''آپ مجھے پرپوز کر رہے ہیں یا جاب کی آفر دے رہے ہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ایک ہی بات ہے۔ گھر داری کے لیے بھی یہ خصوصیات ضروری ہیں۔''

میں نے اس سے ایک ہفتے کی مہلت مانگی۔ میرے پاس سوچنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ ایک سخت مزاج شخص ہے اور بیوی بننے کے بعد بھی مجھے اس کی ڈانٹ ڈپٹ سننا پڑے گی لیکن میرے پاس کوئی اور آپشن بھی تو نہیں تھا۔ میں کب تک اس ہاسٹل میں رہ سکتی تھی۔ ہر عورت کی طرح میری بھی خواہش تھی کہ اپنا گھر ہو اور مجھے چہار دیواری کا تحفظ مل جائے۔ عورت کو بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔ بہت سے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ چنانچہ میں بھی مرد اور چار دیواری کے تحفظ کی خاطر یہ سمجھوتا کرنے پر تیار ہو گئی اور میں نے ایک ہفتے بعد راشد کو اپنی رضا مندی سے آگاہ کر دیا۔ البتہ یہ شرط ضرور رکھی کہ شادی کے بعد بھی اپنی ملازمت جاری رکھوں گی۔ اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور کہا کہ میں جب تک چاہوں ملازمت کر سکتی ہوں۔

باجی نے اس شادی کی بھرپور مخالفت کی۔ شارق بھی ان ..... کا ساتھ دے رہا تھا لیکن میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ مجھے اپنی زندگی کے فیصلے کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ اگر وہ شادی میں شرکت کرنا چاہیں تو ٹھیک ورنہ ان کے بغیر بھی یہ شادی ہو جائے گی۔ اس پر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

نکاح کی رسم بہت سادگی سے انجام پائی۔ البتہ راشد نے ولیمے کا انتظام ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کیا تھا۔ وہاں کی شان و شوکت، میرے کپڑے اور جیولری دیکھ کر باجی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ راشد میرے لیے اتنا کچھ کرے گا۔ میں نے ان کے چہرے پر رشک اور حسد کے تاثرات دیکھے۔

شادی کے بعد راشد مجھے شمالی علاقوں کی سیر کو لے گیا۔ اس دوران میں نے اس کی شخصیت کے مختلف رنگ دیکھے۔ وہ دیکھنے میں جتنا سخت اور کڑوا لگتا تھا اندر سے اتنا ہی نرم اور رحمدل تھا۔ وہ دل کھول کر خرچ کرتا اور کبھی اس کے ماتھے پر شکن نہیں آتی۔ ہنی مون سے واپس آنے کے بعد بھی میں کئی روز تک یہی دعا مانگتی رہی کہ مجھے راشد کی ڈانٹ نہ سننا پڑے لیکن کئی ماہ گزر گئے اور راشد نے مجھے ایک مرتبہ بھی نہیں ڈانٹا تو مجھ سے رہا نہ گیا اور ایک دن میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ ''کیا بات ہے۔ دفتر میں تو آپ روزانہ ڈانٹ ڈپٹ کیا کرتے تھے لیکن شادی کے بعد آپ نے مجھے ایک دفعہ بھی نہیں ڈانٹا۔''

''گھر اور دفتر میں فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح باس اور شوہر کے رویے بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ میں ڈسپلن کے معاملے میں کوئی سمجھوتا نہیں کرتا۔ دفتر میں لوگوں سے کام لینے کے لیے ڈانٹ ڈپٹ ضروری ہے۔ ورنہ سارا نظام چوپٹ ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی تم میری بیوی ہو۔ ماتحت نہیں جو ہر وقت تمہیں ڈانٹتا رہوں۔''

راشد کے اس جملے نے مجھے سرشار کر دیا۔ اب میں ملازم نہیں بلکہ اس کی کمپنی کی مالکن تھی۔ چند ماہ بعد میں نے ملازمت چھوڑ دی اور پوری طرح گھریلو زندگی سے لطف اندوز ہونے لگی۔ مجھے زندگی کا ہر عیش و آرام میسر ہے اور میں باجی کے مقابلے میں کئی گنا بہتر زندگی گزار رہی ہوں۔ یہ سمجھوتا میرے حق میں بہت اچھا ثابت ہوا۔ واقعی وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔

Downloaded From http://paksociety.com

میں مسلسل خود کو کوس رہا تھا۔ وقت کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ میری نظروں میں آج کا دن میرے لیے منحوس تھا۔ اس سے پہلے بھی میں ایسے حالات کا شکار ہوا تھا لیکن وقت کی گردش کہہ کر نظر انداز کر دیا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اچھے دنوں کے بعد برے دن بھی آتے ہیں جو بالآخر گزر ہی جاتے ہیں۔

مگر اس دفعہ یہ وقفہ کافی لمبا ہو گیا تھا اور گزرتے وقت کے ساتھ حالات کی گردش میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے یوں لگنے لگا تھا جیسے میں کوئی کولہو کا بیل ہوں جس کی آنکھوں پر خوش فہمی کی پٹی بندھی ہوئی ہے جو اس اُمید پر چلتا چلا جا رہا ہے کہ کبھی تو اچھے دن آئیں گے، کبھی تو حالات بہتر ہوں گے۔

آج ہی تو.... میں نے ٹی وی پروگرام میں سنا تھا کہ پیٹرول کی قیمتیں بڑھنے سے عام آدمی پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ ایک لحاظ سے یہ بات سچ بھی تھی کہ اثر تو کسی نئی چیز کا ہوتا ہے، جیسے شراب کا پہلا گھونٹ ...... سگریٹ کا پہلا کش ہی اثر کرتا ہے پھر بعد میں آہستہ آہستہ رگوں میں سرایت کرتے ہوئے اسے نشہ نہیں رہنے دیتا' عادت بنا دیتا ہے۔ اسی طرح روز بروز بڑھتی ہوئی مہنگائی معاشرے کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر چکی ہے کہ چیزوں کی قیمتیں بڑھنے سے افسوس نہیں ہوتا البتہ کہیں قیمتیں کم ہو جائیں یا رعایت مل جائے تو خوشی کی بجائے حیرت ہوتی ہے۔

میں بھی اس مہنگائی کے ڈسے ہوئے معاشرے میں

تھکن

محترم مدیرِ اعلیٰ
السلام علیکم

جس واقعے کو میں نے کہانی کی شکل دی ہے یہ زیادہ پرانا واقعہ نہیں ہے۔ اخباروں میں بھی آیا تھا۔ اس واقعے نے مجھے جھنجوڑ دیا تھا۔ سرگزشت کے قارئین کو بھی یہ واقعہ سوچنے پر مجبور کردے گا کہ آج کے دور میں انسان کتنا بے بس ہو چکا ہے۔

اختر شہاب
(کراچی)

Downloaded From http://paksociety.com

کلرکی کرتے ہوئے اپنی بقا کی جدوجہد میں مصروف تھا۔تنخواہ کی مد میں مجھے چار ہزار سات سو پچھتر روپے ماہانہ ملتے تھے‘جو پندرہ سالہ نوکری کے بعد میرا امتحانتہ تھا ورنہ نئے بھرتی ہونے والے تو اس سے بھی کم تنخواہ لے رہے تھے جس میں سے مکان کا کرایہ‘ بجلی‘ گیس و پانی کا بل‘ بچوں کے اسکول کا خرچ اور دفتر آنے جانے کا خرچ نکال کر گھر کے خرچ کے لیے بمشکل ہزار روپے بچا کرتے تھے بلکہ بعض اوقات تو اس سے بھی کم۔باقی اخراجات پورے کرنے کے لیے میں دفتر کے بعد ایک دو ٹیوشنز بھی کرتا تھا جو بچوں کے امتحانات ہونے کے بعد بند ہو جاتی تھیں تب میں جس طرح گھر کا خرچ چلاتا تھا‘ خدا ہی جانتا ہے۔

پہلے میرے حالات اتنے برے نہ تھے۔شادی سے پہلے میں اپنے ماں باپ اور بھائی بھاوج کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہتا تھا۔بھائی چونکہ سرکاری ملازم تھا لہٰذا گھر کا زیادہ خرچ وہی چلاتا تھا۔میں تو ایک محدود رقم گھر میں دینے کے بعد پوری تنخواہ اپنی ذات پر ہی خرچ کر دیتا تھا مگر جب میری شادی ہوئی تو گھر کے خرچ میں مجھے اپنا حصہ دینا پڑا۔تب بھی یہ رقم مجھ پر بوجھ نہ تھی۔پھر اوپر تلے تین بچیاں ہو جانے کی وجہ سے میرا خرچ بڑھ گیا مگر گزارا تب بھی ہو رہا تھا۔مسئلہ تو مجھے تب بھی نہ ہوا تھا جب یکے بعد دیگرے دو پریشانیاں سامنے آئیں یعنی میرے والد صاحب جو شوگر کے مریض تھے‘ان کی ٹانگ کا زخم بگڑ جانے کی وجہ سے ان کی ٹانگ کاٹنا پڑی اور اس کے کچھ عرصہ بعد ہی والدہ پر فالج کا اٹیک ہوا اور وہ صاحب فراش ہوگئیں۔مجھے اس لیے مسئلہ نہیں ہوا تھا کہ ان کے علاج کا تمام خرچ بھائی کے محکمے نے برداشت کیا تھا ورنہ اگر کہیں‘ مجھے یہ کام خود کرانے پڑتے تو کیا ہوتا کیونکہ پچاس روپے ماہانہ میڈیکل الاؤنس میں تو میرا اپنا علاج نہیں ہوتا تھا تو میں والدین کا علاج کہاں سے کرواتا۔البتہ میری ذمے داری بڑھ گئی۔بڑے بھائی اور اس کی بیوی کی بہ نسبت ہم دونوں میاں بیوی والدین کی خدمت زیادہ کرتے تھے۔

حالات کی سنگینی کا اندازہ مجھے تب ہوا جب میری بیوی اور بھاوج کے جھگڑے کے بعد بڑے بھائی نے مجھے بلایا اور کہا۔"اشتیاق!میرے اور تمہارے بچے ہو جانے کی وجہ سے یہ گھر چھوٹا پڑ رہا ہے لہٰذا ہم دونوں کو علیحدہ ہو جانا چاہیے۔"

"کیا......!"میں بھائی کے اس براہ راست جملے سے حیرت زدہ ہوگیا۔مجھے اس کی توقع نہ تھی۔یہ میرا پُرخلوص بھائی تھا جس نے ہمیشہ میری مدد کی تھی۔اب اسے کیا ہوگیا تھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔"وہ بولا۔"اس سے پہلے کہ آپس میں جھگڑے بڑھیں اور تعلقات خراب ہوں‘ہم لوگوں کو علیحدہ ہو جانا چاہیے۔"

"جھگڑے بڑھ ہی تو گئے ہیں۔دلوں میں گنجائش کم ہوگئی ہے تبھی تو بات علیحدگی کی ہو رہی ہے۔"میں نے سوچا مگر بولا کچھ نہیں۔

"اور ویسے بھی آج کل محکمے کے حالات اچھے نہیں جا رہے۔ہمارے ہاں تو نوکری بچاؤ مہم جاری ہے۔ان حالات میں گھر میں بھی سکون نہ ہو تو انسان پاگل ہو جائے گا۔"

"اب میری سمجھ میں بات آئی۔"میں نے سوچا۔"یہ سب بھاوج کا پڑھایا سکھایا ہے۔وہ تو میری شادی کے بعد ہی علیحدہ کرنے کے درپے تھی۔یہ تو بھائی کی وجہ سے اتنا لمبا عرصہ گزر گیا ورنہ علیحدگی تو کبھی کی ہو جاتی۔"

"تو میں کہیں علیحدہ مکان کرائے پر لے لوں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں میں نہیں چاہتا کہ تم پریشان ہو۔لہٰذا یہ مکان بیچ کر اس کے حصے میں سے جو رقم تمہیں ملے‘اس سے کوئی چھوٹا موٹا مکان خرید لینا۔"

"اور امی ابو......"

"وہ تمہارے ساتھ رہیں گے۔"بھائی فوراً بولا۔"ہم لوگوں نے والدین کی بہت خدمت کر لی‘اب تمہاری باری ہے۔"

"بھائی تو بالکل فرنٹ ہی ہوگیا ہے۔"میں نے سوچا اور میرا دل دکھ سے بھر گیا۔نمی آنکھوں سے باہر نکلنے کو بے تاب ہونے لگی مگر میں نے خود کو سنبھال لیا۔

مکان کے بٹوارے میں میرے حصے میں اتنی رقم نہیں آسکی تھی کہ میں کوئی مکان خرید لیتا کیونکہ مکان کی تعمیر کے وقت بھائی نے بھی لون لے کر پیسا لگایا تھا لہٰذا زیادہ حصہ اس کے پاس چلا گیا۔میرے حصے میں جو رقم آئی تھی‘اس میں سے کرائے کے مکان کا ایڈوانس دینے اور ضرورت کی چند چیزیں خریدنے کے بعد اتنی رقم بچی تھی کہ میں ایک موٹر سائیکل خرید لوں۔یہ موٹر سائیکل کافی

Downloaded From http://paksociety.com

عرصہ میرے ساتھ بھی رہی پھر بچی کی پیدائش پر کیس بگڑ جانے کی صورت میں مجھے موٹر سائیکل بیچ کر اسپتال کا بل ادا کرنا پڑا تھا۔

☆.....☆

اس دن میں دفتر سے فارغ ہو کر ٹیوشن پڑھا کر گھر آیا تو کھانے کے دوران بیوی نے کہا۔ ''آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟''

''ہاں بولو!'' میں نے لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''آپ اتنی محنت کرتے ہیں اور تھک جاتے ہیں جبکہ میرے پاس کافی وقت ہوتا ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ آپ کی مدد کروں۔'' وہ بولی۔

''مطلب کیا ہے تمہارا؟''

''میں...... میں چاہ رہی تھی کہ کسی اسکول میں نوکری کرلوں۔'' وہ بولی۔

''پاگل ہوگئی ہو کیا؟'' میں نے کہا۔

''آپ نہیں چاہتے کہ میں اپنی تعلیم سے فائدہ اٹھاؤں یا پھر میرے نوکری کرنے سے آپ کی انا پر شدید ضرب لگے گی یا آپ نوکری کرنے والی عورتوں کو برا سمجھتے ہیں۔'' شاید بیوی نے یہ باتیں پہلے سے سوچی ہوئی تھیں۔

''یہ بتاؤ' یہ پٹی تمہیں کس نے پڑھائی ہے؟'' میں ہنس پڑا۔

''کیا مطلب!'' وہ بولی۔ ''مجھے اتنی بھی عقل نہیں ہے کیا؟''

''نہیں!'' میں بولا۔ ''اگر تمہارے پاس عقل ہوتی تو یہ بات ہرگز نہیں کہتیں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ تم نے جتنی بھی باتیں کہی ہیں۔ مجھے ان میں سے کسی پر بھی اعتراض نہیں ہے۔ اگر ہمارے حالات صحیح ہوتے تو تم بخوشی نوکری کر سکتی تھیں مگر کیا ہم نے سوچا ہے کہ میں تو سارا دن گھر سے باہر ہوتا ہوں اور اگر تم بھی چلی جاؤ گی تو بچیوں کو کون دیکھے گا۔ امی ابو کو کون دیکھے گا۔ ابو تو ٹانگ کی وجہ سے کہیں آنے جانے کے قابل نہیں ہیں اور امی کی حالت تمہیں پتا ہے؟ ایسے میں خدانخواستہ اگر دونوں میں سے کسی کی طبیعت خراب ہوتی ہے تو پھر گھر پر کون ہوگا انہیں دیکھنے والا؟ دعا کرو دونوں صحت مند ہو جائیں تو پھر کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔''

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

Downloaded From http://paksociety.com

☆......☆

اگلے دن میں دفتر میں بیٹھا بیوی کی باتوں پر غور کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر میں کسی طرح ایک موٹر سائیکل خرید لوں تو نہ صرف ایک ٹیوشن زیادہ کر سکتا ہوں بلکہ بسوں میں آنے جانے اور پیدل چلنے کی تھکن سے بھی بچ سکتا ہوں۔

اتنے میں میری کولیگ سائرہ آگئی۔

''اشتیاق صاحب!'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''آپ اور ہم تو خاص آدمی ہو گئے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ دیکھیں!'' وہ ایک اخبار سامنے کرتے ہوئے بولی۔ ''اس اخبار میں چھپنے والے تجزیے کے مطابق وہ عام آدمی جس پر مہنگائی کا اثر نہیں ہوتا' اس کی ماہانہ آمدنی 35 سے 40 ہزار ہونا چاہیے لہٰذا اس لحاظ سے آپ خاص آدمی ہوئے۔ کیا میں نے غلط کہا؟''

''یہ اخبار والے حقیقت کو سامنے لانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں مگر ان کی سنتا کون ہے۔''

''کہتے تو آپ ٹھیک ہیں مگر میں نے آپ کو خاص آدمی ایک اور وجہ سے کہا ہے۔''

''کیا؟''

''پہلے مٹھائی کا وعدہ کریں تو بتاؤں گی۔''

''ارے بھئی' میں نے پہلے کبھی انکار کیا ہے۔'' میں بولا۔

''تو آپ کو مبارک ہو۔ آپ کی موٹر سائیکل کا ایڈوانس منظور ہو کر آگیا ہے۔''

''اچھا!'' میں خوش ہو گیا۔ اب روز روز بسوں کے جھنجٹ سے نجات مل جائے گی۔ اس کے علاوہ وہ بچوں کو بھی اسکول چھوڑ آیا کروں گا۔ وین کا خرچ بھی بچے گا۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟'' سائرہ مجھے خاموش دیکھ کر بولی۔

''وہی' دو اور دو چار جوڑ رہا ہوں۔''

''چلیں' آپ جوڑتے رہیں' میں چلتی ہوں۔''

''بیٹھیں بھئی' ایک کپ چائے تو پیتی جائیں۔''

''نہیں!'' اس نے کہا۔ ''مجھے اپنا کام ختم کرنا ہے' میں تو بس آپ کو مبارک باد دینے آئی تھی ورنہ آپ دیکھ رہے ہیں نا' وہ منحوس مجھے کیسے گھور رہا ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے باس کی طرف اشارہ کیا۔'' اب لنچ میں ملاقات ہوگی۔''

یہ سائرہ بھی عجیب عورت تھی۔ دفتر میں اسٹینو تھی۔ سارا دفتر اس سے ڈرتا تھا۔ جب بھی کسی نے اس سے فری ہونے کی کوشش کی' وہ اسے جھاڑ دیا کرتی تھی مگر نہ جانے کیوں وہ مجھ سے بہت فری ہو کر باتیں کر لیا کرتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں فطرتاً سیدھا سادا شخص ہوں۔ میں ہر ایک کی مدد کرنا چاہتا تھا۔

عموماً دفتر کی کینٹین میں وہ اکیلے لنچ کیا کرتی تھی مگر کبھی کبھار میری میز پر بھی آجاتی تھی۔ اس دوران وہ باتیں بھی عجیب کیا کرتی تھی۔

اس دن بھی اس نے پوچھا۔ ''آپ کو پتا ہے کہ عورتوں کی عمر مردوں سے نسبتاً زیادہ کیوں ہوتی ہے؟''

''میں نے غور نہیں کیا۔'' میں بولا۔ ''شاید! ان کی طبعی حالت کی وجہ سے یا خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی زیادہ قوت برداشت کی وجہ سے۔''

''بکواس!'' وہ بولی۔ ''آپ تو بھولے بادشاہ ہیں۔''

''کیا میں نے غلط کہہ دیا؟'' میں اس کے بکواس کہنے پر چونک گیا کہ اب پتا نہیں یہ مجھے کیا کہہ دے۔

''اشتیاق صاحب!'' وہ بولی۔ ''اصل چیز احساس ذمے داری ہے۔ آپ تو سروس میں ہیں آپ کو تو پتا ہے کہ انسان جب بڑے عہدے پر آجائے تو اس کی ذمہ داریاں بھی بڑھ جاتی ہیں۔ وہ پہلی سی بے فکری نہیں رہتی۔ اپنی غلطیوں کے ساتھ ساتھ آپ کو اپنے ماتحتوں کی غلطیوں کو بھی سنبھالنا پڑتا ہے۔ ان کے بارے میں جواب دہ ہونا پڑتا ہے۔ یہی حال مرد اور عورت کے رشتے کا ہے۔ مرد کی ذمے داری زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے سامنے سو مسائل ہوتے ہیں۔ اپنے دفتر کے مسائل' بھائی بہنوں کا خیال' ماں باپ کی فکر' بیوی بچوں کی ذمے داری۔''

''تمہارا مطلب ہے' عورت ذمے دار نہیں ہوتی۔'' میں اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''تم تو اپنی صنف کی مخالفت کر رہی ہو۔''

''میں نے کب کہا۔'' وہ بولی۔ ''مگر عورت اور مرد کی ذمے داری میں فرق وہی افسر اور ماتحت والا ہے۔ عورت کو لاشعوری یا شعوری طور پر ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ اس کے سر پر سائبان موجود ہے۔ وہ اپنی ذمے داریاں اپنی سوچیں' اپنے مسائل مرد کی جھولی میں ڈال کر چند لمحے

Downloaded From http://paksociety.com

سکون کے لیے ملتی ہے جبکہ مرد عورت کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی مستقبل کی سوچوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔''

''تمہاری بات دل کو لگتی ہے۔''میں نے کہا۔

''مگر تم نے یہ سب سیکھا کہاں سے؟''

''تجربے سے۔''وہ بولی۔''مجھے یہ احساس اس وقت ہوا جب شوہر کے مرنے کے بعد میں نوکری کرنے نکلی تو میں نے دیکھا بلکہ میں نے محسوس کیا کہ میری ذمے داریاں جن کا میں بہت شور مچایا کرتی تھی' مرد کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔اس سے پہلے مجھے بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ دنیا میں اتنی تھکن' اتنی پریشانیاں اور اتنی سوچیں ہیں۔اس سے پہلے میں اپنے شوہر کے پاس جا کر اپنی پریشانیاں بھول جاتی تھی مگر اب بچوں کو پیار کرتے ہوئے بھی میرے ذہن میں یہ خیال رہتا ہے کہ نوکری پر جانا ہے۔صبح جلدی اٹھنا ہے۔فلاں کام کل رہ گیا تھا' اسے آج مکمل کرنا ہے۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ نوکری کرنے والی شادی شدہ عورت زیادہ مظلوم ہے؟''

''یقیناً!''وہ بولی۔

''مگر مغرب میں ملازمت پیشہ خواتین ہماری خواتین کی بہ نسبت زیادہ خوش اور خوشحال نظر آتی ہیں۔''

''یہ سب پروپیگنڈہ ہے۔''وہ بولی۔''مغرب کا مرد عقلمند ہے۔اس نے اپنی ذمے داریاں عورت کو منتقل کردی ہیں اور خود بے فکر ہوگیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے یہاں وہاں سب مظلوم ہی ہیں۔''میں نے کہا۔

''آپ اس کا اطلاق سب پر نہیں کرسکتے۔''وہ بولی۔''ہوسکتا ہے کہ میں اسے زیادہ شدت سے محسوس کررہی ہوں کیونکہ میں نے کچھ عرصے پہلے گھر سے قدم نکالا ہے یا ہوسکتا ہے کہ میری ذمے داریاں دوسری عورتوں سے زیادہ ہوں۔اس کے علاوہ شوقیہ نوکری کرنے والی خواتین بھی تو ہیں' آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟''

''مجھے تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔''میں نے کہا۔

''کبھی کبھی مجھے بھی اپنی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔'' وہ بولی''پتا ہے' کبھی میں سوچتی ہوں کہ مرد بہت ظالم ہے اور عورت بہت مظلوم مگر جب میں حالات کا تجزیہ کرتی ہوں تو مرد بھی مظلوم ہی نظر آتا ہے۔شاید نہ مرد ظالم یا مظلوم ہے اور نہ عورت......ظالم تو ہماری قسمت ہے' ہمارا مقدر ہے جو ہمیں ادھر سے ادھر بھگاتا رہتا ہے اور ہم سب اپنا اپنا مقدر بھگتتے ہوئے دوسروں کو الزام دے کر خود کو مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں۔''

دفتر سے ملی موٹر سائیکل کی ایڈوانس کی رقم اتنی نہ تھی کہ اس سے ایک اچھی سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل خریدی جاسکتی لہٰذا میں نے بیوی کا کچھ زیور بیچ کر رقم ملائی۔تب ایک موٹر سائیکل خرید سکا۔آج جس کا افتتاح تھا۔

یہ افتتاح اس قسم کا نہیں تھا جس میں نمود و نمائش ہوتی ہے۔فیتے کٹتے ہیں' واہ واہ ہوتی ہے۔مٹھائیاں بٹتی ہیں بلکہ افتتاح کے طور پر میں نے سوچا تھا کہ بچیوں کو اسکول چھوڑتا ہوا' اپنے دفتر چلا جاؤں گا۔واپسی پر بچیوں کو بیوی لے آیا کرے گی۔وین والے کو میں نے پہلے ہی منع کردیا تھا کہ اس پہلی سے میں اپنی بچیوں کو خود ہی اسکول چھوڑنے جاؤں گا۔

میں نے ایک بچی کو آگے اور دو کو پیچھے بٹھا کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور گلی سے نکلتا ہوا سیدھا مین روڈ پر آگیا۔آگے چورنگی کراس کرنے کے بعد میں تھوڑا آگے بڑھا تو اچانک ایک مونچھوں والا قدآور شخص موٹر سائیکل کے سامنے آگیا۔میں تھوڑا سا پریشان تو ہوا مگر میں نے موٹر سائیکل روک لی۔

''کیا بات ہے' مرنے کا ارادہ ہے کیا؟''میں نے غصے سے پوچھا۔

''اس کا تو نہیں البتہ اگر تمہارا مرنے کا ارادہ ہے تو موٹر سائیکل پر بیٹھے رہو ورنہ شرافت سے نیچے اتر آؤ۔''پیچھے سے آنے والے نے جواب دیا اور گردن پر رکھی ہوئی پستول کی ٹھنڈی نال نے مجھے یکدم جیسے منجمد کردیا۔

''ارے ارے بھائی' یہ کیا مذاق ہے؟''میں مڑتے ہوئے بولا۔

''مذاق کے بچے نیچے اترتا ہے یا نہیں۔''پیچھے والے شخص نے پستول کی نال گردن پر رکھ کر دباؤ ڈالا۔

میرا جی چاہا کہ اس شخص سے بھڑ جاؤں۔زیادہ سے زیادہ کیا کرے گا' گولی مار کر جان ہی لے لے گا ناں مگر میں بھی دونوں میں سے ایک کو تو لے کر ہی مروں گا۔میں نے سوچا مگر بچیوں کے رونے نے غصہ ٹھنڈا کردیا۔میں جلدی سے موٹر سائیکل سے اترا۔ایک بچی کو اتارا' دوسری کو اتارا۔تیسری کی طرف میں ہاتھ ہی بڑھا پایا تھا کہ آگے والے نے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حنا ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

اسے اٹھا کر نیچے پٹخ دیا۔ وہ اور زور زور سے رونے لگی۔

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں غصے سے ان کی طرف بڑھا ہی تھا کہ بچیوں نے ''بابا' بابا'' کہہ کر چلانا شروع کر دیا۔

میں مڑ کر انہیں چپ کرانے لگا اور وہ دونوں ہوا ہو گئے۔

میں نے موٹر سائیکل پر وہاں سے گزرنے والے دو تین افراد سے ان کا تعاقب کرنے کو کہا مگر جان بوجھ کر موت کے پیچھے کون جائے۔ ہر شخص نے مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ پولیس چوکی چورنگی کے پاس ہی تھی۔ میں ڈاکوؤں کی دلیری پر حیران تھا کہ وہ پولیس چوکی کے نزدیک بھی واردات کرنے سے نہیں چوکے اور لوگوں کی بے حسی پر متاسف تھا کہ چند سیکنڈوں کا یہ ڈراما درجنوں افراد نے دیکھا اور خاموشی سے گزرتے گئے۔

میں پولیس چوکی پہنچا، تمام واردات سنائی اور سو روپے دے کر ایف آئی آر درج کروائی ورنہ سارا دن ایف آئی آر ہی درج نہ ہوتی۔ بچیوں کو رکشے میں گھر لے گیا۔ انہیں وہاں چھوڑ کر دفتر آ گیا۔

دفتر میں موٹر سائیکل چھن جانے کی اطلاع آگ کی طرح پھیل گئی اور سب لوگ ہی افسوس کرنے لگے۔

''بہت افسوس ہوا آپ کی موٹر سائیکل چھن جانے کا۔'' سائرہ کی آواز پر میں خیالوں سے چونکا ورنہ افسوس کرنے والوں کا رش ختم ہونے کے بعد اپنے خیالات میں گم بیٹھا تھا۔

''شکریہ، مگر مجھے افسوس موٹر سائیکل کے چھننے کا نہیں ہے۔'' میں بولا۔

''تو پھر؟''

''مجھے تو اپنی بے بسی پر رونا آ رہا ہے۔ کاش میں نے مقابلہ کر کے موٹر سائیکل دی ہوتی۔ مجھے افسوس تو معاشرے کی بے حسی پر ہے کہ درجنوں لوگوں نے یہ منظر دیکھا مگر کسی نے میری مدد کرنے کی کوشش نہ کی۔ مجھے تو اس بات کا بھی افسوس ہے کہ میں قانون کی ناک کے نیچے لٹ گیا لیکن ان سب باتوں سے ہٹ کر مجھے اعتبار اور اعتماد لٹنے کا افسوس ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ کسی بھی بچی کے لیے اس کا باپ' اس کا محافظ' اس کا سہارا اور آیندہ زندگی کے لیے اس کے اعتماد کی بنیاد ہوتا ہے اور میری بچیاں میرے سامنے اپنے باپ کی بے بسی کا تماشا دیکھتی رہیں۔ اب میں کس طرح انہیں ایک باپ کا اعتماد دے سکوں گا۔ کیا وہ ساری عمر عدم تحفظ کے اندیشے کا شکار نہیں رہیں گی؟ یہ خوف' یہ عدم تحفظ ان کے لاشعور میں بیٹھ کر نہ جانے ان میں کہاں کہاں ذہنی پریشانیاں پیدا کرے گا۔ میں تو اس لیے پریشان ہوں۔ ابھی تو میں انہیں سہا سہا گھر چھوڑ آیا' نہ جانے وہ کیا کر رہی ہوں گی؟''

''آپ کی بات صحیح ہے مگر وقت بڑے بڑے زخم مندمل کر دیتا ہے۔'' وہ بولی۔ ''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی موٹر سائیکل مل جائے تو ان کی حالت بہتر ہو جائے۔''

''شاید ایسا ہو جائے مگر ان کا اعتماد' ان کا یقین اور باپ کی طرف سے تحفظ کا احساس شاید ہی کبھی واپس آ سکے۔'' میں خاموش ہو گیا۔

''خیر آپ فکر نہ کریں۔ اللہ بہتر کرے گا۔'' وہ بولی۔

''فکر نہ کروں۔'' میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''یہ تم نے خوب کہی۔ ان تمام باتوں کے علاوہ میرے افسوس کی ایک وجہ اور بھی ہے' ابھی تو میں نے اپنی موٹر سائیکل ایڈوانس کی ایک قسط بھی ادا نہیں کی۔''

''اس پہلو کی طرف تو میری توجہ ہی نہیں گئی۔'' وہ بولی۔ ''اس معاملے میں ایک ترکیب ہو سکتی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''ہیڈ کوارٹر کو درخواست دی جائے کہ جب تک موٹر سائیکل نہ مل جائے' قرضے کی واپسی مؤخر کر دی جائے۔''

''ایسا ہوگا نہیں۔''

''کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ آپ کوئی قرضہ معاف کرنے کو تو نہیں کہہ رہے ہیں۔''

''چلو بناتے ہیں درخواست۔''

''آپ بیٹھیں' میں درخواست بنا کر لاتی ہوں۔ اسے آج ہی ہیڈ کوارٹر بھیج دیتے ہیں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''یہ لیں' اس پر دستخط کر دیں۔'' وہ درخواست بنا کر لائی تو میں پھر سوچوں میں گم صم سا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کاغذ لے لیا۔ درخواست پڑھی اور دستخط کر دیے۔

Downloaded From http://paksociety.com

''ایک بات کہوں۔'' وہ بولی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔

''اس طرح گم صم ہو کر مت بیٹھیں۔ آپ کو نہ صرف خود یہ نقصان برداشت کرنا ہے بلکہ گھر جا کر سب کو تسلی بھی دینا ہے۔ آپ اگر خود کو نہیں سنبھالیں گے تو پریشان ہو جائیں گے۔''

''کہتی تو تم ٹھیک ہو مگر مجھے سنبھلنے کے لیے وقت درکار ہے۔ بار بار وہی منظر میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اشتیاق صاحب ان سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیں۔ یہ چوری' یہ ڈاکے' یہ ناانصافیاں اور یہ معاشی جدوجہد کرنے میں مصروف بے حس لوگ...... اک حقیقت ہیں' جن سے نظریں نہیں چرائی جا سکتیں مگر انہیں اوپر طاری کرنے سے آدمی ڈپریشن کا شکار ہو کر وقت سے پہلے ہی مر جاتا ہے۔''

''بات تو تمہاری صحیح ہے مگر انسان اپنے ذہن کو تالا بھی تو نہیں لگا سکتا۔''

''تالا لگانے کو کون کہہ رہا ہے۔ آدمی ہر بات کا اچھا پہلو بھی تو دیکھ سکتا ہے۔''

''مثلاً میری موٹر سائیکل چھن جانے میں نقصان کے علاوہ اچھا پہلو کہاں سے آ سکتا ہے؟''

''اس میں کئی اچھے پہلو ہیں۔ اول یہ کہ آپ کی جان بچ گئی۔ جان کا صدقہ مال گیا' ورنہ ہو سکتا تھا کہ آپ مرتے نہیں تو گولی سے زخمی ہو کر اسپتال میں پڑے ہوتے۔ آپ کی بچیوں پر بھی خراش نہ آئی۔ خدانخواستہ وہ بھی زخمی ہو سکتی تھیں۔'' وہ بولی۔

''یقین نہیں آتا کہ اتنی ہنسنے بولنے والی لڑکی اس قسم کی سیریس باتیں بھی کر سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے' اندر سے تم بہت دکھی ہو۔''

''دکھ...... یہ بہت معمولی سا لفظ لگتا ہے میرے مسائل کے آگے۔'' وہ تلخی سے بولی۔ ''آپ کو پتا ہے' میرے کیا حالات ہیں؟''

''تم نے کبھی بتایا ہی نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اور میں کسی کی پرسنل لائف میں دخل دینے کا قائل نہیں۔ نہ میں کسی کی پرسنل باتیں پوچھتا ہوں اور نہ ہی کسی کو بتا سکتا ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے کہ آپ میں یہ برائی نہیں ہے اسی لیے میں آپ سے فری ہو کر بات بھی کر لیتی ہوں۔ میں شاید آپ کو اب بھی کچھ نہ بتاتی' مگر اس لیے بتا رہی ہوں کہ شاید دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔''

میں خاموش رہا۔

''یہ تو آپ کو پتا ہے۔'' وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''شوہر کے انتقال کے بعد سے میں نوکری کر رہی ہوں۔ میں شاید نوکری نہ کرتی اگر اپنے ساس سسر کی بات مان لیتی۔ وہ میرے نیم پاگل دیور سے میرا نکاح کرانا چاہتے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ میں ان کی بات مان لیتی کیونکہ مجھے اس پر ویسے بھی ترس آیا کرتا تھا مگر میرے پابند شرع سسر صاحب نے بیٹے کی محبت میں یہ مسئلہ نظرانداز کر دیا کہ پاگل سے نکاح نہیں ہو سکتا۔ شرع کا یہ مسئلہ میں نے بتایا تو انہوں نے میرا وہاں رہنا دوبھر کر دیا۔ جیسے تیسے عدت پوری کی پھر میں کرائے کے مکان میں اٹھ آئی۔''

اتنا کہہ کر وہ چپ سی ہو گئی۔ میں بھی خاموش' اس کے بولنے کا منتظر رہا۔

''میں سسرال سے میکے بھی جا سکتی تھی مگر کس کے پاس؟ ماں باپ کا انتقال ہو گیا۔ بھائی اپنی بیویوں کے دباؤ میں ہیں۔ انہوں نے رسماً بھی مجھے اپنے پاس آنے کو نہیں کہا اور نہ ہی کبھی روپے پیسے سے میری مدد کی۔ کرائے کے مکان میں تنہا رہنے والی عورت کو لوگ ویسے بھی لوٹ کا مال سمجھتے ہیں۔ یہ تو آپ کو بھی پتا ہے کہ گھر سے دفتر کے راستے میں عورتوں کو کن کن باتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ویسے بھی آج کل محلے کا ایک لفنگا میرے پیچھے پڑا ہوا ہے جس کی وجہ سے میں راتوں کو بھی سکون سے نہیں سو سکتی۔ آپ کو پتا ہے کہ میں اپنے باس کو منحوس کیوں کہتی ہوں محض اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے۔ میرے پاس فون آیا کہ میری بچی گھر میں کھیلتے ہوئے آنکھ زخمی کر بیٹھی ہے۔ میں فوراً چھٹی کر کے جانا چاہتی تھی مگر مجھے تمام ضروری لیٹر ٹائپ کرنے تک چھٹی نہ ملی۔ جب میں گھر پہنچی تو محلے والے میری بچی کو اسپتال تو پہنچا چکے تھے مگر اس کی آنکھ ضائع ہو چکی تھی۔ یہاں تو ٹھیک ٹھاک لڑکیوں کے رشتے نہیں آتے' ایک عیب دار لڑکی کو کون پوچھے گا۔'' وہ سانس لے کر پھر بولی۔ ''تازہ ترین کیا بتاؤں۔ میرا بڑا بیٹا میٹرک میں آ گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرا سہارا بنے گا مگر گھر میں میری عدم موجودگی کی

Downloaded From http://paksociety.com

وجہ سے وہ بہک گیا ہے۔ ہیروئن کا عادی بن گیا ہے اور یہ خبر پا کر میری ہمت بالکل ختم ہوگئی ہے۔ میں تو اس آس میں جدوجہد کررہی تھی کہ کبھی تو سکھ کے دن آئیں گے مگر اب تو میں اس قدر ٹوٹ گئی ہوں کہ حالات سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کے بارے میں سوچتی ہوں۔''

''دوسروں کو حوصلہ دینے والی لڑکی خود حوصلہ ہار جائے' ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ آیندہ ایسا سوچنا بھی مت۔'' میں نے کہا۔ سائرہ کے حالات سن کر میرا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ لہٰذا میں پورے خلوص سے بولا۔ ''میری کسی قسم کی بھی مدد درکار ہو تو ضرور بتانا۔''

''میری سب سے بڑی مدد یہ ہے کہ آپ میری کوئی مدد نہ کریں۔'' وہ بولی۔

''کیا!'' میں حیران رہ گیا۔

''جی!'' وہ بولی۔ ''آپ کو پتا ہے کہ میں آپ سے چند باتیں کرلیتی ہوں تو دفتر میں کیا راز و نیاز ہوتے ہیں؟ اگر آپ میری مدد کرنے لگے تو لوگوں کی بند زبانیں کھل جائیں گی اور میں اپنے مسائل میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میں آپ سے چند باتیں کرکے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلیتی ہوں۔ ویسے بھی شاید میں اپنی ذاتی باتیں آپ سے بھی شیئر نہ کرتی مگر میں نے آپ کو یہ سب اس لیے بتایا ہے کہ آپ اس حقیقت کو جان سکیں کہ اس دنیا میں صرف آپ ہی پریشان نہیں ہیں۔ صرف آپ ہی کے ساتھ مسئلے نہیں بلکہ مسئلے مسائل اور پریشانیاں تو یہاں قدم قدم پر بکھرے ہوئے ہیں۔''

☆......☆

آج صبح جب میں گھر سے نکلا تو کافی پریشان تھا کیونکہ پچھلے دو تین ماہ سے حالات بگڑتے ہی جارہے تھے۔ بیماری کی وجہ سے والد اور والدہ باری باری اسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ ان کے علاج پر خاصا خرچا آ گیا تھا۔ وہ ٹھیک ہوئے تو بیوی بیمار ہوگئی تھی جس کی وجہ سے گھر کا نظام بھی درہم برہم ہوگیا تھا۔ دوائیں وغیرہ خریدنے میں قرض الگ چڑھ گیا تھا۔

میں ناشتا کررہا تھا جب بیوی نے پوچھا۔ ''سنیں! پہلے تو آپ کبھی کبھار پھل وغیرہ لے آتے تھے' اب نہیں لاتے۔''

''میں تو اب فقیر کو بھی خیرات نہیں دیتا۔'' میں اپنے جواب سے بیوی کو حیرت زدہ دیکھ کر دوبارہ بولا۔ ''یہ سوچ کر یہ پیسے بیوی بچوں پر خرچ کروں گا تو دہرا ثواب ملے گا۔''

''آپ میری بات کا برانہ مانیے۔'' بیوی بولی۔ ''میں گھر کے حالات سے بے خبر نہیں ہوں۔ میں نے تو یہ سوچ کر کہا تھا کہ بچوں نے بہت دن سے کوئی پھل نہیں کھایا ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' میں بولا۔ ''حالات کچھ بہتر ہوں تو تبھی کچھ لاؤں گا۔'' میں نے سوچا۔ آج تو ویسے بھی مہینے کا آخری دن تھا۔ پچھلے ہفتے میں نے ایک دوست سے جو قرض لیا تھا' اس میں سے سو روپے اور کچھ ریزگاری پڑی ہوئی تھی۔ جب میں گھر سے نکلا تھا تو گٹر کے بہتے پانی سے بچنے کے لیے چھلانگ لگا کر جانا چاہا اور پیر مڑ گیا۔ پیروں میں موچ آ گئی تھی۔ مجھے لنگڑاتے ہوئے بس اسٹاپ تک جانا پڑا۔ بس بھی کافی انتظار کے بعد آئی۔ یوں جب میں دفتر پہنچا تو لیٹ ہوچکا تھا لہٰذا باس کی جھاڑ بھی سننا پڑی۔

ابھی میں اپنی سیٹ پر بیٹھ کر پیر کو ہلا رہا تھا تاکہ کچھ درد کم ہو کہ میرا کولیگ فاروق ایک کاغذ لیے آ گیا اور اسے پکڑاتے ہوئے بولا۔ ''لو بھیا! یہ جواب آیا ہے' تمہاری موٹر سائیکل ایڈوانس کی کٹوتی مؤخر کرنے کی درخواست کا۔''

اس نے لیٹر لیا۔ ہیڈ کوارٹر سے جواب آیا تھا کہ ''مدعا علیہ سے نہ صرف یہ پوچھا جائے کہ اس نے موٹر سائیکل خریدتے وقت اس کی انشورنس کروا کر سرکاری رقم محفوظ کیوں نہ کی بلکہ اسے اس بات کا بھی پابند کیا جائے کہ اب وہ سرکاری رقم یکمشت ادا کرے۔''

''یہ کیا بکواس ہے؟'' میں نے لیٹر پڑھنے کے بعد فاروق سے کہا۔

''یہ بکواس نہیں' حقیقت ہے۔ قرضے کے کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے تم نے یہ شق نہیں پڑھی تھی کہ تم موٹر سائیکل کا انشورنس بھی کرواؤ گے؟''

''یار! اٹھارہ ہزار میں تو موٹر سائیکل نہیں آتی' اس پر پانچ ہزار سالانہ انشورنس والوں کو دوں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟''

''یہ انصاف نہیں' سرکار کے قانون ہیں۔ اس میں جو پھنس جائے' اسے بھگتنا تو پڑتا ہے۔''

''ہاں' نوکری کی ہے تو بھگتنا تو پڑے گا ہی۔''

ابھی ہم یہ باتیں کرہی رہے تھے کہ تمریز بھاگتا ہوا

Downloaded From http://paksociety.com

آیا۔

''اشتیاق! اشتیاق! تمہیں پتا ہے' سائرہ نے خودکشی کرلی۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

''کیا بک رہے ہو؟'' میں غصے میں بولا۔ ''تمہیں ایسا مذاق کرتے ہوئے شرم نہیں آتی ؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''مگر وہ تو بڑے حوصلے والی عورت تھی۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟'' مجھے اب بھی یقین نہ آرہا تھا۔

''کل اس کا بیٹا ہیروئن کی اوورڈوز کی وجہ سے مرگیا تھا۔ اسے دفنانے کے بعد رات کو اس نے پنکھے سے لٹک کر خودکشی کرلی۔''

☆......☆

ظہر کے بعد سائرہ کے جنازے میں شرکت کرکے وہ دفتر جانے کے بجائے وہاں سے سیدھا گھر آگیا۔ راستے میں تمام وقت میں سائرہ کے بارے میں سوچتا رہا جس کے تمام سہارے ایک ایک کرکے ختم ہوتے رہے اور بالآخر وہ حوصلہ ہارگئی۔ اس جیسے نہ جانے کتنے لوگ روز حوصلہ ہارجاتے ہوں گے لیکن معاشرہ اس قدر بے حس ہوگیا ہے کہ اب یہ بھی روٹین کی باتیں لگنے لگی ہیں۔

میں گھر پہنچا تو بیوی نہ صرف بخار میں تپ رہی تھی بلکہ سردرد سے بھی کراہ رہی تھی۔

''کیسی طبیعت ہے ؟'' میں پریشان ہوگیا۔ ''صبح تو حالت بہتر تھی۔''

''ٹھیک ہوں۔'' وہ بولی۔

''خاک ٹھیک ہو۔'' مجھے غصہ آگیا۔ ''دیکھو! تمہاری کیا حالت ہورہی ہے۔ چلو ڈاکٹر کے پاس چلو۔''

''اس وقت ڈاکٹر کہاں بیٹھا ہوگا۔ وہ تو شام کو بیٹھتا ہے۔''

''تم نے دوا کھائی ؟''

''دوا تو ختم ہوگئی۔ شام ہی کو آئے گی۔''

''چلو' میں تمہیں کسی اسپتال کی ایمرجنسی میں لے چلتا ہوں' اٹھو۔''

''رہنے دیں شام تک گزارہ ہوجائے گا۔ ایسا کریں ایک پیراسٹامول کی گولی لادیں۔'' بیوی نے بات ختم کرکے آنکھیں بند کرلیں۔

''اچھا!'' میں بولا۔ بیوی کی طرف دیکھ کر میرا دل غم سے بھر گیا۔

''کیسی صابر عورت ہے۔'' میں نے سوچا۔ ''اسے پتا ہے اس وقت ایمرجنسی میں گئے تو چار پانچ سو روپے خرچ ہوجائیں گے۔ پیسے بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیل رہی ہے۔ کاش میری جیب میں کچھ رقم ہوتی تو میں اسے ضرور اسپتال لے جاتا۔ کمبخت سرکاری اسپتال بھی اتنا دور ہے کہ ٹیکسی میں آنے جانے میں دو سو روپے لگ ہی جائیں گے مگر وہاں بھی کیا ہوگا۔ دوا تو باہر کی لکھ کردیں گے۔ یہ کیسا انصاف ہے ؟ سرکار کی خدمت کرنے والے اور ان کے بال بچے اپنی جان پر کھیلتے رہتے ہیں یا سرکاری اسپتالوں سے رنگین پانی لے آتے ہیں جبکہ سرکاری کارپوریشن کے ادارے اپنے ملازمین کے علاج واسپتال سب کے بل ادا کرتے ہیں۔''

''یار اشتیاق!'' مجھے اپنے ایک دوست کی بات یاد آگئی۔ ''جب میں سرکاری ملازمت میں تھا تو میری بیوی بچے کم بیمار ہوتے تھے۔ اب ایک کارپوریشن میں ہوں' مفت کی دوائیں ملتی ہیں تو سو بیماریاں لگ گئی ہیں۔''

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں اپنے آنسو چھپانے کے لیے باتھ روم چلا گیا۔ وہاں سے منہ ہاتھ دھوکر باہر نکلنے لگا تو بچی آواز دے کر بولی۔ ''بابا میں بھی آپ کے ساتھ باہر جاؤں گی۔''

میں اسے گود میں اٹھا کر باہر نکل آیا۔ میڈیکل اسٹور پہنچ کر میں نے ایک پیراسٹامول کا ایک پتا لیا اور پیسے ادا کرنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو علم ہوا کہ اس آخری سو کا نوٹ بھی کہیں گم ہوچکا ہے۔

''میں...... میں بعد میں پیسے دے جاؤں گا۔''

''جب پیسے ہوں تو پھر لے جانا۔'' دکاندار نے ہاتھ سے پتا لے لیا۔ ''پہلے ہی کافی ادھار ہوگیا ہے۔''

واپسی پر شرم وخفت سے پیر من من بھر کے ہورہے تھے۔ راستے میں ایک جنرل اسٹور پر رش دیکھ کر وہ رک گیا۔ پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک شخص دکان پر سودا خریدنے آیا تھا کہ اچانک کھڑے کھڑے گرا اور مرگیا۔

''بابا!'' میری بیٹی نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا لوگ ایسے بھی مرجاتے ہیں؟''

میرا جی چاہا کہ بیٹی کو گود سے اتاردوں اور اس مردہ شخص کے برابر لیٹ کر سر پر چادر اوڑھتے ہوئے کہوں۔

''ہاں! لوگ ایسے بھی مرجاتے ہیں۔''

Downloaded From http://paksociety.com

انعام

جناب معراج رسول
سلامِ مسنون
یہ واقعہ جسے میں نے بیان کیا ہے سو فیصد سچا ہے۔ ولی محمد آج بھی زندہ ہے اور خوش و خرم زندگی گزار رہا ہے۔ میں نے اس کے حالات قلمبند کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس کی کہ دوسرے لوگ بھی عبرت حاصل کریں۔

سید محمود حسن
(کراچی)

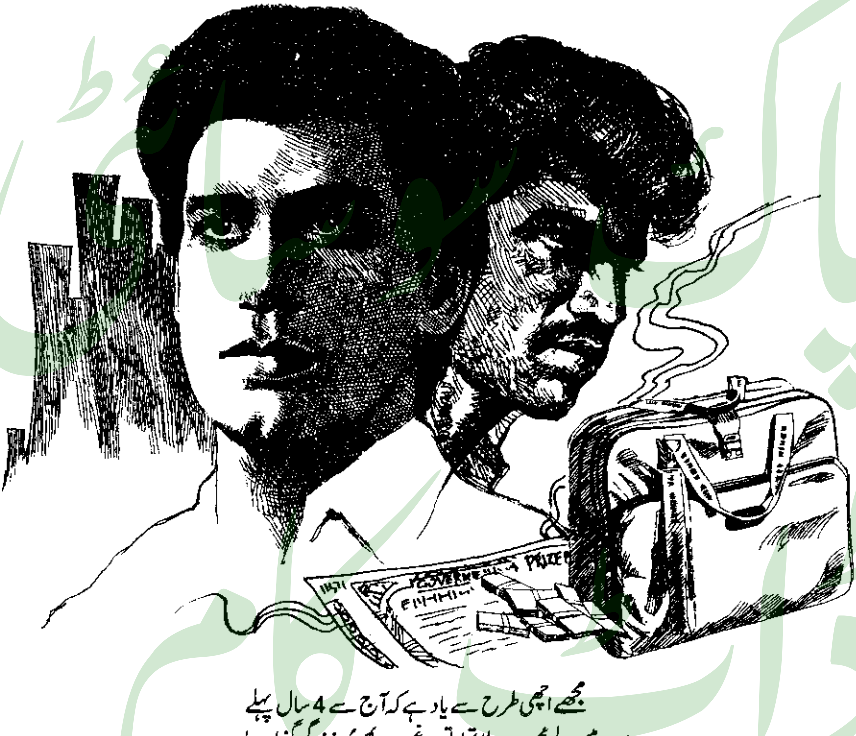

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ آج سے 4 سال پہلے جب میں ولی محمد سے ملا تھا، تو وہ غربت بھری زندگی گزار رہا تھا، لیکن اس میں ایک بات بہت اچھی تھی کہ اسے اللہ کی ذات پر یقین اور اعتماد تھا کہ اللہ سائیں ایک دن اپنا کرم ضرور کرے گا۔ اس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔

وہی ولی محمد سامنے حاضر تھا۔ میں گاؤں کے بس اسٹاپ پر اتر کر متلاشی نظروں سے کسی سواری کا خواہاں تھا کہ رکشا خود ہی میرے قریب آ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر نظر ڈالی تو ولی محمد نظر

Downloaded From http://paksociety.com

آیا۔

''ارے ولی محمد، تم رکشا چلا رہے ہو؟''

''آپ تو ادھر شہر میں ہوتے ہو۔ گزارا کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔''

''پہلے تم بس میں کنڈیکٹر تھے، پھر ہوٹل پر کام کرنے لگے، اور ابھی رکشا چلا رہے ہو؟'' میں نے رکشے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''سائیں جب اگلی مرتبہ آئیں گے تو میں آپ کو کچھ اور کرتا ہوا نظر آؤں گا۔'' ولی محمد نے قہقہہ لگا کر کہا۔ آؤ سائیں پہلے کچھ چائے پانی ہو جائے، پھر آپ سے کچہری ہوگی۔ ولی محمد کے لہجے میں خلوص تھا۔ اس کی دعوت پر میں رکشے سے نیچے اتر گیا۔

''ہاں اب سناؤ کیا حال ہے۔'' میں نے بخشل کے ہوٹل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

بخشل کا ہوٹل پرانی یادوں کا امین تھا۔ ہم لڑکپن سے ہی وہاں بیٹھ کر چائے پینے اور گپ شپ کرنے کے عادی تھے۔

''سائیں میرے بچے بڑے ہوتے جا رہے ہیں ناں۔'' اس نے چائے کی چسکی لے کر کہا۔

''ہاں تمہارے چار بچے ہیں ناں؟'' میں نے کہا۔ سندھ کے گاؤں میں جلدی شادی کا رواج ہے اس لیے بچے بھی جلدی بڑے ہو جاتے ہیں۔

ولی محمد کے چار بچے تھے، دو بیٹیاں اور دو بیٹے، بیٹیاں تو اب تقریباً جوانی کی سرحد پر قدم رکھ چکی تھیں، ایک بیٹا چھوٹا تھا اور دوسرا بڑا، لیکن دوسرا بیٹا بیمار رہتا تھا۔ وہ اپنی اس غربت بھری زندگی سے بہت پریشان تھا، اس پر سے بیوی کی بدمزاجی اور طعنے بازی نے اس کو ہمیشہ پریشان ہی رکھا تھا۔

''ہاں ولی محمد، زندگی کیسی گزر رہی ہے؟'' میں نے اس سے سوال کیا تو اس نے کہا۔

''بس سائیں آپ تو بڑے آدمی ہو، میرا تو وہی حال ہے، غربت ہے، بچے بیمار، اور بیٹیوں کی شادی بھی کرنی ہے۔ اتنا پڑھا لکھا بھی نہیں کہ دوسرا کام کرلوں۔ زندگی تو سائیں آپ بڑے لوگوں کی ہے۔''

اس دن کے بعد مزید چھ مہینے تک ولی محمد سے ملاقات نہ ہو سکی، کیونکہ میں اپنے بزنس کے سلسلے میں شہر آ گیا تھا، شہر کی مصروفیت نے پوری طرح گھیر رکھا تھا اس لیے گاؤں جا نہ سکا۔ اب جا کر وقت ملا تھا تو میں گاؤں کے لیے نکل پڑا۔ اس

مرتبہ بھی میں بس اسٹاپ پر کھڑا تھا کہ ایک چنگ چی رکشا جاتا ہوا نظر آیا، چلانے والا کوئی اور نہیں بلکہ ولی محمد ہی تھا۔ ولی محمد نے مجھے دیکھ کر چنگ چی روک دیا اور کہا کہ بیٹھو سائیں تمہیں بھی گھر چھوڑ دوں گا۔

''یار پھر تم نے کام بدل لیا، کیا ساری زندگی یہی کرتے رہو گے؟''

''تو اور کیا کروں سائیں، ہم غریبوں نے تو یہی چھوٹے موٹے کام کرنے ہیں۔'' وہ جلدی میں تھا اور مجھے بھی گھر جانے کی جلدی تھی، اس لیے میں نے کوئی اور بات نہیں کی۔

میں جب بھی ولی محمد سے ملتا تو اسے مشورہ دیتا کہ یار تم شہر آ جاؤ، میں تمہیں کوئی نہ کوئی کام دلوا دوں گا کیونکہ میرے والد کی نہ صرف شہر میں جایداد اور کاروبار تھا، بلکہ ہم جدی پشتی وڈیرے ہیں لیکن بابا سائیں نے ہمیں ہمیشہ اچھائی اور انسانوں سے محبت کا درس دیا ہے۔ جس کی وجہ سے میں سب سے یکساں رویے کے ساتھ ملا کرتا تھا، ولی محمد سے بھی میری دوستی کی وجہ یہی تھی، حالانکہ ہم دونوں میں طبقاتی فرق بہت زیادہ تھا۔ میں جمال خان ایک وڈیرہ اور وہ ایک عام سے مزارع تھا جو کہ ہماری زمینوں پر کام کرتا تھا۔

کھیتوں میں جی توڑ محنت کے بعد بھی گزارہ بمشکل ہی ہوتا تھا اسی لیے وہ مختلف کام کرتا رہتا تھا، یعنی صبح کھیت پر کام تو دن میں اور شام میں دوسرا کام، کبھی ہوٹل پر بیرا گیری، تو کبھی رکشا ڈرائیونگ۔ اسی طرح وہ اپنی زندگی کی گاڑی کو دھکا دے رہا تھا۔

ولی محمد بنیادی طور پر عام کسانوں کی طرح ایک کسان تھا، وہ سندھ کی اس لہلاتی اور زرخیز زمین پر اپنے خاندان کے ساتھ آباد تھا۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ ان کے رشتوں کی بھی فکر تھی۔

اس کا ایک چھوٹا بیٹا تھا جو کہ بیمار رہتا تھا وہ اس کے لیے بھی بڑا فکر مند تھا، ایک تو غربت، بیٹیوں کا ساتھ اور اس پر سے بیماری، یعنی اس کی زندگی انہی گردابوں میں گزر رہی تھی۔

''ارے تم بھی اپنے ہاتھ پاؤں ہلاؤ اور دوسرا کوئی دو نمبر کام کرو تاکہ ہماری غربت دور ہو۔ اس کی بیوی ہاجراں اسے اکثر برائی کی ترغیب دیتی، لیکن وہ فطرتاً ایسا نہ تھا، اس لیے اسے ہمیشہ سمجھاتا او بھاگ بھری، اللہ سائیں چاہے گا تو ایسے ہی ہمارے دن پھیر دے گا'' اور وہ جواباً ایک طنزیہ سا ہوں کہتی اور بڑبڑاتی ہوئی چلی جاتی۔ یہ نوک جھوک اور بدمزگی

Downloaded From http://paksociety.com

روز کا معمول بن چکی تھی۔ اس کی بیوی کو تو چاہیے تھا کہ ایسے نیک اور ایماندار آدمی کے ساتھ زندگی گزارنے پر اللہ کا شکر ادا کرتی لیکن وہ تو وقت کے ساتھ ساتھ مزید بدمزاج ہوتی جا رہی تھی۔

لیکن آج جب میں اس سے چار سال کے بعد ملا تو وہ ایک اچھے سے گھر کا مالک تھا تھوڑی زمین بھی خرید چکا تھا اور دونوں بیٹیوں کے فرائض بھی ادا کر چکا تھا اور سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اس کا بیمار بیٹا بھی بالکل صحت یاب ہو چکا تھا اور اس کے شانہ بشانہ کام کر رہا تھا۔

میں نے جب ولی محمد سے اس کایا پلٹ کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ سائیں مجھے انعام ملا ہے اللہ سائیں کی طرف سے نیکی اور ایمانداری کا جس کی وجہ سے میں تو سمجھتا ہوں کہ میری غربت، امیری میں بدل گئی۔

''میں ایک دن سوچوں میں گم اپنے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔'' وہ بتانے لگا۔

گاؤں سندھ کے ایک ایسے علاقے میں ہے جہاں سے ریلوے لائن گزرتی ہے اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ لہلاتے ہوئے کھیت ہیں، یہ سکھر اور شکار پور کے درمیان کا علاقہ ہے۔

ابھی میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا کہ ٹھوکر لگی اور میں گرتے گرتے بچا، پھر میں نے جب جھک کر نیچے دیکھا تو ایک کالے رنگ کا چمڑے کا بیگ پڑا ہوا تھا۔ نجانے کس کا ہے، شاید رات کو سکھر ایکسپریس گزری ہے، کسی مسافر کا گر گیا ہوگا۔ اسے ذرا کھول کر دیکھوں تو سہی کہ اس میں ہے کیا؟ اور جب میں نے بیگ کھولا تو دنگ رہ گیا، بیگ میں کچھ کاغذات رکھے ہوئے تھے اور کپڑے میں کچھ لپٹا ہوا تھا۔ جب میں نے کپڑے کو کھولا تو اس میں نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ یہ سارے بڑے نوٹ تھے اور لاکھوں میں تھے۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، کوئی بھی مجھے نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے بیگ کو اپنی چادر میں چھپایا اور واپس گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچ کر چارپائی پر بیٹھ کر نوٹوں کو گننا شروع کیا، یہ بیس لاکھ روپے تھے، واہ قدرت والے کیا تو نے چھپر پھاڑ کر دیا ہے، اور میرے دلدر دور کر دیئے ہیں، وہ سوچنے لگا، پھر ایک خیال ذہن میں آیا کہ آخر یہ روپے ہیں کس کے، کسی ضرورت مند کے بھی تو ہو سکتے ہیں۔

بیگ میں رکھے کاغذات کا میں نے جائزہ لیا تو یہ کسی اسپتال کے میڈیکل پیپرز تھے، یہ پیپرز میں اپنے دوست اللہ بخش کے پاس لے گیا جو کہ پڑھا لکھا تھا، اس نے پیپرز کو پڑھنے کے بعد بتایا کہ یہ کسی کی بیماری کے بارے میں ہے، اور کاغذات کے مطابق کینسر کی بیماری ہے جس کے علاج کے لیے کچھ رقم جمع کی ہے اس میں ایک ایسا کاغذ بھی تھا جس کے مطابق کسی نے اپنی زمین فروخت کر کے یہ رقم حاصل کی تھی، جو کہ پندرہ لاکھ مالیت کی تھی، باقی کے پانچ لاکھ لوگوں سے ادھار اور بطور قرض لیے تھے۔

اس بیگ سے ملنے والے کاغذات کے مطابق یہ کسی رحیم بخش نامی شخص کے علاج کے لیے تھا۔ اور ایک عدد شناختی کارڈ کی کاپی بھی اس میں رکھی ہوئی تھی۔ میں نے مولوی صاحب سے مسجد میں وعظ کے دوران سنا تھا کہ کسی کی بھی امانت نہیں رکھنی چاہیے اور نہ ہی ناجائز ذرائع سے دولت حاصل کرنی چاہیے۔

یہی باتیں میرے ذہن میں تھیں، میں نے ہاجراں کو بتایا کہ مجھے کسی کی امانت ملی ہے۔

''کیا مل گیا تجھے، آج تک تو کچھ ملا نہیں سوائے چند روپوں کے۔'' اس کی بیوی بدستور خراب موڈ میں تھی۔

''ارے مجھے یہ کاغذات اور روپوں سے بھرا ہوا بیگ ملا ہے یہ کسی کی امانت ہے اور میں اسے واپس کرنا چاہتا ہوں۔''

''کہاں ہے وہ بیگ۔'' بیوی نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ رہا۔'' میں نے اپنی چادر کے نیچے چھپایا ہوا بیگ اس کے سامنے رکھ دیا۔ بیوی نے بے صبری سے بیگ کھولا تو اس میں اوپر تک نوٹ بھرے ہوئے تھے۔

''ارے تو کہتا تھا ناں کہ اللہ ہمیں چھپر پھاڑ کے دے گا، یہ دیکھ اللہ سائیں نے یہ رقم ہمیں غیب سے بھیجی ہے۔'' بیوی نہایت خوش نظر آرہی تھی۔ ''اتنے سارے پیسے، تو نے گنے کتنے ہیں۔''

''یہ بیس لاکھ روپے ہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''اب اپنے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔''

''نہیں یہ پیسے تو کسی ہم سے بھی مجبور اور غریب آدمی کے لگتے ہیں جو کہ بیمار ہے اور اپنے علاج کے لیے یہ رقم لے کر جا رہا تھا، نجانے کس طرح ریلوے لائن کے پاس یہ بیگ گر گیا۔''

''ارے جیسے بھی آئے ہوں، ہمیں تو اللہ سائیں نے بھیجے ہیں۔''

اور پھر ہم دونوں میں زبردست لڑائی ہوئی، لیکن میں جیت گیا، میں نے دوسرے دن صبح اخبار میں جا کر اشتہار دیا

Downloaded From http://paksociety.com

کہ میرے پاس ایک امانت کالا بیگ، جس میں اسپتال کے کچھ کاغذات اور شناختی کارڈ ملا ہے اور رقم بھی ہے جس کی ہو مجھے نشانی بتا کر لے جائے۔ اخبار میں میں نے اپنا پتا اور فون نمبر بھی لکھ دیا تھا۔

اور پھر دوسرے ہی دن اس بے کے پاس ایک فون آیا جو کہ کسی عورت کا تھا، میں رحیم بخش کی بیوی بات کر رہی ہوں ہماری ایک امانت آپ کے پاس ہے۔

"لیکن میں بابا کیسے یقین کروں کہ یہ امانت آپ ہی کی ہے، آپ کو جو اس بیگ میں سے شناختی کارڈ کی کاپی ملی ہے، میں اصلی شناختی کارڈ اور اپنے بیمار شوہر کو لے کر آپ کے پاس آتی ہوں۔ میں جیکب آباد کی رہنے والی ہوں اور اپنے شوہر کو علاج کی غرض سے لے کر کراچی جا رہی تھی کہ یہ بیگ نجانے کس طرح سلپ ہو کر ٹرین سے گر گیا۔"

"پہچان بتاؤ۔" میں نے فون پر کہا۔

"اصل میں میرے شوہر کو کینسر ہے جو کہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہے اور ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اگر اس کا ابھی علاج ہو گیا تو اس کی جان بچ جائے گی ورنہ یہ چند سالوں کے اندر اپنی زندگی ہار جائے گا۔ یہ روپے ہم نے اپنی زمین اور زیور بیچ کر اور کچھ قرضہ لے کر جمع کیے تھے۔ وہ بیگ شاید برتھ پر سے سلپ ہو کر گر گیا ہم اس وقت گہری نیند میں تھے اور ہمیں پتا بھی نہ چلا۔ ہم شدید پریشانی اور کرب کے عالم میں تھے لیکن جب تم نے اخبار میں اشتہار دیا تو ہماری غم بھری زندگی کو حوصلہ ملا اور اب ہم آپ کے پاس آ رہے ہیں۔"

اگلے دن جب وہ آئی تو میں نے کہا۔ "آپ اپنا شناختی کارڈ دکھائیں۔"

"اس عورت نے جو کہ اپنے ایک بھانجے کے ساتھ آئی تھی، شناختی کارڈ دکھایا۔"

"ہاں بابا یہ تو وہی ہے۔" میں نے شناختی کارڈ کی فوٹو اسٹیٹ سے اسے میچ کرتے ہوئے کہا، پھر میں اپنی جگہ سے اٹھا، اندر گیا اور روپوں سے بھرا ہوا بیگ اس عورت کے حوالے کر دیا۔

اس عورت کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "بھائی آپ تو ہمارے مسیحا ہیں ورنہ ہم تو اس کی زندگی سے مایوس ہو چلے تھے کہ اب اس غم بھری زندگی کا کیا کریں گے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی موت کی دعائیں مانگ رہے تھے۔"

"نہیں بابا، نہیں، مایوسی کفر ہے، اللہ سائیں تم لوگوں کو

مارچ 2017 کا دلکش شمارہ
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مزید
خطوط کی محفل، محفل شعر و سخن اور
مرزا امجد بیگ کی کھوج کا نتیجہ

منقسم عورت
دو کشتیوں کا سوار بے شک ڈوبتا ہے مگر مانجھی چاہے تو سوار کو ایک ہی کشتی کا مسافر بنا کر کنارے لگا سکتا ہے۔ ایسا ہی اس نے بھی کیا...... آخری صفحات پر نشور ھادی کا تحفہ

عمر جاوداں کی تلاش
منگولوں کی وحشت اور خانہ بدوشی کا قصہ تمام ہوا اور اسلام کی کرامات نے نقشہ ہی بدل ڈالا...... الیاس سیتاپوری کے قلم کا جادو

شیش محل
اسماء قادری کے قلم سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے والے خاندان کا حوصلہ اور آبلہ پائی کا دلگداز ماجرا۔

ماروی
رفتہ رفتہ اختتام کی جانب گامزن کرداروں پر مشتمل اس طویل داستان کا آخری پڑاؤ

اس کے علاوہ
منظر امام، سیما کمال، تنویر ریاض، سلیم انور اور دیگر قلمکار کی دلچسپ تحریریں آپ کی منتظر

Downloaded From http://paksociety.com

خوش رکھے، ابھی تم لوگ کھانا کھا کر جانا۔" پھر میں نے زبردستی انہیں کھانا کھلا کر رخصت کیا۔ "بس ہمارے لیے اللہ سائیں سے دعا کرنا، وہی سب کا پالن ہار ہے، اور انسانوں کے دکھوں کو دور کرنے والا ہے۔" میں نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

ابھی اس نے مزید قرضہ لے کر ایک چھوٹی سے دکان کھولی تھی جس میں آٹا، شکر، گھی وغیرہ ملتا تھا۔ پر ابھی تک وہ سیٹ نہیں ہو پایا تھا، کیوں کہ ابھی تو اس دکان کا قرضہ بھی اتارنا تھا۔ بیٹے کا علاج بھی جاری تھا، جس پر بھاری خرچا ہوتا تھا۔ پھر بیٹیوں کی شادی بھی جلد ہی کرنا تھی۔ میں انہی سوچوں میں گم رہتا۔

اس پر سے ہاجراں کی وہی باتیں۔ "ارے تمہیں اللہ سائیں نے غیب سے پیسے دیئے تھے، پر تم پر تو ایمانداری کا بھوت سوار تھا تم نے آئی ہوئی دولت کو لات ماردی۔ اب گزارو وہی گھسی پٹی زندگی۔"

اس بیگ والے واقعے کے بعد سے اس کی تلخ مزاجی اور زبان درازی میں اضافہ ہوگیا تھا۔ کبھی کبھی تو میں بھی سوچتا کہ شاید وہ ٹھیک ہی کہتی ہے مجھے وہ بیگ واپس نہیں کرنا چاہیے تھا۔

گاؤں کے لوگ اس سے ادھار بھی لیا کرتے تھے جنہیں وہ بخوشی ادھار دے دیا کرتا تھا۔ ہادی بخش جو کہ ایک غریب انسان تھا اور اس سے سامان ادھار لیتا تھا۔

اس مرتبہ بھی ہادی بخش نے تقریباً دو ہزار روپے کا سامان ادھار لیا، اور کہا کہ بھائی ولی محمد بات یہ ہے کہ ابھی میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اگر تم برا نہ مانو تو اگلے مہینے لے لینا، نہیں تو یہ دو پرائز بانڈ ہیں جو کہ 750 روپے والے ہیں، باقی 500 بعد میں لے لینا۔

"ہاں بھائی ہادی بخش مجھے بھی پیسوں کی ضرورت ہے اور مجھے شہر جا کر ہول سیل مارکیٹ سے سامان بھی تو لانا ہے تم بھلے یہ پرائز بانڈ مجھے دے دو، ایک ہی بات ہے۔

اور جب مہینے کی پہلی تاریخ آئی تو میں نے بیزاری کے ساتھ پرائز بانڈ کی لسٹ خریدی اور گھر آگیا۔

میں نے اپنی الماری کھولی جس میں پرائز بانڈ اور پیسے رکھتا تھا اور لسٹ میں بانڈ کا نمبر دیکھنا شروع کیا لیکن لسٹ میں مطلوبہ نمبر کہیں بھی نہیں تھا، بس اب تو صرف بڑے انعام ہی رہ گئے ہیں اور اب جو اس نے غور سے دیکھا تو پہلا انعام جو کہ پندرہ لاکھ روپے کا تھا اس کے نمبر پر نکل آیا تھا۔

وہ بے حد خوش تھا، سب سے پہلے وہ اپنے گھر گیا اور چیختا ہوا بولا۔ "ارے او بھاگ بھری، سنتی ہے، اللہ سائیں نے ہمارے دن پھیر دیئے ہیں۔"

"کیوں کیا ہوگیا، تمہیں پھر کوئی روپیا یا پیسا پڑا ملا ہوگا، اور اسے واپس کرنا ہوگا۔" ہاجراں زور سے چیختی ہوئی بولی۔

"ارے نہیں بھاگ بھری، ہمارا پہلا انعام کھلا ہے، پندرہ لاکھ روپے کا یہ دیکھ۔" میں نے پرائز بانڈ اور لسٹ سامنے رکھتے ہوئے کہا اور اب ہمارے سارے ولدر دور ہوجائیں گے، اور پھر اس نے اپنے بیٹے اور بیٹیوں کو بھی پرائز بانڈ دکھایا۔

"ہاں ابا!" اس کی بیٹی نے بھی تصدیق کی۔ "ہمارا پہلا انعام کھلا ہے۔"

"اس... واقعے کے بعد مجھے اللہ سائیں کے نظام اور انصاف پر یقین ہوگیا کہ وہ واقعی رحیم و کریم ہے، میں نے انہی پیسوں سے اپنی دونوں بیٹیوں کی شادی کرادی اور میرے بیٹے کا علاج بھی اچھی طرح سے ہو رہا ہے، بلکہ وہ تیزی سے صحت یاب ہو رہا ہے۔ پھر سائیں، دو لاکھ روپے مجھ پر قرض تھا، وہ بھی اتار دیا ہے، اور باقی پیسوں کا زمین کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا خرید لیا ہے اور اب میں اللہ کریم کے فضل سے خوشحال زندگی گزار رہا ہوں۔ بس سائیں! میں تو یہی کہتا ہوں کہ اللہ ہمیں ہر طرح دینے پر قدرت رکھتا ہے، اگر ہم اس سے حلال ذرائع سے مانگیں گے تو وہ اسی طرح سے دیتا ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔

میں، ولی محمد کی زبانی یہ سچا واقعہ سن کر نہ صرف اس کے ایمان اور یقین کا قائل ہوگیا بلکہ اس کی ایمانداری کا بھی معترف ہوگیا۔ یعنی میرے سامنے ہی کی بات ہے۔ اس کی زندگی ہمارے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہے جب اس کے ساتھ یہ بیگ والا واقعہ ہوا تو کس طرح سے اس کی قسمت نے ایک ٹرن لیا اور وہ بد قسمت سے ایک خوش قسمت انسان بن گیا۔ یہ پیسے تو شاید اس کے نصیب میں لکھے تھے اور اسے مل گئے۔

جس طرح انسان کو اپنے گناہوں اور کرنی کا پھل نہ صرف آخرت میں ملتا ہے بلکہ دنیا میں بھی اس کی سزا مل ہی جاتی ہے، چاہے اس کی شکل کچھ بھی ہو، اسی طرح جب کوئی بھی انسان جو کہ نیک نیت ہو اور ہمیشہ دوسروں کے لیے اچھا سوچے اور ان کے کام آنے کا جذبہ اس میں پایا جائے باوجود اس کے کہ وہ معاشی طور پر اتنا مستحکم نہ ہو، پر اس کا یقین کامل ہو تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو دنیا میں اس کا انعام ضرور دیتا ہے۔

Downloaded From http://paksociety.com

میں ہوا کافر

محترم مدیر

السلام علیکم

میں نے پہلی بار قلم سنبھالا ہے۔ اس سے قبل میں نے کوئی کہانی نہیں لکھی ہے۔ پہلی بار خود پر گزرے ایک واقعے کو کہانی کی شکل دے رہی ہوں اگر کہانی بنانے میں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو تصیح کرا لیں گے کیونکہ اس کے دونوں کردار اب بھی اپنے اپنے طور پر زندگی گزار رہے ہیں جب کہ میں اب سیالکوٹ آگئی ہوں۔

روزینہ

(سیالکوٹ)

یہ کہانی میری نہیں ہے۔

اور نہ ہی میں اس کہانی کا کوئی کردار رہی ہوں لیکن اس کہانی سے میرا گہرا تعلق اس لیے ہے کہ یہ کہانی میری ایک دوست انجم کی ہے۔

انجم اور میں دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے، وہ خاصی بے باک لڑکی تھی۔

لڑکوں سے دوستیاں کرنا، پھر ان کو بے وقوف بنا کر نکل جانا، اس کا پسندیدہ شوق تھا۔ وہ کہا کرتی۔ ''روزی یہ جو

Downloaded From http://paksociety.com

لڑکے ہوتے ہیں یہ ایک نمبر کے دہ ہوتے ہیں (اس موقع پر وہ گالی بھی دیتی) ان کو تو جتنا بے وقوف بنایا جائے وہ کم ہے۔"

"انجم! ایسا نہ ہو کہ اس چکر میں تم کسی دن پھنس جاؤ۔"

"ارے کچھ نہیں ہوتا۔ جو میرے ہاتھوں بے وقوف بن جائے وہ کب دوسروں کے سامنے بے وقوف بننے کا اعتراف کرے گا۔"

بہر حال میں اس کو سمجھایا کرتی لیکن مجال ہے جو اس نے کبھی اپنی عادت بدلی ہو۔ ایک دن اس نے ایک بہت بڑے آدمی کا نام لیتے ہوئے پوچھا۔ "یار! یہ بتاؤ تم نے زکریا سلمان کا نام سنا ہے۔"

"کون زکریا سلمان؟ میں تو ایک ہی زکریا سلمان کو جانتی ہوں۔" میں نے کہا۔

"کون ہیں وہ، میرا مطلب ہے کہ تم جن کو جانتی وہ کون ہیں۔"

"وہ بہت بڑے دینی اسکالر ہیں۔" میں نے بتایا۔

"اس کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ اس دور میں اگر کسی صاحبِ حال بزرگ کو دیکھنا ہو تو ان کو دیکھ لو۔"

"تم نے بالکل ٹھیک بتایا۔ میں ان ہی کی بات کر رہی ہوں۔ وہ واقعی ایک اسکالر ہی ہیں اور ایک پہنچے ہوئے عالم باعمل بھی ہیں۔ اس دور میں ایسے لوگوں کا ہونا بہت غنیمت ہے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ تم کو کسی کی اہمیت کا احساس ہوا۔"

"آگے بھی تو سنو۔"

"آگے کیا ہے۔"

"میں ان پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

اس نے بہت بے باکی سے بتایا۔ "یہ سمجھ لو کہ میں ان کو اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"خدا کا خوف کرو لڑکی۔" میں بھڑک اٹھی۔ "تم کسی کالج کے کسی فیشن ایبل لڑکے کی بات نہیں کر رہی بلکہ ایک ولی کی بات کر رہی ہو۔ زکریا سلمان صاحب کی بات کر رہی ہو۔"

"ہاں تو کیا ہوا میں نے تو کچھ لوگوں سے شرط بھی لگا رکھی ہے۔"

"کیسی شرط؟"

"یہی کہ میں ان کو اپنی لائن پر لا کر رہوں گی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خدا تم کو سمجھے۔ ویسے تم اپنی طرف سے کوشش کر کے دیکھ لینا۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم ان کو ان کی راہ سے ہٹا نہیں سکتیں۔"

"ہاں ہے تو بہت مشکل۔" اس نے گردن ہلائی۔

"مشکل نہیں ناممکن ہے۔" میں نے کہا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ اپنے تجربے میں ناکام ہو جاؤں گی۔ اس کے علاوہ کیا ہوگا۔ لیکن Attampt تو کر کے دیکھ لوں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اب مکمل شیطان بن گئی ہو۔"

"زندگی تو اسی کا نام ہے نا جانِ من۔ اور ان کی زندگی میں اس قسم کی انجوائے منٹ تو ہونی چاہیے۔"

"مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اس مقصد میں کامیاب ہو گی۔ ویسے مجھے اپنی پروگریس بتاتی رہنا۔"

"ضرور۔" وہ ہنس پڑی۔ "پوری رپورٹ دوں گی تم کو۔"

انجم نے ایک ہفتے کے بعد رپورٹ دی تھی۔ "یار وہ تو بہت ٹیڑھی کھیر ہے۔" اس نے بتایا۔

"ہوا کیا؟"

"یار کچھ بھی تو نہیں۔ میں یوں ہی جھوٹ موٹ کا ایک مسئلہ لے کر اس کے پاس پہنچ گئی تھی اور میں نے بالکل ماڈرن ڈریسنگ کر رکھی تھی اگر تو بھی دیکھ لیتی نا تو پاگل ہو جاتی۔"

"تو کیا انہوں نے لفٹ نہیں دی؟"

"لفٹ؟ لفٹ تو بہت دور کی بات ہے اس پتھر کے انسان نے صرف ایک دفعہ میری طرف دیکھا۔ پھر آنکھیں جھکا لیں اور جب تک میں اس کے کمرے میں رہی اس نے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اسے شاید پتا ہی نہیں چلا ہوگا کہ میں کون ہوں اور کیسی ہوں۔"

"یہ بات ہوئی ناں۔" میں ہنس پڑی۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ تو وہاں سے ناکام ہو کر واپس آئی ہے۔"

"یاد رکھ، میں اتنی جلدی ہار ماننے والوں میں نہیں ہوں۔" اس نے کہا۔ "میں کل پرسوں پھر جاؤں گی اور پتھر کے اس آدمی کو لائن پر لا کر ہی رہوں گی۔ میری جان اپنی قیمت پہچان، عورتوں کے پاس بہت طاقت ہوتی ہے۔ وہ اپنی اداؤں کے ذریعے کچھ بھی کر سکتی ہیں۔"

Downloaded From http://paksociety.com

چار پانچ دنوں کے بعد اس نے پھر ایک کہانی سنا دی۔ ”یار وہ تو بالکل ہی پاگل آدمی ہے۔“

”کیوں اب کیا ہوا؟“

اس پر تو کسی چیز کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ اس بار میں نے اس سے لگاوٹ بھری باتیں کی تھیں لیکن مجال ہے جو اس کی طرف سے کوئی رسپانس آیا ہو۔ بالکل خاموش۔ سوائے میری بات کے اور کچھ بھی نہیں۔ اس کے علاوہ فالتو کی نصیحتیں ہیں کہ بی بی تم اپنے آپ کو سنبھالو۔ تمہارے مزاج میں منفی باتیں بہت زیادہ ہیں۔ ان کو دور کردو۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں تو جھلا کر واپس آ گئی۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے ان کی جان چھوڑ دی۔“

”یہ کس نے کہہ دیا۔ میں تو پھر جاؤں گی۔ میں نے اس معاملے میں ہار ماننا تو سیکھا ہی نہیں ہے۔ ویسے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیسے مزاج کا آدمی ہے۔ حالانکہ ابھی اس کی شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔“

”یہ کیسے معلوم ہوا؟“

”میں پوری انفارمیشن لے کر اس کے پاس گئی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”حالانکہ اس کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ جوان آدمی ہے اور اس عمر میں تو اسے بہک جانا چاہیے۔ تو یقین کرا گر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو مجھ سے لپٹ پڑتا۔“

”تو بہت بے شرم ہے یار۔“

”سب چلتا ہے۔ مجھے ہر حال میں شرط جیتنی ہے۔“

”فرض کر، وہ تجھ پر دھیان دینے لگتے ہیں اور تو یہ شرط جیت جاتی ہے۔ تو اس کے بعد کیا ہوگا، کیا تو اس کو چھوڑ دے گی۔“

”تو اور کیا اس کا اچار ڈالوں گی۔“ انجم نے کہا۔ ”صرف شرط کی حد تک یہ سب ہے۔ اس کے بعد وہ مجھے یاد ہی کرتا رہ جائے گا کہ اسے ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر۔“

اب میں ایسی ڈھیٹ لڑکی سے کیا کہہ سکتی تھی اس لیے بس اس کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔ ویسے دل ہی دل میں دعائیں کررہی تھی کہ خدایا اس لڑکی کو ایسی شرمندگی ہو کہ اس کے ہوش ٹھکانے آ جائیں۔

پھر کچھ دنوں کے بعد وہ ملی تو پہلے سے کہیں زیادہ جھلائی ہوئی تھی۔ ”یار وہ تو پاگل آدمی ہے۔ یا تو اس کی آنکھیں کام نہیں کرتیں یا پھر کوئی اور چکر ہے۔“

”آخر ہوا کیا۔ کیوں اتنی جھلائی ہوئی ہو۔“

”بالکل ہی بے کار آدمی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تجھے معلوم ہے پرسوں میں اس کے پاس قیامت بن کر گئی تھی، قیامت۔ کوئی اور ہوتا تو موم بن کر پگھل جاتا لیکن اس کا وہی حال تھا۔“

”اب تو پیچھا چھوڑ دے یار۔“ میں نے کہا۔

”بس ایک دو بار اور جا کر دیکھ لوں۔ اس کے بعد اعلان کردوں گی کہ لو بھائی میں تو شرط ہار گئی۔ اس پتھر سے سر ٹکرانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔“

اس کے بعد بہت دنوں تک انجم سے ملاقات نہیں ہوئی۔ البتہ سراج مل گیا۔ میں نے شاید سراج کا ذکر نہیں کیا ہے۔

سراج وہ واحد لڑکا تھا جس سے انجم کی دوستی بہت حد تک سیریس تھی۔ دونوں میں بہت بے تکلفی تھی۔ سراج اس دن بہت جھلایا ہوا تھا۔ ”یار تمہاری دوست انجم تو پاگل لڑکی ہے۔“

”کیوں کیا بات ہوگئی۔“

”بھئی وہ تو ایک شرط کے پیچھے ہی پڑ گئی ہے۔“ اس نے بتایا۔

میں چونکی ہوگئی۔ ”شرط! کیسی شرط کی بات کررہے ہو۔“

”اس نے تمہیں بتا دیا ہوگا زکریا سلمان کا معاملہ ہے۔“

”اوہ! تو انجم سے یہ شرط تم نے لگائی تھی۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں یار! اب میں اس سے کہہ رہا ہوں کہ لعنت بھیجو اس شرط پر لیکن وہ کہتی ہے کہ اب یہ اس کی انا کا مسئلہ ہوگیا ہے۔ وہ ہر حال میں زکریا سلمان کو توڑ کر رہے گی۔ اب اسے شرط کی بھی پروا نہیں رہی۔ وہ صرف اپنی انا کے چکر میں پڑ گئی ہے۔“

”واقعی وہ پاگل لڑکی ہے۔“

”تم ہی اسے سمجھاؤ۔ اس چکر میں تو اس نے ملنا جلنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اس سے صرف فون پر باتیں ہوا کرتی ہیں۔“

”او کے۔ میں اس سے بات کروں گی کہ سراج کو ایسی شرط وغیرہ سے دلچسپی نہیں رہی۔ تم اپنی دنیا میں واپس آ جاؤ۔“

”ہاں اس سے یہ کہہ دینا۔“

Downloaded From http://paksociety.com

دو چار دن اور گزر گئے۔ اس دوران انجم کا کوئی فون نہیں آیا اور نہ ہی وہ مجھ سے ملنے آئی۔ پھر ایک شام میں اس کے یہاں جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ وہ آدھمکی لیکن اس شام وہ بہت شکستہ سی دکھائی دے رہی تھی۔

''یار میں تو اس چکر میں تھک چکی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''سراج سے میری ملاقات ہوئی تھی۔'' میں نے بتایا۔ ''اس نے کہا ہے کہ شرط وغیرہ پر لعنت بھیجو اور چھوڑ دو اس کا پیچھا۔''

''ہاں یار! میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن ایسا شاید ہو نہ سکے۔ ویسے تو میں بھی شرط وغیرہ کے چکر سے باہر نکل آئی ہوں لیکن اب بات کچھ اور ہے۔''

''وہی تمہاری بے تکی انا والی بات ہوگی۔''

''ہاں ایسا ہی سمجھ لو۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں اپنی انا سے مجبور ہوں۔''

''تو پھر میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔ تمہیں سمجھانا ہی بے کار ہے۔'' میں اس سے چڑ سی گئی تھی۔

میرا خیال ہے کہ میری اس بات سے وہ کچھ ناراض ہوگئی تھی۔ کیونکہ پھر بہت دنوں تک نہ تو اس نے فون کیا اور نہ ہی ملنے کی کوشش کی۔

ایک شام میں اس کے گھر پہنچ گئی۔''

اس کی والدہ ملی تھیں۔ انہوں نے بڑی خندہ پیشانی اور بے تابی سے میرا استقبال کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ارے روزینہ بیٹی اتنے دنوں کے بعد آرہی ہو۔''

''جی آنٹی! بس انجم سے ملاقات ہو جاتی تھی تو آپ سب کی خیریت معلوم ہو جاتی تھی۔ ادھر بہت دنوں سے نہ تو اس کا فون آیا ہے اور نہ ہی ملاقات ہوئی ہے۔ کیسی ہے وہ۔''

''ٹھیک ہی ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے۔''

''کیا ہو گیا ہے آنٹی؟ خیریت تو ہے نا؟''

''تم خود جا کر دیکھ لو۔ اس نے تو گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا ہے۔'' اس کی والدہ نے بتایا۔ ''دن بھر اپنے کمرے میں رہتی ہے۔ اس وقت بھی کمرے میں ہے۔''

یہ سوچتے ہوئے میں تیزی سے اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی کہ خدا جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ اس کی امی اتنی الجھی ہوئی کیوں ہیں۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں ہلکی سی دستک دے کر کمرے میں داخل ہوگئی۔

اور جو کچھ میں نے دیکھا۔ وہ مجھے حیران کرنے کے لیے بہت تھا۔

انجم نے نماز ختم کی تھی اور جائے نماز اٹھا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے جلدی سے جائے نماز ایک طرف رکھی اور دوڑتی ہوئی مجھ سے آکر لپٹ گئی۔

میں بس حیران ہو کر اس کو دیکھتی ہی رہی تھی۔ یہ تو وہ انجم ہی نہیں تھی بالکل بدلی ہوئی لڑکی تھی۔

اس نے بڑے سلیقے سے سر پر دوپٹا جما رکھا تھا۔ اس کا لباس بھی مغربی نہیں بلکہ خالص مشرقی تھا۔

میں نے حیران ہو کر پہلے اس کو پھر کمرے کی دیواروں کو دیکھا۔ سب کچھ ہی تو بدل گیا تھا۔ پہلے کمرے کی دیواریں مغربی اداکاراؤں کی تصویروں سے بھری رہتی تھیں لیکن اب دیواریں بالکل سپاٹ تھیں۔ البتہ ایک طرف ایک بڑے سے فریم میں صادقین کی خطاطی میں ایک مشہور آیت ضرور دکھائی دے رہی تھی۔

''روزینہ تو حیران ہو رہی ہے کیا؟'' اس نے میرا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

''انجم! کیا ہے یہ سب! یہ تصویریں کہاں چلی گئیں جن کو تو بہت شوق سے خرید خرید کر لاتی تھی۔''

''میں نے وہ سب جلا دیں۔'' اس نے بتایا۔

''جلا دیں۔ وہ کیوں۔''

''یار میں نے اپنے آپ کو بدل لیا ہے۔'' اس نے کہا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ سنجیدگی تھی۔ ''خدا جانے میں اب تک کہاں اور کیوں بھٹکتی رہی تھی۔ میں نے اپنی زندگی کا معیار کیا بنا رکھا تھا۔ اب پتا چلا کہ سب باطل اور جھوٹ تھا۔ سچائی تو کہیں اور تھی۔ میں ہر راستے کی طرف جا رہی تھی۔ سوائے اس راستے کے جو راستہ سچائی کی طرف جاتا تھا۔''

''او خدا! لگتا ہے زکریا سلمان صاحب تو نہیں بدلے بلکہ تم خود بدل گئی ہو۔''

''ہاں یار، ایسا ہی ہوا ہے۔ اس شخص کے زہد و تقویٰ نے مجھے بدل کر رکھ دیا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں ایک دن ان کے پاس سے آکر بہت دیر تک اپنا تجزیہ کرتی رہی تھی۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میں کیا کرنے جا رہی تھی۔ کتنا بڑا گناہ تھا اور اب تک میں جس قسم کی

Downloaded From http://paksociety.com

زندگی گزارتی آئی ہوں وہ سوائے جھوٹ کے اور کیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں۔''

''ایک بات تو بتاؤ۔ تمہارے مزاج کی کیفیت ایسی ہے کہ کچھ پتا نہیں چلتا کہ اگلے لمحے تم کیا کرنے والی ہو۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ وقتی جوش تو نہیں ہے۔''

''نہیں یار، بس دعا کرو کہ میں ثابت قدم رہ سکوں۔'' اس نے کہا۔

''انجم! تم نے تو مجھے حیران کر دیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں خود بھی اپنے آپ پر حیران ہوتی رہتی ہوں۔ میں کیسے ہوا کرتی تھی اور اب کیسی ہوگئی ہوں۔ تم یقین کرو۔ پہلے میں اس بات پر بے چین ہوا کرتی تھی کہ فلاں فلم مجھ سے مس ہوگئی ہے۔ میرے سارے دوستوں نے دیکھ لی لیکن میں نہیں جا سکی اور اب اس بات پر بے چین ہوتی ہوں کہ فلاں وقت کی نماز مجھ سے رہ گئی ہے اس کی کمی کیسے پوری ہوگی۔''

میں اس کی طرف صرف دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ وہ لڑکی کیسی بدلی تھی۔ کون توقع کر سکتا تھا کہ انجم جیسی بے باک اور انتہائی آزاد خیال لڑکی اس طرح کی ہو جائے گی۔

اور یہ سارا کرشمہ زکریا سلمان کا تھا۔ انجم شرط لگا کر ان کو بدلنے گئی تھی لیکن خود بدل کر رہ گئی تھی۔ واہ، شاید اسی لیے علامہ اقبال نے کہا تھا نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔

تو ایک مردِ مومن نے ایک حسنِ آوارہ کو بدل دیا تھا۔ میرے سامنے یہ تو صرف ایک مثال آئی تھی۔ خدا جانے ان کی وجہ سے اور کتنے بدل گئے ہوں گے یہ کتنا بڑا کام تھا۔

میں بہت سی نیک خواہشات کا اظہار کرتی ہوئی اور انجم کو دعائیں دیتی ہوئی واپس آگئی۔

پھر کئی دن گزر گئے اس دوران فون پر اس سے باتیں ہوتی رہی تھیں۔ اس پر وہی رنگ چڑھا ہوا تھا۔

اب اس کی باتوں میں ایک خوب صورت ٹھہراؤ اور وقار پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اسلامی فلاسفی کا مطالعہ کر رہی ہے۔ اس نے بہت سی کتابیں بھی خرید لی تھیں۔ اس کے گھر والے جو پہلے اس کی عادتوں سے تنگ آئے رہتے اب بہت خوش تھے۔

ایک دن سراج میرے پاس آگیا۔

سراج وہی نوجوان جس نے انجم سے شرط لگائی تھی اور جو انجم کو پسند کرتا تھا۔

سراج بہت الجھا ہوا اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

''یار یہ انجم کو کیا ہوا ہے۔ میری کال ہی ریسیو نہیں کرتی۔ ایک دفعہ اس نے اٹھا بھی لی تھا۔ تب اِدھر اُدھر کی مختصر بات کر کے فون بند کر دیا۔ کیا چکر ہے یہ سب؟''

''سراج صاحب! انجم اب وہ نہیں رہی جو شرط لگانے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ وہ اب ایک مختلف لڑکی بن چکی ہے۔''

''کیسی مختلف؟''

''اس نے اب اپنے راستے بدل لیے ہیں۔'' پھر میں نے اسے بتایا کہ انجم میں کس طرح کی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ وہ کیسی ہوگئی ہے۔

''او خدا۔'' سراج نے اپنا سر تھام لیا۔ ''کیا ہوا ہے اس کو، اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہوتا تو اس سے اس قسم کی شرط ہی نہیں لگاتا۔ بہرحال اب مجھے جلدی کرنی پڑے گی۔''

''کس بات کی جلدی۔''

''میرے گھر والے تو راضی ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''میں نے انجم کے حوالے سے ان سے بات کر رکھی ہے۔ وہ میرا رشتہ لے کر اس کے پاس جانے والے تھے لیکن اب ذرا جلدی کرنی ہوگی۔''

''ایک بات بتاؤ کیا خود انجم تیار ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل تیار ہے۔ اس موضوع پر ایک بار اس سے بات ہو چکی ہے۔''

''تو پھر فوراً بھیج دو۔''

پھر ایک دن انجم کا فون آگیا۔ وہ مجھے اپنے گھر بلا رہی تھی۔ میں فوراً ہی اس کے گھر پہنچ گئی۔ وہ مجھے لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کا وہی حلیہ تھا جو میں پہلے دیکھ کر گئی تھی۔

''یار تجھے معلوم ہے سراج کا رشتہ آیا تھا میرے لیے۔'' اس نے بتایا۔

''ہاں، سراج مجھ سے ملا تھا۔ اس نے یہ بتایا تھا مجھے۔ تو پھر کیا ہوا؟''

''میں نے انکار کر دیا۔''

''انکار کر دیا! وہ کیوں؟'' میں نے حیران ہو کر

Downloaded From http://paksociety.com

پوچھا۔

''میں نے ابا سے بات کرلی ہے۔ میں نے زکریا سلمان کو پسند کرلیا۔ وہی میرا آئیڈیل ہیں میں نے شادی کی تو ان ہی سے کروں گی۔''

''لڑکی! کیا تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔'' میں حیرت سے پاگل ہوئی جارہی تھی۔

''ہاں روزی، میں بالکل سنجیدہ ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں کسی اور کے ساتھ زندگی گزار ہی نہیں سکتی۔ میرا مطلب ہے کسی ایسے کے ساتھ جو میرے مزاج کے مطابق نہ ہو۔''

''اور تمہارا یہ مزاج کتنے دنوں کا ہے۔''

''جو بھی ہو۔ اب تو یہی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے اپنا راستہ چن لیا ہے اور یہ روشنی دکھانے والے زکریا سلمان ہی ہیں۔ تو جس شخص نے مجھ پر یہ احسان کیا ہے میں کیوں نہ اس کی شریکِ زندگی بن کر نیکی اور سچائی کے سفر کو آگے بڑھاؤں۔ ہم دونوں مل کر کسی مشنری کے جذبے سے کام کرسکتے ہیں۔''

''اور سراج، اس کا کیا ہوگا؟''

''اس کو منع کردینا۔ میری طرف سے معذرت کرلینا۔'' اس نے کہا۔ ''میں اس کے علاوہ کیا کہہ سکتی ہوں۔''

''لیکن پاگل لڑکی کیا ضروری ہے کہ زکریا صاحب تم سے شادی کے لیے تیار ہوجائیں۔ تمہیں کیا معلوم کہ ان کا کیا بیک گراؤنڈ ہے۔ ان کی پسند ناپسند کیا ہے۔ یوں ہی تو شادی نہیں ہوسکتی۔''

''یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ اس میں بہت رکاوٹیں ہیں۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم ان سے جاکر ملو۔''

''میں جاکر ملوں؟''

''ہاں کیونکہ میں جانتی ہوں کہ یہ کام تم ہی کرسکتی ہو۔'' اس نے کہا۔ اس وقت وہ بہت جذباتی اور پُرجوش ہورہی تھی۔ ''میں انہیں اچھی طرح یاد ہوں گی۔ تم صرف میرا نام لینا۔ وہ پہچان جائیں گے۔ پھر انہیں میری اس تبدیلی کے بارے میں بتاتے ہوئے میرا پیغام دے دینا۔''

''مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔''

''زندگی خوابوں سے بھی زیادہ حیران کرنے والی ہوتی ہے میری جان۔ پلیز اب تم دیر مت کرنا۔''

''ایک بات بتاؤ۔ کیا تمہارے گھر والے اس رشتے کے لیے تیار ہوجائیں گے۔''

''یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوگا کہ زکریا سلمان جیسے آدمی نے میرا رشتہ قبول کرلیا ہے تو وہ خوشی سے پاگل ہوجائیں گے۔''

وہ بہت دیر تک ان ہی کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ اس کے جنون اور اس کی وارننگ کو دیکھتے ہوئے میں نے یہی فیصلہ کیا کہ میں زکریا سلمان کے پاس جاؤں گی۔ انجم فی الحال اپنے گھر والوں کو اس معاملے میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے یہ ذمے داری میرے حوالے کی تھی۔

میں دوسری شام ان کے گھر پہنچ گئی۔

اچھا خاصا گھر تھا بلکہ اور لوگ بھی ان کے پاس آئے ہوئے تھے۔

ان کی عمر واقعی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ وہ ایک خوش شکل انسان تھے۔ ہلکی ہلکی داڑھی اور تقریباً ماڈرن سا لباس۔

انجم کا حوالہ سن کر وہ خوش ہوگئے تھے۔ ''ہاں وہ بہت دنوں سے میرے پاس نہیں آئی ہیں۔ خیریت سے تو ہیں نا۔''

''ہاں بالکل خیریت سے ہیں اور میں ان کا ایک پیغام لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔''

''کیا پیغام!''

''اس نے آپ کے لیے اپنا رشتہ بھیجا ہے۔'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''اوہ۔'' وہ ایکدم سے خوش ہوگئے۔ ''مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ میں تو خود یہی چاہتا تھا۔ سوچا تھا کسی دن اظہار کردوں گا۔ ان سے کہیے گا کہ میں نے اپنے آپ کو ماڈریٹ کرلیا ہے۔ اب ہمیں دیکھیں میری داڑھی بھی ہلکی ہوگئی ہے۔ بس انسان کو نماز روزہ تک رہنا چاہیے اس سے زیادہ ہوجائے تو دنیا کی خوشیوں سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔''

وہ تو جانے کیا کیا بولتے رہے اور میں سناٹے کے عالم میں ان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ خدا جانے یہ انجم کے لیے خوشی کی خبر تھی یا دکھ کی۔

پھر غالب کا وہ مصرعہ یاد آگیا۔ ''میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہوگیا۔''

Downloaded From http://paksociety.com

ڈھلتے سائے

محترم مدیر سرگزشت

السلام علیکم

ایک اور سچ بیانی ارسال کررہا ہوں۔ یہ سچ بیانی ذیشان حیدر کی ہے۔ اس کی حالاتِ زندگی ہے۔ اس کے بکھرے حالات کو میں نے الفاظ میں سمیٹا ہے۔ اس پر جو گزری ہے اسے الفاظ کا پیرہن اپنی جانب سے دیا ہے تاکہ قارئین کو یہ کہانی بور نہ کرے۔

اعجاز احمد راحیل
(ساہیوال)

میرا نام ذیشان حیدر ہے۔ پیشے کے لحاظ سے وکیل ہوں۔ یہ میری زندگی کا اہم واقعہ ہے جو آپ کی بصارتوں کی نذر ہے۔ میں لاہور کے ایک کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ بچپن سے ہی بہت کم گو ہوں۔ میرے ابو میجر رحمٰن ملک آرمی میں تھے۔ میری ماں گھریلو عورت تھی۔ وہ محلے کے بچوں کو قرآن پاک پڑھاتی تھیں۔ صبح صبح ہمارے گھر کے آنگن میں سب بچے اونچی آواز میں اپنا سبق یاد کرتے تو اک سماں بندھ جاتا۔ یوں لگتا تھا ہمارے گھر میں رحمت کا نزول ہو

Downloaded From http://paksociety.com

رہا ہے۔ ابو جب چھٹی پر آتے تو صبح کے وقت صحن میں بچوں کو پڑھتے دیکھ کر اکثر کہا کرتے۔ ''ذکیہ ہمارا گھر جنت کا نمونہ ہے۔ بلاشبہ یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔''

امی جان ان کی بات سن کر مسکرا دیتیں۔ زندگی بہت خوشگوار گزر رہی تھی۔ ایک بار فروری میں ابو چھٹی پر گھر آئے ہوئے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ وہ مجھے انگلش پڑھا رہے تھے۔ میں ان دنوں دسویں جماعت کے پیپرز کی تیاری کر رہا تھا۔ امی کچن میں رات کا کھانا تیار کر رہی تھیں۔ اچانک ہمارے گھر کے فون کی گھنٹی بجی۔ فون کچن کے قریب رکھا ہوا تھا۔ امی نے کال ریسیو کی، پھر اشارے سے ابو کو بلایا۔ وہ اٹھ کر کال سننے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بات کرنے کے بعد واپس آگئے۔ کچھ دیر بعد امی نے کھانا لگا کر ہمیں آواز دی تو ہم ہاتھ دھو کر دسترخوان پر آکر بیٹھ گئے۔ امی نے مچھلی فرائی کی تھی۔ جو بہت مزیدار بنی۔ ہم سب نے جی بھر کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد ہم کمرے میں آگئے تو امی جان نے ابو سے پوچھا۔ ''میجر صاحب کس کا فون تھا؟''

''ذکیہ میرا بلاوا آگیا ہے۔ ابھی میں خود یہ بات بتانے والا تھا۔ تم میرا سامان پیک کر دینا۔ میں کل صبح کھاریاں کینٹ جاؤں گا۔'' وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

ہم نو بجے تک باتیں کرتے رہے۔ پھر میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ تھوڑی دیر پڑھنے کے بعد سو گیا۔ صبح امی کے جگانے پر میری آنکھ کھلی۔

میں جلدی سے اٹھا اور واش روم چلا گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر ناشتے کی ٹیبل پر آگیا۔ ہم سب نے مل کر ناشتا کیا۔ اس کے بعد ابو کمرے میں چلے گئے اور کھاریاں کینٹ جانے کی تیاری کرنے لگے۔ دس منٹ بعد وہ اپنا بریف کیس اٹھائے کمرے سے باہر آگئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے مجھے اپنے کشادہ سینے سے لگا کر بہت پیار کیا۔ پھر امی جان سے کہنے لگے۔ ''ذکیہ شانی کو بہت پیار کیا کرو۔ یہ ہمارا ایک ہی بیٹا ہے۔ بیٹا اپنی ماں کا بہت خیال رکھنا۔'' پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے گھر سے باہر چلے گئے۔ اس دن ان کے جانے کے بعد گھر کے درودیوار بھی اداس ہو گئے تھے۔ شام کو انہوں نے اپنے بخیر وعافیت پہنچنے کی اطلاع دی۔ مگر میری بات نہ ہو سکی۔ دو دن بعد پھر دوپہر کو انہوں نے کال کی۔ وہ امی جان سے کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر مجھ سے بھی بات کی۔ پہلے انہوں نے میرا حال چال پوچھا۔ اس کے بعد پڑھائی کے بارے میں استفسار کیا۔ آخر میں انہوں نے کہا۔ ''شانی یار دل لگا کر پڑھنا، تاکہ بڑے آدمی بن سکو۔ اگر تمہارے پاس چار پیسے ہوں گے تو سب اپنے ہیں۔ ورنہ کوئی اپنا نہیں۔''

وہ کافی دیر مجھے سمجھاتے رہے۔ پھر اچانک کال کٹ گئی۔ بعد میں امی جان نے مجھے بتایا کہ ابو اپنی یونٹ کے ساتھ بطور کمانڈنگ آفیسر کشمیر کے بارڈر پر جا رہے ہیں۔

☆......☆

وقت گزرتا رہا۔ میں نے میٹرک کے پیپر دیے۔ میرے سارے پیپر بہت اچھے ہوئے۔ میں ان دنوں فارغ تھا۔ ایک صبح گھر کے فون پر کال آئی۔ امی جان کال سننے کے بعد اونچی آواز میں رونے لگیں۔ ان کی آواز سن کر میں کمرے سے باہر آگیا۔ امی مجھے دیکھ کر چلّاتے ہوئے بولیں۔ ''شانی تمہارے ابو شہید ہو گئے ہیں۔''

یہ روح فرسا خبر بم کی طرح سر پر گری۔ جسے سن کر میں بھی رونے لگا۔ ہماری آوازیں سن کر اڑوس پڑوس کے لوگ بھی اکٹھے ہو گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ عصر کے وقت ابو کی میت آرمی والے لائے تھے۔ کچھ دیر میت گھر میں رکھی تھی۔ پھر میاں میر کے قبرستان میں انہیں فوجی اعزاز کے ساتھ سپرد خاک کر دیا گیا۔

ابو کی ڈیتھ کے ایک سال ... بعد ہم نیازی اڈے کے قریب شفٹ ہو گئے۔ ان کی سروس کی رقم سے ہم نے دو پورشن کا نیا گھر بنوایا تھا۔ یہاں ہمارا پانچ مرلے کا پلاٹ پہلے ہی سے موجود تھا جو کہ ابو نے اپنی زندگی میں ہی خریدا تھا۔ میں نے میٹرک سائنس سبجیکٹ میں اچھے مارکس میں پاس کیا۔ امی جان نے مجھے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں داخلہ دلوا دیا۔ میں روزانہ بائیک پر جاتا تھا جو کہ امی نے دلوائی تھی۔ ان دنوں ہمارے مالی حالات بھی اتنے اچھے نہیں تھے۔ گھر کے اوپر والے پورشن کے کرائے اور ابو کی پنشن سے بمشکل گزارا ہو رہا تھا۔ امی کوئی پرائیویٹ جاب کرنا چاہتی تھیں۔ مگر میں نے منع کر دیا۔ وقت کا پنچھی پر لگا کر اڑتا رہا۔ میں ان دنوں بی اے کر رہا تھا۔ جب حنا سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ برسات کا موسم تھا۔ اس دن لاہور کا آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ بارش اب ہوئی کہ اب ہوئی۔ میں چھٹی کے بعد تھوڑی دیر دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگاتا رہا۔ اس وجہ سے تھوڑا لیٹ ہو گیا تھا۔ میں جلدی سے پارکنگ میں کھڑی اپنی بائیک پر بیٹھا اور گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ جب گیٹ سے باہر نکلا تو سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے مجھے

Downloaded From http://paksociety.com

رکنے کا اشارہ کیا۔ میں بائیک روک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر کہہ نہیں پا رہی تھی۔ میں اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ جھینپ سی گئی۔ اس نے فوراً نظریں جھکا لیں۔ مجھے اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں بے چینی کے سائے محسوس ہوئے۔ اس کے چاند چہرے پر جھولتی بالوں کی سیاہ لٹ مجھے بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

"جی فرمایئے محترمہ؟" میں نے اسے شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر گویا اس کی مشکل حل کر دی۔

"کیا آپ مجھے چوک چوبرجی تک لفٹ دے سکتے ہیں؟" وہ بدستور نظریں جھکائے آہستگی سے بولی۔

مجھے اس کے انداز پر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس سے پہلے کہ کچھ کہتی۔ میں جلدی سے بولا۔ "چلیں جلدی سے بیٹھ جائیں۔ بارش کا کچھ پتا نہیں کب شروع ہو جائے۔ مجھے چوک یتیم خانہ تک جانا ہے۔ راستے میں آپ کو ڈراپ کرتا جاؤں گا۔"

اس نے شولڈر بیگ درست کیا۔ ایک نظر میری طرف دیکھا اور پیچھے بیٹھ گئی۔ میں نے بائیک آگے بڑھا دی۔ اسی اثنا میں بوندا باندی شروع ہو گئی۔ میں نے ایکسیلٹر گھما دیا۔ بائیک برق رفتاری سے دوڑنے لگی۔ اچانک بادل زور سے گرجے تو وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اپنی پشت پر اس کے گداز جسم کا لمس محسوس کیا۔ جو میرے وجود میں برقی رو کی طرح دوڑنے لگا تھا۔ میں اس لذت آمیز لمس سے زندگی میں پہلی بار آشنا ہوا۔ مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ایک پُرکیف احساس رگ و پے میں سرایت کرنے لگا۔ روڈ پر کافی رش تھا۔ ایک گاڑی بائیک کو کراس کرنے کے بعد اچانک سامنے آئی۔ مجھے بریک لگانا پڑی۔ وہ میرے مزید قریب ہو گئی۔ میرے وجود میں سرشاری کی لہر دوڑ گئی۔ اسے شاید اپنی اس حالت کا ادراک ہو گیا تھا۔ وہ جلدی سے پیچھے ہو گئی۔ چوک چوبرجی آنے والا تھا۔ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ لاہور کا آسمان کھل کے برسنے لگا۔ منوں پانی زمین پر گر رہا تھا۔ موسم ٹھنڈا ہو گیا۔ مگر میرا وجود سلگ رہا تھا۔ ہم بارش میں بھیگتے ہوئے چوک چوبرجی پہنچ گئے۔ میں نے چوک کے قریب بائیک روکی تو وہ نیچے اتر کر میرے قریب کھڑی ہو گئی۔ بارش قدرے کم ہو گئی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"سو تھینکس۔" وہ آہستگی سے بولی۔

بھیگے ہوئے لباس میں اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔

"نو تھینکس جی۔" اب آپ گھر جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو آپ کو ٹھنڈ لگ جائے۔" میں نے اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ تھوڑی سی شرمائی۔ پھر مسکراتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر بولی۔

"ٹھنڈ تو آپ کو بھی لگ سکتی ہے۔ آپ بھی بھیگ گئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ زیرلب مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی مجھ سے دور ہوتی گئی۔ میں محویت سے دیکھتا رہا۔ میری نظریں اس کے نرم و نازک سفید پیروں پر جم گئی تھیں۔ بلیک کلر کی ڈوریوں والے سلیپرز میں اس کے بچوں جیسے گداز پیر بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ پھر وہ ایک گلی میں مڑ گئی۔ مڑنے سے پہلے وہ ایک پل کے لیے رکی اور پلٹ کے دیکھا۔ پھر وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ بارش ایک بار پھر زور پکڑنے لگی۔ مجھے بھیگنے کا احساس ہوا تو میں نے بائیک آگے بڑھا دی۔ مگر میں خود کو چوبرجی چوک کے چاروں میناروں کے آس پاس کہیں چھوڑ آیا۔ یتیم خانہ چوک پہنچنے تک میں سرتاپا بھیگ چکا تھا۔ وہاں سے میں نے دائیں ہاتھ ٹرن لیا اور بائیک کو دوڑاتا ہوا نیازی اڈے کے ساتھ والی گلی میں مڑ گیا۔ دو تین منٹ بعد اپنے گھر پہنچ گیا۔ بائیک گیٹ کے سامنے برآمدے میں کھڑی کی اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ شاور لینے کے بعد لباس بدلا اور امی کے کمرے میں آ گیا۔ وہ عصر کی نماز کے بعد تسبیح کر رہی تھیں۔

"آؤ بیٹا۔ ادھر بیٹھ جاؤ۔" وہ مجھے دیکھ کر شفقت آمیز لہجے میں بولیں۔

"اچھا ماں جی۔" یہ کہہ کر میں ان کے پاس بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرا جسم آگ میں جلنے لگا ہو۔ میں بیڈ پر لیٹ گیا۔ امی نے شاید میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا تھا۔ انہوں نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا، اور بے ساختہ بولیں۔

"شانی تمہیں تو بخار ہو گیا ہے۔"

مجھ سے کچھ نہ بولا گیا۔ وہ پریشان ہو گئیں۔ پھر وہ اٹھیں۔ الماری میں پڑی ہوئیں بخار کی ٹیبلٹ اور پانی کا گلاس لے آئیں۔ انہوں نے دونوں چیزیں ٹیبل پر رکھیں۔ مجھے سہارا دے کر اوپر اٹھایا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ان سے ٹیبلٹ لے کر پانی سے نگل لیا۔ پھر لیٹ گیا۔ وہ چائے بنا کر لے آئیں۔ میں نے چائے کا آدھا کپ بمشکل پیا پھر بیڈ پر لیٹ گیا۔ باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکی سے

Downloaded From http://paksociety.com

آسمانی بجلی کی چمک اور بادلوں کی گھن گرج سنائی دے رہی تھی۔ ایسے میں اس کے بولے دو فقرے ''ٹھنڈ تو آپ کو بھی لگ سکتی ہے۔ آپ بھی بھیگ گئے ہیں۔'' بازگشت کی طرح میری سماعتوں سے ٹکراتے رہے۔ میری ساری رات سوتے جاگتے گزری۔ امی بھی جاگتیں رہیں۔ مجھے اس بات کا اندازہ صبح ان کی آنکھیں دیکھ کر ہوا۔ جو رتجگے کی غماز تھیں۔

☆......☆

میں تین دن بعد یونیورسٹی گیا۔ میری بے چین نگاہیں اسے سارا دن تلاشتی رہیں۔ وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ میں چھٹی سے قبل ایک خالی پیریڈ میں کینٹین کی طرف چلا گیا۔ وہاں کافی طلبہ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اِدھر اُدھر طائرانہ نگاہ ڈالتا ہوا ایک خالی ٹیبل کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے وہاں بیٹھے بمشکل ایک منٹ ہوا ہوگا۔ اچانک مجھے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے نظریں اٹھا کر اپنے بائیں جانب دیکھا۔ مجھے اپنی بصارتوں پر یقین نہ آیا۔ وہ بائیں جانب کھڑی مسکراتی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ سفید کاٹن کا سوٹ اس پر خوب جچ رہا تھا۔

''ایکسکیوزمی۔ کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟'' وہ میرے پاس خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شرارت آمیز لہجے میں بولی۔

''ج......جی بیٹھیں۔'' میں ہکلا کر بولا۔

''بہت شکریہ۔'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

پھر اس نے شولڈر بیگ کندھے سے اتار کر ٹیبل کے کونے پر اپنے سامنے رکھ دیا۔ پرس بہت نفیس تھا۔ جس پر موتیوں سے دو دل بنے ہوئے تھے۔ میں نے ویٹر کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ اسے کوک اور برگر کا آرڈر دیا۔

''آپ تو اس دن کے بعد غائب ہی ہو گئے۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ میرے دل نے خوشی اور طمانیت محسوس کی کہ وہ بھی مجھے تلاشتی رہی ہے۔

''میری طبیعت خراب تھی۔ اس وجہ سے نہیں آسکا۔'' میں آہستگی سے بولا۔

''کیا ہوا آپ کو؟'' اس کے لہجے میں بے چینی تھی۔

''مجھے بخار ہوگیا تھا۔ اس وجہ سے یونیورسٹی نہیں آسکا۔''

''اب کیسے ہو؟''

''اچھا ہوں۔'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

اس دوران ویٹر کوک اور برگر سرو کر کے چلا گیا تھا۔ ہم برگر کھانے اور کوک پینے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتے رہے۔

باتوں کے دوران اس نے اپنے بارے بتایا کہ اس کا نام حنا ہے۔ وہ چوک چوبرجی کے نزدیک ایک محلے میں چار مرلے کے گھر میں رہتی ہے۔ اس کے باپ کا گارمنٹس اسٹور ہے۔ اس کی ماں کا دو سال پہلے انتقال ہوگیا تھا۔ دو بھائی ہیں۔ جو اس کے والد کے ساتھ اسٹور پر کام کرتے ہیں۔

میں نے بھی مختصراً اپنے بارے میں بتا دیا۔ ہماری مختصری ملاقات ہمیں آنے والے وقت میں اتنا قریب کر دے گی۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ جب وہ جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو میں نے اس سے سیل نمبر مانگا۔ اس نے میرا نمبر پوچھا اور اپنے سیل فون سے مس کال دے دی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے نمبر سیو کرلیا۔

☆......☆

حنا کے ساتھ میرا فون پر رابطہ ہوا تو ہم ایک دوسرے کو میسج کرنے لگے۔ ہماری شروع میں مختصر بات چیت ہوتی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ پھر وہ مجھ سے چھوٹی بات بھی شیئر کرنے لگی۔ ہم گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔ اکثر باہر بھی ملنے لگے۔ کبھی کسی پارک میں یا پھر ہوٹلوں میں۔ ہماری دوستی بہت جلد محبت میں بدل گئی۔

وہ سردیوں کی یخ بستہ رات تھی۔ میں بیڈ پر کمبل اوڑھے لیٹا حنا کی کال کا انتظار کر رہا تھا۔ ہم اکثر رات کو بات کرتے تھے۔ میں کافی دیر انتظار کرتا رہا مگر اس کی کال نہ آئی۔ رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ میں نے انباکس میں موجود ایک شعر فارورڈ کیا۔ اس کے نیچے ویٹنگ لکھ کر اسے میسج کر کے سو گیا۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ موبائل کی گھنٹی بجی تو میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے جلدی سے بیڈ کے سرہانے پڑا سیل فون اٹھا لیا۔ اتنی دیر میں بیل بند ہو چکی تھی۔ میں نے کال چیک کی حنا کی پندرہ کالز آئی ہوئی تھیں۔ میں نے فوراً کال بیک کی۔ اس نے کال ریسیو کرلی۔

''شانی میں بارہ بجے سے وقفے وقفے سے کال کر رہی ہوں۔ لگتا ہے تم سو گئے تھے۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''ہاں میں سو گیا تھا۔ تم بتاؤ آج کہاں تھی؟'' میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

''شانی میں زیادہ بات نہیں کرسکتی۔ بس تم کل مجھے ملو۔''

''خیر تو ہے نا؟''

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
- ایڈ فری لنکس
- ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
- ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
- کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

یکبارگی میرا دل زور سے دھڑکا۔ میں نے بہت اصرار کیا مگر اس نے کچھ نہ بتایا۔ ہماری پانچ منٹ مزید بات ہوئی۔ اس نے ملاقات کی جگہ اور وقت بتا کر کال ڈراپ کردی۔ میں نے سیل فون پر صبح چھ بجے کا الارم لگا کر تکیے کے ساتھ رکھا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں کروٹیں بدلتا رہا۔ اسی اثنا میں فجر کی اذانوں کی صدا لاہور کی فضا میں بلند ہوئی۔ مجھے نیند آنے لگی۔ تاہم میں نے سونا مناسب نہیں سمجھا۔ اٹھ کر وضو کیا۔ نماز پڑھی اور پھر دوبارہ بستر پر دراز ہوگیا۔ بلا ارادہ میری آنکھ لگ گئی۔

صبح الارم بجنے پر میری آنکھ کھلی۔ ایک گھنٹا سویا رہا تھا۔ میں نے شاور لیا۔ لباس بدلا اور ناشتا کرنے کے بعد یونیورسٹی کی طرف چل پڑا۔

لاہور کا موسم بہت خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے دل و دماغ کو فرحت بخش رہے تھے۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ صبح صبح روڈ پر کافی رش تھا۔ لوگ فکر معاش اور زندگی کے روزمرہ کاموں کے لیے گھروں سے نکل پڑے تھے۔ ان میں اکثر ملازم پیشہ افراد اور اسٹوڈنٹس تھے۔ اس روڈ پر ہمیشہ کافی رش ہوتا ہے۔

میں جب چوک چوبرجی پہنچا تو حسبِ عادت میری نگاہیں اس جگہ کی جانب اٹھ گئیں۔ جہاں میں نے حنا کو ڈراپ کیا تھا۔ میں اس کے بارے سوچتا ہوا یونیورسٹی پہنچ گیا۔ بائیک پارکنگ میں کھڑی کرکے لان کی طرف بڑھ گیا۔ یونیورسٹی کا لان بہت خوبصورت اور دلکش ہے۔ یہاں کئی اقسام کے درخت اور پھولدار پودے لگائے گئے ہیں۔ طلباء اکثر فارغ اوقات میں یہاں بیٹھے یا چہل قدمی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ یونیورسٹی کے مین ہال کے بالکل سامنے ہے۔

اس لان کو ”اوول گراؤنڈ“ بھی کہا جاتا ہے۔ میرے ایک کلاس فیلو واجد نے مجھے دور سے ہی..... دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔ اس کے ساتھ سلام دعا کی۔ اتنی دیر میں کلاسز کا وقت ہوگیا۔ میں اپنے کلاس روم کی طرف چلا گیا۔ سارا دن گزر گیا۔ وہ مجھے نظر نہیں آئی تھی۔

چھٹی سے کچھ دیر قبل میرے موبائل پر میسج کی ٹون ابھری۔

میں نے اسکرین دیکھی۔

”شانی۔ چھٹی کے بعد ناصر باغ آجانا۔“

آدھا گھنٹا بہت مشکل سے گزرا۔ وقت جیسے تھم گیا تھا۔ یونیورسٹی سے جونہی چھٹی ہوئی۔ میں پارکنگ کی طرف چلا گیا۔ بائیک اسٹارٹ کی اور گیٹ سے باہر نکل آیا۔ گیٹ کے قریب ایک آٹو ورکشاپ پر میں نے بائیک ٹیوننگ کے لیے کھڑی کی۔ وہاں سے پیدل ہی ناصر باغ کی جانب چل پڑا۔ کم و بیش دس منٹ بعد میں ناصر باغ پہنچ گیا تھا۔ گیٹ کے نزدیک ہی ایک سنگی بنچ پر بیٹھ گیا۔ میری نظریں گیٹ پر لگی ہوئی تھیں۔

مجھے وہاں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

حنا نے گیٹ عبور کیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی تو میں نے ہاتھ ہلایا۔ وہ خراماں خراماں چلتی ہوئی میری طرف آنے لگی۔ مجھے ہمیشہ کی طرح اس کی چال اچھی لگ رہی تھی۔ اس کے چلنے کا انداز بچوں جیسا تھا۔ سنبھل سنبھل کر چلتی تھی۔ اس نے کاٹن کا سوٹ پہن ہوا تھا۔ سفید ٹراؤزر اور میرون کلر کی قمیص۔ جو کہ اس کے بدن پر خوب جچ رہا تھا۔ میں ستائشی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ پاس آکر بنچ پر بیٹھ گئی۔ مختصر حال احوال کے بعد اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”شانی۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ تم خاموشی سے میری بات سنو۔ پھر مشورہ دو کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟“

”بولیں میں سن رہا ہوں۔“

”ابو میری شادی اپنے بھائی کے بیٹے سے کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ٹھوکر نیاز بیگ سے رائیونڈ روڈ پر ایک گاؤں میں رہتے ہیں۔“

وہ نان اسٹاپ بولتی چلی گئی۔ میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ ابھی تو ہماری محبت کا آغاز ہوا تھا۔ ہم نے ساتھ نبھانے کے وعدے کیے تھے۔ ابھی تو سفر شروع ہوا تھا۔ ہم نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے منزل پر پہنچنا تھا۔ میں حیران نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ بولی۔ ”تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ میں جانتی ہوں۔“ ذرا توقف کے بعد وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ”میرے چچا کا بیٹا بالکل جاہل ہے۔ واجبی شکل وصورت ہے۔ اب تم بتاؤ۔ کیا تم چاہو گے جسے تم چاہتے ہو۔ اس کی شادی ایک میٹرک پاس اور ناکارہ انسان سے ہو؟“

وہ جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

اس نے مجھے اہم سمجھا۔ اپنی زندگی کے فیصلے کا اختیار مجھے دیا تھا۔ وہ فیصلہ جس کی تائید میرے خلاف تھی۔

”میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ نہ کبھی ہوگا۔ ہر انسان کو اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔ کوئی اس پر

Downloaded From http://paksociety.com

اپنی مرضی مسلط نہیں کر سکتا۔ تم اپنے ابو کو صاف صاف بتا دو کہ ان کا یہ فیصلہ تمہیں قبول نہیں ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ میں اسے اپنی زندگی سمجھتا تھا۔ کوئی اپنی زندگی کو بھلا خود سے کیسے جدا کر سکتا ہے؟

''اگر تم ساتھ ہو تو مجھے کوئی فکر نہیں شانی۔'' وہ میرا جواب سن کر کھل اٹھی۔ گویا اسے حوصلہ ہو گیا تھا۔

''تم کہو تو کچھ دن بعد امی جان کو تمہارے ہاں بھیج دوں؟''

میں نے اس کے گداز ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنسی، پھر بولی۔ ''ہاں۔ بھیج دینا اور اب مجھے اجازت دو۔'' وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور اپنا بچوں جیسا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ جسے میں نے محبت سے تھام لیا۔

پھر ہم ساتھ ساتھ چلتے ہوئے گیٹ سے باہر آ گئے۔

☆......☆

صبح میری آنکھ ذرا دیر سے کھلی۔ اس کی وجہ میرا رات گئے تک جاگنا تھا۔

میں بیڈ سے اٹھا اور واش روم چلا گیا۔ فریش ہو کر سیدھا ناشتے کی میز پر آ بیٹھا۔ یونیورسٹی جانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ امی جان کچن میں تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ ناشتے کے لوازمات لے کر آ گئیں۔

ہم نے اکٹھے ناشتا کیا۔ ناشتے کے بعد چائے پی۔

''بیٹا کیا تم رات دیر تک جاگتے رہے ہو؟''

''ہاں امی بس نیند نہیں آ رہی تھی۔''

مائیں بھی بہت عجیب ہوتی ہیں۔ ان کے اندر قدرت نے صلاحیت رکھی ہوتی ہے۔ اولاد اگر نہ بھی بتائے۔ یہ ان کی خوشی اور غم محسوس کر لیتی ہیں۔ تاہم ایک بات میری ماں میں شاید یہ صلاحیت کچھ زیادہ تھی۔ وہ میری فیلنگز کو بہت جلد جان جاتی تھیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مجھے عورت کا بس یہی روپ اچھا لگتا ہے۔ ہاں صرف ماں کا روپ۔ کیونکہ ماں رب کا دوسرا روپ ہوتی ہے۔ اچانک ذہن میں خیال آیا کہ حنا کے حوالے سے امی سے بات کرنی چاہیے۔ میں نے ہمت جمع کی۔ پھر میں نے امی جان کو ساری بات بتا دی۔ آخر میں، میں نے انہیں کل والی بات سے آگاہ کر دیا۔

وہ تمام تفصیل سننے کے بعد کچھ دیر چپ رہی، پھر بولیں۔ ''بیٹا مجھے تمہاری خوشیاں عزیز ہیں۔ تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔ میری ایک بات یاد رکھنا کہ وقت اور حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ مجھے تمہاری باتوں سے اندازہ ہوا ہے۔ وہ لڑکی دولت کی پجاری ہے۔ اس کی نظر میں رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسے غریب لوگ اچھے نہیں لگتے۔ جس گھڑے کا پانی ہو وہ پار نہیں لگائے گا۔ اس کی مٹی گوندھنا بھی عبث ہے۔'' وہ کچھ دیر چپ ہوئیں، پھر کہا۔ ''بہر حال میں تمہاری خوشی کے لیے ان کے ہاں جاؤں گی۔''

میں جلدی سے اٹھا۔ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولا۔ ''آئی لو یو ماں......آپ بہت اچھی ہیں۔''

انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

پھر وہ ناشتے کے برتن سمیٹنے لگیں۔ میں نے اپنے کمرے میں آ کر حنا کو کال کی۔ اسے بتایا کہ میں نے امی سے بات کی ہے۔ وہ بہت جلد تمہارے گھر آئیں گی۔ وہ یہ سن کر خوش ہوگئی۔ اس نے یقین دلایا کہ سب اچھا ہو جائے گا۔ بس اپنی امی کو جلد بھیج دیں۔ انسان جو سوچتا ہے۔ وہ مشکل سے ہوتا ہے۔

اسی شام امی جان کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ میں نے انہیں سی ایم ایچ میں داخل کروا دیا۔ بروقت طبی امداد سے ان کی حالت سنبھل گئی۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کرنے کے بعد کہہ دیا، ہلکا سا ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ ان کو کچھ دن یہاں رکھنا پڑے گا۔ ورنہ کسی بھی وقت دوبارہ ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے۔

میں رات امی جان کے پاس رہا۔ دعائیں مانگتا رہا۔ حنا کے نمبر پر میں نے میسج کر دیا تھا۔ رات دس بجے کے لگ بھگ اس نے کال کی۔ امی جان کی خیریت پوچھی تو میں نے تفصیل بتائی اور کہا۔ ''بس تم دعا کرو امی جان جلد صحت یاب ہو جائیں۔''

ہماری تھوڑی دیر مزید بات ہوئی، پھر کال کٹ گئی۔ میں رات دو بجے تک جاگتا رہا۔ پھر سو گیا تھا۔

فجر سے کچھ دیر قبل موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی انجان نمبر تھا۔ ''ہیلو! آپ ذیشان ہیں؟'' موبائل کے اسپیکر سے بھاری بھرکم آواز ابھری۔

''جی بولیں؟''

''میں ایس ایچ او کامران جٹ بات کر رہا ہوں۔ آپ کے گھر ڈکیتی ہوگئی ہے۔ ڈاکوؤں نے اسلحہ کے زور پر آپ کے کرائے داروں کو یرغمال بنا کر زدوکوب کیا۔ ان کے گھر سے بھی قیمتی اشیا لے گئے ہیں۔'' لمحاتی توقف کے بعد وہ بولا۔ ''آپ ایسا کریں کہ گھر آ جائیں۔''

''ایس ایچ او صاحب! میری امی جان کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ میں ان کے ساتھ اسپتال میں ہوں۔ بہر حال میں

Downloaded From http://paksociety.com

کوشش کرتا ہوں۔"

اس نے او کے کہہ کر کال ڈراپ کردی۔

امی جان کی طرف دیکھا وہ سوئی ہوئی تھیں۔ میں نے انھیں جگانا مناسب نہ سمجھا۔

میں اسپتال سے باہر نکل آیا۔ گیٹ پر ہی مجھے ٹیکسی مل گئی۔ میں اس میں بیٹھ کر آدھے گھنٹے بعد نیازی اڈے آگیا۔ ٹیکسی والے کو کرایہ دیا۔ وہاں سے پیدل گھر کی طرف چل پڑا۔

گھر کے سامنے کھڑی پولیس وین مجھے دور سے ہی نظر آگئی۔

میں آہستہ آہستہ چلتا گھر میں داخل ہوگیا۔ ایس ایچ او کامران جٹ کے ساتھ تین چار کانسٹیبل تھے۔ وہ ہمارے کرائے دار مختار سے بیان لے رہا تھا۔ میں نے اس سے سلام دعا کی۔ "ذیشان صاحب! آپ گھر کا سامان وغیرہ چیک کریں۔ فہرست بنا کر ہمیں دیں، تاکہ پتا چلے ڈاکو کیا کیا چیز لے گئے ہیں؟" ایس ایچ او نے شائستہ لہجے میں کہا۔

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور امی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں سیدھا الماری کی طرف بڑھا۔ امی اپنے زیورات اور رقم وغیرہ الماری میں رکھتی تھیں۔ دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ میں نے الماری میں رکھی صندوقچی کھول کر دیکھی۔ انہوں نے جو زیور میرے لیے بنوایا تھا۔ سب غائب تھا۔ رقم بھی نہیں تھی۔ یہ سب دیکھ کر میرا دماغ چکرا گیا۔ تاہم خود کو سنبھالا۔ پھر ایس ایچ او کے پاس آگیا۔ اسے صورت حال سے آگاہ کردیا۔

☆......☆

چوہدری کامران روایتی پولیس والوں جیسا نہیں تھا۔ اس نے تحمل اور توجہ سے میری بات سنی۔ سامان کی فہرست بنائی۔ کچھ مزید پوچھ گچھ کی۔ اس کے بعد اپنے ماتحت اہلکاروں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ میں نے ان کے جانے کے بعد حنا کا نمبر ملا لیا۔ دو تین بار کوشش کی۔ تاہم اس نے کال ریسیو نہ کی۔ مایوس ہوکر موبائل جیب میں ڈال لیا۔ اس کے بعد کچن میں چلا گیا۔ چائے بنا کر کیک پلیٹ میں رکھے اور امی کے کمرے میں آگیا۔ ٹھیک دس منٹ بعد اسپتال جانے کی تیاری کررہا تھا کہ حنا کی کال آگئی۔

رسمی سلام دعا کے بعد اسے ساری صورت حال بتا دی۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی، پھر بولی۔ "شانی! تم فکر مت کرو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "بس تم امی جان کا خیال رکھو۔"

یہ حقیقت ہے۔ غم کی گھڑی میں کسی اپنے کا ساتھ اور تسلی کے دو بول بہت حوصلہ دیتے ہیں۔ "بہت شکریہ حنا۔ اب میں اسپتال جا رہا ہوں۔ پھر بات کریں گے۔"

رابطہ منقطع ہوگیا۔ میں نے موبائل کی اسکرین دیکھی۔ موبائل کی بیٹری لو ہوگئی تھی۔ میں نے ایک اضافی بیٹری رکھی ہوئی تھی۔ وہ لگالی۔ پھر بائیک نکالی۔ گیٹ بند کیا اور اسپتال کی جانب روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچ کر بائیک پارکنگ میں کھڑی کی۔ ٹوکن لے کر عمارت میں داخل ہوگیا۔

اگلے چند منٹوں بعد میں امی کے پاس تھا۔ ایک نرس ان کے بازو کی نس میں انجکشن لگا رہی تھی۔ امی کی نظر مجھ پر پڑی۔ ان کے ہونٹوں پر آسودہ مسکراہٹ ابھری۔ میں بھی مسکرا دیا۔ نرس انجکشن لگا کر دوسری مریضہ کی طرف بڑھ گئی۔ میں بیڈ کے قریب پڑے بنچ پر بیٹھ گیا۔ ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا، بولا۔ "ماں جی۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"اب میں ٹھیک ہوں بیٹا۔ رات نجانے کیا ہوگیا تھا۔ صبح آنکھ کھلی تو خود کو ادھر پایا۔"

وہ وارڈ کے دوسرے مریضوں کو دیکھنے لگی۔ "اچھا تم کہاں تھے۔ ناشتا کرلیا؟"

انھیں شاید میری غیر موجودگی کا خیال آگیا تھا۔ میری ماں بہت باہمت عورت تھی۔ انھیں خود سے بھی زیادہ میری فکر رہتی تھی۔

"ماں جی۔ میں گھر گیا تھا۔ وہیں ہلکا پھلکا ناشتا کرلیا ہے۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

ان کی طبیعت کے پیش نظر چاہتے ہوئے بھی ڈکیتی کا نہ بتا سکا۔ وہ فکرمند ہوجاتیں۔

"اچھا میں آپ کے لیے کچھ لے کر آتا ہوں۔"

یہ بتا کر کھڑا ہوگیا۔ ناشتا لینے باہر چلا گیا۔ پھر ہم نے اکٹھے ناشتہ کیا۔ امی نے صرف چائے کے کپ اور بریڈ پر اکتفا کیا۔ ناشتا کرتے وقت ذہن ڈکیتی کی واردات میں الجھا رہا۔ تاہم میں نہیں جانتا تھا۔ وہم و گماں میں بھی نہ تھا کہ ایک بڑی واردات ہونے والی ہے۔ جس سے زندگی میں بھونچال آجائے گا۔ انسان ہمیشہ آنے والے وقت سے بے خبر ہوتا ہے۔

☆......☆

سی ایم ایچ میں آئے چوتھا دن تھا۔ امی کی طبیعت کافی بہتر ہوگئی۔ ڈاکٹر نے صبح ڈسچارج کا کہہ دیا تھا۔ اس دوران حنا دو بار آئی۔ کچھ ساتھی اسٹوڈنٹس بھی چکر لگا گئے۔ جن میں واجد

Downloaded From http://paksociety.com

بھی شامل تھا۔ میں نے حنا کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ حتیٰ کہ اتنا تک کہا کہ گھر میں اب کوئی قیمتی چیز باقی نہیں بچی۔

یہ بھی شکر تھا کہ جس رات امی کو اسپتال لایا۔ اس وقت کچھ رقم گھر سے لے لی۔ جو اب کام آرہی تھی۔ ورنہ اس رقم سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے۔

پانچویں دن امی کو ڈسچارج کیا گیا۔ میں انھیں گھر لے آیا۔ بائیک صبح ہی گھر چھوڑ گیا تھا۔ اس شام انھیں میں نے سب بتادیا۔

وہ چپ چاپ سنتی رہیں۔ آخر میں بولیں۔ ''بیٹا اللہ ہمیں بہت دے گا۔ تم دل چھوٹا مت کرو۔'' لمحاتی توقف کے بعد کہا۔ ''اگر ہم گھر میں ہوتے تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ ڈاکو جان لیتے وقت کب دیکھتے ہیں بھلا؟''

ہم کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر میں نے کھانا بنایا۔ کھانا کھا کر ہم سو گئے۔

اگلے دن میں گھر ہی رہا۔ اگلی صبح میں یونیورسٹی چلا گیا۔ حنا سے ملاقات ہوئی۔ اس نے امی کی خیریت پوچھی۔ میں نے بتادیا کہ اب طبیعت بہتر ہے۔

دن گزرتے گئے۔ آخر ایگزام قریب آگئے۔ میں پیپرز کی تیاری کرنے لگا۔ امی بھی بالکل صحت یاب ہوگئیں۔ اس دوران حنا نے رابطہ کم کر دیا۔ جب میں نے وجہ پوچھی تو پیپرز کا بتا دیا۔ میں چپ ہو گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ امتحان کے بعد امی کو ان کے ہاں بھیجوں گا۔

پیپر شروع ہو گئے۔ اس دن میرا آخری پیپر تھا۔ میں پیپر دے کر کمرے سے باہر آکر گراؤنڈ میں اپنے کلاس فیلوز سے گپ شپ لگانے لگا۔ اس دوران میری نظر حنا پر پڑی۔ وہ ایک لڑکے کے ساتھ بیرونی گیٹ کی طرف جارہی تھی۔ میں چونک گیا۔ کیونکہ اس لڑکے کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بھی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ اپنی گاڑی پر آتا تھا۔ وہ دونوں پارکنگ میں گئے۔ گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ میں نے حنا کو کال کی۔ اس نے کاٹ دی۔

میں بار بار کال کرتا رہا۔ آخر اس نے نمبر بند کر دیا۔ یہ نہ سمجھ آنے والی بات تھی۔ اس سے قبل ایسا ہرگز نہیں ہوا تھا۔ میں یونیورسٹی سے گھر آگیا۔

اس رات میں نے حنا کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کرلی، بولی۔ ''شانی تم بچوں جیسی حرکتیں کیوں کرتے ہو؟ دن کو مجھے تمہاری وجہ سے موبائل آف کرنا پڑا۔ بندہ خود سمجھ جاتا ہے کہ کوئی مسئلہ ہوگا۔''

وہ نان اسٹاپ بولتی چلی گئی۔ میں سنتا رہا۔ جب وہ خاموش ہوئی تو میں نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

''اچھا مجھ سے غلطی ہوگئی۔ آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔''

چونکہ اس کا موڈ اچھا خاصا بگڑا ہوا تھا۔ میں منانے لگا۔ ''پھر آج کیوں کیا ایسا؟''

مجھے لگا کہ وہ بات ختم کر دے گی۔ لیکن وہ بات کو طول دینے کے موڈ میں تھی۔ میں نے محسوس کر لیا۔

''تم خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا رہی ہو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر بات کو مزید آگے بڑھایا۔

''تمہارے دل میں جو بھی بات ہے۔ مجھے صاف صاف بتادو۔''

''میرے دل میں کچھ بھی نہیں۔ اگر ہے بھی تو بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ اب میں مزید بات نہیں کرسکتی۔ تم ایسا کرو کہ کل عصر کے بعد ناصر باغ آجانا۔''

یہ کہہ کر اس نے کال کاٹ دی۔ میں بیڈ پر لیٹا اس کے بدلے ہوئے لہجے پر سوچنے لگا۔ رات بھی سوتے جاگتے گزری۔

اگلے دن میں بارہ بجے کے لگ بھگ گھر سے نکلا۔ کچھ وقت ایک دوست کے پاس گزارا اور عصر کے بعد ناصر باغ پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی آگئی۔ اس نے رسمی طور پر حال چال پوچھا۔ پھر اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ''شانی ہماری شادی بھی نہیں ہوسکتی۔ بہتر ہے تم مجھے بھول جاؤ۔''

''کک...... کیا۔''

''ہاں میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔

میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے کہیں سے بھی وہ حنا نہیں لگ رہی تھی جسے میں جانتا تھا۔ وہ جو مجھے اپنا سمجھتی تھی۔ لوگ کتنی جلدی بدل جاتے ہیں۔ پل میں تعلق اور رشتے توڑ دیتے ہیں۔ وہ بھی میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کی جھیل سی شفاف آنکھیں، جن میں ڈوبنے کو دل چاہتا تھا۔ جذبات و احساسات سے یکسر عاری نظر آئیں۔ ریشمی لٹیں حسبِ عادت اس کے چہرے پر ڈھلک آئی تھیں۔ وہ ہاتھ سے پیچھے ہٹانے لگی۔

''کیوں نہیں ہوسکتی حنا۔ آخر مجھ میں کیا کمی ہے؟'' میں نے بے تابی سے استفسار کیا۔

''شانی پتا نہیں تم کس دور میں جی رہے ہو؟ شکل و

Downloaded From http://paksociety.com

صورت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ جینے کے لیے دولت بھی بہت ضروری ہے۔تم کبھی میری خواہشیں، میرے خواب پورے نہیں کرسکو گے۔'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔

میرا دل کٹ سا گیا۔الفاظ نہیں گویا زہر میں بجھا خنجر تھا جو اس نے دل پر ماردیا۔میں نے التجا آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا۔وہ بولی۔''اب مجھے بھول جانا اور کبھی میسج کال مت کرنا۔اچھا اب میں چلتی ہوں۔''

پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی گئی۔میں اس کے دور جاتے قدموں کی چاپ سنتا رہا۔محبت کو دولت کے ترازو میں تولنے والی نے سب رشتے،وعدے توڑ دیے۔ہاں محبتوں کا تاج محل ریت کے گھروندے کی طرح ڈھے گیا تھا۔جانے سے پہلے اس نے ایک بار پلٹ کر دیکھا۔مگر وہ میرے چہرے پر کرب وغم کی پرچھائیاں نہیں دیکھ پائی۔اس کے جانے کے بعد میں کافی دیر سنگی بنچ پر گم صم بیٹھا رہا۔وہ لمحے یاد کرتا رہا۔جو ہم نے ایک دوسرے کے سنگ بتائے تھے۔اس کی قربت مجھے ہمیشہ اچھی لگی تھی۔پارک میں اکّادکّا لوگ تھے۔اچانک میرا دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔نجانے کتنی دیر روتا رہا۔وہ آنکھیں جن میں کسی کے خواب تھے۔عذاب بنے تو آنسوؤں کی صورت میں تعبیر ملی۔

دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوگیا۔میں اٹھا اور تھکے تھکے قدموں سے گیٹ کی طرف چل پڑا۔شام ہوچکی تھی۔دن بھر کا تھکا ہارا سورج دور مغربی افق میں ڈوب رہا تھا۔ڈوبتے سورج کو دیکھ کر مجھے یوں لگا۔جیسے میری زندگی کی خوشیوں کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہورہا ہے۔

پارک کے گیٹ کے ساتھ ایک پان سگریٹ والے کھوکھے پر میوزک بج رہا تھا۔

دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے
ہم وفا کرکے بھی تنہا رہ گئے

گانے کے بول بہت دور تک میرا پیچھا کرتے رہے۔میں ہارے ہوئے جواری کی طرح چلتا رہا۔

☆......☆

حنا سے آخری ملاقات کے بعد میں اپنے کمرے میں آکر دیر تک روتا رہا۔ماضی کی فلم میرے ذہن کی اسکرین پر چلتی رہی۔بچپن سے اب تک کے واقعات مجھے یاد آتے گئے۔میرے ابو نے مجھے جو بہت پہلے کہا۔وہ سب سچ ثابت ہوا۔یہ دنیا واقعی دولت والوں کی قدر کرتی ہے۔غریب ہونا شاید سب سے بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔

میں بکھر کر ریزہ ریزہ ہوگیا۔لوگ چلے جاتے ہیں۔لیکن یادیں رہ جاتی ہیں۔

وقت جیسے تیسے کٹتا رہا۔بی اے کا رزلٹ آگیا۔میں نے جاب کی تلاش شروع کردی۔کیونکہ آرمی میں نہیں جانا چاہتا تھا۔

اس دن بھی دفتروں میں خوار ہوکر شام کو گھر پہنچا۔حسب معمول امی نے گیٹ کھولا۔جب بائیک اندر لے آیا تو امی نے بتایا کہ مہمان آئے ہیں۔

میں نے بائیک کھڑی کی اور کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

کمرے میں ایک مرد اور لڑکی بیٹھے نظر آئے۔امی نے ان کا تعارف کروایا۔

مرد جس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔امی کا کزن حسن امین تھا۔ان کے ساتھ جو لڑکی تھی۔وہ ان کی بیٹی تھی۔یہ لوگ پہلے کراچی میں مقیم تھے۔کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر کراچی سے لاہور آگئے۔چونکہ انہوں نے ہمارا پرانا گھر دیکھا ہوا تھا۔وہاں گئے تو ابو کے ایک دوست نے انھیں ہماری موجودہ رہائش کا بتادیا۔وہ یہاں آگئے۔بعد ازاں پتا چلا کہ کراچی میں ان کے دو بیٹے دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔وہ اپنا بنگلا اور کپڑے کی دکان بیچ کر لاہور آگئے۔

ہم کافی دیر گپ شپ لگاتے رہے۔پھر میں اپنے کمرے میں آگیا۔

اگلی صبح ماموں حسن نے مجھے بلالیا۔

ہم چاروں کمرے میں موجود تھے۔انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ جاب کا خیال دل سے نکال دو اور آگے تعلیم جاری رکھو۔کافی دیر بحث ہوتی رہی آخر میں نے ہامی بھرلی۔مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ رات امی اور ان کی تفصیلی بات ہوئی تھی۔قصہ مختصر میں نے ان کے کہنے پر پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں داخلہ لے لیا۔میری تعلیم کا خرچا ماموں حسن نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔وہ الگ گھر لینا چاہتے تھے۔تاہم میں نے اور امی نے انہیں منع کردیا۔ماموں حسن نے یتیم خانہ چوک کی ایک مارکیٹ میں کپڑوں کی دکان بنالی۔میں نے دوبارہ پڑھائی شروع کردی۔

☆......☆

وقت کا پنچھی اڑتا رہا۔کتنے موسم بدلے۔مگر میرے دل کا موسم نہ بدلا۔ہمیشہ خزاں رسیدہ رہا۔شنید میں آیا کہ حنا نے ایک امیر زادے سے کورٹ میرج کرلی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

مجھے پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں جاتے چھ ماہ گزر گئے۔ میں ایل ایل بی کررہا تھا۔ یہ سب ماموں حسن کی خواہش تھی۔ وہ مجھے ایک کامیاب وکیل بنانا چاہتے تھے۔ ان کی دکان بھی خوب چل رہی تھی۔

ہمارے کرائے دار چلے گئے۔ ہم نے اوپر والا پورشن ان لوگوں کو دے دیا۔ تاہم ہمارا کھانا پینا اکٹھا رہا۔ رمشا نے کچن کا سارا کام اپنے ذمے لے لیا۔ وہ امی کو کوئی کام نہیں کرنے دیتی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ فی زمانہ ایسے رشتے ناپید ہو چکے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ میں آج اس مقام پر ہوں تو اس کی وجہ ماموں حسن اور رمشا ہی ہیں۔ اگر وہ ان دنوں مدد نہ کرتے تو آج میں کچھ بھی نہ ہوتا۔ میرا نام اور مقام ان کی مرہون منت ہیں۔ بلاشبہ اللہ بڑا کارساز ہے۔ وہ انسان کی غیب سے مدد فرما دیتا ہے۔

رمشا سارا دن گھر کا کام کرتی رہتی تھی۔ ہم ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی اجنبی تھے۔ ہماری بہت کم بات ہوتی تھی۔ ایک دو بار امی نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ رمشا کو اپنی بہو بنانا چاہتی تھی۔ تاہم میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چپ ہو جاتی تھیں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ کسی دن پھر رمشا کے حوالے سے بات لازمی ہوگی۔

کچھ لوگوں میں قدرتی صلاحیت ہوتی ہے۔ اگر آپ نہ بھی بتائیں۔ وہ آپ کا درد جان لیں گے۔ اس کا حل بھی نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رمشا بھی ایسی ہی تھی۔ وہ بھرپور جوان لڑکی تھی۔ اس کا شباب گویا کھلتا گلاب تھا۔ سروجیسا قد، تیکھے نین نقش۔ بڑی بڑی مسکراتی ہوئی پُرکشش آنکھیں۔ جن میں کوئی تو ایسی بات تھی کہ دیکھ کر پھر دیکھنے کو دل چاہتا تھا۔ جب وہ بولتی تو میں بے اختیار ہو کر کان لگا کر اس کی آواز کی سمت ساعتیں مرکوز کر دیتا۔ جب میں کمرے میں ہوتا۔ وہ صحن میں امی کے ساتھ گپ شپ لگاتی رہتی۔ ویسے بھی ان کا بہت خیال رکھتی تھی۔ میں محبت کا مقدمہ ہارا ہوا انسان کمرے میں اکیلا لیٹا، عذاب تنہائی کا درد سہتا رہتا۔ حالانکہ گلابی گالوں والی رمشا اسی کوشش میں رہتی کہ میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کیا کروں۔ مگر ایک بار کہنے کے بعد میرا ردیہ دیکھ کر اس نے دوبارہ جسارت نہ کی۔

محبت کے لگے زخم ناسور بن جاتے ہیں۔ زخم دینے والے پل پل یاد آتے ہیں اور بہت یاد آتے ہیں۔ بیتے لمحے ہر آن اپنے ہونے کا، کھونے کا احساس دلاتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان زخموں پر کسی اور کی محبت کا مرہم اکسیر ثابت ہوتا ہے۔ دل میں جینے کی تمنا جاگ اٹھتی ہے۔ عورت اللہ پاک کی بہت پیاری تخلیق ہے۔ یہ مرد کو جب اپنی محبت کے حصار میں قید کر لے۔ سب غم بھلا دیتی ہے۔ دل پر جو حنا نے زخم لگائے ناسور بن چکے تھے۔ میں رات کو جب بیتے لمحے یاد کرتا تو آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔

وہ فروری کی ایک سرد رات تھی۔ میں اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ ہاں یہ وہی راتیں تھیں۔ وہی موسم تھا۔ میں جب اور حنا کال پر لمبی گفتگو کیا کرتے تھے۔ مستقبل کی باتیں، ایک ہونے کی باتیں۔۔۔ اس کے ساتھ گزرا اک اک لمحہ بے طرح یاد آنے لگا۔ اک عجیب سی کیفیت دل پر طاری ہو گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پھر میں سسک سسک کر رونے لگا۔ نجانے کتنی دیر روتا رہا۔ اچانک کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں تڑپ کر اٹھا۔ کمرے میں زیرو پاور بلب کی روشنی اندھیرے سے نبرد آزما تھی۔

کمرے کے وسط میں رمشا کھڑی تھی۔ میں بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھنے لگا۔

مجھ سے غلطی ہو چکی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر خاموش رہی، پھر بولی۔

''میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟'' پھر میرے کندھے پر ہاتھ دیا۔ ''رونے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ آنکھوں سے آنسو بلاوجہ نہیں بہتے۔ تاہم ایک بات یاد رکھیں کہ جو لوگ خود ہمارے ساتھ نہ رہنا چاہتے ہوں۔ ان کی یادوں میں رو رو کر خود کو ہلکان نہیں کرنا چاہیے۔''

میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''ہمیں بس اتنا سمجھنا چاہیے کہ وہ لوگ اس قابل ہی نہ تھے کہ ہماری زندگی میں شامل ہو سکیں۔''

اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے بکھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''رمشا! ایسی بات نہیں۔ بس ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ خود کو ان کے قابل بنا لیں۔''

''میں گھما پھرا کر بات نہیں کروں گی۔ پھپھو نے مجھے سب بتا دیا ہے۔ حنا دولت کی پجاری تھی۔ اس کی نظر میں رشتوں سے زیادہ دولت اہم تھی۔'' وہ لمحہ بھر رکی۔ پھر گویا ہوئی۔ ''میں کہتی ہوں کہ وہ آپ کے قابل نہ تھی۔'' آخر میں اس کا لہجہ تلخ

Downloaded From http://paksociety.com

ہو گیا تھا۔

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ دروازے کی جانب بڑھی پھر واپس پلٹ آئی۔ ''پھپھو آپ کی وجہ سے پریشان رہتی ہیں۔ ان کے بارے میں بھی سوچ لیا کریں۔''

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں بیڈ سے اٹھا اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔ میں خیالوں کے لامتناہی سلسلوں میں کھو گیا۔ پھر سوچتے سوچتے سو گیا۔

☆......☆

اگلی صبح جاگا تو یونیورسٹی چلا گیا۔ جب واپس آیا تو سیدھا امی کے پاس آیا۔ رمشا کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ رات والی بات اثر کر گئی ہے۔ حقیقت میں بھی ایسا ہی تھا۔ میں کافی دیر گپ شپ لگاتا رہا۔ اب میرا روز کا معمول بن گیا۔ جب واپس آتا تو کچھ دیر امی کے پاس بیٹھتا یا پھر ماموں کی شاپ پر چلا جاتا۔ سب اس تبدیلی کی وجہ سے خوش ہو گئے۔

دن گزرتے گئے۔ حنا سے جدا ہوئے دو سال بیت گئے تھے۔ یونیورسٹی میں میرا آخری سال شروع ہونے والا تھا۔

ایک تحقیق سے یہ دلچسپ حقیقت سامنے آئی ہے کہ پوتے پوتیوں سے پیار کرنے کا جذبہ صرف انسانوں میں ہی نہیں پایا جاتا بلکہ کچھ جانور بھی ایسی ہی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ ہاتھیوں کے ریوڑ میں مادہ ہاتھی اپنے بچے کی حفاظت کا خاص خیال رکھتی ہے مگر بیشتر اوقات ماں باپ کی بے توجہی سے ہاتھیوں کے اکثر بچے سن بلوغت تک پہنچنے سے پہلے مر جاتے ہیں۔ سری لنکا کی حکومت نے ہاتھیوں کے ایسے لاوارث بچوں کے لیے کولمبو سے چند میل دور پانچ سوا ایکڑ زمین پر ایک ''یتیم خانہ'' قائم کر رکھا ہے جہاں ہاتھیوں کے ایسے لاوارث بچوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے جنہیں ان کے ماں باپ چھوڑ چکے ہوں۔ اب یہ پتا چلا ہے کہ اگر ریوڑ میں بوڑھی مادہ ہتھنی موجود ہو تو وہ اپنے پوتے ہاتھیوں کا خاص خیال رکھتی ہے۔ ایسے نوعمر ہاتھیوں کے لیے جن کی دادی زندہ ہو اور ریوڑ میں موجود ہو زندہ رہنے کے مواقع بڑھ جاتے ہیں۔

مرسلہ: عنایت چشتی، کراچی

ایک رات امی نے اپنے کمرے میں بلا لیا اور پھر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ اب کی بار میں انکار نہ کر سکا۔

پھر انہوں نے ماموں حسن سے بات کی۔ وہ بھی مان گئے۔ ایک ماہ بعد رمشا اور میری شادی ہو گئی۔

میں نے تعلیم جاری رکھی۔ آخر میں نے ایل ایل بی کر لیا۔ اس دوران اللہ نے دو خوشیاں عطا کر دیں۔ ایک تو میں نے اپنی پریکٹس کا آغاز کر دیا۔ دوسری خوشی ایک چاند سے بیٹے کا باپ بن گیا۔ ہم نے جی بھر کر خوشیاں منائیں۔

وہ کہتے ہیں نا کہ خوشیوں کی عمر کم ہوتی ہے۔ کچھ ایسا ہی ہمارے ساتھ ہوا۔ ایک سال کے وقفے سے ماموں اور امی کی اموات نے مجھے توڑ دیا۔ یہی حال رمشا کا تھا۔ بہرکیف اللہ پاک اگر دکھ دیتا ہے تو اس کا مداوا بھی کر دیتا ہے۔ ماموں کی وفات کے سات ماہ بعد اللہ نے ہمیں جڑواں بیٹا اور بیٹی عطا کر دیے۔ زندگی پھر اپنی ڈگر پر چلنے لگی۔

میں نے لاہور ہائی کورٹ میں اپنا چیمبر بنا لیا۔ رمشا نے مجھے بہت سہارا دیا۔ اللہ نے اولاد سے بھی نواز دیا۔ یوں میری زندگی مکمل ہو گئی۔ اب دنیا کی ہر آسائش میرے پاس تھی۔ ہمارے پڑوسی جب گھر بیچنے لگے تو میں نے خرید لیا۔ پھر دونوں گھروں کو گرا کر خوبصورت کوٹھی بنا لی۔ نئی گاڑی بھی لے لی۔ میں غریب لوگوں کے کیس فری لینے لگا۔ حنا سے بچھڑے ہوئے چھ سال ہو چکے تھے۔ اب ماضی ایک خواب بن گیا۔ تاہم کبھی کبھی میرے ذہن میں ایک خیال شدت سے آتا۔ اگر حنا کہیں مل جائے تو اسے دکھاؤں کہ وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ اگر ڈکیتی ہوئی اور وہ سب کچھ واپس بھی نہیں ملا۔ پھر بھی اللہ نے سب کچھ دے دیا ہے۔ زندگی میں کسی چیز کی بھی کمی نہیں۔

☆---☆---☆

وہ موسم بہار کی ایک روشن صبح تھی۔ میں نے گاڑی اپنے چیمبر کے باہر کھڑی کی۔ میرا کلرک ممتاز محمود گاڑی کی آواز سن کر باہر آ گیا۔ میں نے چابی اسے دے دی۔ وہ گاڑی کو پارکنگ میں کھڑی کرنے چلا گیا۔ میں دفتر میں آ کر اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ گاڑی کھڑی کر کے آ گیا۔ اس نے آتے ہی دن کے مقدموں کی تفصیل بتانی شروع کر دی۔

Downloaded From http://paksociety.com

اسی اثنا میں دوسرے دو کلرک بھی آ گئے۔

ہم تینوں عدالت کی طرف چل پڑے۔

میرے مؤکل زیادہ تر متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔یا ایسے لوگ جو بہت زیادہ فیس ادا نہیں کر سکتے۔ان کے اکثر مسائل چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔لیکن ان بیچاروں کے لیے یہ جینے مرنے کے معاملے ہوتے ہیں۔ایسے لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے مقدمات کوئی اچھا اور تجربہ کار وکیل لڑے۔مگر اچھے اور تجربہ کار وکلاء فیس اتنی مانگتے جو ان سائلین کے بس سے باہر ہوتی ہے۔لیکن میں ایسے لوگوں سے فیس بہت کم لیتا ہوں۔اگر مجھے لگے کہ سائل واقعی غریب بندہ ہے تو اس سے صرف خرچا لے لیتا ہوں۔اس حوالے سے میری اچھی خاصی شہرت ہے۔میں سارا دن کیس نمٹاتا رہا۔آخری کیس جو کہ فوجداری تھا۔اس دن گواہوں کے بیان ہوئے۔میں تھک سا گیا تھا۔

سیشن کورٹ سے فارغ ہو کر چیمبر میں آ گیا۔ممتاز کے پاس ایک عورت بیٹھی تھی۔جس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔وہ حنا تھی۔اس نے بھی مجھے پہچان لیا۔وہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔میں نے ممتاز کو چائے لانے کا کہا۔وہ چلا گیا۔ہم دونوں چیمبر میں اکیلے رہ گئے۔

”شانی۔“ وہ ہولے سے بولی۔

”ہاں میں ذیشان حیدر ہوں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔نجانے کیوں اس لمحے مجھے اس کا شانی کہہ کر مخاطب کرنا اچھا نہ لگا۔وہ چپ چاپ میری طرف دیکھتی رہی۔اچانک پھوٹ کر رونے لگی۔میں پریشان ہو گیا۔اسے دلاسہ دیا تو وہ چپ ہو گئی۔اسی اثنا میں ممتاز چائے لے آیا اور کسی کام سے باہر چلا گیا۔پھر میرے پوچھے بغیر وہ بتانے لگی۔

”شانی! میں نے آپ کو صرف اس وجہ سے چھوڑا کہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔لیکن میں غلط تھی۔مجھے دولت مند شوہر چاہیے تھا۔اس دوران میرا رابطہ کالج کے ایک امیر زادے باسط سے ہو گیا۔میں نے گھر والوں کی مخالفت کے باوجود اس سے کورٹ میرج کر لی۔وہ اپنے بنگلے پر لے گیا۔تاہم اس کے گھر والوں نے مجھے قبول نہ کیا۔ہم نے ایک سال کرائے کی کوٹھی میں گزارا۔شادی کے ایک سال بعد اس نے طلاق دے دی۔میں اپنے ماں باپ کے گھر بھی نہیں جا سکتی تھی۔میں اپنی ایک سہیلی کے گھر آ گئی۔تین ماہ ان کے گھر رہی۔پھر اس کے کہنے پر ایک سبزی فروش سے نکاح کر لیا۔نکاح کے ایک سال بعد اللہ نے ایک بیٹا عطا کیا۔زندگی اچھی گزرنے لگی۔لیکن میں پچھتاتی رہی۔چھ ماہ قبل میرے شوہر کی ڈیتھ ہو گئی۔ہم ماں بیٹا جیسے تیسے زندگی گزار رہے تھے۔اب میرے شوہر کے بھائی نے گھر سے نکال دیا ہے۔حالانکہ وہ گھر میرے شوہر کی ملکیت ہے۔اب میں ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتی ہوں اور ہم دونوں ماں بیٹا اپنی اسی سہیلی کے گھر رہتے ہیں۔اس کے شوہر نے ہی آپ کا بتایا تھا۔“

باتوں باتوں میں ہم نے چائے پی لی۔یہ سب سن کر میں نے اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔تاہم خود کو یہ کہنے سے نہ روک پایا۔”حنا چڑھتے سورج اور دولت کے پجاری یہ بھول جاتے ہیں کہ کبھی سورج سر پہ سایہ نہیں کرتا۔دولت ڈھلتے سائے جیسی ہوتی ہے۔ایسا سایہ جو تادیر ایک جگہ نہیں رک پاتا۔“

وہ یہ سن کر پھر رونے لگی۔تاہم میں نے اسے حوصلہ دینا ضروری سمجھا،بولا۔”بس اب چپ ہو جاؤ۔میں ہوں نا۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

پھر اس سے گھر کے کاغذات،نکاح نامہ اور شناختی کارڈ لے لیے۔انھیں بغور پڑھا۔وہ گھر حنا کے شوہر عابد کی ملکیت تھا۔وہ اس کی منکوحہ تھی۔یہ سیدھا سادا اور آسان کیس تھا۔میں نے وکالت نامے پر اس کے دستخط کروا لیے اور دو دن بعد آنے کا کہہ دیا۔

”اچھا اب میں چلتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی۔پھر اپنے چار سالہ بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

”چلو شانی بیٹا۔اب گھر چلتے ہیں۔“

میں چونک گیا۔اس نے بھی محسوس کر لیا۔”ہاں میں نے اپنے بیٹے کا نام ذیشان رکھا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔میں ایک بار پھر ماضی میں کھو گیا۔

اگلے دن میں نے حنا کی طرف سے کیس دائر کر دیا۔مقدمہ چلتا رہا اور فیصلہ اس کے حق میں ہو گیا۔اس دوران میں نے بھی ایک فیصلہ کر لیا۔حنا سے بات کی تو وہ بھی مان گئی۔کیسے مانی؟ یہ الگ کہانی ہے۔

آج کل وہ ہنسی خوشی اپنے گھر میں رہ رہی ہے۔میرا کلرک ممتاز محمود اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔کیونکہ وہ اس کی بیوی ہے۔

میرا یہ فیصلہ یقیناً آپ سب کو بھی اچھا لگے گا۔

Downloaded From http://paksociety.com

”چاچا، انور غائب ہے آپ عباسی اسپتال آجاؤ۔“رات 12 بجے کی اس کال نے مجھے چونکا دیا۔میرے ایک مرحوم دوست اکبر اعوان کے بیٹے اکرم کا فون تھا۔

میں نے تفصیل پوچھی تو اس نے کہا چاچا بس عباسی اسپتال پہنچ جاؤ باقی بات وہاں ہوگی۔

عباسی اسپتال میں وہ مجھ سے پہلے پہنچا۔

”انور نے رات 8 بجے میسج کیا تھا کہ ابو میں آفس سے

اس ہاتھ دے

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

داناؤں کا کہنا ہے کہ کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ لوگ اس محاورے کو بیان تو کرتے ہیں لیکن اس پر عمل نہیں کرتے۔ اس واقعے سے جسے میں نے کہانی کی شکل میں بیان کیا ہے آپ خود دیکھ لیں کہ یہ محاورہ کتنا صحیح ہے۔

شمیم الدین غوری

(کراچی)

Downloaded From http://paksociety.com

نکل رہا ہوں۔ایک گھنٹے کا راستہ ہے۔ میں نے ساڑھے نو بجے فون کیا تو اس نے فون کاٹ دیا۔ جب سے اب تک فون بند ہے۔ آفس کے ساتھیوں کو فون کیا تو سب نے کہا کہ وہ تو 8 بجے نکل گیا تھا بائیک پر۔اس کے ساتھ مائیکل بھی تھا۔ مائیکل کا فون بھی بند تھا۔ کچھ جاننے والوں کو سول بھیجا ہے۔ کچھ کو جناح بھیجا ہے۔ میں یہاں عباسی میں دیکھ چکا ہوں۔اب کیا کریں چاچا؟''

''بیٹا چلو نزدیک کے تھانوں میں پتا کرتے ہیں۔''

آدھی رات کا وقت تھا زیادہ تر دکانیں بند تھیں۔ چند ہی کھلی تھیں، وہ بھی خالی خالی سی تھیں۔بس اسٹاپ خالی تھے۔جو بھی سڑک پر نظر آتا گیا اس سے پوچھتے گئے کہ بھائی یہاں کوئی ایکسیڈنٹ تو نہیں ہوا۔راستے کے تھانوں سے بھی پتا کررہے تھے۔

ایک تھانے میں گئے اور ایک منشی سے پوچھا۔''بھائی صاحب ایک لڑکا آفس سے نکل کر اس راستے گھر آرہا تھا ابھی تک نہیں پہنچا۔خدانخواستہ اس علاقے میں کوئی حادثہ تو نہیں ہوا؟''

اس نے کہا۔''آپ لوگ بیٹھیے میں وائرلیس پر پورے تھانوں میں اطلاع کرتا ہوں۔''اس نے اپنا نمبر دیا اور ہمارا نمبر لے لیا۔صبح کے 6 بجے اس ایک پھول والے کا فون آیا کہ سول اسپتال چلے جاؤ۔وہاں پہنچے۔تو سول والوں نے بتایا کہ ایک لاش آئی تھی یہ اس کا فوٹو ہے۔دیکھا تو انور ہی کا فوٹو تھا۔انہوں نے ایک پرچہ بنا کر دیا کہ آپ لوگ ایدھی سینٹر سہراب گوٹھ چلے جائیں۔یہ پرچہ دکھا کر آپ کو لاش مل جائے گی۔

سب کو خبر کی کہ انور اب اس دنیا میں نہیں۔ہمارے پہنچنے سے پہلے قریب کے لوگ ایدھی سینٹر پہنچ چکے تھے۔

اکرم کا کیا حال بتاؤں کہ کیا تھا۔ایدھی کی چادر میں لپٹی ہوئی خون آلود نوجوان بیٹے کی لاش دیکھ کر اس کے باپ کا کیا حال ہوگا، یہ لکھنے کے الفاظ دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہو سکتے۔ایمبولینس والے نے اسپتال والوں کو بتایا تھا کہ اس کا واٹر ٹینکر سے ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔رحیم آباد تھانے کا علاقہ ہے۔

دفتر کے تمام لڑکوں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔لڑکے ہم سے کہیں تیز ہوتے ہیں۔انہوں نے ٹینکر جا کر دیکھا، اس کے فوٹو لیے، بائیک کے فوٹو لیے، ٹینکر کے خون آلود پہیوں کی وڈیو بنائی۔انور کا خون جو زمین پر پڑا تھا اس کے فوٹو لیے۔ارد گرد جو لوگ اکٹھے تھے ان میں سے کچھ نے رات ایکسیڈنٹ دیکھا تھا ان سے نمبر لیے کہ بھائی جوان موت ہے اس کے باپ کو بتانا ہے کہ کیا ہوا ہے۔بچے کی دادی کو سعودیہ میں فون کر کے بتایا کہ یہ حادثہ ہوگیا ہے۔ان کا الگ برا حال ہوا سن کر۔ان کا تو یہ بہت ہی لاڈلا پوتا تھا۔

تمام رشتہ داروں میں کہرام مچ گیا۔دفتر میں خبر پہنچی تو سارے دفتر کے لوگ آگئے۔ساتھی لڑکیوں کا رو رو کر برا حال تھا۔

اکرم نے مجھے کہا''چاچا میں اسے گھر لا کر خود نہلاؤں گا۔نامعلوم ایدھی میں کیسے لوگ ہوں چرسی موالیوں سے اسے نہیں نہلا سکتا۔یا وہاں اجازت ہوگی تو خود نہلا دوں گا۔''

''بیٹا گیارہ بجنے والے ہیں۔صرف دو گھنٹے ظہر میں ہیں۔جو کرنا ہے جلدی کرو۔''

اسی وقت کوئی ہائی روف سے کوئی موٹر سائیکل سے ایدھی سینٹر پہنچا۔اکرم کو وہاں کا ماحول دل کو بھایا۔ بھلے لوگوں کو دیکھ کر وہیں نہلانے کا طے کیا۔اس نے عملے کی مدد سے اپنے بیٹے کو خود نہلایا، کفن پہنایا اور اسٹریچر پر رکھ کر ہال میں رکھ دیا۔ایمبولینس کا انتظار کرنے لگے۔ایک کے بعد ایک لاش کے لیے ایمبولینسیں لگ رہی تھیں،اتنی لاشیں ہوتی ہیں یہاں۔تھوڑی دیر بعد نمبر آگیا۔لاش کو ایمبولینس میں رکھا اور گھر کی جانب روانہ ہوئے۔راستے میں ٹریفک جام ملا۔محلے کی مسجد میں پہلے سے کہہ دیا تھا کہ ظہر میں جنازہ ہے۔امام صاحب نے نماز ختم ہونے کے بعد بھی لوگوں کو روک کر رکھا۔اللہ اللہ کر کے کسی نہ کسی طرح نماز کے چند منٹ بعد پہنچ گئے۔سارا بندوبست مکمل تھا۔نماز جنازہ پڑھادی گئی اور ساتھ خیریت کے تدفین کردی۔جنازے میں ہر ایک بزرگ بنا ہوا تھا۔رخ ادھر کرو، ادھر سے لاؤ، پہلے سر کی طرف سے سلیب رکھو، ادھر مٹی سے بند کرو،اِدھر یہ کرو اُدھر یہ کرو۔ہر ایک اپنی اپنی لن ترانی جھاڑ رہا تھا۔جنازے کا احترام تھا ورنہ جی چاہتا تھا کہ یہیں سب کو ڈانٹ کر چپ کرادوں۔شور مچا مچا کر شاید یہ ظاہر کررہے تھے کہ بڑے تجربہ کار ہیں۔بول بول کر اپنی حاضری یقینی کررہے تھے۔

انور پندرہ سال کا ایک انتہائی پیارا سا بچہ تھا۔میرے ایک جگری دوست جو اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں۔ان کے بیٹے اکرم کا بیٹا تھا۔میرے دوست اکبر نے اپنے بچوں کو میرے بارے میں نصیحت اور وصیت کی تھی کہ مجھے ساری عمر اپنا بڑا سمجھیں۔یہ تمام بھائی بہن واقعی مجھے اپنا بڑا، ہمدرد اور دوست

Downloaded From http://paksociety.com

سمجھتے ہیں۔ میرا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ اپنے تمام معاملات میں مجھے شامل بھی رکھتے ہیں اور چھوٹے بڑے معاملات میں میری بات بھی مانتے ہیں۔ انور کی ماں بچپن میں اللہ کو پیاری ہوگئی تھی۔ اس کو اکرم نے ماں اور باپ بن کر پالا تھا۔ دنیا بھر کے کہنے کے باوجود دوسری شادی نہیں کی تھی۔ انور دن میں ایک موبائل کمپنی میں کام کرتا اور پرائیویٹ طور پر اپنی تعلیم جاری رکھے ہوئے تھا۔ خوبصورتی اور نزاکت کی وجہ سے اپنے آفس میں بلبل کے نام سے مشہور تھا۔ باقاعدہ ملازم تو بالغ ہونے پر ہی ہوسکتا تھا لیکن اس کی فنی مہارت کی بدولت اسے آفس سے پندرہ ہزار روپے مل جاتے تھے۔ دو تین سال سے اپنے والد کی ہنڈا 125 چلا رہا تھا۔ اس کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے اس کے باپ نے اسے نئی 70 دلا دی تھی۔ نئی گاڑی لیے صرف دو دن ہوئے تھے کہ یہ حادثہ ہوگیا۔

اکرم نے اگلے دو دن تک میرا فون نہیں اٹھایا۔ گھر پر بھی نہیں تھا۔ اس کا اپنا گھر تو بند پڑا تھا۔ بھائی بہنوں کے گھر بھی نہیں تھا۔ اس کے بھائی نے بتایا کہ تدفین کے اگلے دن فجر میں مسجد میں تھا اس کے بعد سے اب تک نہیں آیا۔ سب پریشان تھے کہ دو دن سے کہاں ہے۔ اس کی والدہ کا کسی بھائی سے رابطہ ہوا تو انہوں نے بتایا کہ ان سے وہ رابطے میں ہے اور خیریت سے ہے۔ دو دن بعد بھائی کے گھر آیا اور دن بھر سوتا رہا۔ رات کو میرے پاس آیا۔

''بیٹا کہاں ہو؟ دو دن سے سارا گھر تمہیں تلاش کر رہا ہے۔''

''چاچا چائے بنواؤ۔''

''کیا ہوا تھا؟ کیسے یہ حادثہ ہوگیا۔''

''چاچا میں نے ساری معلومات کر لی ہیں۔ میں کسی ایک کو نہیں چھوڑوں گا۔ چاچا میں پہلے حادثے کی جگہ گیا۔ ابھی تک خون وہاں پڑا تھا۔ وہاں ایک لڑکا مل گیا جس نے بتایا۔'' اس جگہ پل کی ریلنگ کے پاس ایکسیڈنٹ ہوا، میں ادھر سامنے کی ریلنگ پر بیٹھا تھا۔ میرے ہاتھ میں بھری ہوئی سگریٹ تھی اس لیے میں یہاں سے اٹھا نہیں۔''

اس نے ٹینکر والی جگہ کھڑے ہوکر بتایا۔'' یہاں ٹینکر تھا سیدھے ہاتھ پر ایک بائیک والا تھا۔ وہ ٹکرا کر نیچے گرا اور زخمی ہوگیا۔ میں نے ایدھی ایمبولینس کو فون کر کے بلایا۔ وہ لڑکا کھڑا ہوا ٹینکر والے کو خوب گالیاں دیں اور وہ اپنی بائیک پر بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی کہ خوامخواہ ایمبولینس کو فون کیا۔ کافی دیر ہوگئی ٹینکر والا جا ہی نہیں رہا تھا مجمع جمع ہو گیا۔ میں بھی سگریٹ ختم کر کے ادھر گیا تو دیکھا دو لڑکے نیچے زمین پر بے ہوش پڑے ہیں مجھے ان کا پہلے پتا ہی نہیں تھا، ایک تو لگتا تھا کہ ختم ہوگیا ہے ایک زخمی تھا۔ ایمبولینس آگئی۔ جو زیادہ زخمی تھا لوگ اسے ایمبولینس میں ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈرائیور نے کہا اس میں تو سانس نہیں ہے، دوسرے کو ڈالو اس کو زیادہ ضرورت ہے اسپتال پہنچانے کی اور اس نے دوسری ایمبولینس کے لیے فون کر دیا۔ پہلی ایمبولینس کے جانے کے پانچ منٹ بعد دوسری ایمبولینس بھی آگئی اور دونوں کو اسپتال لے گئے۔''

''بائیک کون چلا رہا تھا۔''

''بڑا والا جس نے جینز کی پتلون اور لال شرٹ پہنی ہوئی تھی۔'' ایک اور لڑکے نے بتایا۔

''پیچھے والے نے کیا پہنا ہوا تھا۔''

''وہ نیلی شلوار قمیص میں تھا، وہ زیادہ زخمی تھا اور اس کا سر اور چہرہ بہت زیادہ زخمی تھا ایسا لگتا تھا کہ اس میں جان نہیں ہے۔''

''تم نے خود دیکھا کہ جینز والا چلا رہا تھا۔''

''ہاں ہاں میں نے دونوں کو بائیک کے نیچے سے نکالا تھا آگے بڑی عمر کا اور پیچھے چھوٹا بیٹھا تھا۔'' ایک اور بولا۔

اتنے میں چائے آگئی اور ہم چائے پینے لگے۔ میں نے رسمی دلاسے دیئے کہ اللہ آپ کو صبر دے، مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے وغیرہ۔

''ہاں چاچا یہ سب دنیا داری ہے۔ ہم بھی یہی سب کو کہتے رہے ہیں۔ اور کہنے کو ہوتا بھی کیا ہے۔ لیکن چاچا ان سب سے قطع نظر دل کو کوئی قرار نہیں آتا۔ نامعلوم کیوں یہ رسمی باتیں سن سن کر دل اور پریشان ہو جاتا ہے۔ چاچا آپ کی طبیعت میں جانتا ہوں اور دنیا میں میری عادت کو سمجھنے والا آپ سے زیادہ کوئی نہیں اس لیے جو بات دل میں ہے وہ کہہ دی۔ کسی اور کو یہ بات کہوں تو وہ یا تو مجھے پاگل سمجھے گا یا مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ چاچا بس صرف قرآن پڑھنے سے دل کو کچھ ڈھارس ہوتی ہے اور کسی بات سے کوئی صبر نہیں ہوتا۔ چاچا میرا بچہ چلا گیا میں کیا بتاؤں مجھے کسی پل قرار نہیں۔ میں اس کتے کے بچے ٹینکر ڈرائیور اور اس مائیکل کو نہیں چھوڑوں گا۔ انور تو بچہ ہے یہ مائیکل تو اس سے دس سال بڑا ہے کیوں اسے مجبور کر کے بائیک چلانے کا شوق پورا کیا، سالے کو چلانی نہیں آتی تھی تو چلائی کیوں؟ چاچا میں نے ساری معلومات نکال لی ہیں۔'' یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں

Downloaded From http://paksociety.com

میں آنسو آگئے۔ اتنا مضبوط آدمی جو دوسروں کو سہارا دیتا ہو، جو نہ کبھی پولیس سے ڈرا ہو نہ ڈاکوؤں سے ایک بار اس نے مسلح ڈاکو پکڑ لیا تھا۔ پراپرٹی اور رینٹ اے کار جیسا بزنس کرنے والا شخص بیٹے کے مرنے پر کیسا ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ مجھے بڑا افسوس ہو رہا تھا۔

"بیٹا تم نے بتایا نہیں کہ تم تھے کہاں۔"

"چاچا میں سارے سرے نکالتا پھر رہا تھا۔ حادثے کی جگہ میں شام سے صبح تک ساری رات رہا ہوں۔ کبھی کسی ٹھیلے والے کے پاس، کبھی کسی ہوٹل پر کبھی وہاں ایک مزار ہے جو رات بھر کھلا رہتا ہے وہاں رہا، غرض میں جتنی معلومات کرسکتا تھا وہ میں نے کیں۔ ایک ایک سے پوچھا اور لوگوں نے مجھ سے تعاون کیا۔ چاچا میں کہتا ہوں ابھی دنیا میں بہت ہمدردی باقی ہے۔ مجھے چائے بھی پلائی۔ جس جس کو معلوم تھا اس نے بات بتائی۔ جو اس حادثے کے وقت موجود تھے لوگوں نے ان کے گھروں میں لے جا کر مجھے ان سے ملوایا۔ انہوں نے اپنے گھروں میں آدھی رات کو بٹھا کر چائے بنوائی اور یہ جان کر کہ میں مرنے والے کا باپ ہوں جو جو تعاون ہو سکتا تھا وہ کیا بلکہ اس سے بڑھ کر کیا۔ ایک ایک بات پتا لگ گئی کہ حادثہ کیسے ہوا۔ چاچا یہ بچے اپنی سائیڈ پر چل رہے تھے ان کو ٹینکر نے اوور ٹیک کیا۔ سامنے سے ایک بائیک والا آگیا اسے بچانے کے لیے یہ کتے کا بچہ بائیں جانب ہو گیا، بچوں کو پل کی ریلنگ کی وجہ سے بچنے کی جگہ ہی نہ ملی اور اگر جگہ تھی بھی تو وہ مائیکل اناڑی تھا۔"

"بیٹا کوئی ایف آئی آر درج کرائی؟"

"چاچا میں مائیکل کے پاس آغا خان اسپتال ملنے گیا تھا۔ وہ کومے میں تھا۔ اس کے باپ بوٹا سے ملاقات ہوئی۔ اس کی جانب سے ایف آئی آر درج ہوئی ہے۔ اس سے میں نے پوچھا" بھائی کیا ہوا بیٹے کو۔"

"میرا بیٹا ڈیوٹی کر کے آرہا تھا ایک ٹینکر نے اس کو ٹکر ماردی۔ جب سے بیہوش ہے۔"

"لڑکا کس کی گاڑی پر تھا۔"

"پیدل تھا جی۔"

"پیدل؟ میں نے تو سنا ہے کہ وہ میرے بیٹے انور کی بائیک پر تھا؟ اور بائیک چلا رہا تھا۔"

"نہیں جی وہ تو پیدل تھا اور بائیک چلانی اسے نہیں آتی تھی۔"

"بیٹا کیا کام کرتا تھا۔"

"جی بیروزگار ہے دو بیٹے ہیں دونوں کا روزگار نہیں، میں غریب آدمی ہوں گٹر کھولتا ہوں۔"

میں نے اسے دھمکی دی۔" تو گٹر کھولتا ہے اور آغا خان میں علاج کرا رہا ہے۔ بتا کہ تو نے اس ایف آئی آر کو درج کرانے کے بعد کتنے پیسے لیے ہیں ٹرک والوں سے؟ دیکھ میرا بیٹا تیرے بیٹے نے مارا ہے۔ میرا بیٹا چھوٹا تھا۔ تیرے بیٹے نے بائیک چلانے کے شوق میں اس کو بائیک دینے پر مجبور کیا۔ تو کہتا ہے کہ وہ بیروزگار تھا۔ کیا وہ موبائل کمپنی کے دفتر میں کام نہیں کرتا تھا موبائل کے آفس میں اس کا نام نہیں۔ بوٹا کیوں جھوٹ پہ جھوٹ بولے چلا جا رہا ہے۔ سچ بتا تو نے ایف آئی آر میں میرے بیٹے کا نام کیوں نہیں لکھوایا۔ تو نے کتنے پیسے لیے ہیں ٹرک والے سے۔ دیکھ اگر تو پولیس اور ٹرک والے سے ملا ہوا ہے تو میں تیرے بیٹے کو چھوڑوں گا نہیں۔ اور تجھے بھی غلط بیانی پر اندر کراؤں گا۔ یا تو تو میرا ساتھ دے یا پھر تو تیار ہو جا تجھے بھی میں اندر کراتا ہوں۔"

اس دھمکی نے کام کیا اور وہ یوں گویا ہوا۔" صاحب میں تو غریب آدمی ہوں جو مجھے تھانیدار نے کہا میں نے سن لیا اور سائن کر دیئے۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ کے بیٹے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور میرا بیٹا پیدل تھا۔ اگر ایسا کہو گے تو تمہارے بیٹے کا علاج ٹرک والا اچھے سے اچھے اسپتال میں کرا دے گا اور اگر کہو گے کہ وہ بائیک پر تھا اور بائیک کے پیچھے والا مر گیا ہے تو پھر جاؤ اپنے بیٹے کا علاج سول اسپتال سے کرالو تمہارے بیٹے کے پاس لائسنس بھی نہیں ہے۔ وہ اندر ہو جائے گا۔"

"چاچا میں بوٹے کو اصل بیان پر پکا کر کے یسوع مسیح کی قسم لے کر تھانے آیا۔ تھانیدار کو بتایا کہ میں انور کا باپ ہوں۔ اس نے بڑے افسوس کا اظہار کیا اور کہا۔ نامعلوم کون اس پھول سے بچے کو مار گیا۔ اللہ اس کا بیڑا غرق کرے۔ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں کہ بھاگنے والی گاڑی کا پتا لگا لیں۔ انشا اللہ جلدی پکڑ میں آجائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔

"چاچا اس نے مگر مچھ کے آنسو بہانے میں بڑی اداکاری سے کام لیا۔ میں نے ساری بات بڑے تحمل سے سنی اور کہا۔" دیکھ تو میانوالی کا ہے، ٹرک کا مالک میانوالی اور ٹرک ڈرائیور بھی میانوالی ہے۔ تو نے ایف آئی آر سب سے کمزور آدمی کے نام سے کاٹی۔ اب میرا بچہ مرا تھا مجھے مدعی بننا تھا۔ تو نے اپنے میانوالی ہونے کے ناتے میرے بچے کی ایف آئی آر کاٹنے کی بجائے بوٹے کو پڑھایا کہ میرے بیٹے کے نام کو

Downloaded From http://paksociety.com

ہی گول کر دیا جائے۔ اس کے بیٹے کو پیدل دکھایا جائے اور میرے بیٹے کے لیے نامعلوم گاڑی کی ٹکر۔ تجھے تو میں دیکھ لوں گا۔ بے ایمان رشوت خور تیرے تو میں سارے بل نکال کر نوکری سے نکلواتا ہوں۔ میرے پاس بوٹے سمیت محلے کے لوگ اور ایمبولینس ڈرائیور بھی گواہ ہیں۔ صبح تک ٹرک اور موٹر سائیکل حادثے کی جگہ پر کھڑے تھے اور اب نامعلوم ہو گئے۔ شاہ جی میرے پاس جس ٹرک کو تو نے رشوت لے کر چھوڑا ہے اس کے فوٹو اور وڈیو ہے کس کس چیز کو چھپائے گا تو۔ ابھی تو میں جا رہا ہوں لیکن یہ سمجھ لے کہ میں اخبار کا کرائم رپورٹر ہوں اور تیرے جیسوں کو اخبار میں ننگا کرتا ہوں۔ دوبارہ آؤں گا اور ایف آئی آر میری مرضی سے کٹے گی۔ شاہ جی ہم مجسٹریٹوں کو نکیل ڈالتے ہیں تو ہے کیا چیز۔ ایسا نہ ہو کہ ساری تفصیل کرائم زون کے اگلے شمارے میں تیری داستان تیرے اور ٹرک کے فوٹوز کے ساتھ چھپ جائے انسان بن اور اپنی نوکری بچا۔''

میں انور کی بات انہماک سے سنتا رہا۔ آخر اس کے دل پر لگی ہوئی تھی۔ ''چاچا میں ایمبولینس کے دونوں ڈرائیوروں سے ملا۔ انہوں نے تصدیق کی کہ کیا ہوا تھا۔ کس طرح ایک ڈرائیور نے دوسری ایمبولینس ایک ہی حادثے میں بلائی۔ ان کے نمبر لیے اور سول اسپتال چلا گیا۔ چاچا مجھے کسی پل چین نہ تھا۔ میں نے ایمرجنسی میں پوچھا کہ میں 12 بجے رات یہاں آیا اور آپ نے مجھے ٹرخا دیا۔ مجھے کیوں نہیں بتایا کہ میرا بیٹا حادثے میں یہاں آیا ہے۔ میں گرم ہوا کچھ گالیاں بھی دیں۔ اس پر انہوں نے بتایا کہ آپ کو بتایا تھا کہ ایک زخمی آیا ہے آپ نے اسے دیکھا بھی تھا، لیکن اسے آپ نہیں جانتے تھے۔ یہ درست ہے کہ جب آپ آئے اس وقت اس کی لاش مردہ خانے میں رکھی تھی لیکن میرے پاس ایمرجنسی میں زخمیوں کا اندراج ہوتا ہے، لاشوں کا ڈیپارٹمنٹ تو مردہ خانہ ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہاں کون کون اب تک آچکا ہے۔ اگر آپ وہاں جاتے تو پتا لگ جاتا۔''

ایک بار پھر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ پھر شروع ہوا، ''چاچا کیسی بے حسی اور کیسا انتظام ہے کہ بیٹے کی لاش اسپتال میں پڑی ہے اور باپ اسے اسی اسپتال سمیت سارے شہر میں رات بھر ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ افسوس۔ چاچا میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ میں کسی کو نہیں بخشوں گا۔ آئی او سے بھی کہہ دیا ہے کہ بس ایک بیٹا تھا اور آگے پیچھے کوئی نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تو میرے ہاتھ سے مارا جائے۔ چاچا ایمان سے ایس او نے کیس میں ذرا گڑبڑ کی اور میں نے اسے ٹھوکا نہیں چھوڑوں گا میں کسی کو۔ ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔''

بیچارہ باپ ہونے کی وجہ سے تین رات کہاں کہاں مارا پھرتا رہا، ایک رات تو بچے کو ڈھونڈنے میں اور دو رات معلومات میں۔ وہ اپنی داستان سنا کر چلا گیا۔ میں سوچتا رہا کہ اس نے زندگی میں کتنے دکھ جھیلے ہیں۔ پہلے بیوی مری پھر کس کس طرح سے اس نے ماں باپ بن کر بچے پالے، ایک بیٹا اپنے گھر میں بیوی کے ساتھ چلا گیا کہ دستور

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چادستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

Downloaded From http://paksociety.com

ہی یہ ہے۔اس کا [illegible] بیٹا [illegible] چاچا [illegible] لیا۔ اب اللہ میاں نے اس کا واحد ساتھی معصوم سا بیٹا بھی لے لیا۔ چند دن بعد پھر ملاقات ہوئی۔ اور اس نے بتایا کہ بوٹے کا بیٹا گھر آ گیا ہے۔ وہ ہمارے حق میں گواہی دے گا۔ اب کوئی اس ڈرائیور کو نہیں بچا سکتا۔ اس نے ایف آئی آر مرضی سے درج کرائی ہے۔ تمام گواہ موجود ہیں۔ مجسٹریٹ نے ڈرائیور کو ایک ہفتے کے ریمانڈ پر جیل کسٹڈی میں بھیج دیا ہے۔ اور ٹرک بھی پکڑ کر تھانے میں کھڑا کرا دیا ہے۔ گواہ پکے ہیں۔ تیرہ تاریخ کو پیشی ہے۔ میں نے اس کی کامیابی کی دعا کے ساتھ اسے رخصت کیا۔

تیرہ تاریخ کو میں بھی کورٹ چلا گیا۔ اس دن ڈرائیور کی ضمانت کی درخواست بھی لگی تھی۔ کورٹ صبح آٹھ بجے شروع ہو گئی۔ ہم جیل کی گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ بہت سی عورتوں مردوں کے ساتھ ایک عورت تین معصوم سے بچوں کے ساتھ کورٹ کے حوالات کے ساتھ کھڑی تھی۔ بار بار خوشی محمد کی گاڑی کب آئے گی پوچھ رہی تھی۔ اکرم نے بتایا کہ خوشی محمد اسی منحوس ڈرائیور کا نام ہے۔ دوپہر کے دو بج گئے جیل کی گاڑیاں آتی رہیں خوشی محمد کی گاڑی آئی یا نہیں آئی پتا ہی نہیں چلا۔ قیدی گاڑی سے اتر کر گیٹ میں داخل ہو رہے تھے، بس ایک جھلک نظر آتی تھی شناخت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس عورت کے بچے اس کے ساتھ بھوکے پیاسے کھڑے تھے اور بار بار ماں سے پوچھ رہے تھے کہ اماں ابا کب آئے گا۔ ماں بار بار آنسو پونچھ کر انہیں تسلی دے رہی تھی کہ بس آنے والا ہے۔ آخر کار چار بجے ڈرائیور ہتھکڑی لگے حوالات سے باہر آیا۔ تینوں بچے ابا ابا کہہ کر اس سے لپٹ گئے۔ مجھے اکرم نے بتایا کہ یہی ڈرائیور ہے۔ کورٹ میں پیشی ہوئی اس کی ضمانت ہو گئی اور بچے خوشی خوشی اس کے ساتھ چلے گئے۔ اگلی پیشی ایک ماہ بعد کی تھی۔

میں نے دیکھا کہ کورٹ کے باہر اکرم گم صم بیٹھا ہوا ہے۔ میں سمجھا کہ ڈرائیور کی ضمانت ہونے سے پریشان ہے۔ میں نے کہا چلو گھر چلیں۔ کہنے لگا کہ آپ جائیں میں شام کو آپ کے گھر آؤں گا...... دو تین دن غائب رہنے کے بعد آیا۔ آ کر بولا۔ ''چاچا میں سخت ذہنی کشمکش میں ہوں۔ بے انتہا پریشان ہوں۔''

''بیٹا تم نے کہا تھا کہ کلام پاک سے زیادہ کوئی شے تسلی نہیں دیتی، کیا پڑھنا چھوڑ دیا ہے؟''

''چاچا بس بہت پریشان ہوں۔''

''بیٹا ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانو گے؟''

''چاچا بولو میں نے کبھی آپ کی کسی بات کا برا مانا ہے جو [illegible] بات [illegible] ہے۔ آپ میرے باپ کی جگہ ہی نہیں آپ میرے باپ ہو۔''

''بیٹا شائد اسی کلام پاک میں لکھا ہے کہ اللہ معاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اگر بدلہ لینے کی قدرت رکھتے ہوئے معاف کر دیا جائے تو اس سے بڑی نیکی نہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اس ڈرائیور کو معاف کر دو۔ سالوں تک تم اسی طرح کورٹ میں خوار ہوتے رہو گے، اگر ڈرائیور کو سزا ہو گئی تو تمہیں کیا ملے گا، بچہ تو واپس......''

اس نے میری بات کاٹ دی اور بولا۔ ''چاچا آپ نے میری مشکل آسان کر دی، میں نے جس دن سے اس ڈرائیور کے بچوں کو ابا ابا کہہ کر اس سے چمٹتے دیکھا ہے اور سارا دن اس کی بیوی کو روتے دیکھا ہے۔ مجھے چین نہیں مل رہا۔ آپ دیکھیں کہ سوائے اس کے ٹرک کے مالک کے کوئی دوسرا رشتہ دار بھائی بہن پیشی پر نہیں آیا۔ لگتا ہے ان دونوں میاں بیوی کا کوئی ہے ہی نہیں۔ چاچا خدا کی قسم لے لو نیند میں بھی وہ بچے مجھے نظر آتے ہیں۔ مجھے ابھی سے لگتا ہے جیسے میں ان کے باپ کو ان سے چھین رہا ہوں۔ چاچا اگر اسے سزا ہو گئی تو میں تو پاگل ہو جاؤں گا۔ میں نے اسے معاف کیا۔ چاچا اب رشتہ دار اور بھائیوں کو آپ جواب دینا۔ میں اسی لیے آپ کے پاس آیا تھا۔ میری پریشانی ہی یہ تھی کہ اتنا کچھ کرنے کے بعد میں پیچھے کیسے ہٹوں۔ بھائی اور رشتہ دار تو میری جان کھا جائیں گے۔''

میں نے اسے اگلے دن آنے کو کہا۔

اس کو ٹینکر کے مالک کا گھر پتا معلوم تھا۔ اگلے دن ہم ٹینکر کے مالک کے گھر گئے۔ سلام دعا کی۔ اس نے بیٹے کی وفات پر گھر آ کر تعزیت کی تھی اس لیے اکرم اسے پہچانتا تھا۔ اسے کہا کہ ڈرائیور کے گھر جانا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ تو آپ کے خوف سے گھر سے نہیں نکلے گا۔ میں نے سمجھایا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم صلح صفائی کے لیے جا رہے ہیں کوئی جھگڑا کرنے نہیں جا رہے۔ اس نے ڈرائیور کو فون کیا وہ گھر پر نہیں تھا۔ اسے جلد گھر پہنچنے کا کہا اور اتنے میں اس نے ہماری کچھ خاطر داری کی۔ پھر پوچھا کہ کیا چاہتے ہو۔ میں نے کہا کہ کچھ نہیں چاہتے۔ کوئی مطالبہ نہیں۔ ڈرائیور کا گھر نزدیک ہی تھا آدھے گھنٹے بعد اس کے فون آنے پر ہم اس کے گھر پہنچ گئے۔

ہمارے آنے کا سن کر سارا محلہ جمع ہو گیا۔ عورتیں مرد بچے سب آ گئے۔ اس غریب محلے میں پتلون والے بابو لوگ اچھی شخصیت والے کم ہی آتے ہوں گے۔ سب کو پتا تھا کہ ڈرائیور سات دن جیل رہ کر آیا ہے اور اس پر کیس بھی

Downloaded From http://paksociety.com

ہے۔کوئی سمجھا کہ پولیس والے آئے ہیں۔پولیس آنے کی بات ایسی اڑی کہ ایک خلقت جمع ہوگئی۔

سلام دعا ہوئی، بیٹھے اور اکرم نے ڈرائیور کو مخاطب کر کے کہا۔"خوشی محمد میں نے تجھے اللہ واسطے معاف کیا۔میں تیرے بچوں کی خوشیاں نہیں چھین سکتا۔یار یہ جھگڑا تیرا میرا ہے۔اس میں بچوں کا کیا قصور ہے۔میرا بچہ تو گیا۔قدرتی بات ہے کہ میں غصہ کروں کیس کروں اور تمہیں سزا دلواؤں۔میں بھی انسان ہوں، باپ ہوں، بدلہ انسان کی قدرتی جبلت ہے۔اب تک جو کیا ایک باپ کی حیثیت سے کیا۔لیکن میں ایک انسان بھی ہوں۔انسان کے ناتے میں تیرے بچوں کو روتا نہیں دیکھ سکتا۔خوشی محمد جب سے میں نے تیرے بچوں کو عدالت میں تجھ سے ملتے دیکھا ہے مجھے ایک پل چین نہیں آیا۔بس دل میں ایک ہی بات آتی ہے کہ کیا میں اپنی خواہش کے بدلے ان معصوموں کو ان کے باپ سے دور کردوں۔نہیں کرسکتا۔خوشی محمد میں نے اب تک جو کیا اس پر مجھے معاف کردے۔"

اکرم کی اس جذباتی گفتگو پر اس کی آنکھیں بھر آئیں اور سننے والوں کے دل بھی بھر آئے۔

خوشی محمد ہاتھ جوڑ کر بولا۔"صاحب مجھ سے بھی جو غلطی ہوئی اس کی معافی چاہتا ہوں۔سوائے اس دعا کے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے میں اور کچھ نہیں دے سکتا۔"

"آپ لوگ اگلی پیشی سے پہلے اپنے وکیل سے اور آئی او سے مل لیں۔میرا گھر آپ لوگوں نے دیکھا ہوا ہے۔میرا نمبر لکھ لیں۔جس وقت جہاں کہیں میری ضرورت ہو، تھانے میں یا وکیل کے دفتر میں یا کہیں اور جانا ہو میں آدھی رات کو بھی چلنے کو تیار ہوں۔میرا پورا تعاون رہے گا۔میری خواہش ہے کہ یہ کیس اگلی پیشی پر ختم ہو جائے۔خوشی محمد تو خوش رہ اپنے بچوں کے ساتھ۔" اکرم اس کے ایک پیارے سے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا جو کچھ نہ جانتے ہوئے اکرم سے لگ کر کھڑا ہوا تھا۔

خوشی محمد کی بوڑھی ماں جو اندر کے دروازے کے ساتھ کھڑی ساری بات سن رہی تھی۔وہ کمرے میں داخل ہوئی اور اکرم کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوئی بولی۔"پتر اللہ تجھے صبر دے۔"

اکرم نے اس کے ہاتھ پکڑے اپنے نزدیک بٹھایا اور کہا۔"اماں بس آپ میرے لیے دعا کرتی رہیں۔"

وہ بولی"ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں۔خوشی محمد کا باپ جب یہ چھوٹا سا تھا تو بیمار ہو کر مر گیا۔میں مزدوری کر کے اسے پالتی رہی۔جس کے سر کا سائیں دنیا میں نہیں ہے اس کا کوئی نہیں ہوتا۔بڑی مشکل سے زندگی گزار کر اسے بڑا کیا ہے۔یہ ایک بیٹا ہی میری کل اولاد ہے۔اسی کے دم سے یہ گھر چل رہا ہے۔صاحب میں نے کل ہی جا کر سعید آباد میں بابا ولایت علی شاہ صاحب کے مزار پر منت مانگی تھی کہ میرا بیٹا اس کیس سے چھوٹ جائے تو میں آکر چادر چڑھاؤں گی۔اللہ نے میری سن لی اور آپ کے دل میں رحم ڈال دیا۔اللہ آپ کو خوش رکھے۔"

ہم دونوں جب اس کے گھر سے نکل رہے تھے تو نامعلوم کتنے ہی لوگ باہر کھڑے تھے۔یہ ایک کمیونٹی کے مزدور پیشہ لوگ تھے۔ان کی خوشیاں اور غم ساجھے ہوتے ہیں۔سب نے ہمارا شکریہ ادا کیا اور ہمیں دعائیں دیں۔ہم وہاں سے واپس آگئے اور میں نے اسے ڈرائیور کو معاف کرنے پر بہت بہت دعائیں دیں اور تعریف کی۔میں اس کام سے واقعی بڑا خوش تھا۔مجھے معلوم تھا کہ آج کل لڑکے کس طرح بائیک چلاتے ہیں اور انور مرحوم کو تو دو دن پہلے نئی بائیک ملی تھی۔پھر چلانے والا بھی اناڑی تھا۔اس میں خوشی محمد ڈرائیور کا کیا قصور تھا۔

دو تین دن بعد اکرم آیا اور بتایا۔"چاچا تمام انتظامات ٹرک کے مالکان نے کر لیے ہیں۔وکیل اور تھانے میں بات کر لی ہے۔جو کچھ لکھ کر دینا تھا وہ وکیل نے لکھ کر مجھ سے سائن کرا لیے ہیں۔آنے والی پیشی پر انشاءاللہ کیس ختم ہو جائے گا۔"

ایک ہفتے بعد اکرم کا آدھی رات کو فون آیا۔"چاچا مرشد آباد تھانے آجاؤ، میں وہیں ہوں۔"

"اب کیا ہوا؟"

"چاچا بس آجاؤ، ارشد سے ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے وہ مرشد آباد میں بند ہے۔میں وہیں ہوں۔"

شمارہ فروری 2017ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش......آپ کا انتخاب

☆اول: ماں جایا......مہرین (کراچی)

☆دوم: بے رحم......فیاض چانڈیو (کراچی)

☆سوم: خواب سراب......ارشد علی ارشد (سعودیہ)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

Downloaded From http://paksociety.com

مرشد آباد تھانے میں اکرم کا بھانجا بنچ پر بیٹھا تھا اور ایک بڑے سخت اور بھاری ڈیل ڈول والا بشیرا ڈاکو شخصیت والا آدمی تھانے میں چنگھاڑ رہا تھا۔ ''میں اسے چھوڑوں گا نہیں، اس کے خلاف قتل کا پرچہ کاٹوں گا۔ ساتھ میں گالیاں بھی بک رہا تھا۔''

میں نے معلومات کیں تو پتا لگا کہ اکرم کا بھانجا ارشد کار میں آرہا تھا اور ایک موٹر سائیکل والا رانگ سائیڈ سے آتے ہوئے اس سے ٹکرا گیا۔ تین لڑکے بائیک پر سوار تھے۔ دو کے معمولی چوٹیں تھیں اور ایک سول اسپتال کے آئی سی یو میں بیہوش پڑا تھا۔ اس کا بھائی تھانے میں شور مچائے ہوئے تھا۔ میں نے اپنے سفارشی ذرائع استعمال کیے تو اتنا ہوا کہ ارشد کو تھانے میں بٹھائے رکھا۔ ایف آئی آر درج نہیں کی۔ ہمیں کہا کہ اگر بچہ ہوش میں آجاتا ہے تو ٹک مکا کرا دیا جائے گا اور اگر انتقال ہو جاتا ہے تو ایف آئی آر کاٹنا لازمی ہو جائے گا۔

صبح اس لڑکے کا اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ میں اور اکرم ان کے گھر گئے۔ کفن دفن میں شامل ہوئے۔ یہ غریب لوگ تھے اور لگتا تھا کہ یہ بھی میانوالی کے رہنے والے ہیں۔ تمام اخراجات ہم نے برداشت کیے۔ ارشد ابھی تھانے ہی میں تھے۔ ادھر اکرم کی بہن کے گھر میں ایک کہرام تھا کہ اب کیا ہوگا۔

دفنا کر واپس آئے، مرحوم کے والد سے بات ہوئی کہ کیا چاہتے ہو۔ مرحوم کا بھائی تو ہتھے سے اکھڑ رہا تھا۔ کوئی بات ایسے میں کیا ہو سکتی تھی۔ اگلے دن مرحوم کے باپ نے ایف آئی آر درج کرائی۔ ارشد کو پہلے حوالات اور پھر تین دن کی جیل کسٹڈی ہو گئی۔

جس دن پہلی پیشی تھی اس سے ایک دن پہلے ہم صلح صفائی کے لیے ان کے گھر گئے۔ ہمارے ساتھ کچھ معزز اور بااثر شخصیات بھی تھیں۔ ہم نے سوچا تھا کہ جتنے پیسے وہ کہیں گے ان کو دے کر صلح صفائی کی راہ ہموار کریں گے۔ لیکن وہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔

مرحوم لڑکے کا دادا دل محمد پوتے کے انتقال کا سن کر میانوالی سے واپس آیا تھا۔ وہ ڈرائیور تھا۔ سلام دعا کے بعد ہم بیٹھے۔ کچھ بات کرنے کے لیے ہم تیار ہی ہو رہے تھے کہ دل محمد نے ہمیں اس معاملے پر کوئی بات کرنے سے منع کر دیا۔

وہ گویا ہوا۔ ''مجھے معلوم ہے آپ لوگ کیوں آئے ہیں۔ تسلی رکھیں اور چائے پئیں۔ ہم بھائی ہیں۔''

ہم چائے پیتے رہے اور وہ بولتا رہا۔ ''دیکھیں جی کوئی کسی کو جان بوجھ کر نہیں مارتا۔ جس کی جتنی لکھی ہے اس سے ایک سیکنڈ زیادہ نہیں جی سکتا۔ میں بچپن سے ڈرائیوری کر رہا ہوں۔ میں نے کتنے ہی کیس دیکھے ہیں۔ کسی کیس میں ڈرائیور کو پھانسی کی سزا نہیں ہوتی۔ یہ میرے بچے جب سے کہہ رہے ہیں ہم کیس لڑیں گے۔ ہم یہ کریں گے ہم وہ کریں گے۔ میں نے ان کو سمجھایا ہے کہ بھائی آج تم معاف کرو کل کوئی آپ کو معاف کرے گا۔ صاحب یہ میرا پوتا تھا، آپ سوچ نہیں سکتے مجھے کتنا پیارا تھا۔ میں تو بڑھاپے میں ٹوٹ کر رہ گیا ہوں۔ لیکن میں نے ان کو راضی کیا ہے کہ اللہ کی رضا اسی میں تھی۔ آپ لوگ اس کیس میں ڈرائیور کو معاف کر دیں۔ تو صاحب جی ہم نے معاف کیا۔ آپ لوگ اگر اس خیال سے آئے ہیں کہ کچھ دے دلا کر معاملہ ختم کرائیں تو دیکھیں ہمارا ایک رشتہ دار ہے خوشی محمد، بڑا غریب آدمی ہے۔ اس سے گاڑی لگ گئی تھی اور ایک مہاجر مر گیا تھا۔ بھائی مرنے والے کے باپ نے خوشی محمد کے گھر جا کر اسے معاف کیا۔ اللہ نام پر کیا۔ ورنہ وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ پانچ چھ لاکھ دے دو۔ اگر کہتا تو مالک دیتا اور اس غریب کی تنخواہ سے کاٹتا۔ جب ہمارے آدمی کو کوئی اس طرح معاف کر سکتا ہے تو کیا ہم نہیں کر سکتے۔''

میں تو حیران رہ گیا کہ یہ تو ہماری ہی بات کر رہا ہے میں بولا۔ ''دل محمد کیا آپ جانتے ہیں کہ خوشی محمد کو کس نے معاف کیا تھا وہ کون لوگ تھے جو اس کے گھر آئے تھے؟''

''نہیں، کوئی مہاجر تھا۔ اللہ اس کا بھلا کرے۔ گھر آ کر معاف کر گیا۔ ہمیں جا کر معافی مانگنی تھی وہ پہل کر گیا، یارا کیا آدمی تھا۔''

میں نے اکرم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بھائی وہ یہ آدمی تھا۔ اس کا بیٹا خوشی محمد کے ٹینکر سے ٹکرایا تھا۔''

دل محمد تو جوش میں اٹھا اور اکرم کے گلے لگ گیا، اسے محبت سے بھینچ کر بولا۔ ''یارا تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ یارا ہم تم کو آدمی سمجھتا رہا اور تم تو فرشتہ نکلا۔ اپنے گھر والوں کو بولا دیکھا میں نے کیا کہا تھا۔ یارا تم لوگ اس کے خلاف کورٹ میں جاتے۔ جس نے تمہارے چاچا کو گھر جا کر معاف کیا۔''

ان کے گھر سے آتے ہوئے میں سوچتا رہا کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

کیا خوب سودا نقد ہے
اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

Downloaded From http://paksociety.com

ٹیوشن

جناب ایڈیٹر

السلام علیکم

اپنے مخصوص انداز میں ایک روداد بھیج رہا ہوں۔ یہ روداد میری نہیں منور کی ہے۔ اسی کی زبانی یہ واقعہ سنا تھا تبھی سے سوچ رہا ہوں کہ اسے قلمبند کروں گا لیکن وقت نہیں مل رہا تھا۔ واقعہ ہے ہی ہنسی کا اسی لیے اسے ہلکے پھلکے مزاح کے انداز میں لکھا ہے۔

منظر امام

(کراچی)

جس لڑکی سے میری ملاقات ہوئی اس کا نام رخسانہ تھا۔

بہت ہی پرانا نام تھا۔ لیکن کیا کرتا۔ لڑکی بہت اچھی تھی۔ اگر وہ بھینگی اور اس کی چال میں تھوڑی لنگڑاہٹ نہیں ہوتی تو ہزاروں میں ایک تھی۔ میں چونکہ زندگی میں بالکل اکیلا تھا اسی لیے میں نے جہاں ہے اور جہاں ہے کی بنیاد پر اسے قبول کرلیا تھا۔

اس کو قبول کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ میں اپنے ایک دوست اکرام کی وجہ سے پھنس گیا تھا۔ اکرام میرا پرانا دوست تھا۔ اس نے مجھ سے کہا ”یار۔ منور۔ تجھ سے ایک کام

Downloaded From http://paksociety.com

ہے۔ بہت ضروری۔"

"یار۔ آج کل میرا ہاتھ بہت تنگ ہے۔" میں نے کہا۔

"ارے بھائی۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ میں تو برسوں سے سنتا آرہا ہوں۔ کام کچھ اور ہے۔"

"پھر تو ٹھیک ہے۔ بتا کیا کام ہے۔"

"یار وہ جو اپنی ماہ لقا ہے نا اس نے ملنے کا وعدہ کرلیا ہے۔" اکرام نے بتایا۔

"کیا کہہ رہا ہے یار؟"

"ہاں یار سچ کہہ رہا ہوں" اس نے بتایا۔

ماہ لقا اس کی محبوبہ کا نام تھا۔ وہ ماہ لقا کی بجائے لقا کبوتر زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کے باوجود اکرام کے لیے پوری دنیا میں اس سے زیادہ خوبصورت لڑکی کوئی نہیں تھی۔ وہ کسی اور محلے میں رہتی تھی۔ اور نہ جانے اکرام سے کس طرح اس کی دوستی ہوگئی تھی۔

"اچھا۔ چل مان لیا کہ وہ تجھ سے ملنے آرہی ہے تو میں کیا کروں؟" میں نے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ وہ اکیلی نہیں آئے گی۔" اکرام نے بتایا "وہ اپنی ایک سہیلی کو بھی لے کر آئے گی۔ میں ماہ لقا سے باتیں کروں گا۔ تو اس کی سہیلی کو سنبھال لینا۔"

یہ ایسی زبردست آفر تھی کہ میں انکار کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اسی لیے فوراً بولا "ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ دوست دوست کے کام نہیں آئے گا۔ تو اور کون آئے گا؟ کب ملنا ہے اس سے؟"

"کل شام کو۔" اس نے بتایا "تو نے کلو آئس کریم والے کی دکان دیکھی ہے۔ جس کو اس نے آئس کریم پارلر کا نام دے رکھا ہے"

"ہاں دیکھی ہے۔" میں نے بتایا۔

دوسری شام کو میں کلو آئس کریم پر پہنچ گیا۔ اکرام پہلے سے موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ "یار تو واقعی میرا سچا دوست ہے۔"

"یار جب تک ایک آئس کریم تو کھلا دے۔" میں نے کہا۔

"بھائی۔ میں اتنے ہی پیسے لایا ہوں کہ ایک ایک بار سب کو آئس کریم کھلا سکوں۔ آنے دے اس کو۔"

کچھ دیر بعد اس کی ماہ لقا بھی نمودار ہوگئی۔ اس کے ساتھ برقع میں ایک اور بھی تھی۔ جو اس کی دوست ہی ہوسکتی تھی۔

دونوں اکرام کے پاس آگئیں۔ اکرام نے میرا تعارف کروایا۔ ماہ لقا تو مجھے جانتی تھی۔ اس کی دوست مجھے نہیں جانتی تھی۔

اکرام نے اشارہ کیا۔ میں اس کی دوست کو لے کر دوسری میز پر آگیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے اپنی نقاب الٹ دی۔ میرے تو ہوش ہی ٹھکانے لگ گئے تھے۔ وہ ایسی ہی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھ کر یا شاید کسی اور کی طرف دیکھ کر کہا۔

"آپ مجھے دیکھ کر مایوس تو نہیں ہوئے؟"

اس وقت مجھے اس پر افسوس ہونے لگا۔ اس لڑکی کو اپنی کم صورتی کا احساس تھا۔ اس کا دل رکھنے کو میں نے پوچھا۔

"ارے نہیں۔ ایسی کیا بات ہے۔ میں کیوں مایوس ہونے لگا؟"

"یہی کہ میں ماہ لقا کے ساتھ چلی آئی ہوں۔" اس نے کہا۔

"لاحول ولا......" یہ میں نے دل میں ہی کہا تھا۔ "نہیں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اور ویسے بھی ماہ لقا میرے دوست اکرام کا معاملہ ہے۔ میرا کیا ہے۔ میں تو آپ کو کمپنی دینے آگیا ہوں۔"

"ہائے اللہ۔ آپ تو بہت اچھے ہیں جو اپنے دوست کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ میرا تو کوئی دوست ہی نہیں ہے۔"

ایک بار پھر مجھے اس پر افسوس ہونے لگا۔ بے چاری۔ دوستی کو ترسی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "چلو ٹھیک ہے۔ اکرام اور ماہ لقا دوست ہیں۔ اسی طرح ہم بھی دوست ہو جاتے ہیں۔"

"سچی" وہ خوشی سے نہال ہوگئی تھی۔

"ہاں..... ہاں۔" میں نے اسے یقین دلایا۔ "میں تمہارا دوست رہوں گا۔"

اس دوران اکرام نے ہم دونوں کے لیے آئس کریم بھجوادی تھی۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ وہ جیسی بھی سہی۔ ایک لڑکی تھی۔ اور وہ بھی دوستی کو ترسی ہوئی۔ دوسری طرف میرا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میں بھی بالکل اکیلا ہی تھا۔ میرے ساتھ تو کوئی بھی نہیں تھا۔ رخسانہ جیسی بھی سہی۔ تھی تو ایک لڑکی اور دوستی کرنا جانتی تھی۔

بہرحال یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ کبھی یہاں۔ کبھی وہاں۔ کبھی کسی پارک میں کبھی کسی کولڈ اسپاٹ پر۔

ایک دن ہم ایک کولڈ اسپاٹ پر کولڈ ڈرنک پی رہے تھے کہ اچانک اس نے گھبرا کر کہا۔ "منور۔ غضب ہوگیا۔"

"کیا ہوگیا؟" میں بھی گھبرا گیا تھا۔

"میرے ابا اسی طرف آرہے ہیں۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہیں۔"

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کس طرف سے بھاگا جائے

Downloaded From http://paksociety.com

کہ اس کا باپ ہمارے سر پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک دبلا پتلا انسان تھا۔ منہ میں پان بھرا ہوا۔ وہ کھا جانے والی نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ ''تو یہاں کیا کر رہی ہے۔'' اس نے پوچھا ''اور تیرے ساتھ یہ کون ہے؟''

''ابا۔ وہ میری سہیلی ہے نا ماہ لقا۔ اس کے سوتیلے بھائی ہیں۔'' رخسار نے کہا۔ ''میں ان سے ٹیوشن کی بات کر رہی تھی۔''

''تو اس کو ٹیوشن پڑھائے گی؟''

''میں نہیں ابا۔ یہ پڑھائیں گے۔''

''جی ہاں میں پڑھا دوں گا۔'' میں جلدی سے بولا۔ ''میرا بہت تجربہ ہے۔''

''اچھا اچھا۔'' اس نے گردن ہلائی۔ پھر رخسانہ کی طرف دیکھا۔ ''جیسی تیری مرضی۔ اب ایک کام تو کر۔ جلدی سے پانچ سو کا بندوبست کر دے۔ مجھے امجد بھائی کو دینا ہے۔''

''ابا میں کہاں سے کروں پانچ سو۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

اس کے باپ کو قابو میں کرنے کا یہ بہت اچھا وقت تھا۔ اور اتفاق سے اس وقت جیب میں روپے بھی تھے۔ میں نے اس کے باپ سے کہا۔ ''جناب۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں خدمت کر سکتا ہوں۔''

''یہ اچھی بات نہیں ہوگی کہ تم سے پیسے لیے جائیں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن اگر دے ہی رہے ہو تو دے جاؤ۔''

میں نے اس شخص کو فوراً پانچ سو روپے دے دیئے۔ پیسے لے کر اس نے رخسانہ کی طرف دیکھا۔ ''بیٹا کوشش کرنا کہ جلدی گھر واپس آجاؤ۔''

''جی ابا۔''

وہ ایک طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رخسانہ نے مجھ سے کہا۔ ''آپ نے اس وقت میری عزت رکھ لی۔''

''ارے نہیں ایسی کیا بات ہے۔ یہ تو چلتا رہتا ہے۔ پھر تمہارے ابا اب میرے ابا بھی تو ہونے والے ہیں۔''

''ہائے اللہ۔'' اس نے شرمانے کی کوشش کی۔ ''آپ کی باتیں کتنی اچھی ہوتی ہیں۔ اب اپنی بات کا بھرم رکھنے کے لیے آپ کو مجھے ٹیوشن دینی ہوگی۔''

''وہ تو ظاہر ہے۔ اس طرح ملنے کا موقع بھی ملتا رہے گا۔'' میں نے کہا۔

''تو کل ہی سے آجائیں نا۔ ہم جی بھر کر باتیں کریں گے۔'' اس نے کہا۔

''کیوں نہیں۔ میں کل ہی سے آ رہا ہوں۔''

اور میں دوسری شام اس کے گھر پہنچ گیا۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ شاید دو یا تین کمرے تھے۔ میرے لیے ایک کمرا مخصوص کیا گیا تھا۔ رخسانہ نے اس دن ہلکا ہلکا میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ اس کو دیکھ کر اچھا لگا تھا۔ وہ جیسی بھی ہو۔ لڑکی ہی تو تھی۔

وہ اپنی کتابیں لے کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ ''سنیں۔ ابا ابھی آپ سے بات کریں گے۔ دیکھیں انکار مت کیجیے گا۔'' اس نے کہا۔

''کس بات کا انکار؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ جو بھی کہیں۔''

اتنی دیر میں اس کا باپ بھی آ گیا۔ اس کو دیکھ کر رخسانہ کمرے سے چلی گئی تھی۔

''ہاں بھائی۔ تم کو دیکھ کر خوشی ہوئی'' اس نے کہا۔ ''مجھے وقت کے پابند لوگ پسند ہیں۔''

''جی جناب۔ میں بھی اس کا خیال رکھوں گا۔''

''شاباش۔ اب یہ بتاؤ پیسے کتنے دے رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ارے جناب۔ اب آپ لوگوں سے پیسے کون لے گا؟'' میں نے کہا۔

''نہیں بھائی۔ میں پیسے لینے کی بات نہیں کر رہا۔ دینے کی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے کہا ''میرا مطلب ہے میری بیٹی کو پڑھانے کے تم کتنے پیسے دو گے؟''

میں تو چکرا کر رہ گیا۔ یہ تو بالکل نئی بات سن رہا تھا۔

''ارے جناب۔ ایسا کیسے ہوتا ہے۔ ٹیوشن پڑھانے والا الٹا پیسے کیوں دے گا؟''

''بیٹا۔ برا مت ماننا۔ یہ ہمارے خاندان کی رسم ہے۔ ہمارے خاندان کی لڑکیاں جس سے ٹیوشن پڑھتی ہیں تو ٹیچر کو پیسے دینے پڑتے ہیں اب تم سے کچھ انسیت سی ہو گئی ہے۔ لہٰذا صرف ایک ہزار دے دیا کرنا۔ اب تم سے حساب کتاب کیا کرنا۔''

''جناب۔ میں تو یہ سن کر بوکھلا کر رہ گیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''کیوں کہ میں یہ سب پہلی بار سن رہا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں یہاں آتے جاتے رہے تو ایسی باتیں سننے کے عادی ہو جاؤ گے۔ اب جلدی بتاؤ کیا سوچا ہے تم نے۔ میری بیٹی کو پڑھا رہے ہو یا میں صداقت سے بات کروں۔'' اس نے کہا۔

''اور یہ صداقت کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

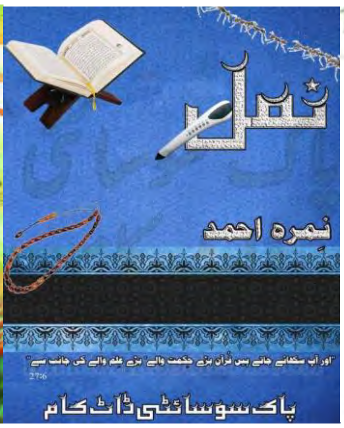

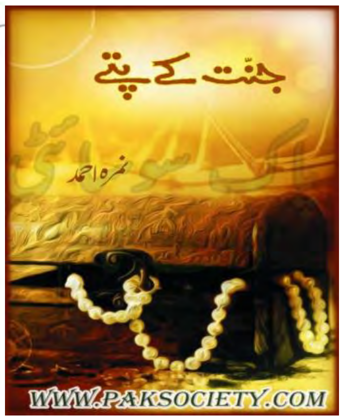

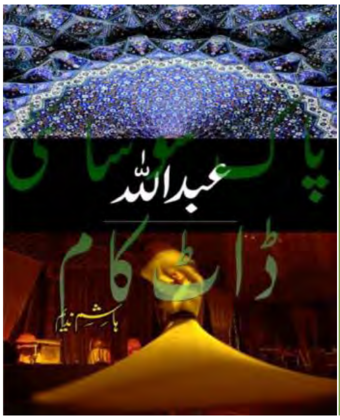

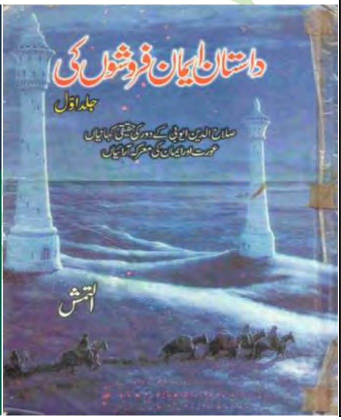

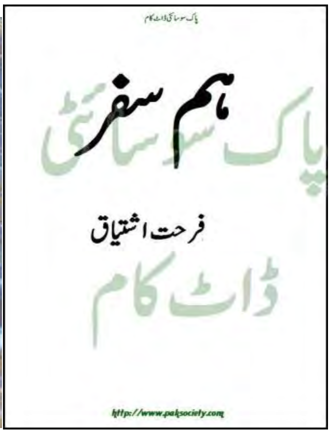

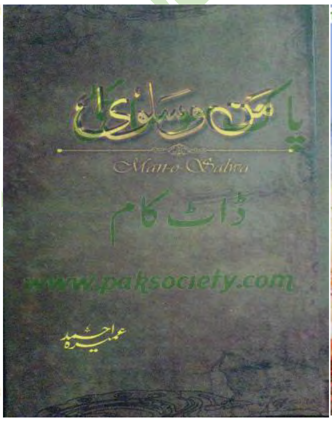

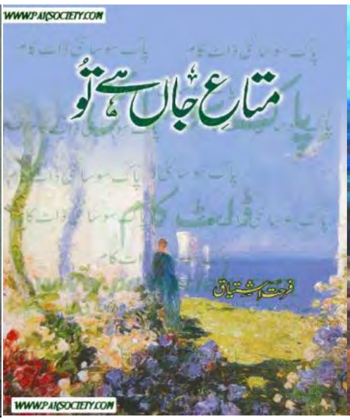

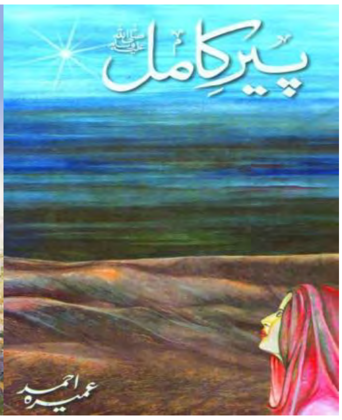

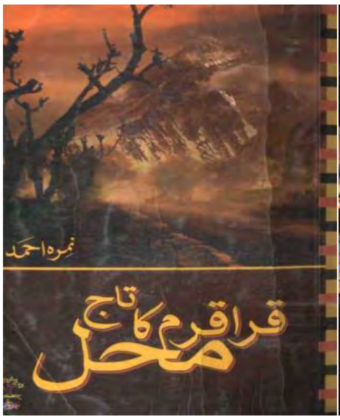

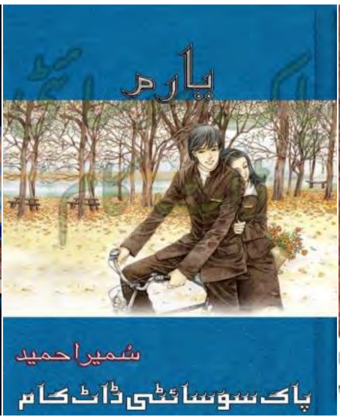

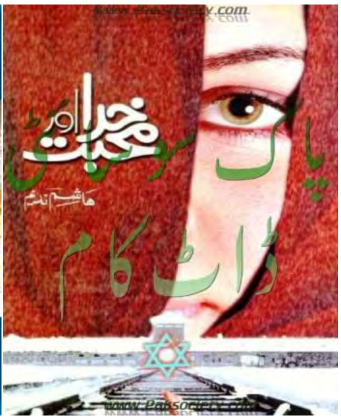

Downloaded From http://paksociety.com

''اسی محلے کا تو جوان ہے۔ ہے تو ایک نمبر کا بدمعاش لیکن رخسانہ کو پڑھانے کے لیے دو ہزار مہینا دینے کو تیار ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اب جو تمہاری مرضی۔''

''نہیں جناب۔ مجھے چونکہ آپ کی بیٹی سے کچھ انسیت سی ہو گئی ہے۔ اسی لیے اس کے شاندار مستقبل کے لیے اسے پڑھانے کو تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے تو پھر تم ہی کو رکھ لیتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''چلو اب ایڈوانس کے پانچ سو روپے دے دو۔''

''ایڈوانس؟''

''ہاں بھائی۔ یہ ٹیوشن کا اصول ہے۔'' اس نے کہا۔

''جناب۔ یہ اصول تو اس طرح ہے کہ ٹیوشن پڑھانے والا ایڈوانس لیتا ہے۔''

''وہ سلسلہ تو یہاں نہیں ہے۔ اسی لیے تم ہی کو دینا ہوگا۔''

مرتا کیا نہ کرتا۔ میں نے اس کو پانچ سو روپے دے دیے۔ میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ اب میں جی بھر کر رخسانہ سے باتیں کروں گا۔ ایک محروم انسان کی خواہشات اسی قسم کی ہو سکتی ہیں۔ چاہے جس کے ساتھ بھی ہو۔

وہ اندر جا کر رخسانہ کو بلا کر لے آیا۔ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اس وقت مسکرا رہی تھی۔

''تم مسکرا رہی ہو۔'' میں نے جل کر کہا۔ ''تمہارے ابا مجھ سے پانچ سو روپے لے گئے ہیں۔''

''ایڈوانس کے طور پر لے گئے ہوں گے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں یہی بولا تھا۔''

''ہاں یہ تو ہمارے یہاں کا اصول ہے۔ پچھلا جو ماسٹر تھا۔ اس سے پورے دو ہزار ایڈوانس لیے تھے۔'' اس نے کہا۔

''تمہارے یہاں کا یہ اصول میری سمجھ سے باہر ہے۔''

''اصول کو چھوڑو۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تمہارے سامنے ہوں۔'' اس نے ایک لگاوٹ بھرے انداز سے کہا۔

اچانک میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی نے مجھ سے ایسی کوئی بات کی تھی۔ میں نے اپنے ذہن میں اس سے بولنے کے لیے خوبصورت جملے سوچنے شروع کر دیے۔ میں نے ایک جملہ کرشن چندر کا سوچ لیا۔ ابھی میں بولنے ہی والا تھا کہ اس کا باپ کمرے میں داخل ہو گیا۔

''کیوں بھائی؟ ابھی تک پڑھائی شروع نہیں ہوئی؟'' اس نے پوچھا۔

''ابا۔ یہ مجھ سے زبانی کچھ پوچھ رہے تھے۔'' رخسانہ نے بتایا۔

''چلو پھر تو ٹھیک ہے۔'' وہ سامنے والی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے میز پر رکھا ہوا ایک پرانا اخبار اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ساری پڑھائی کے دوران سامنے ہی بیٹھا رہے گا۔

میں نے رخسانہ کو اشارہ کیا کہ وہ اپنے باپ کو سمجھا دے کہ یہاں سے ہٹ جائے۔ رخسانہ نے اس کی طرف دیکھا ''بابا۔ تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ اپنے کمرے میں جاؤ۔ تم سامنے رہو گے تو ٹھیک سے پڑھائی نہیں ہوگی۔''

''بیٹا تجھے تو ہمارے خاندان کا دستور معلوم ہے نا۔'' اس نے کہا۔ ''ہم اپنے گھر کی بیٹیوں کو ماسٹر کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑتے۔''

''پیسے لے لینے کے بعد بھی نہیں چھوڑتے۔'' میں جل کر بولا۔

''پیسے؟'' وہ تپ گیا تھا۔ ''تم اس کو پیسے سمجھتے ہو۔ پانچ سو کی حقیقت کیا ہوتی ہے۔'' پھر اس نے رخسانہ کی طرف دیکھا۔ ''تم اس کو بتاتی کیوں نہیں کہ تمہارے پچھلے ماسٹر نے کتنے ایڈوانس کے طور پر دیے تھے؟''

''پورے پانچ ہزار دیے تھے ابا'' رخسانہ نے بتایا۔

''اس کے باوجود بھی میں نے اسے ٹکنے نہیں دیا۔ جانتے ہو کیوں؟''

''اب یہ تو آپ ہی بتائیں۔''

''اس لیے کہ وہ اپنی حد سے آگے نکل رہا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''بہرحال اب تم پڑھانا شروع کر دو۔''

میں نے اسی وقت سوچ لیا کہ اب میں دوبارہ اس طرف نہیں آؤں گا۔ چاہے زندگی میں محرومیاں ہی ہوں۔ دوسرے دن میں نہیں گیا۔ اس کے بعد بھی نہیں گیا۔ کئی مہینے گزر گئے۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ اس دوران اس کا اور اس کی پڑھائی کا کیا ہوا۔

ایک دن میرے دوست اکرام نے بتایا۔ ''یار تیرے لیے ایک مصیبت ہو گئی ہے۔''

''کیسی مصیبت؟''

''وہ جو لڑکی ہے نا رخسانہ۔ جس کو تو ٹیوشن پڑھانے گیا تھا۔ وہ گھر سے غائب ہو گئی ہے۔''

''اوہو۔ یہ تو برا ہوا۔ لیکن اس میں میری کیا مصیبت؟''

''اس کے باپ نے پرچہ کٹوا دیا ہے کہ تو نے اسے اغوا کیا ہے۔'' اکرام نے بتایا۔

''کیا؟ میرے تو ہوش اڑ گئے تھے۔'' کیا اس کا باپ

www.paksociety.com

بہار کے موسم سے لطف اندوز کرواتا مارچ 2017ء کا پُرکشش شمارہ

کراچی

ماہنامہ

پاکیزہ

انجم انصار، رفعت سراج و شیریں حیدر کے خوب صورت ناول

سحر ساجد کا دل نشیں ناولٹ ...... **من جانبازم**

سیما رضا ردا کی دل کش تحریر منی ناول **ہم کو عبث بدنام کیا** کی صورت

پاکیزہ کے خوب صورت مہمان کی بزم میں خوشگوار آمد

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے قلم سے نیا سلسلہ **اللہ اور اس کا نور**

باتیں بہار و خزاں کی

کے سلسلے میں آپ بھی شامل ہوئیے

اختر شجاعت کی پُرروح تحریر **تحمل و برداشت** کے موضوع پر

نگہت سیما ، عقیلہ حق ، پروین عذرا تشنہ کی خصوصی تحریریں

اس کے علاوہ

مشاق قلم کاروں کے دل پذیر افسانے، ناولٹ جس میں **تحسین اختر،**
سارہ احمد، سمیرا یونس ہارون ودیگر شامل ہیں

اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ، معلومات افروز سلسلے صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | f PAKSOCIETY

Downloaded From http://paksociety.com

پاگل ہو گیا ہے؟"

"اب یہ تو میں نہیں جانتا کہ وہ پاگل ہے یا نہیں۔ لیکن اس نے یہ کام کر دیا ہے۔" اکرام نے بتایا۔

"یار اس سے جان چھڑانے کی کوئی ترکیب بتاؤ۔" میں نے کہا۔ "میں تو بلاوجہ پھنس جاؤں گا۔"

"مصیبت یہ ہے کہ اس کے باپ کا کوئی بھائی پولیس انسپکٹر ہے۔" اکرام نے بتایا۔ "اسی لیے اس نے یہ حرکت کی ہے۔"

"یار یہ تو زبردستی والی بات ہوئی۔"

"میں ایک مشورہ دیتا ہوں۔" اکرام نے کہا۔ "تو اس کے باپ کے پاس جا کر اپنی پوزیشن کلیئر کروالے۔ ورنہ اگر پولس ایک بار تجھے پکڑ لے گئی نا تو پھر جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔"

"لیکن میں اس سے جا کر کہوں گا کیا؟"

"اپنی پوزیشن واضح کر دے۔ بلکہ ایک کام کر۔ اسے جا کر یہ دے کہ تو کئی مہینوں کے لیے اس شہر سے باہر چلا گیا تھا۔ اب واپس آیا ہے تو رخسانہ کو پڑھانے کے لیے آ گیا ہے۔"

"یعنی میں یہ ظاہر کروں کہ مجھے معلوم ہی نہیں ہے کہ رخسانہ گھر سے بھاگ گئی ہے۔"

"ہاں۔ بالکل انجان بن کر پہنچ جا اس کے پاس۔ اس کو خود احساس ہوگا کہ تجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔"

"ہاں۔ یہ طریقہ سمجھ میں آ رہا ہے۔"

"تو پھر دیر نہ کر۔ اس سے پہلے کہ پولس حرکت میں آ جائے۔ تو خود ہی چلا جا۔"

اور میں اس کے مشورے پر عمل کر کے اس کے گھر چلا گیا۔ دروازے پر دستک دی تو اس کا باپ گھر سے نکل کر آ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا میں نے بولنا شروع کر دیا۔

"جناب۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں بغیر اطلاع دیے اچانک چلا گیا تھا۔ لیکن ایسی ایمرجنسی آ گئی تھی کہ راتوں رات مجھے لاہور جانا پڑ گیا۔ اب واپس آیا ہوں تو آپ کی صاحب زادی کا خیال آیا ہے کہ اس کی تعلیم میری وجہ سے ادھوری رہ گئی ہوگی۔ بس اس کو پڑھانے کے لیے چلا آیا ہوں۔"

"پڑھائے گا اسی وقت نا جب میری بیٹی کو لے کر آئے گا۔" اس نے کہا۔

"جی میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" میں نے کہا۔ "میں آپ کی بیٹی کو کہاں سے لے کر آؤں؟"

"جہاں تو اسے لے کر گیا تھا۔"

"کیسی بات کر رہے ہیں۔ اگر میں آپ کی بیٹی کو کہیں لے کر جاتا تو اسے پڑھانے کیوں آتا؟" میں نے کہا۔ "کیا رخسانہ کہیں گئی ہوئی ہے؟"

"بیٹا" اب اس کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ "وہ کئی دنوں سے غائب ہے۔ ہم نے یہ سمجھا کہ تم اسے لے کر کہیں چلے گئے ہو۔ لیکن اب اندازہ ہوا ہے کہ وہ کہیں اور ہے۔ کسی اور کے ساتھ ہے۔ تمہاری اس بات میں بہت وزن ہے کہ اگر تم اسے لے گئے ہوتے تو پھر یہاں کیوں آتے؟"

اس وقت مجھے اکرام کے عقلمندانہ مشورے کی قدر معلوم ہونے لگی۔ اس نے بالکل صحیح مشورہ دیا تھا کہ میں خود پہنچ جاؤں۔

"بیٹا۔ میں نے پولس میں تمہارے خلاف پرچہ بھی کٹوا دیا تھا۔" اس نے کہا۔ "اب جا کر واپس لینا ہے۔ لیکن بیٹا تم سے ایک درخواست ہے۔"

"جی فرمائیں۔ میں ہر خدمت کو حاضر ہوں۔"

"دیکھو۔ معاملہ یہ ہے کہ رخسانہ اگر تمہارے ساتھ نہیں گئی۔ تو پھر فریدہ کے پاس چلی گئی ہوگی۔ جب گھر سے ناراض ہوتی ہے تو اسی کے پاس چلی جاتی ہے۔ یہ اس کی پرانی عادت ہے۔ اب میں فریدہ کے گھر جا کر اسے منا کر لے آؤں گا۔ تم بس ایک کام کر دینا۔"

"جی فرمائیں۔"

"دیکھو بیٹا۔ کہتے ہوئے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ لیکن مجھے اس کی مستقبل کی بھی تو فکر کرنی ہے نا۔ تو تم اس کی ٹیوشن مت چھوڑ دینا۔ اس کو پڑھانے کے لیے آتے رہنا۔ تمہاری مہربانی ہوگی۔"

"ارے نہیں جناب۔ اس میں مہربانی کیا ہے میں ضرور آیا کروں گا۔"

"بس تو میں ابھی جا کر اپنی رپورٹ واپس لے لیتا ہوں۔"

بس وہ دن ہے اور آج کا دن۔ میں اس رخسانہ کو پڑھانے چلا جا رہا ہوں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اب تو پڑھانے کے تین ہزار مہینا بھی دیتا ہوں۔ اور اس دوران اس کا کم بخت باپ میرے سامنے ہی بیٹھا رہتا ہے۔ اور میں قسمت کو روتا رہتا ہوں۔

ابھی پچھلے دنوں مجھے یہ پتا چلا ہے کہ رخسانہ گھر سے کہیں نہیں گئی تھی۔ یہ سب اس کے باپ کی سازش تھی۔

اس کہانی کو لکھنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اگر آپ کو ٹیوشن پڑھانے کا شوق ہے تو مجھ سے رجوع کریں۔ میں آپ کے لیے رخسانہ کی ٹیوشن چھوڑنے کو تیار ہوں۔

Downloaded From http://paksociety.com

پالش والے بابا

مکرمی جناب
السلام علیکم
یہ دنیا رنگا رنگ ہے۔ اس دنیا میں عجیب عجیب سے لوگ رہتے ہیں۔ یہ پالش والے باباکی بھی عجیب سی شخصیت تھی۔ ان کی زندگی پر میں بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں لیکن کیا کروں لکھنے کے لیے معلومات چاہیے۔ ہزار کوشش کے بعد بھی سیر حاصل معلومات نہیں ملی اس لیے مختصر سا تذکرہ کررہا ہوں۔

احمد
(کراچی)

ولی دادا ایک زبردست کردار ہیں۔ وہ ہمارے ہی محلے میں رہتے ہیں۔ ان کا رویہ بہت اچھا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے کرداروں کو دیکھا ہے۔ ان کا تعلق کسی زمانے میں زیرزمین دنیا سے بھی رہ چکا ہے۔ اسی لیے دنیا بھر کے تجربات سمٹ کر ان کی باتوں میں آگئے ہیں۔ ہر مزاج اور ہر طبقے کے لوگوں کو انہوں نے دیکھا سنا اور برتا ہے۔ یہ کہانی انہوں نے ہی سنائی تھی۔ ویسے تو یہ ایک سیدھی سادی کہانی تھی لیکن میں نے اپنے طور جو اضافے کیے

Downloaded From http://paksociety.com

ہیں وہ کہانی کی اصل روح کو مجروح کرنے کے لیے نہیں بلکہ کہانی کے تاثر کو رواں رکھنے کے لیے کیے ہیں۔

دادا نے کہانی کئی نشستوں میں سنائی تھی۔ میں نے اس کو ایک ترتیب میں لکھ دیا ہے۔

اب کہانی سنیں۔ اور غور کریں کہ کیسے کیسے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ میں ایک بار جب منیر کی دکان کے سامنے سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ دکان کے سامنے کئی دیگیں چڑھی ہوئی ہیں جن میں بریانی بن رہی ہے۔ منیر ہمارے علاقے کا ایک دولت مند دکاندار تھا۔ دولت مند ان معنوں میں کہ اس کی اپنی ایک دکان تو تھی ہی اس کے علاوہ دائیں بائیں کی بارہ تیرہ دکانیں بھی اسی کی تھیں جن کو اس نے کرائے پر لگا رکھا تھا۔

میرا خیال ہے کہ ہزاروں روپے اس مد میں آجایا کرتے تھے۔ خود اس کی دکان کا یہ حال تھا کہ کئی کئی لوگ کام کرتے تھے۔ وہ مٹھائیوں کی دکان تھی۔ بہت پہلے جب میں اس محلے میں آیا تھا تو میں نے منیر کی دکان دیکھی تھی۔ وہ جوتے پالش کی دکان تھی۔ مختلف قسم کی پالش اس کی دکان پر ہوا کرتی۔ اس کے علاوہ موزے بھی بکا کرتے تھے لیکن اس کی حالت بہت خراب تھی۔ بہت کم ہی گاہک آیا کرتے تھے۔

اس زمانے میں اس علاقے میں زیادہ آبادی بھی نہیں تھی۔ اسی لیے بے چارہ منیر اپنی دکان میں بیٹھا پڑوسیوں سے گپ شپ کیا کرتا۔ اس کے پڑوسی دکانداروں کا بھی یہی حال تھا۔ سب تقریباً بے کار ہی بیٹھے رہتے تھے۔

میں اپنے بابا سے پوچھا کرتا "بابا یہ کیا چکر ہے۔ منیر انکل نے یہ دکان کیوں کھول رکھی ہے۔ میں نے تو آج تک کسی کو اس دکان میں آتے نہیں دیکھا۔"

"بیٹا۔ میں نے بھی کسی کو نہیں دیکھا۔" بابا نے مسکرا کر کہا۔

"تو پھر کیوں دکان کھولی ہے؟"

"اب میں کیا جانوں؟" بابا نے کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ ان کو امید ہو کہ ایک دن دکان چل نکلے گی۔"

لیکن میں جب تک وہاں رہا۔ میں نے اس دکان کو چلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اور نہ ہی کوئی گاہک دیکھا۔ البتہ منیر کو باقاعدگی سے دکان کھولتے اور بیٹھے ہوئے دیکھتا رہتا تھا۔

میں نے کبھی پڑھ کر نہیں دیا۔ بس آوارہ گردی میں لگا رہا۔ اس آوارہ گردی کی بھی ایک الگ کہانی ہے۔ اگر موقع ملا تو وہ بھی سنا دوں گا۔ بہر حال اسی دوران مجھے دو تین سالوں کے لیے شہر سے باہر جانا پڑ گیا۔ کیوں گیا تھا۔ وہ بھی ایک کہانی ہے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ میں نے بہت لاابالی پن کی زندگی گزاری ہے۔ وہی لاابالی پن مجھے شہر سے باہر لے گیا تھا۔ واپسی دو تین سال کے بعد ہوئی تھی۔

میں دوسرے شہر میں بھی بہت کچھ کرتا رہا۔ لیکن اس کی تفصیل ایک الگ داستان ہے۔ اس کہانی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہاں، اس دوران یہ ہوا کہ والد صاحب کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ یہ امید کہ میں پڑھ لکھ کر کام کا آدمی بن جاؤں گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔ بہر حال واپس آکر جب میں ایک دن آرام کرنے کے بعد بازار کی طرف نکلا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ منیر کی تو حالت ہی بدل گئی تھی۔ اس کی دکان جگمگا رہی تھی۔ شوکیس بن گئے تھے جن میں مٹھائیاں سجی ہوئی تھیں۔ اب وہ دکان مٹھائی کی تھی۔ جس کا نام بھی کچھ عجیب سا تھا۔ "پالش بابا سویٹ"

منیر اس دکان کے باہر ہی کھڑا تھا۔ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے مجھے ایک نظر میں پہچان لیا تھا۔ "ارے تو کہاں چلا گیا تھا؟ اتنے دنوں کے بعد دیکھ رہا ہوں۔"

"منیر انکل میں دوسرے شہر چلا گیا تھا۔ ایک ضروری کام ہے۔"

"ہاں۔" ہاں تیرے سارے ضروری کام جانتا ہوں۔" وہ معنی خیز انداز میں بولے۔ پھر انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "آ اندر۔ میں تجھے اپنی دکان کے گلاب جامن کھلاتا ہوں۔ دل خوش ہوجائے گا۔"

وہ مجھے دکان کے اندر لے آئے۔ انہوں نے ذرا سی دیر میں میرے سامنے کئی طرح کی مٹھائیاں رکھ دیں۔ "لو کھاؤ۔"

"منیر چاچا اتنی کون کھائے گا؟ میں نے کہا۔

"اچھا چلو۔ جتنی کھا سکتے ہو کھالو۔ جو رہے اسے ساتھ لے جانا۔"

"مجھے تو یہ بتائیں کہ یہ سب کیا ہے۔" میں نے پوچھا۔ "کہاں تو آپ کی دکان چلتی ہی نہیں تھی۔ آپ پالش بیچتے تھے۔ اب مٹھائیاں بیچ رہے ہیں۔"

"پالش تو اب بھی میری دکان میں ہے۔" منیر نے بتایا "یہ دیکھو۔" اس نے ایک شوکیس کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں پالش کی کئی ڈبیاں رکھی ہوئی تھیں۔ "میں تو اب بھی پالش

Downloaded From http://paksociety.com

بیچتا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ اصل کاروبار اب مٹھائیوں کا ہے۔ پالش تبرک کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ کیوں کہ ان ہی کی برکت سے میرے حالات بدلے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں منیر چاچا۔'' میں نے کہا۔

پھر منیر نے جو کہانی سنائی وہ بہت حیرت انگیز تھی۔ اسے سن کر پتا چلا کہ انسان کے کتنے روپ ہوتے ہیں۔

''بیٹا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دکان چلانے کے لیے کیا کروں۔ میں جو آئیٹم لے کر بیٹھا تھا اس کی کوئی مانگ نہیں تھی۔ پالش خریدنے کے لیے کبھی کبھی کوئی آ جاتا تھا۔ ورنہ دکان خالی ہی رہتی تھی۔ تم نے تو خود دیکھا ہوگا؟''

''ہاں چاچا۔ میں نے خود دیکھا ہے اور اس پر حیران بھی ہوا کرتا تھا۔''

''یہ صرف میرا ہی حال نہیں تھا بلکہ آس پاس کی جتنی دکانیں تھیں۔ سب کا یہی حال تھا۔ ہم دکاندار دن بھر جھک مارتے رہتے۔ کیوں کہ ہمارے پاس کوئی کام ہی نہیں تھا۔ ایک دن ایک مجذوب دکان پر آ گیا۔ بہت برا حال تھا اس کا۔ کپڑے پھٹے ہوئے۔ داڑھی بے تحاشہ بڑھی ہوئی۔ بال جھاڑ جھنکاڑ ہو رہے تھے۔ منہ سے رال نکل کر اس کے جسم پر گر رہی تھی۔ ایسے لوگ آیا ہی کرتے تھے۔ میں نہ جانے کتنوں کو دیکھ چکا تھا۔ لیکن اس کی بات کچھ اور تھی۔ اس کے ایسے حلیے کے باوجود اس میں ایک جلال سا تھا۔''

''آ آ'' اس نے اشارہ کیا۔ وہ پالش کے ڈبوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اندازہ ہو گیا کہ وہ بول نہیں سکتا۔ یعنی وہ گونگا تھا اور کسی سبب سے پالش مانگ رہا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا'' بابا۔ جوتے تو تمہارے پاس ہیں نہیں۔ تم پالش لے کر کیا کرو گے؟''

اس نے پھر اشارہ کیا۔ نہ جانے میرے دل میں کیا آئی۔ میں نے ایک ڈبیا اٹھا کر اس کو دے دی۔ اور تم یقین کرو اس نے ڈبیا کھول کر ساری پالش اپنی انگلیوں سے نکال نکال کر اس طرح کھالی جس طرح لوگ کٹورے یا مٹی کے پیالے سے فیرنی یا کھیر چاٹ چاٹ کر کھاتے ہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہیں منیر چاچا۔ وہ پالش کھا گیا؟''

''ہاں بیٹا۔ وہ پالش کھا گیا۔'' میں حیرت سے اس کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ کسی کو پالش کھاتے میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ پالش کھا کر اس نے میری طرف دیکھا اور ایک طرف روانہ ہو گیا۔

اس کے جاتے ہی ایک دکاندار میرے پاس آ گیا۔ اس کی دکان ذرا فاصلے پر تھی۔ وہ اپنی دکان ہی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''منیر بھائی۔ یہ تو کہیں آتا جاتا نہیں ہے۔ تمہارے پاس کہاں سے آ گیا؟''

''کیا تم اس کو جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔ اس کو پالش والے بابا کہتے ہیں۔ میوہ شاہ کے قبرستان میں رہتا ہے۔ پالش کھایا کرتا ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو بھائی؟ پالش کھایا کرتا ہے؟''

''ارے منیر بھائی حیران کیوں ہو رہے ہو۔ تم نے تو خود بھی اسے پالش کھاتے دیکھا ہے۔''

''ہاں بھائی۔ دیکھا تو ہے۔ یہ تو کمال ہے۔''

منیر چاچا مجھے اس پالش والے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ میں حیران ہوتا جا رہا تھا۔ بہت عجیب سی بات تھی۔ میں نے خود ایسے کئی ملنگوں کو دیکھا ہے۔ لیکن کسی کے بارے میں یہ نہیں سنا کہ وہ پالش کھاتا ہے۔ اب یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ منیر چاچا کی ترقی سے پالش والے بابا کا کیا تعلق ہے۔ بہر حال منیر چاچا اپنی کہانی سنا رہا تھا اور میں حیرت سے سنتا جا رہا تھا۔

''بیٹا!'' منیر نے کہانی آگے بڑھائی۔ ''یہ سب تو ہو رہا تھا لیکن ایک پرابلم یہ بھی تھی کہ دکانداری نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ حالات خراب ہی ہوتے جا رہے تھے اور یہ حال صرف میرا ہی نہیں بلکہ آس پاس کی ساری دکانوں کا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس پورے علاقے کو کسی نے باندھ دیا ہو کہ کچھ بھی کر لے یہاں سے روزی نہیں ملے گی۔ ہم دکاندار دن بھر جھک مارتے رہتے۔ ہمارے پاس کوئی کام ہی نہیں تھا۔ اس طرف اس مجذوب کی فرمائشیں بڑھتی جا رہی تھیں۔''

''کیا وہ کچھ اور بھی مانگنے لگا تھا منیر چاچا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں وہ مانگتا تو پالش ہی تھا لیکن میں تو چڑ سا گیا تھا۔ جب کوئی کام بھی نہیں چل رہا ہو۔ اس وقت کسی کی ذرا سی بھی فرمائش کھلنے لگتی ہے۔ میرا بھی یہی حال ہو رہا تھا۔ ایک دن وہ جب معمول کے مطابق مجھ سے پالش مانگنے آیا تو میں نے اشارہ کیا کہ وہ اپنی جھولی پھیلا دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ میں نے دکان میں رکھی ہوئی ساری ڈبیائیں اس کی جھولی میں ڈال دیں کہ جا عیش کر۔

وہ ملنگ ایک دم سے خوش ہو گیا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام کے دوسرے ہاتھ سے آس پاس اس طرح اشارہ کیا کہ ایک باؤنڈری سی بن گئی۔ پھر اس نے اشارہ کیا کہ جیسے وہ یہ سب

Downloaded From http://paksociety.com

میرے حوالے کر رہا ہو کہ جا میں نے یہ سب تجھے دے دیا۔

''چاچا۔ کچھ مجذوب ایسے بھی ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے ان کے پاس ساری دنیا کی دولت ہو۔ جس کو چاہے جو اشارہ کر دیا۔ لیکن ان پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔''

''بیٹا۔ میں نے بھی کوئی بھروسا نہیں کیا تھا۔ بس جھلا کر دے دیا تھا کہ کام وام تو چل نہیں رہا۔ چلو ساری پالش اسی کو دے دو لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ اس بابا کی حقیقت کیا ہے۔ وہ پالش لے کر اور انجانا سا اشارہ کر کے چلا گیا۔ میں اب خالی دکان میں بیٹھا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ میں نے جھلا کر اس ملنگ کو ساری پالش دے تو دی تھی۔ لیکن اب کرنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ رشید میرے پاس آگیا۔''

''یہ رشید کون تھا چاچا؟'' میں نے پوچھا۔

''درزی۔ میری دکان کے برابر میں اس کی ٹیلرنگ شاپ تھی۔'' منیر نے بتایا۔ ''وہ بہت پریشان معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا منیر بھائی۔ میں تو اس علاقے میں اپنی دکان کھول کر پھنس گیا ہوں۔''

''یہی حال میرا بھی ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''بلکہ میں نے تو اپنا سارا مال اس ملنگ کو دے دیا ہے۔ کرنا ہی کیا ہے۔''

''منیر بھائی۔ مجھے ایک اور دکان مل گئی ہے۔'' اس نے بتایا ''وہ دکان ایک اچھے علاقے میں ہے۔ ساتھ ہی کپڑوں کی مارکیٹ ہے۔ عورتوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری دکان تم لے لو۔''

''کیا مطلب؟ کیسے لے لوں؟''

''خرید لو اس کو۔'' اس نے کہا۔ ''اور جب تمہارے پاس پیسے آجائیں تو مجھے دے دینا۔ میں ابھی پیسے بھی نہیں مانگ رہا۔ دکان تمہارے پاس جائے گی تو مجھے خوشی ہوگی۔''

نہ جانے اس میں کیا مصلحت تھی۔ میں تو خود اپنی دکان چھوڑنے کی سوچ رہا تھا۔ اب یہ ایک دوسری دکان میرے پاس آرہی تھی۔ بہرحال میں نے اس کی یہ آفر قبول کر لی۔ اب سوال یہ تھا کہ اس دکان کا کیا کروں۔

تیسرا یا چوتھا دن تھا کہ ایک آدمی میرے پاس آیا۔ وہ ایک پرچون فروش تھا۔ اسی کام کا تجربہ تھا اس کو۔ اس کی دکان کہیں اور تھی۔ لیکن اسے اب وہ دکان خالی کرنی تھی۔ اس نے دوسری دکان کرائے پر لینے کی بات کی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''بھائی سچ بتا دوں کہ یہ جگہ ایسی ہے کہ یہاں دکانداری نہیں چلتی۔ تم دکان کھول کر بیٹھے رہو گے۔ اور کچھ بھی نہیں ہوگا۔''

''کوئی بات نہیں۔ ایک رسک تو لینا ہی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اگر قسمت میں روزی ہوئی تو اس جگہ بھی اچھی روزی مل جائے گی۔ اگر نہیں ہوئی تو کہیں بھی کچھ نہیں ہوگا۔''

''اس نے وہ دکان کرائے پر لے لی۔ اس کے بعد ایک اور دکاندار اپنی دکان مجھے دے گیا۔ اس کی بھی دکان نہیں چل رہی تھی۔ وہ حلوا پوری بیچا کرتا تھا۔ اس نے بھی یہی کہا کہ اس کی دکان نہیں چل رہی، میں اس کی دکان لے لوں۔ میں نے اس کی دکان بھی لے لی۔ اور یہ اتفاق ہے کہ اب جو شخص دکان کرائے پر لینے آیا۔ وہ بھی حلوا پوری والا تھا۔ اس نے بھی یہی کہا کہ اگر اس کی قسمت ہوگی تو دکان چل جائے گی۔ ورنہ اللہ مالک ہے۔ ایک ایک کر کے آس پاس کی دکانیں میرے پاس آتی چلی گئیں۔ اور میں سترہ اٹھارہ دکانوں کا مالک بن گیا اور ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ ان میں سے ہر دکان چلنے لگی۔ جیسے اچانک دروازے کھل گئے ہوں۔ گھٹن ختم ہوگئی ہو۔ میرے حالات بدلتے جا رہے تھے۔ ایک دن میں نے غور کیا تو احساس ہوا کہ اس ملنگ نے اشارہ کر کے دکانوں کی جو باؤنڈری کھینچی تھی۔ میں ان سب دکانوں کا مالک بن گیا تھا۔''

''یہ تو بہت کمال کی بات ہوئی چاچا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ اور جب مجھے اس بات کا احساس ہوا تو میں اس ملنگ کی تلاش میں نکل گیا۔ کیوں کہ اس دن کے بعد سے وہ میرے پاس نہیں آیا تھا۔ کسی نے بتایا تھا کہ وہ میوہ شاہ کے قبرستان کے گیٹ پر بیٹھا رہتا ہے۔ میں وہیں پہنچ گیا۔

گیٹ ہی پر لوگوں کا مجمع دیکھ کر میں کھٹک گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ پالش والے بابا کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کے بعد کی کہانی یہ ہے بیٹا کہ میں نے ان کا مزار بنوا دیا ہے۔ کیوں کہ میں ان کی بس یہ خدمت کر سکتا تھا۔ تو کبھی میوہ شاہ قبرستان کی طرف جاؤ تو ان کا مزار بھی دیکھ لو گے۔ جس پر پالش والے بابا لکھا ہوا ہے۔ اور میرے پاس اب جو کچھ بھی ہے۔ وہ سب ان ہی کی دین ہے۔''

منیر چاچا کی کہانی ختم ہوگئی۔ اس دن کے بعد سے مجھ میں ایک تبدیلی یہ آئی ہے کہ اگر مجھے اس قسم کا کوئی مجذوب دکھائی دیتا ہے تو میں اس کے احترام میں ایک طرف ہٹ جاتا ہوں۔ یہ بڑے لوگ ہوتے ہیں۔

Downloaded From http://paksociety.com

ایم بی بی ایس کا امتحان دینے کے بعد ان دنوں میں فارغ تھا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا جانے کی تیاریاں کررہا تھا۔ میں نے وہاں کی تین چار یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے درخواست دے رکھی تھی اور اس انتظار میں تھا کہ ان میں سے کسی ایک یونیورسٹی میں داخلہ ہوجائے تو ویزا کے لیے درخواست دوں۔ امی میرے امریکا جانے کے حق میں نہیں تھی۔ ہر ماں کی طرح انہیں بھی یہ خدشہ تھا کہ میں امریکا سے کوئی گوری میم بیاہ کر لے آؤں گا۔ میں نے انہیں

پچھتاوا

محترم معراج رسول

آداب و نیاز

ہمارا معاشرہ کس طرح شکاریوں کی آماجگاہ بن چکا ہے اس کی ایک جھلک میں نے دکھائی ہے۔ مجھے کس طرح جال میں پھانسا گیا اس کو میں نے کہانی کے انداز میں بیان کیا ہے۔ میں کوئی پروفیشنل رائٹر تو ہوں نہیں اگر کہیں غلطی نظر آئے تو اسے درست کرلیں گے۔

عامر

(نیوجرسی)

Downloaded From http://paksociety.com

سمجھایا کہ امریکا میں مردوں کا قحط نہیں پڑ گیا جو وہاں کی لڑکی مجھ جیسے پھٹیچر ایشیائی سے شادی کرنے پر تیار ہو جائے گی جو خود پارٹ ٹائم ملازمت کر کے اپنی تعلیم مکمل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو لوگ امریکی لڑکیوں سے شادیاں کرتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف وہاں کی شہریت حاصل کرنا ہوتا ہے جب کہ میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن امی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی اور وہ یہی کہتی رہیں کہ اب تم ڈاکٹر بن گئے ہو۔ یہیں کوئی ملازمت کر لو۔ اب میں انہیں کیا سمجھاتا کہ سرکاری نوکری تو دیوانے کا خواب بن کر رہ گئی ہے اور پرائیویٹ اسپتال والے اتنی کم تنخواہ دیتے ہیں کہ اپنے آپ کو ڈاکٹر کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔

دوسری مخالفت ثمینہ کی طرف سے ہو رہی تھی۔ وہ میری چچازاد تھی اور بہت پہلے ہم دونوں کا رشتہ طے ہو چکا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور اسے میری جدائی ایک پل کے لیے گوارہ نہیں تھی۔ اسے جب میرے امریکا جانے کا پتا چلا تو وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور اس نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے التجا کی کہ میں امریکا نہ جاؤں۔ میرے لیے یہ ایک مشکل صورت حال تھی۔ میں خود اس سے جدا ہونا نہیں چاہتا تھا لیکن بہتر مستقبل کی خاطر مجھے یہ کڑوا گھونٹ لینا پڑ رہا تھا۔ جب میں نے اسے یہاں رہنے اور امریکا جانے کے فرق کے بارے میں بتایا تو اس کی سمجھ میں بات آ گئی لیکن جذباتی طور پر وہ اب بھی یہی چاہ رہی تھی کہ میں امریکا نہ جاؤں۔

اس روز موسم صبح سے ہی خوش گوار تھا۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور لگتا تھا کہ کسی وقت بھی بارش ہو سکتی ہے۔ میں ناشتے کے بعد اخبار پڑھ رہا تھا کہ ابو نے مجھے ایک لفافہ دیا اور کہا یہ وکیل ہمدانی کو دے آؤں۔ ابو کسی کام سے حیدرآباد جا رہے تھے ورنہ وہ خود ہی یہ لفافہ ہمدانی صاحب کو پہنچا دیتے۔ مجھے تھوڑی دیر بعد ویسے ہی گھر سے باہر نکلنا تھا۔ امجد نے رات ہی مجھے فون کر کے کہا تھا کہ صبح اس سے ضرور ملوں۔ وہ میرے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہ رہا تھا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی جب اس کے پاس باتوں کا ذخیرہ جمع ہو جاتا تھا تو وہ فون کر کے مجھے بلا لیتا یا خود میرے پاس آ جاتا۔ پھر ہم گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرتے۔ وہ میرا بچپن کا دوست تھا اور ہمارے درمیان کوئی بات پوشیدہ نہیں تھی۔ مجھے جب بھی کوئی مشکل یا پریشانی پیش آتی تو میں اسی سے مشورہ کرتا۔ وہ میرا انتہائی مخلص دوست تھا اور ہمیشہ میری بہتری کے لیے سوچا کرتا۔

میں نے اخبار میز پر رکھا اور شاور لینے باتھ روم میں چلا گیا۔ میں نے گھر سے نکلتے وقت امی سے کہہ دیا تھا کہ ہمدانی صاحب سے ملنے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے امجد کے پاس جاؤں گا۔ امی نے مجھے امجد کے گھر جانے سے منع کیا۔ ان کا خیال تھا کہ موسم کے تیور بگڑے ہوئے ہیں۔ کسی بھی وقت موسلا دھار بارش ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد سڑکوں پر اتنا پانی کھڑا ہو جائے گا کہ میں بائیک نہیں چلا سکوں گا۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ اگر بارش شروع ہو گئی تو گھر واپس آ جاؤں گا۔

ہمدانی صاحب کے پاس میں بمشکل پانچ منٹ رکا۔ انہوں نے دو چار رسمی باتیں کیں۔ ابو کی خیریت پوچھی۔ میرے امریکا جانے کے بارے میں دریافت کیا اور اپنے مخصوص انداز میں بولے۔ ''یار دیکھو، وہاں جا کر پیپر میرج نہ کر لینا۔ بہت بری طرح پھنس جاؤ گے۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''انکل! پیپر میرج وہ کرتے ہیں جنہیں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں اسٹوڈنٹ ویزا پر جا رہا ہوں اور تعلیم مکمل ہوتے ہی واپس آ جاؤں گا۔''

''میں جانتا ہوں کہ تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو، پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔''

ہمدانی صاحب کے دفتر سے باہر نکلا تو بارش شروع ہو گئی۔ میں نے امجد کے پاس جانے کا ارادہ ملتوی کیا اور سوچا کہ جب بارش رک جائے گی تو چلا جاؤں گا۔ ابھی آدھا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ بارش کی رفتار تیز ہو گئی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے میرے سامنے پانی کی چادر تان دی ہو۔ میں بڑی احتیاط سے بائیک چلا رہا تھا۔ اچانک ایک موڑ پر پہنچ کر خیال آیا کہ اگر یہاں سے دائیں جانب والی گلی میں مڑ جاؤں تو ایک لمبا چکر کاٹنے سے بچ جاؤں گا۔ اس گلی کو عبور کر کے میں اپنے گھر کے سامنے والی سڑک پر نکل سکتا تھا ورنہ اگر سڑک کے ذریعے جاتا تو مجھے دو میل جانے کے بعد ایک یوٹرن ملتا جہاں سے ایک راستہ میرے گھر کی طرف جاتا تھا۔

وہ گلی بہت تنگ تھی اور جگہ جگہ بچے پانی میں کھیل رہے تھے۔ آگے جا کر ایک چھوٹا سا چوک آیا، جہاں سے مجھے اپنے گھر جانے کے لیے بائیں جانب مڑنا تھا۔ وہ ایک نسبتاً چوڑی جگہ تھی جس کے دائیں جانب مکانات بنے ہوئے تھے۔ اچانک ہی ایک لڑکا میری بائیک کے سامنے

Downloaded From http://paksociety.com

آ گیا۔ میں نے اسے بچانے کے لیے بریک لگایا تو موٹر سائیکل الٹ گئی اور میں زمین پر گر گیا۔ مجھے گرتا دیکھ کر بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا اور وہ سب میرے گرد جمع ہو گئے۔ اس وقت بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا لیکن بادل اب بھی گرج رہے تھے۔ ان لڑکوں نے مجھے اٹھایا اور بائیک کو بھی اسٹینڈ پر کھڑا کر دیا۔ میں بری طرح بھیگ گیا تھا اور میری قمیص کیچڑ میں لت پت ہو گئی تھی۔

اچانک ہی سامنے والے گھر کا دروازہ کھلا اور اس میں ایک لڑکی کھڑی نظر آئی۔ اس نے اشارہ کر کے ایک لڑکے کو بلایا اور کہا کہ انہیں یہاں لے آؤ۔ اس لڑکے نے آ کر مجھ سے کہا کہ زرینہ باجی آپ کو بلا رہی ہیں۔ میں زرینہ کو جانتا تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ اس محلے میں کافی عرصے سے رہ رہی تھی۔ اس کی ماں کو طلاق ہو چکی تھی اور وہ چھوٹے موٹے کام کر کے اپنا گزارہ کر رہی تھی۔ ان دونوں ماں بیٹی کی شہرت اچھی نہیں تھی اور محلے والے انہیں منہ نہیں لگاتے تھے۔ زرینہ کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ محلے کے کئی لڑکوں سے اس کا افیئر چل رہا تھا اور وہ انہیں بے وقوف بنا کر پیسے اینٹھتی رہتی تھی۔

اس وقت میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے یا بائیک سے اچانک گر جانے کے باعث حواس باختہ ہو گیا تھا کہ زرینہ کی ہسٹری سے واقف ہونے کے باوجود اس کے گھر کی جانب چل دیا۔ دو لڑکے بائیک گھسیٹتے ہوئے میرے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے بائیک میں تالا لگایا۔ گرنے سے میری کمر میں چوٹ آئی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ اپنی کمر پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے بائیک کا ہینڈل پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ لڑکے جانے لگے تو ان میں سے ایک بولا۔ ''باجی! بھائی کو چائے کے ساتھ درد کی گولی بھی دے دینا۔ لگتا ہے زور کی چوٹ لگی ہے۔''

زرینہ نے ہاتھ اٹھا کر اس لڑکے کو مارنے کا اشارہ کیا اور ہنستے ہوئے بولی۔ ''اندر آ جائیں۔ ورنہ یہ لڑکے یونہی ریکارڈ لگاتے رہیں گے۔''

میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ گلی میں کوئی نہیں تھا۔ وہ لڑکے بھی اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ میں جھجکتا ہوا گھر میں داخل ہو گیا۔ وہ مجھے لے کر ایک کمرے کی جانب بڑھی اور ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کی شرٹ گندی ہو گئی ہے۔ مجھے دے دیں۔ دھو دیتی ہوں۔ یہیں پنکھے کے نیچے پھیلا دوں گی تو جلدی سوکھ جائے گی۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں رہنے دو۔ تم مجھے ایک گلاس پانی پلا دو۔ پھر میں چلوں گا۔'' پھر مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے پوچھا۔ ''خالہ کہاں ہیں؟''

''امی سلائی کے کپڑے دینے گئی تھیں۔ شاید بارش کی وجہ سے رک گئی ہوں گی۔'' پھر مجھے دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں بولی۔ ''جلدی کیا ہے، میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔ اتنی دیر میں شرٹ بھی سوکھ جائے گی۔''

مجھے خود بھی اس قمیص سے الجھن ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر اس حالت میں گھر گیا تو امی کے الٹے سیدھے سوالوں کا جواب دینا پڑے گا۔ لہٰذا میں نے قمیص اتار کر اسے دے دی۔ وہ تعریفی نظروں سے میرے جسم کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ماشاء اللہ آپ نے باڈی تو بڑی زبردست بنائی ہے بالکل سلمان خان جیسی۔''

میں جھینپتے ہوئے بولا۔ ''اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ یہ قدرتی ہے۔''

''چلیں آپ کہہ رہے ہیں تو مانے لیتی ہوں۔'' اس نے کہا اور قمیص لے کر باہر چلی گئی۔ میں نے کھلے ہوئے دروازے سے دیکھا، بارش اب بھی ہو رہی تھی اور وہ صحن کے پار دیوار کے ساتھ لگے ہوئے واش بیسن میں میری قمیص دھو رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اسے بارش میں بھیگنے کی کوئی پروا نہیں ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ قمیص لے کر آئی اور پنکھے کے نیچے دوسری کرسی رکھ کر اس نے وہ قمیص پھیلا دی۔ میں نے چور نظروں سے دیکھا کہ اس کے کپڑے بارش میں بھیگ کر پوری طرح جسم سے چپک گئے تھے لیکن اسے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ چائے بنانے چلی گئی اور میں بے صبری سے قمیص کو دیکھتا رہا کہ یہ سوکھ جائے تو میں گھر جاؤں۔

اچانک ہی بارش تیز ہو گئی۔ وہ چائے بنا کر لائی تو میری طرح پانی میں بھیگ چکی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ بھی کپڑے تبدیل کر لے ورنہ بیمار پڑ جائے گی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''بارش رک جائے تبھی تبدیل کروں گی۔ ورنہ بار بار باہر آنے جانے میں وہ بھی بھیگ جائیں گے۔''

میں نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور گیلی قمیص پہنتے ہوئے بولا۔ ''اچھا اب چلتا ہوں تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

''اتنی تیز بارش میں کیسے جائیں گے۔'' اچانک ہی بجلی زور سے کڑکی اور وہ ایک چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں اس افتاد سے بوکھلا گیا۔ اسے اپنے آپ سے علیحدہ کرنا چاہا لیکن ایک بار پھر بجلی کڑکی اور بادل بھی گرجنے لگے۔ اس نے مجھے

Downloaded From http://paksociety.com

مضبوطی سے جکڑ لیا۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ اس کے جسم کی حدت نے مجھے ہوش و حواس سے بے گانہ کر دیا اور پھر وہ کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

طوفان جس تیزی سے آیا، اسی تیزی سے گزر گیا لیکن ایک اور طوفان میرا منتظر تھا۔ بارش رک چکی تھی۔ میں نظریں چرائے بیٹھا ہوا تھا اور وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ میرے پاس صفائی میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ کہتا بھی کیا جو کچھ ہوا اس میں صرف میرا ہی قصور نہیں تھا بلکہ اس کی ذمے دار وہ خود تھی لیکن میں جانتا تھا کہ ایسے معاملات میں ہمیشہ مرد کو ہی قصور وار ٹھہرایا جاتا ہے۔ میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ کمرے کے دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا میں نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا وہاں اس کی ماں صغراں شعلہ بار نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا اور میری طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اب اگر تم ساری عمر صفائی پیش کرتے رہو تو بھی میری بیٹی کی کھوئی ہوئی عزت واپس نہیں آسکتی۔ اس لیے آرام سے بیٹھ جاؤ اور میری بات غور سے سنو۔''

میں ایک مجرم کی طرح کرسی پر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ میرے بارے میں کیا فیصلہ سناتی ہے۔ اس نے زرینہ کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا اور مجھ سے کہنے لگی۔ ''دیکھو لڑکے میں اگر چاہوں تو ابھی شور مچا کر پورے محلے کو اکٹھا کر سکتی ہوں لیکن اس سے کیا ہوگا۔ یہی کہ محلے والے مار مار کر تمہیں ادھ موا کر دیں گے۔ تمہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ تم پر زنا بالجبر کا کیس بن سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ قید اور کوڑوں کی سزا بھی سنا دی جائے۔ تمہارا مستقبل برباد ہو جائے گا۔ تمہارے عزت دار باپ کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ بہنیں باپ کی دہلیز پر کنواری بیٹھی رہ جائیں گی بھلا ایک زانی کے گھر رشتہ لے کر کون آئے گا۔ کیا تمہارا ضمیر یہ گوارا کرے گا کہ جو جرم تم نے کیا۔ اس کی سزا تمہارے پورے گھر کو ملے۔''

''نہیں۔'' میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

''اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ میں اپنی زبان بند رکھوں لیکن اس کے لیے تمہیں مجھ سے ایک سودا کرنا ہوگا۔''

''وہ کیا؟''

''تمہیں ابھی اور اسی وقت زرینہ سے نکاح کرنا ہوگا۔ یہ نکاح اس وقت تک خفیہ رہے گا جب تک تم اپنے گھر والوں کو اس کے لیے قائل نہیں کر لیتے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ انہیں کس طرح راضی کرتے ہو۔''

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔'' میں نے اپنے اندر تھوڑی ہمت پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''میں زرینہ سے کس طرح نکاح کر سکتا ہوں؟''

''میں نے کہہ دیا نا کہ فی الحال یہ نکاح خفیہ رہے گا۔ پھر تمہیں کیا پریشانی ہے؟''

''آپ سمجھ نہیں رہی ہیں۔ دراصل میں اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا جا رہا ہوں اور میری واپسی چار پانچ سال بعد ہو گی۔ کیا آپ اتنی دیر انتظار کر سکتی ہیں۔''

''یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔'' وہ اطمینان سے بولی۔ ''تم سال دو سال بعد اسے اپنے پاس بلا سکتے ہو۔''

اب میرے پاس اسے ٹالنے کے لیے کوئی بہانا نہیں تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ میرے لیے دونوں صورتیں ہی نا قابلِ مقبول تھیں۔ مجھے اپنی رسوائی منظور تھی اور نہ ہی زرینہ کو ساری عمر کے لیے گلے کا ہار بنا سکتا تھا۔ اس پریشانی میں مجھے ایک مفکر کا قول یاد آ گیا کہ جب دو برائیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو تو چھوٹی برائی کو ترجیح دو۔ میں نے دونوں برائیوں کا موازنہ کیا تو پہلی برائی زیادہ خطرناک تھی۔ اس میں رسوائی کے ساتھ ساتھ میرا کیریئر، بہنوں کا مستقبل اور خاندان کی عزت، سب کچھ داؤ پر لگ جاتا جب کہ نکاح کرنے کی صورت میں ان سارے نقصانات سے بچا جا سکتا تھا۔ اس وقت میں خالہ صغراں کا مجرم تھا۔ نکاح کے بعد داماد بن جاتا۔ شادی شدہ زندگی میں مرد کو برتری حاصل ہوتی ہے اور وہ حالات کا رخ اپنے حق میں کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی سوچ کر میں نے نکاح کے لیے ہاں کر دی۔

''ٹھیک ہے۔ میں قاضی اور گواہوں کو لینے جا رہی ہوں۔ تم نہا دھو کر تیار ہو جاؤ۔ یہاں سے بھاگنے کے بارے میں مت سوچنا۔ میں باہر سے تالا لگا کر جاؤں گی۔''

اس کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر سوچوں کے سمندر میں ڈوب گیا۔ میں نے نکاح کے لیے ہامی تو بھر دی تھی لیکن اس کا جو نتیجہ نکلتا تھا۔ اس کے بارے میں سوچ کر ہی میری روح فنا ہو رہی تھی۔ یہ بات تو طے تھی کہ میں کسی صورت بھی اپنے گھر والوں کو اس نکاح کے بارے میں نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ پہلا سوال یہی کرتے کہ مجھے زرینہ سے چوری چھپے نکاح کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اگر انہیں

Downloaded From http://paksociety.com

حقیقت بتا دیتا تو اپنے ہی گھر والوں کی نظروں میں مجرم ٹھہرتا۔ دوسرا مسئلہ ثمینہ کا تھا۔ جس دن اسے معلوم ہوتا کہ میں زرینہ سے نکاح کر چکا ہوں۔ وہ میری زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی جاتی اور یہ مجھے منظور نہیں تھا۔ میں ثمینہ کو کسی قیمت پر بھی کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اب میری عافیت اسی میں تھی کہ یہ نکاح زیادہ سے زیادہ دیر تک خفیہ رہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی طرح میری جان زرینہ سے چھوٹ جائے۔

صغراں نے واپس آنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ اپنے ساتھ قاضی، چار گواہ، مٹھائی کا ڈبہ اور پھولوں کے ہار بھی لائی تھی۔ میں نے ان چاروں گواہوں کو پہچاننے کی کوشش کی۔ ان میں کوئی بھی میرے محلے کا نہیں تھا۔ مجھے تو وہ چاروں پیشہ ور لگ رہے تھے۔ قاضی بھی دو نمبر لگ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے شناختی کارڈ مانگا اور نہ ہی نکاح کے فارم میں میرے کوائف درج کیے۔ بس دولہا کے خانے میں میرے دستخط لے لیے۔ اس وقت میری کیفیت ایسی تھی کہ ان باتوں پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بعد میں جب سوچا تو یہ سب باتیں میرے ذہن میں آئیں۔

قاضی نے نکاح پڑھوایا اور نکاح فارم پر گواہوں کے دستخط لینے کے بعد چلا گیا۔ وہ چاروں گواہ بھی اس کے ساتھ ہی رخصت ہوگئے۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد صغراں نے کہا۔ ”اب بھی تم گھر جا کر آرام کرو۔ کل شام کو آنا پھر ہم مزید بات کریں گے۔“

میں نے گھر جا کر بے دلی سے کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیسے ہوگیا اور اس کے بعد جو کچھ ہوگا میں اس سے کیسے نمٹوں گا۔ بس دماغ میں رہ رہ کر ایک ہی بات آرہی تھی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر امریکا چلا جاؤں اور وہاں سے کبھی واپس نہ آؤں۔ خالہ صغراں اور زرینہ میرا کیا بگاڑ لیں گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ وہ میرے گھر والوں کو حقیقت بتا دیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں صاف مکر جاؤں گا کہ میں نے کوئی نکاح نہیں کیا اور یہ نکاح نامہ جعلی ہے لیکن اس میں بھی ایک قیامت تھی اور وہ یہ کہ ثمینہ بھی مجھ سے بچھڑ جاتی جو مجھے کسی قیمت پر بھی گوارہ نہیں تھا۔ بہت سوچنے کے بعد میرے دماغ میں ایک ہی بات آئی کہ امجد کو اس راز میں شریک کیا جائے۔ وہی مجھے کوئی صحیح مشورہ دے سکتا ہے۔

میں نے بستر سے چھلانگ لگائی اور امجد سے ملنے چل دیا۔ وہ میرے صبح نہ آنے پر کافی ناراض لیکن جب میں نے

سردار کی بس نہر میں گر گئی
پولیس۔ ”بس کیسے گری؟“
سردار۔ ”مجھے نہیں پتا؟“
پولیس۔ ”کیوں؟“
سردار۔ ”وہ آج کنڈیکٹر نہیں آیا تو میں پیچھے لوگوں سے کرایہ لینے میں لگا ہوا تھا۔“

اسے وجہ بتائی تو اس کی ناراضی کچھ کم ہوئی۔ پھر میں نے اسے صبح والا واقعہ تفصیل سے سنایا۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے سنتا رہا اور درمیان میں اس نے کوئی مداخلت نہیں کی جب میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ بولا۔ ”اب کیا چاہتے ہو؟“

اس کی بات سن کر میرا دماغ گھوم گیا اور میں جھلاتے ہوئے بولا۔ ”کمال کرتے ہو یار۔ پورا قصہ سننے کے بعد پوچھ رہے ہو کہ زلیخا مرد تھی یا عورت؟“

”ناراض ہونے کی ضرورت نہیں میرے دوست۔“ وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔ ”سب کچھ تو تم کر چکے۔ اب مجھ سے کیا مشورہ لینے آئے ہو؟“

”تمہی بتاؤ۔ میں کیا کرتا۔ حالات ہی ایسے ہو گئے تھے کہ مجھے نکاح کے لیے راضی ہونا پڑا۔“

”غلطی تو تم سے بعد میں ہوئی۔ تم اس سے پہلے ایک بہت بڑی غلطی کر چکے تھے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں نے کون سی غلطی کر دی؟“

”جب اس لڑکی نے اپنے گھر بلایا تو تمہیں اندر نہیں جانا چاہیے تھا جب کہ تم اس کے کریکٹر کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے تم گھر جا کر بھی اپنا حلیہ درست کر سکتے تھے۔“

”بس یار اس وقت میری عقل کام نہیں کر رہی تھی۔ موٹر سائیکل سلپ ہو جانے کی وجہ سے میں بوکھلا گیا۔ اوپر سے وہ لڑکے بھی میرا مضحکہ خیز حلیہ دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔ چنانچہ میری سمجھ میں فوری طور پر یہی آیا کہ اندر جا کر اپنا حلیہ ٹھیک کرلوں۔“

”دوسری غلطی تم سے یہ ہوئی کہ جب تمہیں معلوم ہوگیا تھا کہ اس کی ماں گھر پر نہیں ہے پھر بھی تم وہاں رکے رہے حالانکہ تمہیں فوراً واپس آجانا چاہیے تھا۔“

”بس یار کیا بتاؤں۔ بس یوں سمجھ لو کہ دماغ کام نہیں

Downloaded From http://paksociety.com

کرر ہا تھا۔''

''دماغ کو دوش نہ دو۔ یوں کہو کہ اس لڑکی کا حسن، بھیگا بدن اور ادائیں دیکھ کر تمہارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہوگئی اور وہ جو کہتی گئی تم وہی کرتے گئے۔ اس کے بعد جو ہوا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔''

''جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔'' میں بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔''اب میں کیا کروں؟''

''کچھ نہیں۔ اب تمہارے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔ سوائے اس کے کہ تم دیکھو اور انتظار کرو، کی پالیسی پر عمل کرو۔''

''میں سمجھا نہیں کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''دیکھو یار، جہاں تک میری عقل کام کر رہی ہے اس لڑکی نے تمہیں پھانسنے کے لیے جال بچھایا تھا اور تم اس میں پھنس گئے۔ وہ جانتی ہے کہ تم ایک بڑے باپ کے بیٹے ہو۔ امریکا جا رہے ہو اور تمہارا مستقبل روشن ہے۔ پہلے وہ محلے کے لڑکوں کو بے وقوف بنا کر پیسے اینٹھتی تھی۔ اب اسے ایک مستقل آسامی مل گئی ہے جو اسے روپوں کی بجائے ڈالر بھیجے گا۔ مجھے تو یہ سراسر بلیک میلنگ لگتی ہے تم کہہ رہے ہو کہ قاضی نے نکاح نامہ پورا نہیں بھرا تھا۔''

''ہاں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ نکاح نامہ میں دولہا دلہن، دلہن کے باپ یا سرپرست اور چاروں گواہوں کے نام پتے اور شناختی کارڈ نمبر لکھے جاتے ہیں پھر قاضی جو عموماً نکاح رجسٹرار بھی ہوتا ہے۔ اس نکاح نامہ کو مقامی یونین کونسل میں رجسٹر کرواتا ہے اور اسی کی بنیاد پر نادرا میرج سرٹیفکیٹ جاری کرتا ہے اور تب اس شادی کو قانونی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب نکاح نامہ ہی نامکمل ہے تو یہ ساری کارروائیاں کس طرح پوری ہوں گی۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو امجد۔'' میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔''واقعی میں نے ان باتوں پر غور نہیں کیا۔ اب میں کیا کروں؟''

''کچھ نہیں اس عورت نے تمہیں کل شام بلایا ہے۔ تم ایک سعادت مند داماد کی طرح اس سے ملنے جاؤ اور دیکھو کہ وہ کیا کہتی ہے پھر مجھے بتانا۔''

امجد سے ملنے کے بعد میں کسی حد تک پُرسکون ہو گیا اور میرا دماغ بھی کام کرنے لگا۔ میں خود بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ اس عورت نے نکاح کا ڈراما رچایا ہے۔ جب نکاح نامہ میں کوائف ہی درج نہیں کیے گئے تو یونین کونسل میں اس کی رجسٹریشن کس طرح ہوگی۔ میرج سرٹیفکیٹ کیسے بنے گا۔ اس نے صرف صورتِ حال کا فائدہ اٹھا کر زرینہ کو مجھ سے نتھی کر دیا تاکہ وہ بیوی بن کر میری جیب خالی کرتی رہے۔ امجد نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اب مجھے دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر عمل کرنا ہے۔ آنے والے دنوں میں زرینہ اور اس کی ماں کی طرف سے کیا مطالبات سامنے آتے ہیں اور کیا میں انہیں پورا کر سکوں گا یا نہیں۔

دوسرے دن شام کو اپنی سسرال گیا تو وہاں میرا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ خالہ صغراں نے جاتے کے ساتھ مٹھائی اور سموسوں کا بھی بندوبست کیا تھا۔ میرا کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے صرف چائے پینے پر ہی اکتفا کیا۔ جب زرینہ چائے کے برتن لے کر چلی گئی تو خالہ مطلب کی بات زبان پر لاتے ہوئے بولی۔''کل میں نے کسی مجبوری کی وجہ سے اس نکاح کو خفیہ رکھنے کا وعدہ کر لیا تھا لیکن زیادہ عرصہ تک یہ بات نہیں چھپائی جا سکتی۔ تم جانتے ہو کہ جس گھر میں بیری ہو، وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں اگر کل کلاں کو زرینہ کا کوئی رشتہ آ گیا تو میں کیا کہوں گی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم زرینہ کو جلد از جلد رخصت کر کے اپنے گھر لے جاؤ۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے مجھے اپنے گھر والوں کو ہموار کرنا پڑے گا۔ وہ میرا رشتہ کسی اور جگہ طے کر چکے ہیں۔ اس لیے آسانی سے نہیں مانیں گے۔ ویسے بھی یہ نکاح اسی شرط پر ہوا تھا کہ حالات سازگار ہونے تک اسے خفیہ رکھا جائے گا۔''

''اے لو، میں کون سا ڈھنڈورا پیٹتے جا رہی ہوں۔'' وہ تنک کر بولی۔''ٹھیک ہے اگر اسے خفیہ ہی رکھنا چاہتے ہو تو کوئی الگ گھر لے لو۔''

''یہ بھی ممکن نہیں ہے۔'' میں نے بے خوف ہوتے ہوئے کہا۔''میری تعلیم ختم ہوئے چند ماہ ہی ہوئے ہیں اور ابھی میری کوئی جاب بھی نہیں ہے۔ میں تو خود اپنے اخراجات کے لیے گھر والوں کا محتاج ہوں اور آپ کو تو پتا ہی ہے کہ ویسے بھی میں مزید پڑھنے کے لیے امریکا جا رہا ہوں۔ اس لیے زرینہ فی الحال آپ کے پاس ہی رہے گی۔''

''اے ہے تو کیا یہ پانچ سال تک میرے سینے پر مونگ دلتی رہے گی۔''

''میں کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اسے کب اپنے

Downloaded From http://paksociety.com

پاس بلاسکوں گا۔ سال دو سال تو مجھے سیٹ ہونے میں ہی لگ جائیں گے۔ اس کے بعد شاید کچھ بندوبست ہو سکے۔"

"میں تمہاری مجبوری سمجھ رہی ہوں۔" وہ مکاری سے بولی۔ "جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔ اسے بلا لینا۔ میرا کیا بھروسا کس وقت آنکھ بند ہو جائے لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا کہ اب یہ تمہاری بیوی ہے اور اس کے نان ونفقہ کی ذمے داری تم پر عائد ہوتی ہے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہونا۔"

"اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

"تمہیں شاید میری بات بری لگ گئی۔" وہ سہم کر بولی۔ "میں تو صرف تمہیں ذمے داری یاد دلا رہی تھی۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "تم اپنی بیوی سے باتیں کرو۔ میں ایک کام سے باہر جا رہی ہوں۔ تھوڑی دیر میں آجاؤں گی۔"

اس کے جانے کے بعد زرینہ میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اس نے عام سے کپڑے پہن رکھے تھے اور کوئی میک اپ بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے اسے چھیڑنے کی خاطر کہا۔ "ارے ایک دن کی دلہن ان کپڑوں میں۔ کوئی دیکھ لے تو کیا کہے گا۔"

وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔ "کیا کہے گا۔ یہی نا کہ میرے پاس پہننے کے لیے کپڑے نہیں ہیں۔ میری تو بری بنی نہ جہیز اور نہ ہی کوئی زیور۔ ایسی ہوتی ہے شادی۔ اس سے بھی بڑا ظلم یہ کہ میں سب کے سامنے آپ کو اپنا شوہر بھی نہیں کہہ سکتی۔"

"معاف کرنا، یہ سب تمہاری ماں کی جلد بازی کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ مجھ پر اعتبار کر لیتیں تو یہ نوبت نہ آتی اور میں تمہیں دھوم دھام سے بیاہ کر لے جاتا۔"

"خیر جو ہوا سو ہوا۔ شاید میری قسمت میں یہی لکھا تھا۔" وہ اپنے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ "اب آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ میں نے خالہ کو پوری بات سمجھا دی ہے۔ فی الحال تمہیں یہیں رہنا ہوگا۔ میں ہر مہینے ماہانہ خرچ دیتا رہوں گا۔"

"لیکن آپ تو امریکا جا رہے ہیں۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں ایسا بندوبست کر کے جاؤں گا کہ تمہیں ہر مہینے باقاعدگی سے پیسے ملتے رہیں۔"

"اوہ۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ "میں تو ڈر رہی تھی کہ کہیں امریکا جا کر مجھے نہ بھول جائیں۔"

"تمہیں تو ساری زندگی نہیں بھول سکتا۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "کل میرے ساتھ چلنا شاپنگ کے لیے۔ اپنے لیے کچھ کپڑے اور میک اپ کا سامان خرید لینا۔"

"اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو۔"

"ہاں یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ پھر کیا کیا جائے۔"

"آپ مجھے پیسے دے دیں۔ میں امی کے ساتھ جا کر اپنی مرضی سے شاپنگ کر لوں گی۔"

وہ بڑی چالاک لڑکی تھی۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے میری جیب سے پیسے نکالنے کا پروگرام بنایا تھا وقتی طور پر مجھے اس کی تجویز سے اتفاق کرنا پڑا کیونکہ میں ان لوگوں کے پوشیدہ عزائم جاننا چاہ رہا تھا۔ میں دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔ اب میرا رخ امجد کے گھر کی جانب تھا۔ اسے تازہ ترین رپورٹ دے کر آیندہ کا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ جب میں نے اسے پوری بات بتائی تو وہ بولا۔

"اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ لوگ تمہیں بلیک میل کر رہے ہیں۔ وہ جان گئی ہیں کہ تم اپنی عزت کی خاطر ان کے مطالبات اور فرمائشیں پوری کرتے رہو گے۔"

"لیکن میں یہ سب افورڈ نہیں کر سکتا۔" میں نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ "تم میری پوزیشن سمجھتے ہوا بھی تو میں خود دوسروں کا محتاج ہوں۔"

"کچھ بھی ہو۔ ان کا منہ بند کرنے کے لیے تمہیں یہ چھوٹے موٹے مطالبات تو پورے کرنا پڑیں گے، جب تک تم باہر نہیں چلے جاتے۔"

"نہیں یار، مجھے لگتا ہے کہ یہ سلسلہ رکنے والا نہیں۔ جیسے ہی میں نے ہاتھ روکا۔ وہ روتی پیٹتی میرے گھر پہنچ جائیں گی۔"

تمہاری ساس کی باتوں سے تو ایسا لگتا ہے کہ اسے اپنی بیٹی کا گھر بسانے سے زیادہ رقم بٹورنے سے دلچسپی ہے ورنہ وہ نان نفقہ کی بات کرنے کی بجائے بیٹی کی رخصتی پر زور دیتی لیکن پہلے ہمیں اس نکاح کی حقیقت معلوم کرنا ہے۔ اب تم جاؤ تو ساس سے کہنا کہ اس نکاح نامہ کی ایک نقل تمہیں بھی دے دے۔ زرینہ کا پاسپورٹ بنوانے کے لیے اس کی ضرورت پڑے گی۔

اس کی تجویز معقول تھی۔ اس طرح مجھے نکاح نامہ کی حقیقت معلوم ہو جاتی۔ گھر آیا تو امی نے مجھے ایک بڑا سا لفافہ تھما دیا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں میرے لیے ایک خوش

Downloaded From http://paksociety.com

خبری تھی۔ میرا ایڈمیشن امریکا کی ایک معروف یونیورسٹی میں ہو چکا تھا۔ سیشن شروع ہونے میں تین مہینے باقی تھے۔ اس دوران مجھے ایڈمیشن فیس جمع کروانے کے علاوہ ویزے کا بھی بندوبست کرنا تھا۔ ایڈمیشن فیس کی تو مجھے فکر نہیں تھی۔ ابو نے پہلے ہی اس کا انتظام کر رکھا تھا۔ البتہ ویزے کے حصول میں کچھ وقت لگ سکتا تھا۔ ابو نے مجھے تاکید کی کہ وقت ضائع کیے بغیر ویزے کی درخواست جمع کرا دوں اور چچا کو بھی یہ خوش خبری سنا دوں۔ وہ کئی بار اس بارے میں پوچھ چکے تھے۔

ثمینہ سے ملاقات کرنے کا یہ ایک اچھا موقع تھا۔ ویسے بھی اس سے ملے ہوئے کئی دن ہو چکے تھے اور میں شدت سے اسے یاد کر رہا تھا۔ اس سے مل کر مجھے ہمیشہ دلی خوشی ہوتی تھی۔ پہلے وہ میری کزن تھی پھر دوست بنی اور اب محبوبہ کے درجہ پر فائز ہو گئی تھی۔ جب تک ہمارا رشتہ طے نہیں ہوا۔ میرے دل میں اس کے لیے کوئی جذبہ بیدار نہیں ہوا تھا۔ بس وہ مجھے اچھی لگتی تھی اس کی ہر ادا دل نشین تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ گھنٹوں اس کے سامنے بیٹھ کر اس کی میٹھی میٹھی باتیں سنتا رہوں۔ اس کے چہرے کی ملاحت اور دلکش ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کو آنکھوں کے راستے دل میں اتار لوں۔ وہ بہت حسین نہیں لیکن پُرکشش ضرور تھی۔ میں اسے دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کے لیے بہانے بہانے چچا کے گھر جایا کرتا۔

وہ بھی مجھے دیکھ کر کھل اٹھتی تھی۔ جیسے ہی میں گھر میں داخل ہوتا وہ فوراً میرے لیے چائے بنا کر لاتی۔ پھر میرے پاس بیٹھ کر خوب باتیں کیا کرتی۔ اسے رسالے پڑھنے کا شوق تھا۔ میں اس کے پسندیدہ رسالے خرید کر لاتا تو خوش ہو جاتی۔ وہ بھائیوں کی بجائے اپنے ہر کام کے لیے مجھ سے کہا کرتی اور میں بھی دوڑ دوڑ کر اس کے سارے کام کیا کرتا۔ جب ہمارا رشتہ طے ہوا تو مجھے یوں لگا کہ دنیا بھر کی خوشیاں میری جھولی میں آن گری ہیں۔ میرے دل میں اس کے لیے چھپی ہوئی محبت اچانک ہی بیدار ہو گئی اور جب میں نے تنہائی ملنے پر اس سے اظہار محبت کیا تو اس نے شرماتے اور جھجکتے ہوئے اقرار کیا کہ وہ بھی ہمیشہ سے ہی مجھے پانے کا خواب دیکھا کرتی تھی۔

اب ہمارے درمیان کوئی حجاب باقی نہیں رہا۔ ہم ایک دوسرے کو پانے کی خوشی میں مگن تھے ہمارے ملن کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اگر امریکا جانے کا سلسلہ نہ ہوتا تو شاید ہماری شادی بھی ہو چکی ہوتی۔ اب بھی امی یہی چاہ رہی تھیں کہ جانے سے پہلے میرا ثمینہ سے نکاح کر دیا جائے لیکن ابو اس کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پہلے میں اپنی تعلیم مکمل کر لوں پھر نکاح اور رخصتی ایک ساتھ ہی کر دی جائے گی۔ ایک جانب تو میری اور ثمینہ کی شادی ہو رہی تھی تو دوسری طرف ناگہانی طور پر زرینہ میری بیوی بن گئی۔ گویا اب میں دو کشتیوں میں سواری کر رہا تھا جس کا انجام بہت بھیانک ہوتا۔

سچ تو یہ ہے کہ زرینہ اور ثمینہ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ثمینہ خوب صورت، پڑھی لکھی اور سمجھ دار لڑکی تھی۔ اسے پہننے اوڑھنے اور گفتگو کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ وہ امور خانہ داری کی ماہر تھی۔ اس کے مقابلے میں زرینہ نری پینڈو تھی۔ نیم خواندہ، بدسلیقہ، پھوہڑ، اسے الٹے سیدھے فیشن کرنے اور بے تکی باتیں کرنے کے علاوہ کچھ نہیں آتا تھا۔ اس کے بارے میں محلے والوں کی رائے بھی اچھی نہیں تھی۔ اس کا اور میرا کوئی جوڑ ہی نہیں تھا لیکن حالات کی ستم ظریفی نے مجھے اس کا شوہر بنا دیا تھا۔

میرے پہنچنے سے پہلے ہی چچا کو یہ خبر مل گئی تھی۔ غالباً ابو نے فون کر کے بتایا ہوگا۔ چچا، چچی اور ان کے بیٹے سبھی خوش تھے۔ البتہ ثمینہ کا منہ پھولا ہوا تھا۔ اس نے معمول کے مطابق میرے لیے چائے بنائی اور پیالی مجھے پکڑاتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولی۔ ”اتنی بڑی خوشی ملی ہے اور مٹھائی کے بغیر ہی چلے آئے، کنجوس کہیں کے۔“

”ویزا تو لگ جانے دو۔ پھر مٹھائی بھی کھا لینا۔“

”جب ایڈمیشن ہو گیا ہے تو ویزا بھی لگ ہی جائے گا۔ پریشانی کس بات کی ہے۔“ چچا بولے۔

”پریشانی تو کوئی نہیں۔ میں نے تو بس یونہی ایک بات کہہ دی تھی۔“

اس کے بعد میں کچھ دیر چچا اور چچی سے باتیں کرتا رہا۔ پھر چچا نماز پڑھنے چلے گئے اور چچی بھی گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔ ان کے جانے کے بعد ثمینہ نے میری طرف دیکھا اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ”تو کیا تم واقعی چلے جاؤ گے؟“

”ہاں تمہیں یقین نہیں آ رہا کیا؟“

”یقین تو آ رہا ہے لیکن سوچتی ہوں کہ اتنی لمبی جدائی کیسے برداشت کروں گی۔ تمہیں ایک ہفتہ نہ دیکھوں تو دل بے چین ہونے لگتا ہے۔“

”کچھ یہی حال میرا بھی ہے لیکن اپنے اور تمہارے

Downloaded From http://paksociety.com

بہتر مستقبل کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑے گا۔ بہر حال تم فکر نہ کرو۔ میں کوشش کروں گا کہ جلد از جلد تمہیں بیاہ کر اپنے ساتھ لے جاؤں۔''

''مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''تم وہاں پڑھنے جا رہے ہو مجھے اپنے ساتھ کیسے رکھ سکتے ہو۔''

''میں نے سب معلومات کرلی ہیں۔ یہ تو طے ہے کہ مجھے پڑھائی کے ساتھ ساتھ پارٹ ٹائم جاب بھی کرنا ہوگی۔ تبھی وہاں کے اخراجات پورے ہو سکتے ہیں۔ اگر کوئی اچھی جاب مل گئی تو دو آدمیوں کا گزارا با آسانی ہوسکتا ہے۔ اس وقت تک تمہارا ماسٹرز مکمل ہو جائے گا۔ تم بھی کوئی جاب کر سکتی ہو۔''

''پلان تو اچھا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس پر عمل کس طرح ہوتا ہے۔'' وہ کچھ مطمئن ہوتے ہوئے بولی۔

''نیت صاف ہو تو منزل خود بخود آسان ہو جاتی ہے۔'' میں نے پورے یقین سے کہا۔ ''انشاء اللہ وہی ہوگا جو ہم سوچ رہے ہیں۔''

ایک طرف تو میں ثمینہ کو مستقبل کے سنہرے خواب دکھا رہا تھا تو دوسری جانب میرا دل انجانے اندیشوں اور وسوسوں میں گھرا ہوا تھا۔ جس گرداب میں پھنس چکا تھا۔ اس سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ زرینہ ایک بھوت کی طرح میرے دل و دماغ پر مسلط ہو چکی تھی۔ اس سے چھٹکارا حاصل کیے بغیر میں ثمینہ سے شادی نہیں کر سکتا تھا اگر وہ عین وقت پر نکاح نامہ لے کر پہنچ جاتی تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ یہی سوچ سوچ کر میرا دماغ ہلکان ہو رہا تھا لیکن اس سے نجات حاصل کرنے کی کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

دوسرے دن میں نے بینک سے پانچ ہزار روپے نکلوائے اور زرینہ سے ملنے چل دیا۔ ان ماں بیٹی کا منہ بند رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ میں انہیں وقفے وقفے سے کچھ نہ کچھ دیتا رہوں۔ یہ ایک طرح سے اس غلطی کا جرمانہ تھا جو مجھ سے سرزد ہو گئی تھی لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا۔ میرا کوئی ذریعہ آمدنی تو تھا نہیں کہ زرینہ کو باقاعدگی سے خرچ دیتا۔ ابو مجھے ہر ماہ ایک معقول رقم جیب خرچ کے طور پر دیتے تھے۔ اس میں سے جو پیسے بچ جاتے وہ میں اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیتا۔ اس طرح میرے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی تھی۔

زرینہ کے گھر پہنچا تو وہاں ایک نیا تماشا دیکھا۔ دروازے پر ایک آدمی کھڑا زور زور سے چلا رہا تھا اور زرینہ کی ماں ہاتھ نچا نچا کر اس سے لڑ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ شخص خاموش ہو گیا پھر زرینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اس وقت تو میں جا رہا ہوں لیکن اگر ایک ہفتے میں پیسوں کا انتظام نہ ہوا تو پولیس لے کر آؤں گا۔''

خالہ صغراں بھی کچھ کم نہ تھی۔ اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ارے جا بڑا آیا پولیس لانے والا۔ تیری ٹانگیں توڑ دوں گی اگر میرے گھر میں قدم رکھنے کی کوشش کی۔''

اس آدمی کے جانے کے بعد میں نے خالہ صغراں کو اندر چلنے کا اشارہ کیا اور گھر کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔

''یہ آدمی کون ہے اور کیوں اتنا شور کر رہا تھا؟''

''ارے بھیا! پرچون فروش ہے۔ ہمارے یہاں اسی کی دکان سے سودا آتا ہے اس کے کچھ پیسے دینے ہیں۔ اس کا تقاضا کر رہا تھا۔''

''اس کا جو حساب بنتا ہے۔ وہ دے کر فارغ کریں۔ ورنہ وہ پھر اگلے ہفتے آ کر شور کرے گا۔''

''سو دو سو کی بات ہوتی تو اب تک دے چکی ہوتی۔ یہاں ایک دو نہیں پورے پندرہ ہزار چڑھ چکے ہیں۔''

''لیکن اتنا ادھار ہوا کیسے؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو چاہیے تھا کہ مہینے کے مہینے اسے ادائیگی کرتی رہتیں۔''

''یہ تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ تمہیں ہمارے حالات کا علم نہیں ہے۔'' خالہ صغراں نے روہانسی آواز میں کہا۔ ''ہم دونوں ماں بیٹی جس طرح زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ وہ ہمارا دل ہی جانتا ہے۔ کوئی مستقل ذریعہ آمدنی تو ہے نہیں۔ محلے والوں کے کپڑے سی کر گزارہ کرتی ہوں۔ کبھی کام مل جاتا ہے کبھی نہیں، اسی وجہ سے ادھار چڑھ جاتا ہے۔''

وہ جو کچھ کہہ رہی تھی۔ مجھے اس میں سچ کہیں نظر نہیں آیا۔ گھر کی حالت سے بھی غربت یا مفلوک الحالی کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ ہم جس کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں درمیانی قیمت کا صوفہ سیٹ، شیشے کی سینٹر ٹیبل اور ایک کونے میں اکیس انچ کا فلیٹ اسکرین ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ اس روز زرینہ نے جو سوٹ پہن رکھا تھا اس کی مالیت بھی دو ڈھائی ہزار سے کم نہیں تھی۔ میرے لیے خالہ صغراں کی بات پر یقین

Downloaded From http://paksociety.com

کرنا بہت مشکل تھا کہ ان کا گزارہ مشکل سے ہو رہا ہے۔

زرینہ چائے لے کر آئی اور پیالی میز پر رکھ کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ میں نے پانچ ہزار روپے اس کے ہاتھ پر رکھے اور کہا۔ ”فی الحال اپنے لیے دو جوڑے بنا لو۔ باقی خریداری بعد میں کر لینا۔“

زرینہ کا منہ اتر گیا اور وہ بولی۔ ”یہ تو بہت کم ہیں۔ اتنے پیسوں میں کیا ہوگا؟“

”تمہیں اس سے زیادہ کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہیے۔ اچھی طرح جانتی ہو کہ میرا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔ یہ پیسے بھی اپنے جیب خرچ میں سے دے رہا ہوں۔“

”لا زرینہ یہ پیسے مجھے دے دے۔“ خالہ صغراں نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”وہ کم بخت آئے گا تو اس کے منہ پر مار دوں گی۔ کپڑوں کا کیا ہے بعد میں بھی بن جائیں گے۔“

زرینہ نے خاموشی سے وہ پیسے ماں کو پکڑا دیے پھر خالہ صغراں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”کیا کروں بیٹا منہ سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ تم بھی سوچو گے کہ دو دن شادی کو نہیں ہوئے اور ساس نے فرمائشیں شروع کر دیں لیکن تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں۔ میرے لیے تو داماد ہی بیٹے کے برابر ہے۔ اگر ہو سکے تو پانچ ہزار کا بندوبست اور کر دو تاکہ میں دس ہزار دے کر اس کم بخت کا منہ بند کر دوں۔“

”کوشش کروں گا لیکن وعدہ نہیں کرتا۔“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا پھر اچانک مجھے کچھ یاد آ گیا۔ میں نے خالہ سے کہا۔ ”مجھے نکاح نامہ کی ایک نقل چاہیے۔ زرینہ کا پاسپورٹ بنوانے کے لیے اس کی ضرورت ہوگی۔“

”ارے مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔“ خالہ اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ”میں کل ہی مولوی کے پاس جاتی ہوں۔ وہ ابھی تک نکاح نامہ اپنے پاس دبائے بیٹھا ہوا ہے۔ اسے فیس جو نہیں ملی۔“

میں نے فیس والی بات سنی ان سنی کر دی اور کہا۔ ”کچھ بھی ہو۔ مجھے ہر حال میں نکاح نامے کی نقل چاہیے۔ اس کے بغیر زرینہ کا پاسپورٹ نہیں بن سکتا اور یہ کبھی امریکا نہیں جا سکے گی۔“

”ایسی جلدی بھی کیا ہے۔“ خالہ تنک کر بولی۔ ”پہلے تم تو چلے جاؤ۔ اس کا پاسپورٹ بھی وقت آنے پر بن جائے گا۔“

میں گھر جانے سے پہلے امجد کے پاس گیا اور اسے پوری رپورٹ سنا دی۔ اس نے کہا۔ ”میرا شک یقین میں بدلتا جا رہا ہے۔ اس عورت نے پیسے بٹورنے کے لیے تمہیں گھیرا ہے۔ آج اس نے پرچون فروش والا ڈراما کیا۔ وہ اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ وہ تمہیں یونہی بلیک میل کرتی رہے گی اور تم ڈر کے مارے اس کے مطالبات پورے کرتے رہو گے۔ مجھے تو شک ہو رہا ہے کہ نکاح نامہ کا بھی کوئی وجود نہیں ہے۔ اگر اس نے ایک ہفتے کے اندر فراہم نہ کی تو سمجھ لینا کہ اس لڑکی سے تمہارا نکاح سرے سے ہوا ہی نہیں وہ بھی ایک ڈراما تھا۔“

”اس نے تو مجھ سے مزید پانچ ہزار روپوں کا مطالبہ کیا ہے؟“

”صاف منع کر دو۔ کہہ دینا کہ تمہارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں جب مہینے پر جیب خرچ ملے گا تو اس میں سے زرینہ کو خرچا دے دوں گا۔“

”کہیں وہ طیش میں آ کر بھانڈا نہ پھوڑ دے۔“ میں نے اپنے خوف کا اظہار کیا۔

”وہ تمہارے اسی خوف سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ کبھی تمہارا راز فاش نہیں کرے گی کیونکہ اس میں اسی کا نقصان ہے۔ اسے جو کچھ مل رہا ہے، وہ اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گی۔ بس تم کسی طرح امریکا جانے تک معاملے کو سنبھالو۔ پھر بھول جانا کہ زرینہ نام کی کوئی لڑکی تمہاری زندگی میں آئی تھی۔“

امجد کی باتوں سے مجھے بہت ڈھارس ہوئی۔ اس کے باوجود مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ اگر زرینہ کی ماں کو پانچ ہزار نہ دیے تو کہیں وہ غصے میں آ کر کوئی سخت قدم نہ اٹھا لے۔ چنانچہ میں نے اس کا منہ بند رکھنے کے لیے ایک بار پھر اپنے اکاؤنٹ سے پانچ ہزار روپے نکلوائے اور چپکے سے جا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ یہ پیسے ایک دوست سے لیے ہیں۔ اب پہلی تاریخ سے پہلے میں اسے کچھ نہیں دے سکوں گا۔

میں نے ویزے کے لیے درخواست دے رکھی تھی۔ انٹرویو بھی ہو گیا تھا۔ اب صرف ویزے کا انتظار تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے جانے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ اس موقع پر ثمینہ نے میرا بہت ساتھ دیا۔ زیادہ تر شاپنگ اسی نے کروائی۔ وہ بالکل بیویوں کے انداز میں میرے سارے کام کر رہی تھی۔ اس دوران میں دو تین دفعہ زرینہ

Downloaded From http://paksociety.com

سے ملنے گیا لیکن خالہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں نے زرینہ سے نکاح نامے کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ مولوی اپنے گاؤں گیا ہوا ہے۔ اس کے واپس آنے پر ہی نکاح نامہ ملے گا۔

یہ سن کر مجھے غصہ آگیا اور میں نے کہا۔ ''اگر وہ واپس نہیں آیا تو......؟''

''کیوں؟ واپس کیوں نہیں آئے گا۔'' وہ تنک کر بولی۔ ''یہاں اس کا گھر ہے، مسجد ہے۔''

''فرض کرو اسے سانپ نے کاٹ لیا۔ اسے کسی گاڑی والے نے ٹکر ماردی یا وہ نہر میں ڈوب کر مر گیا۔ پھر کیا ہوگا.... ہمیں نکاح نامہ کیسے ملے گا۔ ہمارے پاس اس نکاح کا کیا ثبوت ہے؟''

''ہاں یہ تو ہے۔'' وہ فکرمند ہوتے ہوئے بولی۔ ''اماں آئیں گی تو میں ان سے بات کروں گی۔''

دوسرے دن میں زرینہ سے ملنے گیا تو وہ گھر پر نہیں تھی۔ خالہ صغراں نے بتایا کہ وہ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ بازار گئی ہے۔ میں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہاں سے باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ زرینہ کسی مرد کے ساتھ بائیک پر بیٹھی ہوئی اپنے گھر کی طرف آرہی تھی۔ میں فوراً دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس شخص نے بائیک دروازے کے سامنے کھڑی کی۔ زرینہ کے ہاتھ میں بہت سارے شاپرز تھے، وہ کچھ دیر کھڑی اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی پھر وہ دونوں گھر کے اندر چلے گئے۔

میرا خون بری طرح کھول رہا تھا۔ فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ پہلے سوچا کہ اندر جا کر زرینہ سے پوچھوں کہ یہ شخص کون ہے جس کے ساتھ تم بائیک پر گھومتی پھر رہی ہو لیکن بات بڑھ جانے کے ڈر سے میں نے اندر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ان کا کوئی رشتے دار ہو لیکن زرینہ کی ماں نے جھوٹ کیوں بولا کہ وہ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئی ہے اور شاپنگ کے لیے پیسے کہاں سے آئے۔ دو دن پہلے تو ان کے گھر میں فاقے ہو رہے تھے۔

یہ ایک نئی صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی اور میرے لیے ضروری ہوگیا تھا کہ فوری طور پر یہ بات امجد کے علم میں لے آؤں تا کہ وہ مجھے کوئی مناسب مشورہ دے سکے۔ پوری بات سننے کے بعد امجد نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔

''مبارک ہو، لگتا ہے کہ تمہاری جان بہت جلد چھوٹنے والی ہے۔''

''کیا مطلب؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''تم ہمیشہ دیر میں سمجھتے ہو۔'' وہ شکایتی لہجے میں بولا۔ ''ارے بھائی بات بالکل سیدھی اور صاف ہے۔ تمہارے بار بار کے اصرار کے باوجود نکاح نامہ کا نہ ملنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ وہ قاضی اور گواہ سب جعلی تھے۔ انہوں نے تم سے سادہ فارم پر دستخط لے لیے اور بقیہ کوائف کا اندراج کرنا ضروری نہ سمجھا۔ تم نے بھی گھبراہٹ کے عالم میں کسی بات پر غور نہیں کیا۔ تمہیں تو شاید یہ بھی معلوم نہ ہو کہ مہر کی رقم کتنی رکھی گئی تھی؟''

''نہیں۔'' میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

''اسی سے اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس نکاح کی حقیقت کیا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ تم پر

سحر

قدیم معاشروں میں سب سے زیادہ عام سحر مشارک یا صوری سحر ہے۔ سحر کی اس قسم میں ایک انسان فطرت کو کسی کردار میں خود چھوٹے پیمانے پر ادا کر کے زیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی سب سے عام مثال ووڈو (Voodoo) گڑیا ہے جس کے ساتھ ساحر دشمن کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ گڑیا کو دشمن کے دھندلے عکس پر تخلیق کیا جاتا ہے اور شاید دشمن کے کچھ ذاتی عناصر مثلاً ٹوٹے بالوں کے سرے یا ناخنوں کی کترنوں کو بھی استعمال کیا جاتا ہو۔ بایں ہمہ گڑیا متعلقہ شکار کی طرح نظر آتی ہے۔ جو سلوک گڑیا کے ساتھ کیا جاتا ہے وہی متعلقہ شکار کے ساتھ ہوگا۔ اگر سوئی سے گڑیا... کی ٹانگوں کو زخمی کیا جائے تو متعلقہ شکار کی ٹانگ زخمی ہوں گی اگر گڑیا کے دل کو تکلیف پہنچائی جائے تو متعلقہ شکار مر جائے گا یا کم از کم دل کی شدید تکلیف میں مبتلا ہو جائے گا۔ قدیم معاشروں میں مینہ برسانے کی تقاریب صوری سحر پر مبنی ہے۔ بہت سے لوگوں کا اعتقاد ہے کہ کرومینئی غاروں کی تصاویر، جن میں شکار کے دوران ہتھیاروں سے تکلیف پہنچائے جانے والے حیوانوں کو دکھایا گیا ہے، وہ پجاریوں نے صوری سحر کے تحت بنائی تھیں۔

مرسلہ: نادیہ حسن۔ راولپنڈی

Downloaded From http://paksociety.com

زور دیتی کہ اپنی منکوحہ کو رخصت کروا کر گھر لے جاؤ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ اس نے تمہیں اس شرط پر بہت مہلت دے دی کہ زرینہ کو باقاعدگی سے خرچا دیتے رہو۔ وہ تمہیں ایک موٹی آسامی سمجھ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دونوں ماں بیٹی تمہارے پیسوں پر عیش کرتی رہیں گی۔ انہوں نے تم سے بہت زیادہ تعلقات وابستہ کرلی تھیں لیکن جب تم نے پہلی مرتبہ شاپنگ کے لیے زرینہ کے ہاتھ پر پانچ ہزار رکھے تو انہیں شدید مایوسی ہوئی اور وہ سمجھ گئیں کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔ ویسے بھی تم امریکا جارہے ہو۔ وہاں نہ جانے کب تک سیٹ ہوسکو۔ کب پیسے بھیجو۔ اس وقت تک یہ کیا کریں گی۔ اس لیے لگتا یہی ہے کہ انہوں نے کوئی اور مرغا پھانس لیا ہے۔“

”میں اس کا خون کردوں گا۔“ میں نے غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ ”میری بیوی ہونے کا ناٹک رچا کر وہ ایک غیر مرد کے ساتھ رنگ رلیاں منارہی ہے۔“

”اس وقت جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہے۔“ وہ میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ”اس نے بیوی ہونے کا ناٹک رچایا ہے لیکن وہ تمہاری بیوی نہیں ہے۔ اس لیے وہ کسی بھی مرد کے ساتھ گھوم پھر سکتی ہے۔“

”لیکن وہ مجھے بے وقوف تو بنارہی ہے۔“

”جب تک تمہارے دل سے خوف نہیں نکلے گا۔ وہ تمہیں بے وقوف بناتی رہے گی۔ میری مانو تو امریکا جانے سے پہلے اس قصے کو ختم کردو تو بہتر ہے۔“

”کیا یہ اتنا ہی آسان ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”پہلے نہیں تھا لیکن اب ہوگیا ہے۔“

”وہ کس طرح؟“

”پہلے تم بیک فٹ پر کھیل رہے تھے اور دفاعی پوزیشن لے رکھی تھی۔ اب تم فرنٹ پر جاکر جارحانہ کھیل کھیلو پھر دیکھو کہ کس طرح چوکے اور چھکے لگتے ہیں۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھا۔ کھل کر بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے۔“

”بہت آسان کام ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”کل تم غصے میں بھرے ہوئے زرینہ کے پاس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ وہ کس کے ساتھ موٹر سائیکل پر گھوم رہی تھی اور کس نے اسے ڈھیروں شاپنگ کروائی۔ اس موٹر سائیکل والے کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے جو وہ اسے گھر کے اندر بھی لے گئی۔ تم اس سے پوچھ سکتے ہو کہ تمہاری اجازت کے بغیر وہ اس موٹر سائیکل والے کے ساتھ باہر کیوں گئی۔ تمہارا انداز اتنا جارحانہ ہونا چاہیے کہ ان دونوں ماں بیٹی کو سنبھلنے کا موقع نہ مل سکے اور وہ سب کچھ سچ سچ بتادیں۔“

اس کی ساری اسکیم میری سمجھ میں آگئی۔ زرینہ سے جان چھڑانے کا یہ ایک نادر موقع تھا۔ میں دوسرے دن زرینہ سے ملنے گیا تو گھر پر تالا پڑا ہوا تھا۔ سامنے میدان میں بچے کھیل رہے تھے۔ میں نے ایک بچے کو اشارے سے بلا کر پوچھا تو اس نے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے ایک آدمی کار میں آیا تھا۔ یہ دونوں اس کے ساتھ کہیں گئی ہیں۔ یہ سننے کے بعد مجھے یقین ہوگیا کہ اس بار زرینہ نے کوئی موٹی آسامی پھانسی ہے اور ایک ہی دن میں موٹر سائیکل سے کار تک کا سفر طے کرلیا۔ اصولاً تو مجھے اس پر خوش ہونا چاہیے تھا کہ خود بخود میری جان چھوٹ رہی تھی لیکن میں کھیل کو اس کے انجام تک پہنچانا چاہ رہا تھا اور اس کے لیے زرینہ اور اس کی ماں کو آئینہ دکھانا ضروری تھا۔

گھر آیا تو ایک خوش خبری میری منتظر تھی جیسے ہی گھر میں داخل ہوا ابو نے آگے بڑھ کر گلے لگالیا اور میرا ماتھا چومنے لگے۔ معلوم ہوا کہ میرا ویزا لگ گیا ہے اور یہ خوشی اسی سلسلے میں منائی جارہی ہے۔ میں نے کیلنڈر میں تاریخ دیکھی۔ اب بھی میرے پاس کلاس جوائن کرنے کے لیے ایک مہینا باقی تھا لیکن ابو نے رائے دی کہ مجھے کم از کم پندرہ دن پہلے وہاں پہنچ جانا چاہیے تاکہ اطمینان سے رہائش اور دیگر انتظامات کرسکوں۔

میں نے دوسرے دن ہی نیویارک کے لیے سیٹ بک کرالی۔ وہاں سے شکاگو کے لیے دوسری فلائٹ ملتی۔ تین چار دن انہی تیاریوں میں گزر گئے۔ اس دوران مجھے بھول کر بھی زرینہ کا خیال نہیں آیا۔ اگر امجد مجھے فون نہ کرتا تو شاید میں زرینہ سے ملے بغیر ہی چلا جاتا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ زرینہ کی ماں سے مل کر اسے اپنے جانے کی اطلاع دوں اور تمام معاملات طے کرکے ان سے چھٹکارا حاصل کرلوں۔

امجد کے کہنے پر میں بادل نخواستہ زرینہ سے ملنے چلا گیا۔ اس وقت بھی دروازے پر وہی موٹر سائیکل کھڑی ہوئی تھی۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ اندر جاؤں یا نہیں۔ اسی وقت دروازہ کھلا۔ میں جلدی سے دیوار کی اوٹ میں ہوگیا تاکہ مجھے کوئی نہ دیکھ سکے۔ زرینہ اسی شخص کے ہمراہ ہنستی ہوئی باہر آئی۔ وہ دونوں بات بات پر قہقہے لگارہے تھے اور

Downloaded From http://paksociety.com

زرینہ اس کے ساتھ بالکل چپکی ہوئی کھڑی تھی۔ ایک دو بار اس آدمی نے زرینہ کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اپنے قریب کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے اپنے آپ کو آہستہ سے پیچھے کرلیا۔ تاہم وہ دونوں دس منٹ تک باہر کھڑے باتیں کرتے رہے اور ان کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے درمیان اب کوئی تکلف باقی نہیں ہے۔ بہر حال خدا خدا کرکے ان کی باتیں ختم ہوئیں۔ اس آدمی نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد زرینہ ہاتھ ہلا کر اسے الوداع کہتی رہی۔

ٹھیک پانچ منٹ بعد میں دیوار کی اوٹ سے باہر آیا اور دروازے پر دستک دی۔ دروازہ زرینہ نے ہی کھولا اور مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔ ''آپ اس وقت؟''

میں نے دروازے کی دہلیز عبور کرتے ہوئے کہا۔ ''کیوں یہاں آنے کے لیے کوئی خاص وقت مقرر ہے یا مجھے پیشگی اطلاع دے کر آنا چاہیے تھا؟''

''نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ بوکھلاتے ہوئے بولی۔ ''دراصل آپ اس وقت آتے نہیں ہیں۔''

''یہ میری سسرال ہے اور میں جب چاہوں یہاں آسکتا ہوں۔ اس کے لیے کسی خاص وقت کا تعین ضروری نہیں۔''

یہ کہتے ہوئے میں اس کمرے کی جانب بڑھ گیا جہاں عموماً مجھے بٹھایا جاتا تھا۔ اس کمرے کا منظر ایسا تھا جیسے کچھ دیر پہلے وہاں کوئی پارٹی ہوئی ہو۔ میز پر چائے کی پیالیاں اور کچھ پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں جن میں بچے ہوئے سموسے، مٹھائی اور چپس پڑے ہوئے تھے اور خالہ صغراں کوک کی بوتل ہاتھ میں پکڑے صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا اور وہ کوک کی بوتل میز پر رکھتے ہوئے بولیں۔ ''ارے عامر بیٹا، آؤ تم اس وقت کیسے آگئے؟''

''کیا بات ہے۔ آپ لوگوں کو مجھے دیکھ کر اتنی حیرت کیوں ہورہی ہے؟ کیا مجھے نہیں آنا چاہیے تھا؟''

''ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔'' خالہ صغراں جلدی سے بولیں۔ ''دراصل ہم لوگ کہیں جانے والے تھے۔''

''تو پھر میں چلتا ہوں۔ پھر کبھی آجاؤں گا۔'' میں نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں اب آئے ہو تو کچھ دیر تو بیٹھو۔'' پھر اس نے اپنی بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''عامر کے لیے چائے لے کر آؤ۔''

میں نے زرینہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اسے میری موجودگی سخت ناگوار گزر رہی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ میں جلد از جلد وہاں سے چلا جاؤں۔ میں سمجھ گیا کہ ان لوگوں کا اس موٹر سائیکل والے کے ساتھ کہیں جانے کا پروگرام ہے۔ میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے میز پر رکھی ہوئی کھانے پینے کی چیزوں پر نظر ڈالی اور کہا۔ ''کوئی آیا تھا کیا؟''

''نہیں، نہیں تو کوئی نہیں آیا۔'' خالہ صغراں بوکھلاتے ہوئے بولی۔

''مجھ سے کیوں چھپا رہی ہو، میں نے خود تھوڑی دیر پہلے ایک آدمی کو آپ کے گھر سے نکلتے دیکھا ہے۔ بلکہ زرینہ نے اس سے باہر کھڑے ہو کر تقریباً دس منٹ تک باتیں بھی کی تھیں۔''

''اچھا، وہ ہاں وہ سلیم تھا۔'' وہ اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ''میرا دماغ بھی بالکل ہی کام نہیں کررہا۔ دو منٹ پہلے کی بات بھول جاتی ہوں۔ وہ سلیم تھا، زرینہ کا کزن، وہ دبئی میں کام کرتا ہے۔ آج کل چھٹیوں پر آیا ہوا ہے۔''

''لگتا ہے۔ وہ یہاں اکثر آتا رہتا ہے میں اسے پہلے بھی تین چار مرتبہ یہاں آتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔''

''ہاں کیا کرے بے چارہ اکیلا ہے۔ دل گھبراتا ہے تو یہاں آجاتا ہے۔''

''زرینہ بھی اس سے خاصی بے تکلف ہے اور اکثر اس کے ساتھ بائیک پر گھومنے جاتی ہے۔''

''تو کیا ہوا۔ وہ کزن ہے اس کا، اگر ایک آدھ مرتبہ اس کے ساتھ کسی کام سے کہیں چلی گئی تو کون سی قیامت آگئی۔''

''ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی دفعہ۔ میں نے خود دیکھا ہے اور اس وقت بھی غالباً اس کے ساتھ کہیں جانے کا پروگرام ہے۔''

''ہاں ہم فلم دیکھنے جارہے ہیں۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے؟''

''ہاں، بالکل ہے۔ کیا مجھے یہ بھی بتانا پڑے گا کہ زرینہ میری بیوی ہے اور میری اجازت کے بغیر گھر سے باہر

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایمائے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

http://paksociety.com

قدم نہیں نکال سکتی۔ دوسری بات یہ کہ سلیم اس کے لیے نامحرم ہے اور میں یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ میری بیوی کسی غیر مرد کے ساتھ بائیک پر تفریح کرتی پھرے۔''

''اوہو، بڑے آئے بیوی والے۔'' خالہ صغراں ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''تم نے آج تک اس کے کون سے حقوق ادا کیے ہیں۔ نہ رخصتی ہوئی نہ ولیمہ۔ نہ ہنی مون نہ شاپنگ۔ صرف نکاح سے کچھ نہیں ہوتا۔ شوہر کی اور بھی کئی ذمے داریاں ہوتی ہیں جو تم پوری نہیں کرسکے پھر کس برتے پر شوہر ہونے کا دعویٰ کررہے ہو۔''

''آخر آپ چاہتی کیا ہیں؟''

''وہی جو ہر ماں چاہتی ہے کہ اس کی بیٹی اپنے گھر کی ہوجائے۔''

''فی الحال یہ ممکن نہیں۔ ویسے بھی میں اگلے ہفتے امریکا جارہا ہوں۔ اس لیے رخصتی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''کیا یہ پانچ سال تک یونہی بیٹھی رہے گی؟''

''یونہی سمجھ لیں۔ یہ بات میں نے آپ کو پہلے ہی بتا دی تھی۔''

''نہیں بھئی یہ نہیں ہوسکتا۔ میں اپنی بیٹی کو انتظار کی آگ میں نہیں جھونک سکتی۔ تمہارا کیا بھروسا واپس آؤ یا وہیں کسی میم سے بیاہ رچالو۔ اس سے تو بہتر ہے کہ تم زرینہ کو آزاد کردو۔ سلیم اس سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے۔''

میرے دل میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ میں جس کام کو بہت مشکل سمجھ رہا تھا وہ چشم زدن میں آسان ہوگیا۔ اب بازی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اپنا پتا کھیلتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔''

''بس تو ابھی اور اسی وقت زرینہ کو طلاق دے دو تاکہ یہ معاملہ ایک طرف ہوجائے۔''

''طلاق بھی دے دوں گا۔ پہلے آپ مجھے نکاح نامہ تو دکھائیں۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ کچھ پریشان ہوتے ہوئے بولی۔

''ضرورت ہے۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اس میں مہر کی رقم لکھی ہوگی، مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ کتنا مہر طے ہوا تھا تاکہ اس کا بندوبست کرسکوں۔''

''ایک لاکھ۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''مجھے یاد ہے۔''

''میں کیسے مان لوں۔'' میں نے تڑخ کر کہا۔ ''آخر آپ کو نکاح نامہ دکھانے میں کیا اعتراض ہے؟''

''نکاح نامہ مولوی کے پاس ہے اور وہ گاؤں گیا ہوا ہے۔''

''میں یہ جھوٹ سنتے سنتے تنگ آچکا ہوں۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''حقیقت تو یہ ہے کہ زرینہ سے میرا نکاح ہوا ہی نہیں۔ وہ سب ایک ڈراما تھا۔ قاضی گواہ سب جعلی تھے۔ میں یونین کونسل میں بھی معلوم کرچکا ہوں۔ ایسا کوئی نکاح رجسٹر نہیں ہوا۔ اس کے بغیر آپ دنیا کی کسی عدالت میں بھی زرینہ کو میری منکوحہ ثابت نہیں کرسکتیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس قصے کو یہیں ختم کردیں ورنہ الٹا آپ کے خلاف فراڈ کیس بن سکتا ہے۔''

یہ سنتے ہی خالہ صغراں کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس نے بے بسی سے زرینہ کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں پھر زرینہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''ہم نے کوئی فراڈ نہیں کیا۔ آپ حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتے۔ بہرحال اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارا نکاح نہیں ہوا تو میں بھی طلاق کا مطالبہ نہیں کروں گی۔ اب آپ جائیں سلیم آتا ہی ہوگا۔ ہمیں بھی تیاری کرنی ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور وہاں سے چلا آیا۔ جب میں نے امجد کو یہ روداد سنائی تو وہ قہقہہ مارتے ہوئے بولا۔ ''میں تو پہلے ہی دن سمجھ گیا تھا کہ یہ سب ڈراما ہے لیکن اس عورت نے تمہیں اتنا خوفزدہ کردیا تھا کہ تم اسے حقیقت سمجھ بیٹھے اور وہ تمہیں بلیک میل کرتی رہی بہرحال اس واقعے سے تمہیں یہ سبق تو مل گیا ہوگا کہ کبھی کسی غیر عورت سے تنہائی میں نہیں ملنا چاہیے کیونکہ شیطان تو ایسے ہی موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔''

اس واقعے کے ایک ہفتے بعد میں امریکا چلا آیا پھر سب کچھ ویسا ہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ دو سال بعد میں چھٹیوں میں پاکستان آیا اور ثمینہ کو بیاہ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ میرا کورس مکمل ہوچکا ہے اور مجھے یہیں ایک اسپتال میں بہت اچھی جاب مل گئی ہے۔ اب میں ایک پُرمسرت زندگی گزار رہا ہوں جب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو شدید پچھتاوا ہونے لگتا ہے اور میں یہ سوچ کر کانپ جاتا ہوں کہ اگر وہ نکاح نامہ اصلی ہوتا تو میرا کیا انجام ہونا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY